پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

تعلیمی میلے میں کہ

ڈاکٹر سوشیل

مشیامحل کلب کی ایک ٹیم جس نے کہانیوں سے مقابلے میں انعام حاصل کیا۔

ڈاکٹر سوشیلا نائر مشیامحل کلب کے بچوں کو گاندھی ٹرافی پیش کر رہی ہیں۔

پیامِ تعلیم

جنوری ۵۵ء

ادارہ

حامد علی خاں

اطہر پرویز

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ چار روپے

قیمت فی پرچہ ۶ر

فہرست

بچّوں سے باتیں

"پیامِ تعلیم" کا سالنامہ آپ سب کی نظر سے گزرا۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ سالنامہ بچّوں اور بڑوں سب ہی نے پسند کیا۔ ہم اس پرچے میں کچھ لوگوں کی رائے بھی شایع کر رہے ہیں۔

ہمارا سالنامہ جامعہ کے تعلیمی میلے کے موقع پر شایع ہوا تھا۔ تین دن تک جامعہ میں میلے کی چہل پہل رہی۔ یہ میلہ ہمارا سالانہ جشن ہے جو ہر سال نت نئی خوبیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اِس موقع پر ہم تفریحی مشغلوں اور کھیل تماشوں کے علاوہ اپنے تعلیمی کاموں کی بھی جانچ کرتے ہیں۔ میلے کا افتتاح ہماری مرکزی حکومت کے وزیر شری اجیت پرشاد جین نے کیا۔ "تین دن" بڑی دھوم دھام سے گزرے۔ کہانیوں کے مقابلے ہوئے، بچّوں اور عورتوں کا مشاعرہ ہوا، موسیقی کی محفل جمی اور یہ سارے پروگرام بڑے کامیاب رہے۔

اس بار میلے میں پانچ ڈرامے پیش کیے گئے۔ چھوٹے بچوں نے "بادل کے بچے"، "شریر لڑکا" اور "سیلنگ گاؤں" پیش کیے۔ "بادل کے بچے" آپ نے سالنامے میں پڑھا بھی ہوگا۔ یہ تینوں ڈرامے بچوں اور بڑوں نے پسند کیے۔

دو ڈرامے بڑوں کے لیے میلے کے آخری دن پیش کیے گئے۔ یہ دونوں ڈرامے منشی پریم چند کی کہانیوں سے لیے گئے تھے۔ پہلا "کفن" جس کو محمد مہدی صاحب نے لکھا تھا اور دوسرا "شطرنج کی بازی" جسے حبیب تنویر صاحب نے ڈرامے کی شکل دی تھی۔ یہ ڈرامے بھی بہت دلچسپی سے دیکھے گئے۔

اس طرح میلے کا پروگرام بڑی اچھی طرح ختم ہوا۔ اور ہر لحاظ سے پسند کیا گیا۔

اس ماہ میں ہمارے یہاں آنے والے مہمانوں میں مارشل ٹیٹو کا نام تو آپ نے بھی اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ آپ مشرقی یورپ کی ایک ریاست یوگوسلاویہ کے صدر ہیں۔ مارشل ٹیٹو آج کل ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ آپ ۲۰ دسمبر کی صبح کو ہماری جامعہ دیکھنے کے لیے آئے۔ آپ نے ہمارے یہاں کے کاموں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ اور بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ جامعہ کے ہر شعبہ نے انھیں اپنے طلباء کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں پیش کیں۔ دیہات کے باشندوں نے ایک صافہ پیش کیا جسے آپ نے اسی وقت پہنا۔ جاتے وقت ہم نے انھیں اپنی اردو، ہندی، انگریزی اور گورمکھی کی کتابیں نذر کیں۔

اس ہماری محفل میں ڈاکٹر محمد شفیع صاحب پہلی بار شریک ہو رہے ہیں۔ ہم نے آپ سے ایک مضمون "ہالینڈ کی سیر" لکھوایا ہے۔ آپ حال ہی میں ہالینڈ سے تشریف لائے ہیں۔ اور آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کام کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے لیے آئندہ بھی اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ مضمون لکھتے رہیں گے۔

دادی اماں کی کہانیاں

بال ہیں جیسے برف کے گالے   چہرہ، جیسے ندّی نالے!!
آنکھیں، ایک کھنڈر کے جالے   ہنستی ٹوٹا دانت نکالے!
اس کے قِصّے مرچ مسالے

ہر قِصّے میں بات پُرانی!   ایک تھا راجا ایک تھی رانی
آیا بڑھاپا گئی جوانی!!!   کوئی نہ تھی اولاد نِشانی!
دونوں مر گئے، ختم کہانی!

آج سُنو بھوتوں کی حویلی   کل ہوگی شیطان کی چیلی!
ایک پری چنچل البیلی!!   دیووں سے کرتی اٹھکھیلی
راجا بھوج اور گنگو تیلی

نہیں - نہیں" پھر مُنّا بولا   سُنیں گے جادُو گر کا جھولا
شاہیں کیسے بنا ممولا!   سُندر شہزادی کا ڈولا!!
شہزادے کا اُڑن کھٹولا

جنک کمار احساس،

جامعہ ملیہ کے تعلیمی میلے نے جو بچوں کے تعلیمی میلے کے نام سے مشہور ہے۔ دہلی کے میلوں کی تاریخ میں ایسے شاندار باب کا اضافہ کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ میلا ہر سال جامعہ کے یوم تاسیس یعنی ۲۹ اکتوبر کے لگ بھگ کسی تاریخ میں ہوتا ہے۔ اس میلے میں زیادہ تر پروگرام بچوں کے ہوتے ہیں میلے کا انتظام بچے خود ہی کرتے ہیں۔ جامعہ کے کارکن اور اساتذہ صاحبان ان کے اس کام میں ہاتھ ضرور بٹاتے ہیں۔ بچوں کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے علمی اور تعلیمی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ میلے کے اس موقع پر جامعہ کے تمام دوسرے شعبے بھی اپنے اپنے کاموں کی نمائش کرتے ہیں۔

آیئے، میلے کی طرف چلیں۔ آج ۳۰ اکتوبر ہے اور آج ہی میلے کا افتتاح ہونے والا ہے۔ یہ میلا تین روز تک رہے گا۔

لیجیے، صاحب اب زیادہ دیر نہ کیجیے، افتتاح کا وقت ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے جامعہ کا پرچم لہرایا جائے گا۔ میلے کا افتتاح حکومتِ ہند کے وزیرِ بحالیات شری

اجیت پرشاد جین فرما رہے ہیں ۔ دیکھئے وہ تشریف لے آئے ہیں ۔ اگر پنڈال پہنچنے میں ذرا سی دیر اور ہو جاتی تو پھر تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی ۔ اب موقع کو غنیمت جان کر ادھر بیٹھ جائیں تاکہ تمام کارروائی اچھی طرح دیکھ سکیں ۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب اور شری اجیت پرشاد جین کی تقریروں کے بعد اور لوگ اٹھنا شروع ہو گئے تاکہ میلے کی رنگا رنگ دلچسپیوں میں اپنے آپ کو گم کر دیں آیئے ہم لوگ بھی نکل چلیں ورنہ پھر نکلنا مشکل ہی ہوگا ۔ چنانچہ مدرسہ ابتدائی ، ثانوی ، استادوں کا مدرسہ تعلیم و ترقی ، دہلی میوزیم اور دوسری تعلیمی نمائش دیکھتے ہوئے اب ہم لوگ بچوں کے پارک کی طرف چلے چونکہ اس کے افتتاح کا وقت قریب آ گیا تھا ۔

"بچوں کا پارک"

بچوں کے پارک کا افتتاح محترمہ بیگم شفیق الرحمن صاحب قدوائی حال میونسپل کمشنر دہلی نے فرمایا ۔ یہ بچوں کے کوں کی چیز تھی ۔ پارک کیا یہ تو تھا اچھا خاصا عجائب گھر تھا ۔ جس میں ہاتھی ، اونٹ ، گھوڑے ، اور گدھے سب ہی کچھ تھے ۔

اس کے دروازے میں داخل ہوتے ہی گیٹ کے پاس ہاتھی صاحب مع اپنے مہاوت کے کھڑے جھوم رہے ہیں ان کے ہلنے جلنے سے ان کے گلے کی بندھی ہوئی گھنٹی ٹن ٹن بجنے لگتی ہے ۔ بچے ان [illegible] اٹھنا بیٹھنا ، کھڑے ہونا ، سونڈ ادھر ا[illegible] اور سوپ جیسے بڑے بڑے پنکھوں [illegible] جھلنا بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں اور کچھ ہاتھی پر سوار ہونے کے لئے مہاوت سے بات چیت کر رہے ہیں ، وہ دیکھئے دوسری طرف ریگستان کا جہاز یعنی اونٹ مع اپنی لمبی گردن کے کھڑا ہوا ہے اور اس کے جسم کی ایک ایک کل ٹیڑھی نظر آ رہی ہے ۔ اتنے میں قریب ہی ایک شور مچا معلوم ہوا کہ ایک بچہ گدھے پر سوار ہے ۔ اور اس کے دوسرے ساتھی اس کا مذاق اڑا رہے ہیں ۔ آپ تعجب نہ کیجئے گدھا بھی سواری کا جانور ہے ۔ ہمارے یہاں چاہے

اس پر سوار ہوتا کسر شان سمجھتے ہوں لیکن دوسرے ملکوں میں تو اس پر نہ صرف سواری کرتے ہیں بلکہ دولہا کی برات بھی گدھے پر جاتی ہے اور ہاں وہ دیکھیے، ایک صاحب کس شان شوکت کے ساتھ چلے آرہے ہیں جیسے ابھی ابھی کسی میدانِ جنگ سے چلے آرہے ہوں۔ ہاں صاحب واقعہ تو یہی ہے کہ گھوڑے کی سواری شاہی سواری ہے۔

ان کے علاوہ یہاں میدانی اور فرشی کھیلوں کا بھی انتظام ہے۔ وہ دیکھیے، بچے کس طرح پھسل منڈے پھسل رہے ہیں۔ کچھ چرخی جھولا اور چکر چھوڑ لکڑی کے جھولے میں جھول رہے ہیں اور کچھ ڈارٹ بورڈ، دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا

بسکٹ وغیرہ اڑا رہے ہیں

"گاندھی ٹرافی"!

میلے کے دوسرے دن بچوں کی دلچسپی کی چیز گاندھی ٹرافی کے مقابلے تھے۔ یہ مقابلے ہاتا گاندھی کی یاد کو زندہ رکھنے اور ان کی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے ان کی پہلی برسی کے موقع پر بچوں کی برادری جامعہ کی طرف سے گاندھی ٹرافی کے نام سے شروع کرائے گئے تھے۔ اب یہ مقابلہ صرف چوتھی جماعت تک کے بچوں کے لئے ہوتے تھے۔ امسال ان مقابلوں

میری گورا ڈنڈے سر لطیفیاں' اس ملک کی سرحدیں جرمنی اور بلجیم سے جا ملتی ہیں یہاں ہیں۔ کچھ لطیفے ڈچ کہلاتے ہیں اور یہی ان کی قومی زبان کا نام بھی ہے۔ ہالینڈ کے ہیں اور نے کا نام ہیگ ہے۔

ہالینڈ بڑا ہی ترقی یافتہ اور دلچسپ ملک ہے۔ حالانکہ ہے بہت چھوٹا سا ملک۔ اس کا کل رقبہ یوں سمجھیے کہ بس ہمارے صوبے اتر پردیش کے کسی ایک ضلع کے برابر ہوگا۔ لیکن اس کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے، بس اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں زمین کی کمی کتنی محسوس کی جاتی ہوگی۔ بڑے بڑے شہر، قصبے اور گاؤں ایک دوسرے کے پاس ہی پاس آباد ہیں، اگر آپ ریل کے ذریعہ ایک شہر سے دوسرے

ہیں دہلی کے اکثر کلب اور اسکولوں کے بچے
اور بچیاں حصہ لے رہے ہیں۔ لیجیے، ہم اب
اُس جگہ آگئے، جہاں یہ مقابلے ہوں گے۔
اور صدر صاحب بھی رونق افروز ہیں ارے
یہ صدر تو وہی حبیب احمد صاحب قدوائی
ہیں جنھوں نے گذشتہ سال اسی جگہ میلے
کے موقع پر بچوں کی کانفرنس کی صدارت
کی تھی۔

اچھا صاحب صدر صاحب کے اعلان
کے مطابق مقابلہ شروع ہوگیا ہے۔ ان
کہانیوں کو سُن کر اندازہ ہو رہا ہے کہ بچوں
[illegible] ہے۔ کہانیاں کہنے اور

تعلیمی میلے میں کہانیوں کا یہ مقابلہ ہو رہا
ہے۔ ابھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ
ان میں اوّل دوم سوم کون رہے گا۔ لیکن
اس مشکل کو جج صاحبان نے آسان کر دیا
ہے۔ چنانچہ اب صدر صاحب اعلان فرماتے
ہیں کہ جب تک نتیجہ تیار ہو آپ دریا گنج
پارک کے بچوں سے ایک گیت سُنیے۔ جتنی
دیر میں گیت سُنایا گیا اتنی دیر میں اُدھر
نتیجہ تیار ہوگیا۔ کہ بچوں کا کلب مٹیا محل
نے گاندھی ٹرافی جیت لی۔ چونکہ بحیثیت
مجموعی ان کے نمبر زیادہ آئے ہیں اس لیے
ٹرافی ان کو دی جائے گی۔ انفرادی انعامات
پہلا انعام محمد اسلم صاحب نونہال کلب،
[illegible] اسکول،
اور خصوصی
دریاگنج

ڈاکٹر محمد شفیع ارغوانی

ہالینڈ کی سیر

آئیے آپ کو یورپ کے ایک چھوٹے سے دیس کی سیر کرائیں، اُسے ہالینڈ کہتے ہیں۔ آپ نے انگلینڈ کا نام تو ضرور سُنا ہوگا، ہالینڈ، بس اس کے جنوب مشرق میں کچھ ہی فاصلہ پر واقع ہے۔ بحرِ شمالی ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے، جنوب اور مغرب میں اس ملک کی سرحدیں جرمنی اور بلجیم سے جا ملتی ہیں یہاں کے باشندے ڈچ کہلاتے ہیں اور یہی ان کی قومی زبان کا نام بھی ہے۔ ہالینڈ کے دارالخلافے کا نام ہیگ ہے۔

ہالینڈ بڑا ہی ترقی یافتہ اور دلچسپ ملک ہے۔ حالانکہ ہے بہت چھوٹا سا ملک۔ اُس کا کُل رقبہ یوں سمجھیے کہ بس ہمارے صوبے اُتر پردیش کے کسی ایک ضلع کے برابر ہوگا۔ لیکن اس کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے، بس اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں زمین کی کمی کتنی محسوس کی جاتی ہوگی۔ بڑے بڑے شہر، قصبے اور گاؤں ایک دوسرے کے پاس ہی پاس آباد ہیں، اگر آپ ریل کے ذریعہ ایک شہر سے دوسرے

شہر جانا چاہیں تو پندرہ بیس منٹ سے
زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ زمین کی اس
ملک میں اتنی قدر کی جاتی ہے کہ ایک چھوٹا
سا قطعہ بھی کہیں ایسا نظر نہیں آتا جو
استعمال میں نہ آتا ہو، اس پر بھی یہ لوگ
زمین کی قلت کو برابر محسوس کرتے ہیں۔
لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ ڈچ لوگوں
نے اپنی طرف سے جدو جہد کرنے میں کوئی
کسر اٹھا رکھی ہے، آج سے کئی سو سال
پہلے ہی سے اُنھوں نے سمندر سے کاشت
اور رہنے سہنے کے لئے زمین حاصل کرنے
کا گُر معلوم کر لیا تھا۔ اس کام میں قدرت
نے بھی اِن لوگوں کی بڑی مدد کی۔ یہ
اس طرح کہ ہالینڈ کے سمندری کنارے
پر بہت فاصلے تک سمندر ذرا کم گہرا
ہے۔ ڈچ لوگوں نے قدرت کے اس
عطیے سے اپنی حوصلہ مندی اور جفاکشی کی
بدولت پورا پورا فائدہ اُٹھانے کا تہیہ
کر لیا۔ اب لیجئے آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ
اس ملک کے لوگوں نے سمندر سے زمین
کس طرح حاصل کی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہالینڈ کے باشندوں
نے سمندر کو پیچھے ڈھکیلنا شروع کر دیا
تو بالکل غلط نہ ہوگا، ہوا یہ کہ اُنھوں نے
بڑی بڑی کشتیوں کی مدد سے سمندر کے
اندر پتھروں کی دیواریں کھڑی کر دیں۔
ان پتھروں کو جوڑنے کے لئے ایک خاص
قِسم کی چکنی مٹّی استعمال کی جاتی ہے اور
جب یہ دیواریں مکمّل ہو جاتی ہیں تو اندر
کا پانی نکال پھینکتے ہیں اور تھوڑی ہی مدّت
میں اس حاصل کی ہوئی زمین کو رہن سہن
اور کاشت کے لائق بنا لیتے ہیں۔ اس
طرح یہ اپنے مُلک کا رقبہ بڑھاتے چلے
جا رہے ہیں، اس کا ایک دلچسپ نتیجہ
یہ ہے کہ ہالینڈ کا تقریباً تین چوتھائی حِصّہ
سطح سمندر سے تین یا چار فٹ نیچا ہے۔

اس مُلک کی ایک خوبی یہ بھی ہے
کہ وہاں پھول بڑی کثرت سے ہوتے
ہیں۔ اس کے پھولوں کے باغات تو دُنیا
بھر میں مشہور ہیں ہی اور انھیں دیکھنے کے
لئے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں لیکن باغات
کے باہر بھی بہت پھول ملتے ہیں، خصوصاً

اپریل اور مئی کے مہینوں میں اگر آپ ریل یا موٹر میں بیٹھ کر ایک شہر سے دوسرے شہر جائیں تو راستے بھر دونوں طرف رنگ برنگ کے پھولوں کی کیاریاں میلوں تک پھیلی نظر آتی ہیں، یہ منظر بڑا ہی دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ پھولوں سے اس ملک کی خوبصورتی کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور تجارت بھی خوب ہو جاتی ہے، پچھلے سال ہی کی بات ہے کہ وہاں کے پھول اگانے والوں نے پچاس کروڑ روپیوں سے زیادہ کے پھول غیر ملکوں کو بھیجے۔

ملک کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے میں وہاں کی ہوا چکیوں (Wind Mills) اور نہروں کا بھی کم حصہ نہیں ہے۔ چونکہ ہالینڈ میں ہر وقت اچھی خاصی ہوا چلتی رہتی ہے۔ وہاں کے لوگوں نے مدت ہوئی جگہ جگہ ہوا سے چلنے والی چکیاں تعمیر کیں، اس وقت لوگ بجلی اور بھاپ کا استعمال نہیں جانتے تھے اس لئے یہ بڑی کار آمد تھیں، اب اگرچہ ان کا استعمال بالکل نہیں ہے پھر بھی ہوا کی قوت سے چلنے والے ان چکیوں کے پنکھے بڑا دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ نہروں کا بھی یہ سمجھئے کہ سارے ملک میں نہروں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ نہ صرف دیہاتوں میں بلکہ بڑے بڑے شہروں میں بھی ہر دوسری تیسری سڑک پر کوئی خوبصورت نہر ہوگی۔ ان نہروں سے اب بھی نقل و حمل میں مدد ملتی ہے، سیر و تفریح کرنے والے بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کل، کارخانوں کا بھی ہالینڈ میں بڑا رواج ہے۔ سمندری جہاز، ہوائی جہاز اور بجلی کے آلات و دیگر سامان بنانے کے یہاں بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ شہر ہو یا دیہات ہر جگہ بجلی کا استعمال گھر گھر ہوتا ہے۔ یہی حال تعلیم کا بھی ہے۔ برقی لہروں کی طرح علم بھی گھر گھر پھیل گیا ہے، یہاں تک کہ ملک بھر میں ڈھونڈنے پر بھی کوئی ان پڑھ آدمی نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہالینڈ کا ہر کسان مصنوعی کھاد اور زراعتی کلوں کے استعمال سے بخوبی واقف ہے۔ کہا جاتا

ہے کہ وہاں کا کسان اپنی زمین سے ایک ایکڑ میں دُنیا کے اور سب مُلکوں سے زیادہ غلّہ پیدا کر لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

غلّے کے علاوہ ہالینڈ میں دُودھ مکھن اور پنیر کثرت سے ہوتا ہے۔ وہاں کی گائیں بڑی تندرست اور خوبصورت ہوتی ہیں اور کئی کئی سیر دُودھ دیتی ہیں۔ اِسی لئے یہ لوگ مشینوں کی مدد سے دُودھ نکالتے ہیں، اس طرح وقت بھی زیادہ نہیں لگتا اور کام بڑی صفائی سے ہوتا ہے، اورجب دُودھ مکھن اور پنیر جیسی چیزیں کثرت سے پیدا ہوتی ہوں اور ہر شخص کو آسانی سے میسّر آتی ہوں تو آپ خود خیال کرسکتے ہیں کہ وہاں کے بچے کس قدر صحت مند ہوں گے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات کہ میں جب ہالینڈ سے ہندوستان واپس آیا تو مجھ سے اکثر دوستوں نے پوچھا کہ ہالینڈ کی کیا چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تو میں نے فوراً یہی کہا "بچے" کیونکہ بچے ہی تو مستقبل کی ضمانت ہیں، صحت منداور خوش مزاج بچے۔ آگے چل کر صحت منداور خوش حال سماج بناتے ہیں۔

(بقیہ شرط صفحہ ۳۷)

اشرف نے کہا کہ آئندہ اگر آپ اپنی قابلیت اور عقل مندی کی دھونس نہ جمائیں تو میں پندرہ روز تک چائے بنا کر پلانے کی شرط معاف کرنے کو تیار ہوں۔ ریاض اپنی ہار پر نادم تو تھے ہی فوراً سمجھوتہ کر لیا اور لپک کر اپنی شیروانی میں سے چاکلیٹ نکال کر اشرف کو دیدئے اور اس کے بعد پھر وہی اشرف اور ریاض تھے۔ ایک دوسرے پر مرمٹنے والے دوست۔ اور بھائی بھی!

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

باجی کی سہیلی

اشرف النساء

ایک روز انیس کی سالگرہ تھی۔ رات کا وقت گرمی کا موسم۔ سفید دودھ سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سب لوگ دن کے کام سے تھک کر پڑے سو رہے تھے۔ ایک ہم تھے کہ ہمیں نیند آتی ہی نہ تھی۔ میں بھی اس کے انتظار میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ آخر کچھ دیر بعد اس کو میرے حال پر رحم آ ہی گیا۔ اور میں سو رہی تھی۔

ابھی پوری طرح آنکھ نہ لگی تھی کہ کسی نے پیر گدگدانے شروع کئے۔ پہلے تو میں نے خیال کیا کہ یہ محض میرا وہم ہے۔ چند منٹ ناخن سے چبھتے محسوس ہوئے۔ اب میں سمجھی کہ یہ کس کی شرارت ہے۔ میں نے آہستہ سے اٹھ کر اسے پکڑ لیا۔ مگر یہ تو تھی ہماری باجی کی عزیز سہیلی "بلی"۔ آج باجی اس کو باورچی خانے میں بند کرنا بھول گئی تھیں۔ جہاں چوہے بہت تھے، اسے لے جاکر بند کرنا میرے لئے بڑا مشکل ہو گیا تھا۔

کیونکہ باورچی خانہ ذرا دور تھا۔ اس طرف ایک درخت بھی تھا۔ مجھے اس طرف جاتے ہوئے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اس مہم کے لئے میں نے رضوانہ سے مدد لینے کی سوچی۔ مگر وہ تھی نیند میں غرق۔ جاگنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کئی مرتبہ اسے جگایا۔ آخر بڑی منت سے کہا۔ "اچھی رضوانہ اٹھو مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ اور ڈر بھی لگ رہا ہے"

"ہوں ـــ تو کیا مجھے ڈر نہیں لگ رہا ہے؟"
رضوانہ نے کہا۔ اور چادر سر سے پیر تک لپیٹ کر سو گئی۔ ایک مرتبہ میں نے اور کوشش کی شکر ہے کہ وہ جاگ گئی۔ میں نے کہا۔ "رضوانہ اس بلی کو باورچی خانہ میں چھوڑ آئیں گے چلو۔" بڑی مشکل سے وہ ساتھ چلنے پر تیار ہوئی ـــ اسے باورچی خانے میں چھوڑ کر دروازہ بند کر کے ہم واپس آ گئے اور بستروں پر دراز ہو گئے۔ اب نیند اُچٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں میں لگے رہے۔ ہماری آنکھ لگی ہو گی کہ "کھٹ" سی آواز نے چونکا دیا۔ اور ساتھ ہی رضوانہ بھی اُچھل پڑی۔

ان دنوں محلے میں خوب چوریاں ہو رہی تھیں اور چور ملتا نہ تھا۔ کچھ دیر بعد پھر خوب زور کی آواز آئی۔ اور پھر پے در پے دو چار آوازیں آئیں۔ اب کی دفعہ چچی جان جاگ گئیں۔ اور "کون؟" کی آواز آئی۔ ان کی آواز نے دادی اماں کو جگا دیا۔ یہ بھی "کون ہے؟" کہتے ہوئے اُٹھ بیٹھیں لیکن ان دونوں کے سوال کا جواب نہ ملا۔ دونوں دیوان خانے کی طرف گئیں۔ وہاں چچا جان۔ حمید بھائی۔ اور بھائی جان کو اٹھا لائیں۔ سب اپنے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے سنبھالے ہوئے تھے۔ حمید بھیا تو ڈرپوک تھے ہی۔ یہ باہر دوڑے اور محلہ والوں کو جگا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ سب گھر کے دروازے پر لاٹھیوں سے لیس جمع ہو گئے۔ احمد بھائی نے پولیس کو ٹیلیفون کیا ـــ ابا حمید بھیا اور چچا جان باورچی خانے کے دروازے پر ڈٹ گئے۔ چچا جان فوجی آدمی تھے۔ بھاری بھرکم اونچا پورا قد ـــ انھوں نے دروازے کی زنجیر تھامی۔ سب کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کر کے خود بھی سیدھے ہاتھ میں ڈنڈا تھام بائیں ہاتھ سے زنجیر کھولی۔ پھر ایک مرتبہ ہوشیار رہنے کا حکم دیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی باجی کی سہیلی "بلی" جسے ہم قید کر آئے تھے نکل بھاگی۔ اس کا سر گھی کی چھوٹی سی دیگچی میں پھنسا ہوا تھا۔ اور وہ اندھا دھند بھاگ نکلی۔ سب کے سب ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ اور ـــ اور وہ قہقہے بلند ہوئے کہ کچھ نہ پوچھئے ـــ پولیس والے آئے اور بڑبڑاتے ہوئے لوٹ گئے۔ محلے والے نہ جانے کیا کہتے ہوئے چلے گئے۔

مگر میں اور رضوانہ ہی جانتے تھے کہ یہ کس کی کارستانی تھی ـــ

مجاہد حسین زیدی

سرنگاپٹم

ہمارے دیس میں ایسے کئی مقامات، شہر اور قلعے ہیں جہاں ہمارے ملک کی قسمت کئی بار بنی اور بگڑی ہے۔ انہیں قلعوں میں ایک قلعہ سرنگاپٹم بھی ہے۔ اس قلعے سے ہمارے ایک وطن پرست کا نام وابستہ ہے، جس کی گردن غیروں کے سامنے کبھی نہیں جھکی۔ جس نے ملک کی آزادی کے لئے جان تک کی بازی لگا دی۔ یہ ہیں ٹیپو سلطان شہید۔

ٹیپو سلطان شہید کی راجدھانی سرنگاپٹم میں ہے جو میسور سے دس میل مشرق کی جانب واقع ہے۔ اس کو دریائے کاویری کی دو شاخوں نے اس طرح گھیر لیا ہے کہ یہ ایک بہت محفوظ جزیرہ بن گیا ہے۔ اس جزیرے تک پہنچنے کے لئے دریائے کاویری کے ایک کنارے پر ایک پُل بنا ہوا ہے۔ سرنگاپٹم کوئی تین میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔

ٹیپو سلطان کے باپ کا نام حیدر علی تھا۔ حیدر علی انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ وہ شروع میں میسور کے سپہ سالار تھے۔ لیکن اس وقت میسور کا راجا انگریزوں کے

زیر سایہ رہ کر زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ حیدر علی آزادی کے پرستار تھے۔ اُن کو راجا کا یہ عمل پسند نہ آیا۔ پہلے تو انہوں نے راجا کو اونچ نیچ سمجھائی۔ لیکن راجا کے سمجھ میں خاک نہ آیا وہ دوسروں کے اشارے پر چلتا رہا اور سلطنت کا کام بگڑتا رہا۔ آخر حیدر علی خود بادشاہ بن گیا۔ اور اس طرح سلطنتِ خداداد میسور وجود میں آئی۔ جس طرح انگریز، بنگال اور بہار سے سراج الدولہ کو بے دخل کر چکے تھے، اُسی طرح وہ حیدر علی کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ اِسی لئے انہوں نے میسور پر دھاوا بول دیا۔ مگر حیدر علی نے انگریزوں کو بُری طرح ہرایا اور پہلی بار سرنگاپٹم کا جھنڈا پورے جنوبی ہند پر لہرانے لگا۔

حیدر علی کی وفات کے بعد سلطان فتح علی ٹیپو سلطنتِ خداداد کے مالک بنے۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح انگریزوں کے دشمن تھے۔ اور انگریز برابر اُن کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انگریزوں اور سلطان ٹیپو کے درمیان پھر چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ ابتدا میں میدان سلطان ٹیپو ہی کے ہاتھ رہا۔ مگر مرہٹے اور نظام انگریزوں کے ساتھ تھے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری لڑائی میں ٹیپو کو انگریزوں سے دَب کر صلح کرنی پڑی۔ اور اُنہیں تین کروڑ روپے تاوانِ جنگ اور اپنے دونوں بیٹے انگریزوں کے حوالے کرنے پڑے۔ انگریزوں نے ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شیر دل سلطان ذِلّت کی زندگی سے موت کو ترجیح دیتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ ٹیپو سلطان بہادری سے لڑتا رہا۔ آخر کسی بزدل کی ایک گولی نے سرنگاپٹم کے اس چراغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گُل کر دیا اور سرنگاپٹم کا جھنڈا سرنگوں ہوگیا۔

یہ تھا قلعہ سرنگاپٹم کا تاریخی پس منظر آیئے اب قلعہ کے اندر چلیں۔ سامنے میسوری دروازہ ہے جہاں سلطان ٹیپو

جھنڈا لہرایا کرتے تھے۔ جب آپ مشرق کی طرف بڑھیں گے تو نرسنگھ سوامی مندر کے کلس آپ کا استقبال کرتے نظر آئیں گے۔ اس مندر کا نام سری رنگا ناتھ جی کا مندر ہے۔ اس کے کچھ فاصلے پر شاہی جامع مسجد کا برج ہے۔ مندر اور مسجد کا یکجا ہونا سلطان کی بےمثل مذہبی رواداری کی شہادت دیتا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھیئے تو ایک اور وسیع میدان میں لمبی محراب کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس محراب کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ڈاٹ کے پتھر پر کھڑا ہو کر زور دینے سے پوری محراب ہلتی ہے۔ اس میدان سے ذرا فاصلے پر شاہی فصیل کے آثار نظر آتے ہیں جنہوں نے کبھی انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے ذرا اور آگے بڑھیئے تو سلطان ٹیپو کے محلات نظر آئیں گے جہاں کبھی نوبت بجتی تھی، وہاں اب موت کی سی خاموشی طاری ہے۔ البتہ دریا دولت باغ میں انقلاب کے باوجود کچھ نہ کچھ زندگی باقی ہے۔ باغ تو اب خس و خاشاک کا انبار ہے لیکن اس کے درمیان لکڑی کی عمارت قائم ہے۔ دریا دولت باغ سے اور آگے بڑھیئے تو لال باغ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حیدرعلی نے محلاتِ شاہی اور باغات کی بنیاد ڈالی تھی۔ محلات اور باغات تو انگریزوں کے جذبۂ انتقام کے بھینٹ ہوگئے البتہ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی آخری آرام گاہ اب بھی باقی ہے جو گنبد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقبرہ سلطان شہید نے اپنی زندگی میں بنوا لیا تھا اور اس میں وہ خود ان کی والدہ سیدانی بیگم اور اُن کے والد حیدرعلی مدفون ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ سلطان ٹیپو کی موت ہماری آزادی کا خاتمہ تھی جس کی خاطر انہوں نے تن من دھن سب کی بازی لگادی تھی۔ قلعہ سرنگا پٹم کا جھنڈا سربلند نہ رہ سکا۔ اور حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی آرزوؤں اور حوصلوں کا

باقی ص۱۲ پر

ا۔ع۔ انصاری اسلام پوری

یہ اچھی رہی

یہ واقعہ ایک ادیب سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت ہی باکمال اور مشہور ادیب ہونے کی وجہ سے، اُن کی عزّت کرنے والے لوگ اُنھیں اپنے نوکروں کے ذریعہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ تحفے بھیجا کرتے تھے۔ ادیب اپنے دوستوں کے بھیجے ہوئے تحفوں کو بہت ہی خوشی اور عزت کے ساتھ قبول کر لیا کرتے تھے۔ لیکن لانے والے نوکروں کو انعام یا بخشش کے طور پر کچھ دینا بھول جاتے تھے۔ اس دستور کا انھیں خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ نوکر دل ہی دل میں تعجب کرتے کہ اتنے بڑے ادیب ہونے پر بھی اُنھیں، اتنی معمولی سی بات بھی نہیں معلوم۔

اُن کے ایک دوست کے یہاں سے، اُس کا نوکر برابر کچھ نہ کچھ اُن کے پاس لایا کرتا تھا۔ وہ ہر بار یہی سوچتا کہ اس بار یہ ادیب اُسے کچھ نہ کچھ انعام ضرور دیں گے۔ لیکن اُسے ہمیشہ مایوس ہی لوٹنا پڑتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُس کے دل سے ادیب کی عزّت کم ہوتی گئی۔

ایک دن وہی نوکر ایک بڑی مچھلی ہاتھ میں لئے، ادیب کے لکھنے پڑھنے کے کمرے

کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اُس نے گھنٹی
بجائی۔ اندر سے ادیب نے کہا: "آجاؤ ---!"
کمرے میں پہنچ کر نوکر نے کہا --- "یہ مچھلی
میرے مالک نے آپ کے لیے بھیجی ہے۔"
اُس کے لہجے میں نرمی کے بجائے بہت ہی
سختی تھی۔ اس بات کو اُس نے فوراً ہی
محسوس کر لیا اور اُنھیں اس سے تکلیف
ہوئی۔ اس لیے وہ کرسی سے اُٹھ کر بولے
"مجھے افسوس ہے کہ تہذیب و ادب سے
تم بالکل کورے معلوم ہوتے ہو۔ تمھارے
اندر ذرا بھی تمیز نہیں۔ ٹھہرو ---! میں
تمھیں سکھاتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ اور
ایک منٹ کے لیے سوچو کہ تمھیں ادیب ہو
اور میں تمھارے دوست کے گھر سے آیا ہوا
نوکر ہوں۔ آئندہ تم کس طرح بات کروگے،
یہ سیکھ لو ---!" یہ کہہ کر ادیب مچھلی لے کر
کمرے کے باہر چلے گئے۔ پھر مچھلی ہاتھ میں
لیے، عاجزانہ صورت بنائے، بڑے ادب سے
سلام کرتے ہوئے، میز کے پاس آکر کھڑے
ہو گئے، اور بولے --- "جناب والا ---! میرے
مالک نے آپ کو بہت ہی احترام کے ساتھ
سلام عرض کیا ہے اور اس حقیر سے تحفے کو
قبول کرنے کی درخواست کی ہے۔"

نوکر (ادیب کی جگہ) نہایت سنجیدہ
اور پُر رعب لہجے میں بولا --- "اچھا! انھیں
میری طرف سے سلام کہنا۔" پھر ادیب کو ایک
آنہ دیتے ہوئے، بولا "اور یہ تم اپنے
لیے رکھو۔ کیوں ٹھیک ہے نا ---؟"

نوکر کے اس سلوک سے ادیب کا منہ
حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُنھیں اپنی
غلطی محسوس ہوئی اور وہ مسکرا اُٹھے۔ پھر
نوکر سے بولے "یہ لو ایک آنہ اپنی بیوی
کو دے دینا۔"

نوکر خوش ہو کر چلا گیا۔

جناب ادیب اُس نوکر کو تہذیب و
ادب سکھانے چلے تھے۔ لیکن خود اُنھیں کو
اُس سے سیکھنا پڑا۔ جانتے ہو یہ ادیب
کون تھے؟ یہ تھے دُنیا کے مشہور لکھنے والے
--- ڈین سوئفٹ (Dean Swift)

مقبول احمد سیوہاروی

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

حضرت عمر فاروق جیسے لوگ دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔
حضرت عمر جیسے مدبر تھے ویسے ہی پاک باز اور نیک بھی تھے، بڑے سپاہی بڑے دلیر نہایت اچھے، بڑی سادہ زندگی گذارتے تھے، غرور اور شیخی کا نام و نشان نہ تھا ایسے منتظم تھے کہ سارے عرب کو گلزار بنا دیا۔ چٹیل میدانوں اور بنجر زمینوں کو ہرا بھرا کر دیا، سارے ملک میں منادی کرا دی کہ جو کوئی پڑی پڑائی زمینوں میں کاشت کرے گا زمین اسی کو دے دی جائے گی۔
حضرت عمر نے مستقل نہر کا محکمہ قائم کر دیا اور صرف مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار مزدور سال بھر تک روزانہ کام میں لگے رہے، اور نہروں کی کھدائی ہوتی رہی۔
نہروں کو دیکھ کر بنجر زمینوں میں لوگوں نے کاشت شروع کر دی تمام اضلاع میں عدالتیں بنائیں۔ حاکم کب تک کام کریں کب کچہریاں بند ہوں کسی پر دعوے ہو اور وہ بڑھاپے بیماری کے سبب حاضر نہ ہو سکتا ہو تو مدعی سواری کا انتظام کرے، عدالت بیمار اور بوڑھے

کو زبردستی نہ ہلائے گی۔

قاضی بڑے بڑے عالم اور سمجھ دار مقرر کئے، سرکاری عمارتیں سڑکیں اور پل بنائے۔

مکہ معظمہ کے راستے ویران تھے پانی کا انتظام نہ تھا، ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور چشمے تیار کرائے، مہمان خانے، مسافر خانے اور فوج کی چھاؤنیاں بنائیں۔ بصرہ جیسا عالی شان شہر آباد کیا۔ بصرہ سے دریائے دجلہ دس میل تھا مگر دجلہ سے بصرہ تک نہر نکالی۔ کوفہ بسایا، اور اتنے مکانات بنوائے جس میں چالیس ہزار آدمی رہ سکیں۔ ہر خاندان والوں کے الگ الگ محلے بنائے۔ چوڑی چوڑی سڑکیں، کھلی ہوئی صاف ستھری گلیاں، شاندار جامع مسجد جس کے چاروں طرف کھلا میدان، مہمان خانہ جس میں باہر کے مسافر ٹھہریں۔

شہر موصل کو جہاں اب تیل کے چشمے نکلے ہیں حضرت عمر نے سجایا، اور رونق دی۔

حضرت عمر کے زمانے میں عرب قوم مالا مال ہو گئی محتاج کوئی نہ رہا۔

حضرت عمر نے قرآن مجید کی تعلیم کے مدرسے کھول دیئے، معلموں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں بچوں کو لکھنے اور شہسواری کی تعلیم دی اس کا بھی انتظام کیا کہ بچے غلط سلط کلام مجید یاد نہ کریں اور وہ استاد بچوں کو نہ پڑھائے جو عربی لغت کا عالم نہ ہو۔

شہروں اور قصبوں میں تنخواہ دار امام اور مؤذن مقرر کئے، حساب کتاب کے بہی کھاتے بنائے، اور جس طرح آج کل ساہوکار لمبے لمبے بہی کھاتوں میں حساب لکھتے ہیں اور تہہ کر کے ڈورا باندھ دیتے ہیں یہ بہی کھاتے بھی لپیٹ کر رکھ دیئے جاتے تھے۔

جب تک حکومت اور خلافت کا انتظام حضرت عمر کے ذمہ نہ تھا تجارت کرتے تھے۔ ملک کے انتظام میں مصروف ہوئے تو صرف کھانے پینے کا خرچہ قومی خزانہ سے لینے لگے۔

مہینوں گیہوں کا آٹا گھر میں نہ پکتا تھا مگر ملک میں خوش حالی اور سکون تھا۔

عام حکم تھا کہ اپاہج اور ضعیف خزانہ سے وظیفہ پائیں اور در بدر مانگتے نہ پھریں غریب اور مسکین مسلمان ہو یا عیسائی یہودی ہو یا آتش پرست ہر ایک کے لئے خزانہ

کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔

حضرت عمر میں شیخی اور غرور نام کو نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے کام بھی خود کر لیتے۔ محلے کے لوگوں اور پڑوسیوں کا کام کر دیتے بازار سے کوئی سودا منگاتا تو لا دیتے۔ ایک دفعہ عرب میں قحط پڑا تو گوشت، گھی مچھلی اور ہر ایک عمدہ غذا ترک کر دی، اور ہر وقت اسی فکر میں رہے کہ قحط دور ہو جائے۔

حضرت عمر ہر مذہب و ملت کے مقدس مقامات کا احترام فرماتے۔ اور ایک فرمان کے ذریعہ حکم جاری کر دیا تھا کہ کسی کے معبد منہدم نہ کئے جائیں۔

اقربا پروری سے قطعاً دور رہتے حد یہ کہ اپنے بیٹے عبداللہ کو جو بڑے عالم فاضل تھے کوئی عہدہ نہیں دیا۔

وفات سے پہلے کسی نے عبداللہ کا نام لیا تو سخت ناراض ہوئے اور چھ آدمیوں کا انتخاب کیا جن میں عبداللہ کا ذکر تک نہ تھا۔

(بقیہ سرنگاپٹم صفحہ ۱۷)

مرکز اپنے ہاتھوں سے نکل کر غیروں کے ہاتھ میں چلا گیا پھر تو ہم سب لوگوں کو ڈیڑھ سو سال تک بدیشی قوم کا غلام رہنا پڑا۔ لیکن آزادی کی تاریخ میں ٹیپو کا نام ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ ☆

صہبا لکھنوی

ننھا شکاری

کسی زمانہ میں ایک شکاری تھا۔ اس شکاری کے ایک لڑکا تھا جس کا نام قاسم تھا۔ اپنے باپ کی طرح قاسم بھی سیر و شکار کا بہت شوقین تھا۔ دونوں باپ بیٹے جنگلوں میں گھومتے رہتے تھے اور شکار کرکے اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔

قاسم کی عمر آٹھ سال کی تھی مگر پھر بھی وہ اپنے چھوٹے سے تیر اور کمان سے پرندوں اور جنگلی جانوروں کا اچھی طرح شکار کر لیا کرتا تھا۔

قاسم کا باپ ہر وقت اپنے جسم پر شیر کی کھال کا لباس پہنے اور کاندھے پر تیر و کمان لٹکائے رہتا تھا۔ قاسم کے لئے بھی اس نے چیتے کی کھال کا لباس بنوا دیا تھا جسے قاسم بہت شوق سے پہنتا تھا۔

ایک مرتبہ قاسم اور قاسم کے باپ کا گذر ایک بہت گھنے جنگل سے ہوا۔ اس جنگل میں ہر قسم کے جانوروں کی بھی کثرت تھی۔ قاسم اور اس کے باپ کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ سورج پتوں میں سے جھانک کر پہاڑ کی اوٹ میں چھپ

رہا تھا۔ ابھی یہ دونوں کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ اُنھیں ہرن نظر آئے۔ دونوں نے اپنے اپنے تیر و کمان سنبھالے اور ایک ساتھ تیر چلا دیئے۔ دونوں کے تیر ٹھیک نشانہ پر لگے اور دو ہرن زمین پر تڑپنے لگے۔ دونوں بھاگتے ہوئے، زخمی ہرنوں کے پاس پہنچے اور اُنھیں حلال کیا۔ لیکن نظر جو اُٹھائی تو کچھ سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اُنھیں دیکھ کر اپنے دل میں کچھ ڈرے تو ضرور مگر بہادروں کی طرح وہیں کھڑے رہے۔ جب سپاہی قریب آگئے، تو اُن میں سے ایک سپاہی جو گھوڑے پر سب کے آگے تھا اور دیکھنے میں سب کا سردار معلوم ہوتا تھا چلّا کر بولا ــــ

"ــــ تم کون ہو اور کس کی اجازت سے یہاں شکار کھیل رہے ہو۔؟"

قاسم کے باپ نے یہ سُن کر جواب دیا ــــ

"ــــ ہم شکاری ہیں۔ شکاریوں کے لئے، کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ کون ہیں اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں ــــ؟"

قاسم کے باپ کے اس جواب کو سُن کر ایک سپاہی جھٹ بول اُٹھا ــــ

"ــــ سردار اگر اجازت ہو تو اس گستاخ کو گرفتار کر لیا جائے، اور اسے اس کی بدکلامی کی سزا دی جائے۔"

یہ سُن کر سردار نے کہا ــــ "ہمیں سزا دینے کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں کو گرفتار کرلو اور بادشاہ کے پاس لے چلو۔ بادشاہ سلامت خود ان کو ایسی سزا دیں گے کہ یہ عُمر بھر یاد رکھیں گے۔"

قاسم اور قاسم کا باپ کہتے ہی رہے کہ آخر اُن کا قصور کیا ہے۔ انھیں کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے مگر سردار اور اُس کے سپاہیوں نے ان کی چیخ پکار کی کوئی پرواہ نہیں کی اور سیدھے بادشاہ کے پاس لے گئے۔

سردار آگے بڑھا اور نہایت ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا ــــ

"ــــ حضورِ عالی ــــ یہ شکاری اور یہ لڑکا اسی جنگل میں جو حضور والا کی خاص شکار گاہ ہے شکار کھیلتے ہوئے پائے گئے، اس نے

ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب جو حکم ہو۔"
بادشاہ یہ سُن کر غصّہ میں آگیا اور کڑک کر بولا ــــ

"ــــ تم کون ہو اور اس جنگل میں کِس کی اجازت سے شکار کھیل رہے تھے۔ جانتے ہو اس شکار گاہ میں ہمارے سوا کوئی شکار نہیں کھیل سکتا اور اگر کوئی بھولے سے بھی اس جنگل میں شکار کرتا ہے تو اُس کا سر قلم کر دیا جاتا ہے ــــ"

یہ سُن کر قاسم کا باپ آگے بڑھا اور نہایت ادب سے بولا ــــ

"ــــ اَن داتا ــــ ہم شکاری ہیں۔ جنگلوں جنگلوں شکار کرتے پھرتے ہیں گھومتے پھرتے اتفاق سے اس جنگل میں نکل آئے اور ہم نے شکار کر لیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ جنگل خاص حضور والا کے شکار کے لئے ہے ورنہ کبھی ایسی غلطی نہ ہوتی۔ اس مرتبہ معاف کر دیا جائے ــــ"

یہ سُن کر بادشاہ نے حکم دیا ــــ

"ــــ ہم غلطی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتے ــــ سپاہیو ــــ لے جاؤ ان شکاریوں کو اور ان کا سر کاٹ دو۔"

بادشاہ یہ کہہ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ اُس کا ایک وزیر آگے بڑھا اور سلام کرنے کے بعد بادشاہ سے اُس نے عرض کیا ــــ

"عالی جاہ! ان شکاریوں سے بھول میں یہ غلطی ہو گئی ہے ــــ اس لئے میری عرض ہے کہ ان کا سر کاٹنے کے بجائے شکاری کے لڑکے کا امتحان لے لیا جائے۔ اگر یہ امتحان میں پورا اُترے تو اِن دونوں کو معاف کر دیا جائے۔"

بادشاہ نے کہا ــــ

"ــــ اچھا ــــ اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو ایسا ہی سہی۔ ہم بھی دیکھیں کہ تم کیا امتحان لینا چاہتے ہو۔"

یہ کہہ کر بادشاہ وہیں بیٹھ گیا۔ وزیر کے حکم سے قاسم اور قاسم کے باپ کو آزاد کر دیا گیا۔ وزیر نے فوراً ایک سیب منگوایا اور سیب کو قاسم کے باپ کے سر پر رکھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وزیر نے قاسم کے باپ کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دیا اور قاسم کو حکم دیا کہ وہ ایک تیر میں سیب کے دو ٹکڑے کر دے جو اُس کے باپ کے

سر پر رکھا ہے۔

قاسم اور قاسم کا باپ یہ شرط سن کر بہت گھبرائے، مگر قاسم نے باپ کو ہمت دلائی اور کہا ـــــ

"ـــ ابا ـــ آپ ذرا خوف نہ کھائیں۔ خدا نے چاہا تو سیب کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اور آپ پر ذرا بھی آنچ نہ آنے پائے گی۔"

آخر کار قاسم کا باپ تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنی گردن کو بھی سخت کر لیا تاکہ سیب کہیں لڑھک نہ جائے۔ ادھر قاسم نے جو بادشاہ اور وزیر کے پاس کھڑا تھا اپنے ترکش میں سے دو تیر نکالے اور ایک تیر کمان میں لگا کر سیب کا نشانہ تاکا۔ بادشاہ، وزیر اور دوسرے درباری پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ انوکھا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ کیونکہ امتحان سخت تھا۔

قاسم نے اللہ کا نام لیا اور تیر چلا دیا سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، تیر نشانہ پر ٹھیک لگا اور سیب دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر پڑا۔ سارے درباری، بادشاہ اور وزیر ننھے شکاری کے سچے نشانے کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور بادشاہ نے ننھے شکاری کو خوش ہو کر بہت سا انعام و اکرام دیا۔

پھر بادشاہ نے قاسم سے پوچھا کہ اس نے سیب پر تیر چلانے کے لئے دو تیر کیوں نکالے تھے؟ قاسم نے اس کا جواب یہ دیا کہ دو تیر اس نے اس وجہ سے نکالے تھے کہ اگر پہلا تیر چوک جاتا اور میرے باپ کی جان لے لیتا تو دوسرا تیر میں وزیر پر چلاتا جنھوں نے ہم کو اتنے سخت امتحان میں بلا وجہ ڈالا تھا۔ یہ سن کر وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ وہ لڑکے کو اس گستاخی کی سزا دے مگر بادشاہ یہ دیکھ چکا تھا کہ لڑکا امتحان میں پورا اترا ہے اس لئے اس نے وزیر کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور ان دونوں سے کہا ـــــ

"ـــ اچھا ـــ اب تم دونوں فوراً اس جنگل سے چلے جاؤ اور آئندہ پھر کبھی اس طرف کا رخ نہ کرنا۔"

یہ سنتے ہی قاسم اور قاسم کا باپ بادشاہ کو سلام کر کے فوراً وہاں سے چل دیئے اور اس کٹھن آزمائش سے بچ نکلے۔

(ماخوذ)
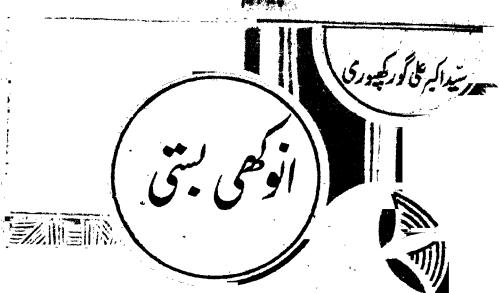
چلّہ کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ وہی بستی جہاں کے رہنے والے اپنے نام کے ساتھ چلّی لکھتے ہیں۔ ہمارے دیس کا مشہور ڈینگیں مارنے والے شیخ چلّی کا وطن یہی چلّہ تھا آیئے آج ہم آپ کو چلّہ کے لوگوں کی ایک کہانی سنائیں۔ جنھوں نے چلّہ کو سارے ملک میں مشہور کر دیا ہے۔

جب چلّہ کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ آج بادشاہ سلامت کی سواری اِدھر سے گذرنے والی ہے۔ یہ بادشاہ بہت ظالم تھا۔ سب اس سے نفرت کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ بادشاہ چلّے میں آئے۔ آخر ان لوگوں نے مِل جُل کر ایک تدبیر سوچ ہی لی۔

انھوں نے راستے کے تمام پیڑوں کو کاٹ کر اس کی لکڑی سے سڑک کا راستہ بند کر دیا جب بادشاہ وہاں تک پہنچا تو اس نے لکڑیوں کا پہاڑ دیکھا جو اس کا راستہ روکے ہوا کھڑا تھا۔

"یہ درخت کس نے گرائے ہیں" بادشاہ نے غصّہ ہو کر پوچھا۔

ایک لڑکا جو وہیں کھڑا تھا اس نے کہہ دیا کہ "ہماری بستی کے لوگوں نے آج ساری رات

"یہی کلام کیا ہے"

بادشاہ کو یہ سُن کر بہت غصہ آیا اور اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا "ابھی جا کر چلنے کے لوگوں کو اس کی سزا دو"

لوکا یہ باتیں سُن کر ڈر گیا اور وہاں سے سیدھا اپنی بستی کی طرف دوڑتا ہوا گیا وہاں جا کر اس نے سارا قصہ اپنی بستی کے لوگوں کو سنایا۔ لیکن بستی کے لوگ تو اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اب چاہے کچھ ہو یہ ظالم بادشاہ یہاں نہیں آیا۔ ہمارے لئے تو خوشی کی بات یہی ہے۔

اب جو سپاہی بستی میں پہنچے تو وہ بستی کے لوگوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے بہت سے آدمی ایک زرد مچھلی کو بار بار پانی میں غوطے دے رہے تھے۔ سپاہیوں نے پوچھا "یہ کیا کر رہے ہو؟"

انھوں نے بڑی لا پرواہی سے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور بولے "یہ مچھلیاں ہمارے کھیت چُر جاتی ہیں آج ہم اسے پانی میں ڈبو کر مار ڈالیں گے۔ بہت دنوں کے بعد یہ ہمارے ہاتھ آئی"

جب یہ سپاہی اور آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھ سات آدمی کھیتوں میں چھتریاں لگائے کھڑے ہیں۔ سپاہیوں نے ان سے پوچھا کہ "کیوں بھائی تم کھیت میں چھتری لگا کیوں کھڑے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواب دیا "آپ دیکھتے نہیں پودوں پر دھوپ کتنی سخت پڑ رہی ہے۔ ہم انھیں دھوپ سے بچا رہے ہیں"

سپاہیوں کو ان کی اس حرکت پر ہنسی آئی وہ اور آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ آدمی ایک پیڑ پر رسّی لئے چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سپاہیوں نے اُن سے بھی یہی سوال پوچھا۔ اُن میں سے ایک نے جواب دیا۔

"پیڑ پر ابھی ایک کوئل کوک رہی تھی ہم اسے گرفتار کرنا چاہتے ہیں" سپاہیوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ وہ اور آگے بڑھے دیکھتے کیا ہیں کہ کچھ لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں انھوں نے پوچھا "کیوں بھائی کیا بات ہے۔ اب سپاہی کے اس سوال کا جواب ایک ایک ہی دینا چاہتا تھا۔ آخر یہ طے

کہ ایک آدمی بولے گا وہی جس کا نام گروگھنٹال
تھا وہ سامنے آیا اور بولا کہ صاحب ہم آج شکار
کھیلنے کی غرض سے نکلے تھے۔ ہم کل ملا کر بارہ
آدمی تھے۔ ہم نے آج دن میں بہت اچھی طرح
سے مچھلی جیسے موذی جانور کا مقابلہ کیا اور اُن
کو ہرا کر اپنے گھر جا رہے ہیں۔ ایک مچھلی کی
ہمت نہ ہوئی کہ مقابلے کے لئے ہمارے سامنے
آئے۔ لیکن جب ہم واپس ہوئے تو ہم نے
سوچا کہ ان مچھلیوں نے کہیں ہمارے کسی ساتھی
کو چوری چھپے مار تو نہیں ڈالا۔ اس لئے بہتر ہے
کہ ہم اپنے ساتھیوں کی گنتی کر لیں اور جب ہم
گنتی کرتے ہیں تو یہاں صرف گیارہ آدمی نظر آتے
ہیں بارھواں لاپتہ ہے۔ ہم نے تالاب کے کنارے
جال ڈالے اور خوب اچھی طرح دریا کا چپہ چپہ
ڈھونڈ ڈالا لیکن اس کا نام و نشان بھی کہیں نظر
نہ آیا۔ اب یہ سوچ رہے ہیں کہ کہیں وہ بارھواں
آدمی ہم میں تو نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، دوسرے
کو بارھواں آدمی سمجھتا ہے اور جب ہم گنتے
ہیں تو کل گیارہ ہی آدمی ہیں۔"

یہ سُن کر سپاہی نے کہا: "ذرا ہمارے سامنے
تو گنو۔" اب گروگھنٹال نے جو گنتی شروع کی تو
اپنے آپ کو چھوڑ گئے۔"

سپاہی سمجھ گئے کہ یہ بھی ویسے ہی بیوقوف
ہیں جیسے اور لوگ ملے تھے۔ انھوں نے سب
کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور آگے بڑھ کر
ایک آدمی کے سر پہ ایک ہات مارا اور کہا "ایک"
پھر دوسرے کو مارا کہا "دو"، آخر اس طرح آخیر میں
گروگھنٹال کے چپت لگا کر کہا "بارہ"۔

یہ سنتے ہی سب لوگ مارے خوشی کے
ناچنے لگے اور بولے "آپ بہت عقل مند ہیں۔ آپ
نے ہمارے ڈوبے ہوئے ساتھی کو تلاش کر دیا۔
آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب اس گروگھنٹال
کو سنبھال کر رکھیں گے کہ کہیں پھر نہ کھو جائے۔"

سپاہیوں کو یقین ہو گیا کہ یہ سب لوگ
بیوقوف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے
اپنی حماقت سے بادشاہ کے راستے پر
لکڑیاں ڈال دی تھیں۔

انھوں نے جا کر بادشاہ کو سارا حال
سنایا جسے سُن کر بادشاہ کو بھی بہت ہنسی
آئی اور اس نے ان کا قصور معاف کر دیا۔

مینا نے سلیٹ بنائی

سید منیر الحسن

دوربین
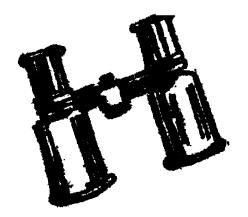
یہ تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ دور کی چیز چھوٹی نظر آتی ہے۔ اور یہ فاصلہ جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے اتنی ہی وہ چیز ہم کو چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر سورج ہماری زمین کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑا ہے لیکن ہمیں چھوٹا نظر آتا ہے اسی طرح یہ ستارے جو محض چمکتے ہوئے ذرے معلوم ہوتے ہیں اصل میں بہت بڑے ہیں۔ بعض ستارے ہمارے سورج سے کئی لاکھ گنا بڑے ہیں۔ ان میں سے بعض ستارے گھومتے ہیں اور بعض ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان ستاروں کے بارے میں چھان بین اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش بہت دنوں سے ہو رہی ہے۔

سائنس دانوں نے اپنی اس ضرورت کو پورا کرنے، نئی نئی معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک ایسی چیز ایجاد کی جس کو دوربین کہتے ہیں۔ اس دوربین کی ایجاد سے صرف ایک یہی فائدہ نہیں ہوا کہ دور کی چیز بڑی دکھائی دیتی ہے بلکہ وہ ہمیں نزدیک بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح سب سے پہلے سائنس دانوں کو مریخ اور زحل کا حال معلوم ہوا

پھر اسی دوربین کے ذریعہ یہ بھی معلوم کیا
گیا کہ چاند ہماری زمین کا ایک ٹکڑا ہے اور
یہاں بھی زمین کی طرح پہاڑ اور وادیاں
پائی جاتی ہیں۔ لیکن چاند میں پانی کا نام
نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئی جاندار
نہیں ہے اور نہ وہاں کسی قسم کی زندگی
پائی جاتی ہے

یوں تو اس سے پہلے بھی دوربینیں تیار
کی گئی ہیں۔ آیئے آپ کو دنیا کی سب سے
بڑی دوربین کے بارے میں بتائیں یہ دوربین
کئی سال کی محنت کے بعد تیار ہوئی۔ اور
۱۹۴۹ء میں کیلیفورنیا میں لگائی گئی۔ اس
یار کا قطر سولہ فٹ آٹھ انچ لمبا ہے۔ اس کے
شیشے کی گھسائی اور صفائی کئی سالوں تک
متواتر ہوتی رہی ہے۔ اس شیشے کو جس
چیز کے اندر جڑا یا لگایا گیا ہے اس کا
وزن تیس ہزار نو سو بیس من ہے۔ اس
طرح پوری دوربین کا وزن ایک ہزار چار
سو من ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی دوربین
کا اس صورت سے نصب کرنا کہ وہ آسانی
سے ہر سمت گھوم سکے کوئی معمولی کام نہیں
ہے۔ اسے جس پلیٹ فارم پر رکھ کر گھمایا
جاتا ہے اس کا وزن صرف اٹھائیس ہزار
من ہے۔ اس طرح یہ دیو قامت دوربین
سائنس انجینیرنگ اور کاریگری کا ایک نادر
نمونہ ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
اتنی بڑی دوربین ظاہر ہے کہ ہاتھ سے نہیں
گھمائی جا سکتی۔ چنانچہ اس کو گھمانے کے
لئے بجلی کے بہت بڑے بڑے موٹر لگے ہوئے
ہیں۔ ان موٹروں کے لئے جس قدر بھی بجلی
کی ضرورت ہوتی وہ بھی وہیں تیار کی جاتی
ہے۔ اس طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ
یہ دوربین کتنی بڑی ہوگی۔

اس دوربین کو لگانے کا سب سے پہلا فائدہ
تو یہ ہوا کہ جتنی بڑی دوربین ہوگی اتنی ہی
زیادہ دور کی چیز ہمیں دکھائی دے گی یعنی
سمجھئے کہ اگر پہلے والی دوربین سے ہم [illegible]
میل دور کی چیز دیکھ سکتے تھے تو اسی
دوربین کی مدد سے ہم ۳۶ میل دور تک
دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے والی دوربین کی مدد
سے اتنے دور کے ستارے دیکھے جا چکے
ہیں کہ اُن سے آنے والی روشنی

شعاعیں ہم تک ڈھائی ارب سال میں
پہنچی ہیں۔ اور آپ کو یہ تو شاید معلوم ہی
ہوگا کہ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ
چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کرلیتی ہے
تو کیا آپ حساب لگا کر بتا سکتے ہیں کہ
وہ ستارے ہم سے کتنی دور ہوں گے
جن کی روشنی دو ہزار پانچ سو لاکھ سال
میں ہم تک پہنچی ہے۔ غرض کہ اس نئی
دوربین کی مدد سے دور کی چیزیں دیکھی جا
سکیں گی۔

دوسرا فائدہ اس نئی دوربین سے
یہ ہوا کہ پہلے والی دوربین سے ستارے جڑے
ہوئے معلوم ہوتے تھے لیکن جب ستاروں
کو اس نئی دوربین سے دیکھا تو پتہ چلا کہ
بہت سے ستارے قریب قریب ہوگئے
ہیں جو معمولی دوربین سے الگ الگ دکھائی
نہیں دیتے تھے۔ اس نئی دوربین کے ذریعہ
ان ستاروں کے گچھوں کا مطالعہ کرنے کے
بعد یہ بھی پتہ چلا کہ ان میں سے بعض ستارے
آپس میں ٹکرا جاتے ہیں اور ٹکرا کر ایک
ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس ستارے سے
اور ستارے ملتے رہتے ہیں۔ اور یہ ستارہ
بڑا ہوتا رہتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی
آتا ہے کہ یہ ستارہ خود پھٹ جاتا ہے
اس میں سے بعض ٹکڑے جو کافی دور نکل
جاتے ہیں وہ بہت جلد ٹھنڈے پڑنے
لگتے ہیں اور ان کی روشنی کم ہونے لگتی
ہے۔

اس طرح ان ستاروں کا گہرا مطالعہ
کرنے کے بعد ممکن ہے کہ ہم یہ بتا سکیں کہ
ہماری کائنات کیسے وجود میں آئی۔ اور اس
دنیا کے علاوہ اور بھی دنیا ہیں یا نہیں۔
ممکن ہے کہ اس نئی دوربین کی مدد سے
اس بات پر بھی روشنی پڑ سکے کہ شعاعیں کیا
ہیں اور کیسے وجود میں آتی ہیں۔ اس طرح
اس نئی دوربین کے نصب ہو جانے سے
سائنس کی ترقی میں ایک نئے باب کا اضافہ
ہوا ہے۔ اور علم نجوم و علم طبیعات میں ایک
نیا رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ لیکن سائنس دانوں
نے اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ وہ اس
سے بھی بڑی دوربین بنانے کی فکر میں ہیں

افضل صدیقی

شرط

ریاض اور اشرف دو چچا زاد بھائی تھے۔ ریاض اشرف سے کوئی دو سال بڑے تھے وہ ہمیشہ اشرف پر اپنی قابلیت کی دھونس جماتے رہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اشرف ان کو اپنے سے زیادہ عقل مند سمجھیں۔ لیکن اشرف زبردستی کی دھونس ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ ریاض سے زیادہ محنتی اور ذہین تھے۔

اشرف اور ریاض ایک ساتھ اسکول جاتے تھے، ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، کھیلتے کودتے اور پڑھتے لکھتے تھے۔ کہیں کہیں دونوں میں کسی بات پر جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ مگر چونکہ دونوں میں بہت دوستی تھی اور وہ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اس لئے جھگڑے کے کچھ دیر بعد ہی کبھی اشرف اور کبھی ریاض ایک دوسرے کو چاکلیٹ۔ ٹافی یا برفی کھلا کر منا لیا کرتے تھے۔

ادھر کئی دنوں سے دونوں میں بالکل لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا اور ریاض جو اشرف کے مقابلے میں کچھ زیادہ شریر اور شوخ واقع ہوئے تھے کسی نئی شرارت کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔
ایک دن شام کو وہ بغل میں ایک اخبار دبائے گھر میں آئے اور اِدھر اُدھر اشرف کو دیکھا۔ پھر لپکے

کمرے میں پہنچے۔ اشرف وہاں موجود تھے اور اسکول کا کام کر رہے تھے۔ ریاض نے موقع غنیمت جانا ذرا اکڑ کر اخبار کھولا اور بغیر کچھ کہے سنے اخبار کے ایک صفحہ پر نظریں جما کر پڑھنا شروع کیا۔

"ـــــ کراچی کی ایک خبر ہے کہ جزیرہ منوڑا میں برف کے دو بڑے بڑے پہاڑ نا معلوم مقامات سے بہتے ہوئے کنارے پر لگے ہیں برف کے یہ پہاڑ چٹان کی طرح سخت ہیں اور ان کی وجہ سے جہازوں کے آنے جانے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے ـــــ"

خبر سناتے وقت ریاض اس طرح صفحہ پر نظریں جمائے رہے جیسے سچ مچ اخبار ہی پڑھ رہے ہوں۔ جب یہ خبر سنا چکے تو ریاض نے اشرف سے کہا "کیوں ہے نا مزیدار خبر؟ اشرف سمجھ گئے کہ ریاض دھونس جما رہے ہیں۔ سنبھل کر بڑے بھولے پن سے جواب دیا کہ بہت معمولی خبر ہے۔ ریاض اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور اخبار لے کر چلتے بنے۔ یہ سوچ کر کہ وار خالی گیا

دوسرے روز اسکول جاتے وقت اشرف نے ریاض سے کہا کہ "آج کے کسی اخبار میں برف کے پہاڑوں کی کوئی خبر نہیں چھپی" ریاض چوکنے ہو گئے۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر بات بنائی اور اشرف سے دریافت کیا کہ انہوں نے کون کون سے اخبار پڑھے تھے اشرف نے دو تین اخباروں کے نام بتائے۔ ریاض نے کہا کہ واہ بھلا یہ اخبار ایسی خبریں کیوں چھاپنے لگے۔ تم نے 'معلومات' دیکھا ہوتا تو برف کے پہاڑوں والی خبر مل جاتی۔ اشرف نے دریافت کیا کہ معلومات کہاں ملے گا۔ ریاض کہنے لگے کہ دوپہر کی چھٹی میں اسکول کی لائبریری میں معلومات تلاش کروں گا اشرف نے کہا کہ بھائی جان مجھے بھی لائبریری لے چلئے گا ذرا میں بھی خبر پڑھ لوں گا۔ ریاض نے فوراً چوٹ کی ـــــ کہنے لگے میاں وہاں چوتھی جماعت کے لڑکوں کو جانے کی اجازت نہیں۔ اشرف چپ ہو کر رہ گئے۔

اسکول ختم ہونے کے بعد جب دونوں گھر چلے تو اشرف نے پھر اس خبر کے بارے میں پوچھا۔ ریاض نے کہا کہ انہوں نے معلومات

دیکھا تھا۔

اشرف نے سوال کیا کہ کیا برف کے پہاڑوں کی خبر اس میں چھپی ہے۔ ریاض نے کہا کہ ہاں چھپی ہے۔ اشرف نے بے چینی سے پھر دریافت کیا۔ کیا خبر چھپی ہے بھائی جان ریاض نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا کہ وہی رات والی خبر۔ منوڑا کے کنارے برف کے دو پہاڑ جہازوں کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔ اشرف نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ کیا وہ پہاڑ پگھل نہیں رہے۔ ریاض سمجھ گئے کہ ان کا جادو چل گیا ہے بڑی بے نیازی سے کہنے لگے کہ وہ پہاڑ تو نہ پگھل رہے ہیں نہ ٹس سے مس ہو رہے ہیں اور آج صبح سے ان پہاڑوں کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ لگا دیا گیا ہے۔ اشرف خوشی کے مارے اچھل پڑے۔

اشرف جیسے تیسے گھر پہنچے۔ چائے پی اور سیدھے اپنے جگری دوست محمود کے گھر گئے اور دوسرے روز چونکہ اتوار تھا اس لئے دونوں نے منوڑا جانے کا منصوبہ بنا لیا۔ اگلے دن ناشتہ سے فراغت کے بعد وہ محمود کے گھر پہنچ گئے اور پھر محمود نے اپنی والدہ کو برف کے پہاڑوں کی خبر سنائی۔ محمود کی والدہ نے محمود کے والد کو یہ خبر سنائی۔ انہیں پہلے تو یقین نہ آیا مگر محمود کی والدہ نے جب کہا کہ اخباروں میں بھی یہ خبر چھپی ہے تو وہ چپ ہو گئے۔ محمود کی والدہ نے موٹر کے لئے کہا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ چنانچہ اشرف محمود اور محمود کی والدہ کے ساتھ منوڑا کے لئے خوش خوش چل دئے۔ ادھر محمود کے والد نے اپنے دو چار دوستوں کو یہ خبر ٹیلیفون پر سنائی اور تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔

لوگ بائی بسوں۔ رکشاؤں ٹیکسیوں اور موٹروں پر کیماڑی کی طرف چل پڑے اور کیماڑی سے کشتیوں اور موٹر لانچوں پر بیٹھ منوڑا پہنچنے لگے اور جب انھیں برف وغیرہ کے پہاڑ وہاں نظر نہ آئے تو خبر پھیلانے والے کو برا بھلا کہتے واپس آ گئے۔

جس وقت برف کے پہاڑوں کی خبر سارے شہر میں پھیل رہی تھی ریاض مزے سے اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی والدہ اتفاقاً کمرے کی طرف آ نکلیں۔ ریاض کو دیکھ کر بولیں

"۔۔ ارے تم برف کے پہاڑ دیکھنے نہیں گئے"
اشرف تو محمود کے ساتھ بھی کا گیا۔ ریاض نے
یہ سن کر زور کا قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے بتایا
کہ "یہ خبر در اصل میں نے اشرف کو بے وقوف
بنانے کے لئے اڑائی تھی۔ مگر اڑ گئی سارے
شہر میں" ریاض کی والدہ بھی یہ سن کر ہنس
پڑیں اور انہوں نے جا کر ریاض کے والد کو
یہ سارا قصہ سنایا۔ وہ بھی خوب ہنسے۔ اتنے
میں اشرف بھی تھکے ہارے۔ منہ لٹکائے واپس
آ گئے۔ ریاض نے اشرف کو دیکھ کر پھر ایک قہقہہ
لگایا اور پوچھا کہ کہو برف کے پہاڑ دیکھ آئے۔
اشرف نے جل کر کہا کہ واہ بھائی جان۔ آپ
کو بس جھوٹی خبریں سنا کر دھوکا دینا ہی آتا ہے
ریاض نے کہا کہ تم تو مجھ سے زیادہ عقلمند
ہو۔ تم دھوکہ میں کیسے آ گئے۔ اپنی عقل سے
کام لیا ہوتا۔ اب کیا ہوتا ہے۔ اب تو
تم بے وقوف بن ہی گئے۔ اشرف نے تنک
کر کہا کہ مجھے کیا بے وقوف بنائیں گے۔
میں چاہوں تو منٹوں میں آپ کو قائل کر دوں
ذرا یہ بتا دیجئے کہ کیا آسمان سے مینہ کی
جگہ مچھلیاں برستی ہیں؟

ریاض نے کہا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔
اشرف نے کہا کہ اگر وہ لکھا ہوا دکھا دیں تب؟
ریاض نے کہا کہ اگر لکھا ہوا دکھا دو گے تو میں
پندرہ روز تک اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر
تمھیں پلاؤں گا۔ اشرف نے شرط منظور کر لی
اور دوڑے دوڑے اپنی کتابوں کی الماری
تک گئے اور ڈھونڈھ کر "عجائبات عالم" کی
ایک کتاب نکال لائے اور یہ خبر پڑھ کر سنائی۔

"۔۔۔ ایک دن انگلستان کی بندرگاہ
پر دفعتاً مچھلیاں برسنے لگیں سائنسدانوں
کا خیال ہے کہ سمندر سے پانی کا
ایک بگولا اٹھا تھا اس بگولے میں
مچھلیاں بھی آ گئی تھیں۔ جب وہ
بگولا پھٹا تو مچھلیاں مینہ کی طرح زمین
پر برسنے لگیں۔۔۔"

ریاض یہ سن کر حیران رہ گئے اور
پھٹی پھٹی آنکھوں سے اشرف کو دیکھنے لگے۔
اشرف نے کہا کہ اب کہیئے بھائی جان۔
آخر آپ شرط ہار گئے نا بہر حال میں کچھ
کہنے کو تیار ہوں ۔۔۔ ریاض نے کہا
۔۔۔ کیا سمجھوتہ؟

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر دیکھئے)

اونٹ رے اونٹ

ترجمہ ریحان احمد عباسی

بہت دن ہوئے عرب دیس میں ایک اونٹ کا بچہ اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ عرب ایک گرم اور خشک دیس ہے۔ وہاں ہر طرف ریگستان ہیں۔ اس اونٹ کے بچے کا نام "سن باد" تھا۔ سن باد نے ایک مہینہ ہی میں چلنا سیکھ لیا تھا۔ پہلے تو اسے بڑی مشکل ہوئی، کھڑا بھی نہ ہوا جاتا تھا۔ لیکن اب تو وہ بغیر گرے ہوئے کافی دور چل لیتا تھا۔ اس لئے سن باد اپنی اس کامیابی پر کافی مغرور ہو گیا تھا۔

آپ شاید جانتے ہوں کہ ریگستانی علاقوں کی راتیں اور صبحیں بڑی سہانی ہوتی ہیں۔ ایک دن صبح کے وقت سن باد ریت پر کھڑا ہوا ریگستان میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پاس ہی اس کی ماں بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھی،

"ماں" سن باد نے کہا "نہ جانے میں کب آپ کی طرح بڑا ہوں گا تاکہ میں ان لمبے لمبے ریگستانوں میں آسانی سے گھوم سکوں!"

سن باد کی ماں نے جواب دیا "میرے بچے

تم بھی میری طرح بڑے ہو جاؤ گے۔ میں جانتی ہوں
تمہارے دل میں ریگستان گھومنے کی خواہش ہے۔
لیکن وہاں کیا چیز دیکھنے کی ہے۔ ہر جگہ ریت ہی
ریت نظر آتی ہے یا اگر کچھ ملتا ہے تو کسی کسی جگہ
کھجور کے پیڑ اور خار دار جھاڑیاں۔"

سن باد بھی اور بچوں کی طرح نٹ کھٹ اور
ضدی تھا فوراً بولا "لیکن کیسا بھی ہو میں اسے ضرور
دیکھوں گا۔"

"جب تم بڑے ہو جاؤ گے" سن باد کی ماں
نے کہا "تو تم ایک بار نہیں سیکڑوں بار ریگستان
کا چکر لگاؤ گے۔ تم اپنی کمر پر اپنے مالک کا سامان
لاد لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کروگے
تمہارا مالک بھی تمہاری کمر پر سواری کرے گا۔
دیکھو دیکھو ہمارا مالک میرے لئے صبح کا ناشتہ
لا رہا ہے۔"

سن باد نے گردن گھما کر دیکھا تو بھورے
رنگ کا ایک لمبا سا آدمی اپنی گود میں چارہ لئے
خیمے سے چلا آ رہا ہے۔ اس آدمی (عرب) نے
بجائے ٹوپی یا ہیٹ کے اپنے سر پر ایک لال
اور سفید رنگ کا پٹی دار کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔
سن باد اپنی ماں کی طرف تھوڑا سا کھسک گیا
اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "ہمارا مالک بڑا اچھا آدمی
ہے۔ صبح صبح آپ کے لئے ناشتہ لے آتا ہے۔"

اس کی ماں نے جواب دیا۔ "ہاں وہ ایک
اچھا مالک ہے۔ لیکن ہم بھی تو اس کا خوب کام
کرتے ہیں۔ ان ریگستانوں کو ہمارے علاوہ کوئی
دوسرا جانور اتنی آسانی سے پار نہیں کر سکتا۔ ہم
چھ چھ سات سات من وزن لاد کر ایک دن میں
تیس تیس میل تک سفر کر لیتے ہیں اور کمر پر ایک
آدمی کو بٹھا کر بلا تھکے سو سو میل کا سفر کر لیتے ہیں
لمبے لمبے پیر ہونے کی وجہ سے ہمارے قدم لمبے
پڑتے ہیں۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ پیروں سے لیکر
کمر تک ہماری اونچائی جانوروں میں سب سے زیادہ
ہوتی ہے۔ ہمارے پیر کھُروں کی طرح پھٹے ہوئے
لیکن گدّی دار ہوتے ہیں۔ جب ہم چلتے ہیں تو
پیروں کی گدّیاں چپٹی ہو کر پھیل جاتی ہیں اس
طرح ہمارے پیر ریت کے اندر نہیں دھنستے۔ ان
ریگستانوں میں جہاں میلوں پیڑ کی ایک پتی بھی نظر
نہیں آتی اور جہاں دور دور پانی کا نام ونشان
نہیں ہوتا ہم کافی عرصے تک بغیر کچھ کھائے پیئے
سفر کر لیتے ہیں۔"

سن باد کی سمجھ میں پوری بات نہ آئی تھی

فوراً بولا: "لیکن ماں بھوکے پیاسے کس طرح سے سفر کر لیتے ہیں؟"

اس کی ماں نے جواب دیا: "اول تو ہم سفر کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح پانی اور کھانے سے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں اس طرح ہمیں جلدی بھوک پیاس نہیں لگتی۔ اس کے بعد اگر ضرورت پیش آئے اور ہمیں کوئی چیز نہ ملے تو یہ کمر پر جو کوبڑ ہے اس کی چربی گھل گھل کر غذا کا کام کرنے لگتی ہے۔ رہا پانی تو وہ ہم اپنے پیٹ میں خوب بھر لیتے ہیں۔ ہمارے پیٹ میں کچھ تھیلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جن میں ہم ایسی ہی ضرورتوں کے لئے پانی کا ذخیرہ جمع رکھتے ہیں:"

"تب تو ہم واقعی ایک عجیب جانور ہیں۔" سن باد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سن باد کی ماں آہستہ سے اٹھی۔ سب سے پہلے اس نے پچھلے پیر اٹھائے اس کے بعد اگلے پیر اٹھا کر جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اب سن باد نے ان گدیوں کو بغور دیکھا جو اس کی ماں کے سینے اور گھٹنوں پر موجود تھیں۔ اس نے سوچا ذرا بڑے ہونے پر میرے بھی اسی طرح کے گدے بن جائیں گے۔ اگر یہ گدے نہ ہوتے تو ہمیں گھٹنوں کے بل بیٹھنے اور کھڑے ہونے میں بہت تکلیف ہوا کرتی۔

چارہ کھلانے کے بعد سن باد اور اس کی ماں نے پاس ہی ایک چشمے سے پانی پیا۔ خیمہ کے پاس واپس لا کر سن باد کی ماں کو اس کے مالک نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیٹھانے کے بعد اس کی کمر پر لکڑی کی بنی ہوئی بڑی سی کاٹھی رکھ دی ایک دم سے اس کی ماں نے زور زور سے بلبلانا شروع کر دیا۔ بے چارہ سن باد ڈر گیا۔ اس نے گھبرا کر اپنی ماں سے پوچھا "کیا تکلیف ہو رہی ہے؟"

"نہیں" اس کی ماں نے جواب دیا: "نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں میں یونہی بلبلائی تھی۔"

"یونہی کیوں" سن باد نے تعجب سے پوچھا۔

"میں اس کی صحیح وجہ نہیں جانتی ــ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ سب اونٹ اسی طرح بلبلایا کرتے ہیں۔ یاد رکھو جب تم سفر کرنے کے قابل ہو جاؤ اور تمہاری کمر پر سامان وغیرہ رکھا جانے لگے تو تم بھی اسی طرح بلبلایا کرنا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں، اپنی پوری طاقت سے بلبلایا کروں گا۔ لیکن ماں تمہارے اوپر یہ کاٹھی کیوں رکھی ہے؟"

"میں سمجھتی ہوں اب ہم ایک لمبے سفر پر
جانے والے ہیں۔" سن باد کی ماں نے جواب دیا۔
ننھا سن باد خوشی سے چلا اٹھا۔ "اور تب
تو میں بھی ریت پر چلوں گا۔ آج میری خواہش پوری
ہو جائے گی۔"
"نہیں بیٹا!" اس کی ماں نے کہا۔ "تم تو
ابھی چھوٹے ہو۔ تم پیروں پیروں نہیں چلو گے تمھیں
اوپر بٹھا کر لے جایا جائے گا۔ چھوٹے بچے لمبے سفر پر
ہمیشہ اسی طرح لے جائے جاتے ہیں۔"
وہ ابھی کچھ اور کہنے کو تھی لیکن ایک دم
بڑے اونٹ کے بلبلانے کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا
اس پر بھی کاٹھی رکھی گئی تھی اور ایک طرف مال لدا
ہے۔ مال رکھنے کے بعد مالک نے بچے کو گود میں
اٹھا کر بڑے اونٹ کی کاٹھی کے دوسری طرف
جھولی میں بٹھا دیا۔ سن باد کے لئے یہ پہلا موقع تھا
وہ ڈر گیا۔ اس کی ماں نے اسے بیٹھنے کی تاکید
کی اور اسے بتایا کہ وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا
ہے۔ اب تم اس پر رہو گے اور میں تمھارے ساتھ
پیچھے پیچھے چلوں گی۔"
"لیکن ماں میں تمھاری پیٹھ پر بھی تو بٹھایا
جا سکتا تھا۔ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا؟" سن باد
نے پوچھا۔
"صرف اس لئے کہ میں تمھیں ہر وقت دیکھ سکوں
بس چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہو۔" ماں نے جواب دیا۔
اس کے بعد مالک نے اس کی ماں کے اوپر بھی
مال لادا اور خود ایک تیسرے اونٹ پر جو ذرا چھوٹا
تھا بیٹھ کر گوم گوم کی آواز نکالی۔ گوم کا مطلب
تھا اب اٹھ جاؤ۔ تینوں اونٹ آہستہ آہستہ کھڑے
ہو گئے۔ لیکن وہ تینوں بلبلا رہے تھے۔ جیسے وہ
کچھ ناراض ہوں۔ سن باد کے بڑے اونٹ نے
جیسے ہی اٹھنے کے لئے پچھلی ٹانگیں اٹھائیں تو
سن باد کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس کی گردن
پر اب گرے اور جب اگلی ٹانگیں اٹھائیں تو
دم کی طرف لڑھک گئے۔ گرے تو نہیں۔ لیکن
بہت تکلیف دہ تجربہ ہوا۔ چلنے میں وہ بڑے
زوروں سے ہچکولے کھا رہا تھا۔
ذرا سی دیر میں ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ان
کی طرح دوسرے اونٹ آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔
ان سب پر بھی مال لدا ہوا تھا۔ سن باد کے
بڑے اونٹ کو بھی ایک قطار میں جگہ ملی، اور
ٹھیک اس کے پیچھے اس کی ماں کو کھڑا کیا گیا۔
اس کے بعد فوراً ہی سب نے ایک ساتھ چلنا

شروع کیا۔

اس وقت کا نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا
تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی ریت ہی ریت تھی۔
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ریت کا بہت بڑا سمندر ہے۔

قافلے نے تپتے ہوئے ریت پر دیر تک سفر
جاری رکھا۔ جب دوپہر ہو گئی تو ایک جگہ آرام
کرنے کے لئے رک گئے۔ سن باد کو اس کے
مالک نے گود میں اُٹھا کر باہر نکالا۔ ننھا اونٹ
جلدی سے اپنی ماں کے پاس بھاگ آیا۔ اور
تھنوں سے دودھ پینے لگا۔ اس وقت وہ بہت
بھوکا تھا۔

اچانک کچھ اونٹوں نے اُچھلنا کودنا شروع
کر دیا جیسے وہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں اور بھاگنا
چاہتے ہیں۔ ان کے مالک ایک دم اُٹھ بیٹھے۔
کچھ ہی دیر میں سب آدمی اُٹھ اُٹھ کر اِدھر اُدھر
دوڑنے لگے وہ چلا چلا کر دوسروں کو ہوشیار
رہنے کی تاکید کر رہے تھے۔ اونٹ کافی بھڑک
رہے تھے۔ لیکن آدمی بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔
اور وہ انھیں بھاگنے کا راستہ نہیں دے رہے
تھے۔ لیکن ان کے قریب بھی نہیں جا رہے تھے
ننھے سن باد کو کچھ ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز
سنائی دی۔ اس نے اپنا سر اُٹھا کر دیکھا۔ آواز
برابر بڑھ رہی تھی۔ "آندھی، آندھی" ایک بوڑھے
اونٹ نے چلانا شروع کر دیا۔ "آندھی آ رہی ہے۔"
سن باد نے اس سے پہلے کبھی ایسی آندھی نہیں دیکھی
تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ اپنی ماں کے پاس آ کر بولا۔
"ماں یہ کس کی آواز ہے؟"

"یہ ریگستانی آندھی کی آواز ہے تم جلدی
سے میرے ساتھ مل کر بیٹھ جاؤ۔ تم بھی دوسروں کی
طرح اپنی گردن اور سر زمین پر لٹا دو۔ اس کی
ماں نے بتایا۔ اس طرح تمھیں کوئی نقصان
نہیں پہنچے گا۔ اب تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔ تمھاری
بڑی بڑی پلکیں ریت کو اندر نہیں جانے دیں گی۔
تم اپنے نتھنے بھی خوب بند کر لو جس سے ناک کے
اندر بھی ریت نہ جا سکے۔ بس اب تم چپ چاپ
اسی طرح لیٹے رہو۔"

ریت کی آندھی گرج دار آوازیں نکالتی بہت
زور شور سے آئی۔ گرم گرم ریت سن باد کے جسم میں
تیز سوئیوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ مگر سن باد بالکل
خاموش اپنی آنکھیں اور ناک پوری طاقت سے بند
کئے پڑا تھا۔ اونٹوں کے مالک بھی اپنے بچاؤ کے
لئے کپڑوں میں منھ چھپائے اونٹوں سے لگے ہوئے

بیٹھے تھے۔ حسن یاد اونٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تھوڑی
دیر بعد اس کی ماں نے کہا۔
"حسن یاد آندھی ختم ہو چکی ہے۔ تم بھی اپنی
آنکھیں کھول سکتے ہو۔ اب تو تم کافی بہادر ہو گئے
ہو۔ تم نے عقل مندی سے اپنا خوب بچاؤ کر لیا تھا"
ان کا مالک بھی کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ
بیٹھا۔ اس کی ماں نے پھر کہا۔ "یہ لوگ تو کہیں
نہ کہیں اپنا منہ چھپا ہی لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے
لئے کہیں بچاؤ کی جگہ نہیں ہوتی۔ اگر کچھ ہے تو
صرف یہی ایک ترکیب۔ ہم اونٹ ریگستان سے
تعلق رکھتے ہیں۔ اور ریگستان ہم سے۔ تمہیں اس
پر فخر ہونا چاہیئے کہ تم اونٹ کے بچے ہو"۔

ننھا حسن یاد کافی دیر تک اس بارے میں
سوچتا رہا۔ وہ ابھی اس خیال میں گمن ہی تھا کہ
قافلے نے دوبارہ چلنے کی تیاری شروع کر دی
اپنی اسی جھولی میں بیٹھنے کے بعد اس نے
چاروں طرف ریگستان میں نگاہ دوڑائی۔ وہ
دوبارہ اپنی من پسند جگہ مل جانے پر بہت خوش
تھا۔ اس نے سوچا میں خوش ہوں اس لئے کہ
میں ریگستان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں دنیا کی
تمام دوسری چیزوں کے مقابلے میں اپنے کو بھی
قابلِ فخر سمجھتا ہوں۔

اگر اس کا سارا جسم بے ڈھنگا ہے تو
اس میں اس کا کیا قصور۔ ریگستان کا موسم
ہی ایسا ہوتا ہے۔ اور انسان اسے چڑانے
کے لئے کہتا ہے کہ "اونٹ رے اونٹ تیری
کون سی کل سیدھی"۔

اطہر علی فاروقی

جب لاد چلے گا بنجارہ

آپ میں سے شاید ہی کسی نے بنجارہ دیکھا ہو، اور اگر کہیں دیکھا بھی ہوگا تو یہ بنجارا وہ بنجارا نہ ہوگا۔ جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے، اس لئے کہ اس بنجارے کے نہ تو پٹے ہوں گے یعنی سر کے چاروں طرف تو بال اور چاند اُسترے سے صاف، اور نہ بنجارن کی اوڑھنی میں کوڑیوں کی بیل ٹنکی ہوگی اُس کے پاس وہ کرتی بھی نہ ہوگی جس میں کوڑیوں اور پوتھ سے پھول بنے ہوں۔ اس کا لہنگا بھی اب بدل گیا ہوگا، زمانہ بدلا اور اس کے ساتھ ساتھ بنجارا بھی بدل گیا، شاعر ان بنجاروں کے بارے میں کہتا ہے جو آج سے ڈیڑھ پونے دوسو برس پہلے کچھ تو ڈاک ہرکارے کا کام کرتے تھے اور زیادہ تر بیوپار اور تجارت کے سلسلے میں گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ گاؤں والے ان کے انتظار میں رہتے اور اُن سے سودا سلف خریدتے، اگر اتفاق سے وہ چلے جاتے اور سودا نہ خرید پاتے تو اُنھیں افسوس ہوتا، شاعر یہیں سے زندگی کی بابت سوچتا ہے اور بتاتا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے کرلو ورنہ پچھتانا پڑے گا، اور

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا
جب لاد چلے گا بنجارا

اس شاعر کا نام تو تھا ولی محمد اور نظیر اس کا قلمی نام تھا جسے تخلص کہتے ہیں۔ یہ اکبرآباد (آگرہ) کا رہنے والا تھا، مغل تاجدار محمد شاہ کے عہد حکومت میں جب ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا اس وقت اس کی عمر کوئی چار یا پانچ سال کی تھی اور اس کی ماں دلی میں تھی۔ کہا جاتا ہے اس نے ایک لمبی عمر پائی، لگ بھگ سو سال۔ اسی لئے اس نے بہت کچھ تباہی دیکھی مغلیہ حکومت کی بدحالی اور اس کے بعد کی حالت بھی دیکھی یعنی بادشاہ پر بادشاہ بدلتے، اور ان کی لاشیں جمنا کی ریت پھنکتے، مرہٹوں کی لوٹ مار، اور جاٹوں کی دست درازیاں بھی، رہیلوں کی بغاوتیں بھی دیکھیں۔

(۲)

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پرانے شاعر زیادہ تر غزلیں لکھتے تھے، بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں وغیرہ کی تعریفوں میں قصیدے لکھتے تھے، اس شاعر نے غزلیں کہیں تو ضرور مگر دوسرے شاعروں سے الگ تھلگ، یہ نہیں کہ رہیں تو ہندوستان میں اور بات کہیں ایران اور توران کی۔ اس نے جو کچھ لکھا وہ سب کا سب ہندوستانی تھا، زیور، گہنے، پاتے کپڑے لتے وغیرہ سب کچھ ہندوستانی اور تو اور بیان کرنے کا جو طرز اختیار کیا وہ بھی سیدھا سادا جس میں نہ تکلف اور نہ بناوٹ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کے شاعر اسے محض تک بند سمجھنے لگے، اور شاعروں کے حالات لکھنے والوں میں سے اکثر نے اسے شاعروں کی فہرست سے نکال دیا۔ چاند نکلتا رہا اور سورج ڈوبتا، دن پر دن اور رات پر رات آتی رہی اور جاتی، اس طرح وقت گزرتا گیا۔ آخر وہ انسان کو آگے بڑھا سکتی ہے اور پیچھے پڑے لوگوں کو آگے چلا سکتی ہے اگر شاعری یہ نہیں کرتی تو وہ شاعری نہیں شاعر وقت کی پکار کا ساتھ دیتا ہے۔

اب اس آئینے میں شاعروں کی تصویریں دیکھنا شروع کی گئیں تو نظیر اکبرآبادی کی تصویر بڑی اجلی اور جگمگاتی دکھائی دی۔ لوگوں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی شاعری کا ڈھانچا ان چیزوں سے تیار کیا جو عوام کی ملکیت تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ انھیں جس ڈھنگ سے برتتا ہے

وہ بھی عوام کا ہے، رسم و رواج میلوں
ٹھیلوں، تیوہاروں، جانوروں، موسموں
وغیرہ غرضیکہ جن چیزوں کی بھی تصویریں
بنائیں یا خاکے کھینچے وہ انہیں کی زبان میں
اور جو کچھ بھی سمجھا بوجھا انہیں کے ذہن اور
خیال سے، جہاں وہ شب برات اور عید
میں شریک ہوتا ہے وہاں ہولی - دیوالی
سلونو (رکشا بندھن) وغیرہ بھی نہیں بھولتا -
اور وہ ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے جیسے
وہ اس کی اپنی ہوں -

(۳)

نظیر اکبر آبادی کی زبان آج کل کی زبان
سے کہیں کہیں مختلف ہے، بات یہ تھی کہ زبان
اس وقت منجھ کر اتنی صاف نہیں ہوئی تھی جیسی
آج ہے - مگر نظیر اکبر آبادی نے ایک بڑا اچھا
کام یہ کیا ہے کہ آپ کے لئے سینکڑوں لفظ
اپنی شاعری میں اکٹھا کر دیئے ہیں، جن سے
اس وقت کی سماجی حالت تو معلوم ہی ہو جاتی
ہے - اس کے ساتھ ساتھ آپ کی معلومات بھی
بڑھتی ہیں - اگر کھانوں کی فہرست بنائی جائے
تو بہت سے نام ایسے آئیں گے جنہیں آج کل
بہت کم لوگ جانتے ہوں گے، چڑیوں اور جانوروں
کے ناموں کا بھی یہی حال ہے - پیشہ وروں
کی فہرست میں بھی آج بہت سے گم ہیں مختلف
پرندوں کی بولیاں آپ کو معلوم ہو جائیں گی -
آواز سے تعلق رکھنے والے لفظ آپ کو
سب سے زیادہ نظیر کی شاعری میں ملیں گے

شاعر اور ادیب کبھی کبھی اپنے خیالات
ادا کرنے میں مذہبی قصے کہانیوں، پرانے
واقعات، تاریخی حادثات، کہاوتوں وغیرہ
سے مدد لیتے ہیں اور انھیں تلمیح کہتے ہیں -

اردو کے شاعروں نے جن تلمیحوں سے کام
لیا ہے وہ زیادہ تر ایران اور عرب یا پھر
یونان وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں، مگر نظیر
اکبر آبادی خالص ہندوستانی شاعر ہے جو
ہندوستانی تلمیحوں کا ذکر کرتا ہے، جو ہندو
مذہب، ہندو تاریخ، ہندو رسم و رواج
کی باتوں کو تلمیح کے طور پر اردو شاعری میں
جگہ دیتا ہے، نظیر کی شاعری پڑھ کر آپ کو
اس کا بھی اندازہ ہو جائیگا کہ آپ کی زبان نے
کیا کیا روپ بھرے ہیں

یہ سب کچھ تو مختصر طور پر نظیر اکبرآبادی، ان کے ماحول اور شاعری پر ہوا۔ اب سنیئے انھوں نے آپ کے لئے کیا لکھا۔ سرسری طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ کہانیاں تو نظیر اکبرآبادی نے بہت کم نظم کیں، صرف دو ایسی ہیں جو آپ کے لئے بھی دلچسپ بن سکتی ہیں "پودنے اور ارنے" کی کہانی، ارنا بھینسے کی قسم کا ایک خونخوار جانور ہوتا ہے اور بیچارا پودنا ایک چھوٹا سا پرندہ، پودنا ارنے کو بھگا دیتا ہے، دوسری کہانی ہے "کوے اور ہرن کی دوستی" یہ دونوں کہانیاں بڑی اچھی ہیں، نظیر اکبرآبادی نے آپ کی دیکھی بھالی چیزوں کے منظوم اور بیانات بڑے اچھے دیئے ہیں، تیوہاروں میں شب برات اور دیوالی کے یہ شعر پڑھیں تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔ ذرا شب برات کے حلوے کی باتیں سنیئے

شکر کا جن کے حلوہ ہوا وہ تو پورے ہیں
گڑ کا ہوا ہے جس کے وہ ان سے ادھورے ہیں
شکر نہ گڑ کا جن کے وہ پرکٹ لنڈورے ہیں
اوروں کے میٹھے حلوے چپاتی کو گھورے ہیں

ان کی نہ آدھی پاؤ نہ کچھ ساری شب برات

دوسرا منظر دیکھئے :-

کھچ کو اپنے دم میں کہیں چرخ کھاتے ہیں
ٹوٹے ہوائی سنگ کہیں اُڑ کے آتے ہیں
زیپٹ زیپٹ پٹاخے کہیں غل مچاتے ہیں
لڑکوں کے باندھ غول کہیں لڑنے جاتے ہیں

آ کر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کڑی
اوپر سے اس ہوائی کی آکر پڑی چھڑی
ہو گئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی
پاؤں سے لپٹے شور مچا کر قلم تڑی
ناکیں بھی کسی کی تو رانیں جھلس گئیں
مونچھیں کسی کی پھک گئیں پلکیں جھلس گئیں

رکھتے کسی کی ڈاڑھی پہ چنگاری شب برات

ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، آگرے کی ککڑی، بلبلوں کی لڑائی ضرور پڑھئے، بڑی مزیدار نظمیں ہیں، ہماری سواریاں، تل کے لڈو ان سے بھی اچھے ہیں، قدرتی چیزوں کے بیانات بھی بڑے پیارے انداز میں نظم کئے ہیں جاڑا، برسات کی بہاریں، برسات بہت عمدہ ہیں۔

اتنا سمجھ لینے کے بعد ہم اور آپ دونوں ہی کہہ سکتے ہیں کہ "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا" اور "میاں دولہا تو باباراتی ہے" کہنے والا شاعر ہمارا شاعر ہے، اور اس ڈھب سے یاروہ ہے کل بلبلیں لڑائیں کہنے والا شاعر بچوں کا اپنا شاعر ہے۔

صلاح الدین نعمانی

کہنا نہ ماننے کی سزا

بہت دن ہوئے ایک گاؤں میں ایک غریب بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا ایک لڑکا جاوید تھا۔

جاوید بہت نٹ کھٹ اور خراب لڑکا تھا۔

اسے مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ روزانہ صبح صبح ندی کے کنارے جاتا اور گھنٹوں مچھلی کے انتظار میں ریت پر بیٹھا رہتا۔ جب کبھی وہ شکار کھیلنے جاتا تو اس کی ماں اسے شکار کھیلنے سے روکتی۔ مگر وہ کب کسی کا کہنا مانتا۔ ماں کو جھڑک دیتا اور چلتا بنتا۔ ایک دن وہ شکار پر جانے والا تھا کہ اس کی بوڑھی ماں نے کہا بیٹا تو شکار کھیلنے نہ جا' خدا نہ کرے کوئی ایسی بات ہو جائے لیکن جاوید نہ مانا اور چلتا بنا۔

جیسے ہی اس نے پانی میں ڈگن ڈالی ویسے ہی اس کی ڈگن میں کوئی بھاری سی چیز پھنسی۔ وہ خوش ہوا کہ آج بہت بڑی مچھلی پھنسی ہے۔ وہ ابھی اسی خوشی میں مست تھا اسے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے پانی کے اندر سے کوئی چیز کھینچ رہی ہے۔ ابھی وہ اسی سوچ میں تھا کہ وہ پانی میں گر پڑا اور غوطے کھانے لگا۔ آخر کچھ دیر بعد ڈوب ہی گیا۔

دیکھا آپ نے بڑوں کا کہنا نہ ماننا کتنا برا ہے،

(صفحہ ۸ سے آگے)

مقابلے راشٹرپتا مہاتما گاندھی کی تعلیمات کو پھیلانے اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ گاندھی جی جیسا کہ تم سب جانتے ہو ہندوستان کی آزادی کا آفتاب تھے جو آسمان کی بلندی پر چمکتا ہے۔ اور جس کی چمک سے لوگوں کی آنکھیں چکاچوندھ ہو جاتی ہیں تو ایسے تھے مہاتما گاندھی۔ تم سب بچّوں کو بھی ویسا بننا ہے اور آسمان کی بلندی تک پہنچنا ہے اور اُسے چھو لینا ہے۔ یہ اُسی وقت ہوگا جب کہ تم بھی اسی لگن اور دُھن کے ساتھ اپنے مُلک کی خدمت کروگے جیسے گاندھی جی نے کی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم میں سے ہر ایک روشن ستارہ بن کر بھارت ماتا کے آسمان کو جگمگا دے گا۔ اچھا جے ہند!" اس کے بعد لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے جلسہ برخاست ہو چکا تھا۔ لوگ بچّوں کی سنائی ہوئی ہانیوں سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے اور ان کی تعریف کرتے ہوئے رُخصت ہو رہے تھے اتنے میں ایک صاحب نے دوسرے سے کہا بھائی بچّوں کی برادری کی طرف سے گاندھی جی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا یہ مقابلہ خوب ہی رہا۔ آئیے ہم لوگ بھی چلیں اچھا خدا حافظ۔

بچّوں کا مُشاعرہ

اس سال بچّوں کے مشاعرے کا انتظام جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے اُستاد جناب محمد شفیع الدین نیّر کے سپرد تھا۔ اس دفعہ آپ کی کوشش سے جامعہ کے مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کے بچّوں کے علاوہ دہلی کے بعض دوسرے مدرسوں نے بھی حصّہ لیا۔

اس مُشاعرے کی صدارت دہلی ریاست کے چیف کمشنر جناب اے ڈی پنڈت صاحب نے فرمائی۔ یہ مشاعرہ ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس مشاعرہ میں بڑے لڑکوں میں محمد اسلم طالب علم اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول دہلی اوّل اور محمد عبد العزیز طالب علم مدرسہ ثانوی دوم آئے۔

چھوٹے بچّوں میں اوّلیت کا سہرا سیّد ستار شاہ کے سر رہا۔ ہاشمی دوم

سالنامہ ملا

پیامِ تعلیم کا سالنامہ ہر حیثیت سے بڑی قابلِ قدر چیز ہے اور قابلِ قدر چیز کیوں نہ ہوتی اس کے ترتیب دینے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی عمریں بچوّں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دی ہیں اور بچوّں کی نفسیات کے ماہر ہیں، ان کی ضرورتوں سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ انھیں کس طرح سدھائیں اور کس طرح سکھائیں، بچوّں کے رسالے اُردو میں اور بھی بہت سے نکل رہے ہیں اور سب ہی اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں اور کچھ نہ کچھ مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ مگر جو ستھرا اور بلند معیار پیامِ تعلیم نے قائم کیا ہے اس کی نوعیت سب سے الگ ہے، بچوّں کے لئے لکھنا ہر زبان میں بہت ہی مشکل کام سمجھا جاتا ہے اور بہت ہی کم شاعر اور ادیب اِس اہم خدمت کو کما حقہ انجام دے سکتے ہیں، یوں بھی آسان اور سلیس اور ہلکی پھلکی زبان لکھنا مشکل ہوتا ہے، خاص طور پر بچوّں کے لئے لکھنا اور بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ قدم قدم پر ان کی ذہنیت، ان کے رجحانِ طبع اور ان کی ضروریات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، پھر یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ بچوّں میں صحیح مذاق کی نشوو نما ہو تاکہ وہ ادب کے مطالعہ اور ذوق کو اپنی آئندہ زندگی میں جگہ دے سکیں، یہ سب خدمات پیامِ تعلیم بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے، خوش نصیب

ہیں وہ بچے جن کو ہر مہینے پیامِ تعلیم کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے۔

(حامد اللہ افسر)

●

پیامِ تعلیم کا سالنامہ میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اردو میں بچوں کے رسالے میں پیامِ تعلیم بہت اونچا درجہ رکھتا ہے، اس اونچے درجے کے سالنامے میں جو جو خوبیاں ہونی چاہیے تھیں، وہ سب میں نے توقع کے مطابق اس میں پائیں اس کی ظاہری صورت پیاری اور اس کی اندرونی کیفیت من موہنے والی۔ مولانا اسلم جیراجپوری کی نظم کا کیا کہنا۔ محترمہ بیگم فیضی کا مضمون مصر کی شادی بہت دلچسپ، محترمہ قدسیہ بیگم کا مضمون بہت دلکش، کن کن مضمونوں کی تعریف کروں، سب ہی اپنی جگہ پڑھنے کے قابل، ایسے اچھے اور دلکش تحفے کے لئے اپنی اور اپنے بچوں کی طرف سے پیامِ تعلیم کے لئے کام کرنے والوں کی خدمت میں ادبی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مبارز الدین رفعت

●

پیامِ تعلیم کا سالنامہ ملا — بچوں کے لئے مناسب ادب پیش کرنا کافی مشکل کام ہے مگر آپ نے اس مشکل کام کو حل کر کے دکھلا دیا۔ لکھنے والوں نے بھی اپنی تخلیقات کو بچوں کے لئے دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے۔ "راشٹر پتی" اور "بھاکڑا ننگل پروجکٹ" بچوں کے لئے بے حد خشک موضوعات ہیں مگر قدسیہ زیدی اور قیصر نقوی اپنے ارادوں میں بہت کامیاب رہے۔ نثر کے مقابلے میں نظم کچھ کم نظر آتی ہے۔

وامق جونپوری

●

سالنامہ ملا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میں نے اسے بہت ہی مفید، بہت ہی صاف ستھرا، اور بہت ہی دلچسپ پایا۔ یقیناً یہ میری پسند اور خواہش کے عین مطابق بھی ہے اور اپنی روایات کے شایانِ شان بھی۔ چشمِ بد دور "پیامِ تعلیم" بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ؏

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ترقی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لئے امید ہے

کہ آپ اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہ آنے دیں گے۔ میں آپ کو آپ کی کامیابی اور پُر خلوص کوششوں پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ا۔ع۔انصاری

پیامِ تعلیم، کا سالنامہ ملا۔ بچوں کے لئے یہ سالنامہ ’باغ بہار‘ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مضامین نظم ونثر مفید و دلچسپ ہیں۔ بچے پڑھ کر خوش ہوں گے اور کچھ سیکھیں گے بھی۔

ممتاز حسین، ڈاکٹر مسعود حسین، روشؔ، واحق، تاباںؔ، مرزا ادیب اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی سے بچوں کے لئے لکھوانا آپ ہی کا کام ہے ورنہ یہ لوگ کافی ستم ظریف ہیں ہم بڑوں کے رسالوں میں بھی بڑے تکلف سے لکھتے ہیں۔ تاباںؔ اور واحق سے آپنے نثر لکھوائی ہے یہ جوہر آج ہی کھلا۔ ان کے مضامین خاصے دلچسپ اور معیاری ہیں۔ جمیل تنویر۔ مجیب احمد خاں۔ سُلطانہ آصف کی نگارشات کافی معلومات افزا ہیں۔

بچوں کی کہانیاں

- سرمار گا پٹر ۳ر
- پچھو منتر ۳ر
- بگڑا فرشتہ ۴ر
- آفت کا پرکالہ ۴ر
- مسٹر بھوٹ ۳ر
- ماں کا ظلم ۳ر
- جن پکڑا گیا ۳ر
- شاہ صاحب کی بددعا ۴ر
- ظالم بادشاہ ۴ر
- ہیبت خاں ۳ر
- اکبر بیربل کے لطیفے ۶ر
- دو بھائی ۵ر
- ہوائی گھوڑا ۵ر
- وفاداری کا امتحان ۵ر
- تین ٹھگ ۵ر
- لاڈلی بیٹی ۵ر
- ایمانداری کا پھل ۵ر
- دو ہنس ۵ر
- لال بجھکڑ (تھوک کا مال) ۱ر

- شام نگر میں سنیما آیا ۴ر
- جادو کی انگوٹھی ۵ر
- شیخ چلی کا مشاعرہ ۵ر
- نیلم ۶ر
- گھڑی ساز کی بیٹی ۴ر
- سفید ہاتھی ۴ر
- شاہی لباس ۴ر
- شاہی موچی ۴ر
- شہزادی گوہر بار ۵ر
- مٹی کی شہزادی ۳ر
- گرم جائے ۳ر
- ننھی خرگوش ۳ر
- سنہری کھال ۳ر
- رامو موچی ۳ر
- سنہری پرندہ ۳ر
- آنکھ مچولی ۳ر
- علم کی قیمت ۳ر

- بچوں کی بیت بازی ۳ر
- شیخ چلی نے شادی کی ۴ر
- شہزادی نیلوفر ۴ر
- جادو کی چھڑی ۴ر
- اندھیر نگری ۴ر
- نیلم پری ۳ر
- شہزادی نیلم ۴ر
- جادو کا باغ ۴ر
- مداری کا ڈنڈا ۴ر
- بدھو سیٹھ ۴ر
- قاضی اور ٹھگ ۴ر
- ناگ شہزادہ ۴ر
- انوکھی شہزادی ۵ر
- شہزادی کا ہار ۵ر
- ضدی شہزادہ ۵ر
- پھولوں کی شہزادی ۵ر
- مسٹر گڑبڑ خاں ۵ر

- سونے کا راجہ ۵ر
- رستم چور ۵ر
- کہانی میں کہانی ۵ر
- جادو کی کہانی ۵ر
- کا ما پلٹ ۵ر
- بوڑھا جادوگر ۵ر
- گوہر پری ۵ر
- لنگڑا اریو ۵ر
- فقیر کی دعا ۵ر
- خدا کی لاٹھی ۵ر
- جادوگر کی کہانی ۵ر
- چھم چھم پری ۵ر
- مزیدار لطیفے ۵ر
- چٹ پٹی پہیلیاں ۵ر
- نوشیرواں کا انصاف ۵ر
- مکار بھائی ۵ر
- بھائی بہن ۳ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی

پیامی معمّا نمبر ۳۸ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل پیامی معمّا (۱) چار (۲) دیر (۳) منظر (۴) امیر (۵) راہ (۶) عمل ★

★ اس بار صحیح حل ۳۵ موصول ہوئے۔ لہذا پہلا انعام بحساب ۱۴ر فی کس تقسیم کیا گیا ★

(۱) میمونہ بیگم۔ شولاپور (۲) عبدالمجید۔ دہلی (۳) محمد ایوب۔ دہلی (۴) شمیم احمد۔ کانپور (۵) فیاض احمد رائے پور (۶) کریم الدین۔ پٹنہ (۷) رابعہ خاتون۔ لاہور (۸) اے حمید۔ کلکتہ (۹) محمد عمر۔ لاہور (۱۰) عبدالحمید عبدالکریم۔ لکھنؤ (۱۱) سورتی۔ اے۔ ایس۔ کاٹھور (۱۲) مختار میاں۔ کلکتہ (۱۳) محمد ابراہیم۔ شولاپور (۱۴) شفیع الدین۔ الہ آباد (۱۵) محمد مقیم۔ شولاپور (۱۶) محمد عرفان عارف۔ دربھنگہ (۱۷) محمد احمد۔ لکھنؤ (۱۸) احمد حسین کراچی (۱۹) خورشید علی۔ کانپور (۲۰) حنیف احمد۔ لاہور (۲۱) ماجدہ بیگم۔ منظفرنگر (۲۲) عزیز احمد۔ بیلی (۲۳) حیدر جان۔ دہلی (۲۴) محمد اسماعیل۔ کانپور (۲۵) اشتیاق محمد۔ کریم نگر (۲۶) فقیر محمد۔ کراچی (۲۷) شریفہ بیگم۔ برہانپور (۲۸) غلام حسین۔ جموں (۲۹) اوم۔ دہلی (۳۰) عبدالقادر۔ بریلی (۳۱) رحیم داد خاں۔ جمشیدپور۔ (۳۲) عبدالصمد۔ آگرہ (۳۳) شریف الحسن۔ کانپور (۳۴) ابورحیم۔ بریلی (۳۵) زینت بیگم۔ الہ آباد۔

★ اس بار ایک غلطی والے ۲۵ حل موصول ہوئے لہذا دوسرا انعام بحساب ۱۳ر فی کس تقسیم کر دیا گیا ★

(۱) مامونہ بیگم۔ جودھپور (۲) محمد شریف احمد۔ جودھپور (۳) حاتم علی۔ دھار (۴) سرداری لال۔ بمبئی۔ (۵) کلدیپ لعل چوپڑہ۔ جموں (۶) کریم داد خاں۔ حیدرآباد (۷) حمیدہ بانو۔ شولاپور (۸) رشیدہ بانو۔ کانپور۔ (۹) عبدالقیوم۔ شولاپور (۱۰) نثار احمد۔ شولاپور (۱۱) محمد اشتیاق۔ جامعہ نگر (۱۲) اسماعیل محمد علی قیوم۔ دایوالی۔ (۱۳) فاروق اعظم۔ مسلہ (۱۴) لیاقت علی۔ بدار (۱۵) خان اختر مجید۔ باندہ (۱۶) شیخ جمال صاحب۔ جیتور۔ (۱۷) عبداللہ۔ بھاپیج (۱۸) فرید احمد۔ سیتاپور (۱۹) محمد نصراللہ۔ کشن گنج (۲۰) محمد خلیل انصاری۔ گیا (۲۱) فوادالحق۔ مسلہ (۲۲) سلمہ عبدالغنی۔ مچگاؤں (۲۳) احمد پاشاہ جی۔ میلہ شارام (۲۴) ریحانہ عثمانی۔ دہلی حمیدہ بیگم

ایک کوپن کے ساتھ چھے حل پائیں بھیجے سکتے ہیں

۵۰ پچاس روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس چار آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے ‖ دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۷ ستمبر ۵۴ء

پیامی معمّا نمبر ۳۹

				ہ	۱ م
			ی	ر	۲ ش
	ا	ظ	ت	ن	۳ ا
		د	گ	ا	۴
					۵ ک
			ے		۶ آ

اشارے

(۱) ہمارے چیف جسٹس (سپریم کورٹ) کا نام — چند مہاجن۔ (مہر)

(۲) — لڑکے صورت سے بھی پہچانے جاسکتے ہیں۔ (شریر۔ شریف)

(۳) دعوت بڑی ہو یا چھوٹی مہمانوں کا — کرنا بڑا مشکل ہے۔ (انتظار۔ انتظام)

(۴) کبھی زیادہ نہ — اس سے طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ (جاگو۔ بھاگو)

(۵) عام طور پر برسات ہی میں ندیوں کا پانی — ہو جاتا ہے۔ (گندہ۔ گہرا)

(۶) بزدل آدمی عزیزوں کے بُرے وقت پر — ہی جاتا ہے۔ (آ۔گے۔ آڑے)

ٹوکن پیامی معمّا نمبر ۳۹

نام ....

پتہ ....

ٹوکن پیامی معمّا نمبر ۳۹

نام ....

پتہ ....

پتہ: پیامی معمّا نمبر ۳۹ ماہنامہ پیام تعلیم جامعہ نگر۔ نئی دہلی

پرنٹر پبلشر:۔ حامد علی خاں مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی

ہالینڈ کی ایک ”ہوا چکی“ —— اندر کے صفحات میں ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کا مضمون ”ہالینڈ کی سیر“ پڑھیے

Title Printed at The Fine Press DELHI.

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

برانچ آفس نمبر ۲۴۳۶۸ — صدر دفتر فون نمبر ۴۲۱۹۰

پیامِ تعلیم

فروری ۱۹۵۵ء

فہرست

ادارہ
حامد علی خاں بی۔ اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم۔ اے (علیگ)
آرٹسٹ:-
گلیڈون میسی

سالانہ چندہ
چار روپے
فی پرچہ ۶ (چھ آنے)
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

بچّوں سے باتیں

ابھی تک پیامِ تعلیم کے سالنامے کے سلسلے میں پیامی بہن بھائیوں کے خطوط آ رہے ہیں ۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بچے بڑے سب ہی اسے پسند کر رہے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض ادیبوں نے بھی ہمیں تعریفی خطوط لکھے ہیں ـــــ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اب پیامِ تعلیم کا ہر پرچہ سالنامے کی طرح دلچسپ اور خوبصورت ہو ۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب آپ سب مل کر ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔

اکثر بچّوں اور بچیّوں نے خوش ہو کر لکھا ہے کہ وہ پیامِ تعلیم کے لئے خریدار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ اگر آپ سب مل کر یہ کوشش کریں کہ کم سے کم دو دو خریدار بنائیں تو اس سے پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھے گا پھر ہم اِس زائد آمدنی کو رسالے پر خرچ کر کے اس کو اور زیادہ خوبصورت بنا سکیں گے ۔ سالنامے کی طرح ہر پرچے میں اچھی اچھی تصویریں دیں گے ۔

جو بچے اس مہینے میں خریدار بنائیں گے ہم اُن کے نام اگلے پرچے میں شائع کریں گے ۔

جنوری کے پرچے میں جو مضامین اور کہانیاں شائع ہوئی تھیں وہ سب کی سب سالنامے کے لے آئی تھیں لیکن دیر سے ملنے کی وجہ سے سالنامے میں نہ چھپ سکیں اِس بار بھی اکثر مضامین اور کہانیاں ایسی ہی ہیں جو سالنامے کے لئے ملی تھیں ۔

ماجدہ بیگم صاحبہ کا ڈراما "بادل کے بچے" آپ نے سالنامے میں پڑھا ہی تھا۔ اس بار اُنھوں نے ایک کہانی بھیجی ہے۔ جسے پڑھ کر آپ پھڑک اُٹھیں گے۔

ہم ماجدہ بیگم صاحبہ کے خاص طور پر ممنون ہیں کہ اُنھوں نے پیامِ تعلیم سے دوبارہ دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ اُنھوں نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اور اچھی اچھی کہانیاں لکھ کر بھیجیں گی۔

حبیب تنویر صاحب نے پھر ایک اور ڈراما لکھا ہے "اندھیر نگری"۔ وہی اندھیر نگری جہاں ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھاجا بکتا ہے۔ آپ چاہیں تو چند بچّوں کی مدد سے یہہ ڈراما خود بھی کھیل سکتے ہیں۔

آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ حکومتِ ہند نے حبیب تنویر صاحب کو ڈرامے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ دیا ہے۔ ہم ادارے کی جانب سے اُن کو مُبارک باد دیتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ یہاں سے جا کر وہ پیامِ تعلیم کو برابر یاد رکھیں گے۔

اس بار ہمارے ہاں آنے والے مہمانوں میں روسی فن کار پروفیسر بخروف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ بچّوں کی کتابوں کی تصویریں بناتے ہیں اور آپ کی گنتی روس کے چند بڑے مصوّروں میں ہوتی ہے۔ آپ ۱۵ جنوری کو ہمارے مکتبے میں تشریف لائے تھے۔ آپ نے بچّوں کی کتابوں اور پیامِ تعلیم کو بڑے غور اور دلچسپی کے کے ساتھ دیکھا اور پسند فرمایا۔

ہم نے اپنی کتابوں کے علاوہ آپ کی خدمت میں "پیامِ تعلیم" کا سالنامہ بھی پیش کیا۔ پروفیسر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ روس جا کر آپ ہمارے لئے بچّوں کی اچھی اچھی تصویروں والی کتابیں بھیجیں گے۔

ٹائیٹل کی دونوں تصویروں کیلئے ہم سراج انور صاحب کے ممنون ہیں

موٹر سائیکل کی سواری

از
قیصر قیصری

ہمارے بھی یارو ہیں اِک بھائی جان
نہ کچھ پوچھئے بس کہ کیسے ہیں وہ
جو پاس ہم نے اردو چہارم کیا
جو کی پاس ہم نے جماعت چھٹی
کیا پاس ہم نے جب اردو مڈل
نہیں سائیکل میں غلط کہہ گیا
جو پیڈل چلائے بنا چل سکے
دھواں بھی بہت سا اگلتی تھی وہ
اسی سائیکل کی ہے یہ داستاں
بتانے لگے پھر ہمیں بھائی جان
یہاں پیر مارو چلاؤ۔ اسے
گھما "ایکسلیٹر" جو اک لات دی

بہت ہی شفیق اور بڑے مہربان
بہت ہم کو انعام دیتے ہیں وہ
انہوں نے ہمیں گیند بلّا دیا
انہوں نے ہمیں لاکے دی اک گھڑی
انہوں نے ہمیں بخش دی سائیکل
کہ تھی درحقیقت وہ کوئی بلا
اسے کون بے جان گاڑی کہے
کہ پٹرول کھا کھا کے چلتی تھی وہ
جسے کرنے والے ہیں اب ہم بیاں
کہ دیکھو سمجھ لو یہ ہے پائدان
کلچ یہ رہا لو دباؤ اسے
تو پھٹ پھٹ کی آواز آنے لگی

چلا جونہی انجن ہوئے ہم سوار
کہ عجلت پسندی ہے اپنا شعار

ادھر اس کو اسٹارٹ ہم نے کیا
ادھر بھائی چیخے کہ ٹھہرو ذرا

میاں ٹھہر جاؤ یہ سن لو ذرا
اسے روکنے کا طریقہ ہے کیا

مگر اس کے آگے نہ ہم سن سکے
کہ بھیا سے اب ہم بہت دور تھے

ڈڈا ڈڈا ڈڈا ڈڈا کرتی ہوئی
غرض دیکھئے اب یہ گاڑی چلی

روانی میں اک شور کرتی ہوئی
دھواں چھوڑتی زور کرتی ہوئی

ہوا کے تھپیڑوں سے لڑتی ہوئی
کھرنجی سڑک سے جھگڑتی ہوئی

بہت ہی ہمیں ہو رہی تھی خوشی
کہ یہ موت کی خوب چنڈی ملی

اچانک ہمیں آگیا اک خیال
کہ جس سے ہوا دل ہمارا نڈھال

اسے روکنا ہم کو آتا نہیں!
ہمیشہ نہ رہ جائیں چلتے کہیں

ادھر یہ خیال اور اُدھر دیکھئے
کہ اب اور کچھ اس میں پر لگ گئے

قیامت پہ اور اک قیامت ہوئی
کہ کمبخت بازار میں آگئی

ادھر موٹریں اور اُدھر لاریاں
ہلاکت کی سب گویا تیاریاں

یہ ٹمٹم وہ رکشا یہ تانگہ وہ اونٹ
ٹہلتے ہوئے حادثے چاروں کھونٹ

بس اب چھا گیا اپنے دل پر ہراس
نہ باقی رہی زندگانی کی آس

دھڑکنے لگا اس طرح اپنا دل
کہ مشکل ہوا تھامنا ہینڈل

زباں آپ سے آپ چلنے لگی
بلا ربط جملے اُگلنے لگی

اسے مرگیا۔ مرگیا۔ مرگیا
کوئی مجھ کو آکے بچا لو ذرا

بچا لو کوئی ورنہ ہم چل دئے
بہت کم تمہارے جہاں میں جئے

ارے رکشا والے یہ رکشا ہٹا
ہلاکت سے بچ اور ہمیں بھی بچا

میاں سائیکل والے ہٹ جائیو
ذرا اک طرف کو سمٹ جائیو

غرض اس طرح شور کرتے ہوئے — چلے جا رہے تھے ہم اڑتے ہوئے
مگر ساری واویلا بیکار تھی — کہ آواز سے تیز رفتار تھی
کوئی اپنی آواز سنتا کہاں — کہ آواز سے آگے ہم تھے رواں
کئی حادثے ہوتے ہوتے بچے — یہ ننھی سی جاں کھوتے کھوتے بچے
کہیں اونٹ گاڑی سے کترا گئے — کہیں بس کو دیکھا تو لہرا گئے
کہیں اک بڑی بی کو دھکا دیا — کسی موٹے لالہ کو لڑھکا دیا۔
سپاہی بجاتے رہے سیٹیاں — مگر اپنا رہوار رکتا کہاں
چلے جا رہے تھے یونہی بے خبر — کہ آیا اچانک ہمیں یہ نظر
کہ اب ہم شہر سے پرے آ چکے — یہ جنگل—؟ ارے باپ رے مر گئے
وہ اونچا سا ٹیلہ جو ہے سامنے — یقیناً بس اب اس سے ٹکرائیں گے
اٹھا ہاتھ جھٹ آنکھ پر رکھ لئے — کہ دیکھیں نہ ہم خود کو مرتے ہوئے
قضا کے تصور سے اچھلا جو دل — تو خود مڑ گئی اک طرف سائیکل
دھماکا ہوا ہم اچھل کر گرے — جو دیکھا تو اک گندے نالے میں تھے
یہ نالہ بھی تھا پاس ہی ٹیلے کے — ابھی زندگی تھی جو اس میں گرے
اٹھے الغرض لے کے اللہ کا نام — کہ کپڑے تھے کیچڑ میں لت پت تمام
یہ سوچا کہ اچھی سزا مل گئی۔ — یہ عجلت پسندی دغا دے گئی
سواری کی عجلت میں بس چل پڑے — نہ سوچا کہ روکیں گے کیسے اسے
ذرا سن کے چلنے طریقے جو سب — یہاں آ کے کیچڑ میں گرتے نہ اب
ترا جلد بازی ہو خانہ خراب — کہ تو نے ہی بخشا ہمیں یہ عذاب

نصیحت یہ قیصر کی کیا خوب ہے
کہ انسان عجلت سے بچتا رہے

سید منیر الحسن

جوہری بم

ہم سب آج کل جس زمانے میں رہتے ہیں وہ جوہری بم کا زمانہ ہے۔ جوہری بم کو ایٹم بم بھی کہتے ہیں۔ اس کی ایجاد کا سہرا اتحادی سائنس دانوں کے سر ہے۔ اس بم کی تعریف یہ ہے کہ وہ زمین میں ایک میل اندر جاتا ہے اور پانچ مربع میل کے رقبے کی جتنی چیزیں ہوں ان کو برباد کر دیتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دھاتوں میں سب سے قیمتی دھات سونا ہے۔ لیکن سائنس دانوں نے اس سے قیمتی دھات ریڈیم کا پتہ لگا لیا۔ پھر اس قسم کی بلکہ اس سے بھی زیادہ کار آمد دھات "یورانیم" کا پتہ چلا جس کی چمک دمک آفتاب عالمتاب کے مانند ہوتی ہے۔ اور اس میں اتنی گرمی ہوتی ہے کہ بیان نہیں کی جاتی۔ اسی یورانیم کے ذرات سے بم بنائے جاتے ہیں۔

اس دھات کا ایک ذرہ جو کسی طاقت ور خوردبین کے دیکھنے سے ہی نظر آ سکتا ہے۔ اس کے ¾ یعنی چوتھائی حصے کو ایک بم میں دوسری تباہ و برباد کرنے والی اشیاء کے ساتھ بھر دیا جاتا ہے۔ یہ بم ۱۹۴۵ء میں پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا اور اس بم کا پہلا نشانہ جاپان کے ایک شہر ہیروشیما کو بنایا گیا۔ یہ بم جس وقت پھینکا گیا تو اس نے ہیروشیما کے ¾ یعنی تین چوتھائی

حصے کے تمام جان داروں کو ہلاک کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے میں جو چیز بھی زمین پر نظر آتی تھی سب جل کر راکھ ہوگئی۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہاں پہلے کچھ تھا ہی نہیں۔ گویا کہ ہیروشیما مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس بم کا وزن چار سو پونڈ ہے یعنی ہمارے ہندوستانی وزن میں تقریباً سوا دو سو من پختہ۔ جب یہ گرایا جاتا ہے تو اس کی روشنی آفتاب عالمتاب کا مقابلہ کرجاتی ہے۔ اور اس روشنی میں اتنی تیزی اور گرمی ہوتی ہے جیسی کہ ہم ماہ مئی کی سخت تپتی ہوئی دوپہر میں دیکھتے ہیں۔ جب یہ گرتا ہے تو اتنی شدید گرمی پیدا کرتا ہے کہ ہر چیز کوئلہ بن جاتی ہے اور اتنی زبردست آگ لگتا ہے کہ چالیس ہزار فٹ تک دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔ ہیروشیما پر جوہری بم کے حملے کے دو دن بعد ایک اور جوہری بم جاپان کے بندرگاہ ”ناگاساکی“ پر گرایا گیا تھا وہاں بھی اس نے یہی تباہی مچائی۔

اس بم کی ایجاد پر تمام دُنیا حیران ہے اگر اس بم کی ایجاد کچھ پہلے ہوگئی ہوتی تو پھر بہت جلد کئی ملک تباہ ہوجاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ایجاد نے دنیا کو بدل دیا۔ آئندہ لڑائیوں میں اگر یہ بم استعمال ہوا تو یہ کہنا مشکل ہے کہ موجودہ دنیا باقی رہے گی بھی یا نہیں۔ یہ ایجاد جتنی تباہ کن ہے اس سے زیادہ کارآمد بھی ہوسکتی ہے۔ جوہری قوت کے دریافت کرنے سے بڑے بڑے کام ہوسکتے ہیں زبردست مقدار میں بجلی بنائی جاسکتی ہے۔ دنیا کی صنعتوں میں انقلابی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جنگ کا خطرہ دور ہوجائے۔ اور سائنس والے اس جوہری قوت کا راز دریافت کرنے کے بعد اس سے بم بنانے کے بجائے اور اچھے اچھے کام لیں۔

یہ زمانہ جس میں ہم آپ رہ رہے ہیں، دراصل جوہری عہد ہے۔

عشرت صدیقی

ایک کہانی ایک واقعہ

شہباز اور کوا

آج سے بہت سال قبل شہباز اور کوے میں بڑی دوستی تھی۔ ایک مرتبہ شہباز نے کوے سے کہا: "دوست تم سینکڑوں سال زندہ رہتے ہو اور میں تھوڑی مدت تک جیتا ہوں۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں؟ ذرا یہ بھی تو خیال کرو کہ تم کتنے چھوٹے اور کمزور ہو۔ اور میں کتنا لمبا اور قوی ہوں۔ کیا یہ خدا کی سراسر بے انصافی نہیں۔"

کوا ہنس کر بولا "دوست اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ظاہر ہے کہ تم زندوں کا خون پیتے ہو۔ اور میں مردوں کو کھاتا ہوں۔"

کوے کی بات سن کر شہباز نے سوچا۔ کیوں نہ میں بھی کوے کی طرح مردوں کو کھانا شروع کر دوں۔ تاکہ میں بھی اسی کی طرح کافی مدت تک زندہ رہ سکوں، یہ سوچ کر وہ کوے کے ساتھ ہولیا۔ دونوں ساتھ ساتھ اڑتے رہے۔ آخر اڑتے اڑتے انہیں ایک گھوڑے کی لاش جنگل میں نظر آئی۔ جس کا گوشت بہت حد تک جنگلی جانور نوچ چکے تھے۔ اب محض ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔ دونوں نیچے اتر کر اس پر

بیٹھ گئے ۔ کتے نے لاش پر بیٹھ کر چونچ ماری اور خوشی سے چلا کر بولا "واہ ! واہ ! کتنا مزیدار گوشت ہے " اور وہ مزے لے لے کر کھانے لگا ۔

کتے کی زبانی اس کی تعریف سُن کر شہباز نے اپنی عادت کے مطابق جھپٹا مار کر چونچ ماری۔ پھر وہ نفرت سے پَر پھڑپھڑا کر بولا " بھائی کتے یہ سڑا گلا گوشت تمہیں کو مبارک ہو اسے کھا کر لمبی مدت تک زندہ رہنے کی بجائے، میں صرف ایک بار تازہ خون پی کر مرجانا پسند کروں گا "

اور یہ کہہ کر وہ اُڑ گیا ۔

محبِ وطن

ایک چھوٹا سا لڑکا جس کی عمر تقریباً چھ سال تھی پہلی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ سیر کو جا رہا تھا۔ وہ اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے پہلی بار باہری دنیا کو دیکھ رہا تھا ۔ چلتے چلتے راستے میں اُنہیں ایک بھکاری نظر آیا ۔ لڑکے نے اس سے پہلے بھکاری کو کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ چیتھڑے میں لپٹی ہوئی اس بوڑھے فقیر کی کالی کلوٹی شکل کو دیکھ کر لڑکے کا دل بھر آیا ۔ اور وہ ماں کی گود سے اُتر کر بھکاری کے پاس گیا۔ اور اُس کے سینے سے لگ کر اُس کے بدن کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے سہلانے لگا ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُس نے اپنی تتلی زبان سے ماں سے کہا " ماں اِسے کچھ دے دو نا "۔ یہ بہت ہی غریب ہے ." بچّے کی اس ہمدردی کو دیکھ کر بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اور اُس نے اس کی ماں کو مخاطب کر کے کہا " بہن تمہارا لال معمولی بچّہ نہیں ہے ۔ کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ۔ مجھے یقین ہے ۔کہ یہ لڑکا جوان ہو کر اپنے ملک والوں سے بہت پیار کرے گا ۔ اس لئے اس کی ہوشیاری سے پرورش کرنا " بوڑھا یہ دعا دے کر چلا گیا ۔

اس بوڑھے بھکاری کی بات سچ نکلی ۔جوان ہونے پر اس لڑکے نے اپنے ملک والوں کی حالت سدھارنے میں بہت سی مصیبتوں کا سامنا کیا ۔ اپنے ملک والوں کے لئے اس نے بڑی بڑی قربانیاں کیں ۔اِس محبِ وطن نے آخری وقت کہا تھا " میرا سینہ چیر کر دیکھو۔ وہاں ا.ٹ .ل .ی (اٹلی) نام کے چار حرف لکھے دکھائی دیں گے " اس محبِ وطن کا نام " یوسف میزینی " تھا ۔

محمد یوسف (اکولوی)

آپ نے سپیرے تو ضرور دیکھے ہوں گے۔ بین بجانے والے سپیرے جو ٹوکرے میں سانپ لئے پھرتے ہیں۔ یہ سپیرے جہاں کہیں بیٹھ جاتے ہیں اور بین بجاتے ہیں اور اپنی ٹوکری کھولتے ہیں تو سپیرے کی بین پر سانپ جھومتا جاتا ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ سانپ سپیرے کی بین کی آواز سُن کر جھومتا ہے۔ لیکن سائنس دانوں کا تو کہنا ہے کہ سانپ بہرا ہوتا ہے۔ اور یہی بات سچ بھی ہے۔ ایک بار ایک سائنس داں نے اس کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے سانپ کی آنکھوں پر ایک فیتہ باندھ دیا تاکہ وہ دیکھ نہ سکے۔ اب اس کے سامنے بین بجائی گئی لیکن سانپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تب اس نے ایک بگل بجایا اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب اس نے بالکل اس کے پاس لے جا کر ٹین بجایا لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اس تجربے سے سائنس دانوں کو بالکل یقین ہو گیا کہ سانپ بالکل بہرے ہوتے ہیں۔ لیکن کان نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے اور حس تیز ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھ خوب تیز ہوتی ہیں۔ ذرا سی بھی آہٹ کو فوراً معلوم کر لیتے ہیں۔ رہ گئی سانپ کے جھومنے کی بات، سو

جیسے جیسے مداری جھومتا ہے سانپ بھی جھومتا ہے
مداری رک جاتے سانپ رک جائے گا۔

سانپوں کی تقریباً ڈھائی سو قسمیں ہوتی ہیں
لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک سانپ
"کوبرا" ہوتا ہے۔ جس کو ہم ناگ بھی کہتے ہیں۔
یہ بڑا زہریلا ہوتا ہے۔

یہ سانپ افریقہ اور ہندستان میں ہی
پایا جاتا ہے اور ناگ راجا تو تقریباً ۱۴ فٹ
تک لمبا ہوتا ہے۔ ورنہ عام طور پر چھ فٹ لمبا
ہوتا ہے۔ اپنا تہائی جسم زمین پر سے اُٹھا سکتا
ہے۔ اور جب اس طرح کھڑا ہو کر جھومتا ہے تو
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی پودا جھوم رہا ہے۔
اس وقت ناگ سچ مچ بڑا ڈراؤنا نظر آتا ہے
اور یہی وجہ ہے کہ قدیم ہندستان میں لوگوں نے
اُس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ اور ہندوؤں
میں تو اس کا مارنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے یہاں اس کے کاٹنے سے ہر سال
تقریباً ۲ ہزار موتیں ہو جاتی ہیں۔

ہندستانی ناگ کے پھن پر ایک خاص قسم
کا نشان ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ جلد پہچانا
جاتا ہے مگر افریقی کوبرے پر کوئی نشان نہیں ہوتا۔

یہ دانتوں سے زخم ڈال دیتے ہیں اور اس
زخم سے اس کا زہر خون میں مل جاتا ہے۔ یہ منہ
کھول کر اپنے دشمن پر حملہ کرتا ہے۔ اوپر کے
جبڑے میں دو دانت منہ کھولنے پر باہر نکل آتے
ہیں۔ جب زہر خون میں مل جاتا ہے تو خون کی روانی
کی وجہ سے پورے جسم میں زہر پھیل جاتا ہے اور
اُسی وقت آدمی مر جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کوبرا
کا زہر پی لے تو اُس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ لیکن اگر
اس کا زہر زخم پر لگ جائے تو پھر اس کا اثر فوری
طور پر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زہر جب خون
میں دوڑتا ہے تو اس کا فوری اثر ہوتا ہے۔

سب سے خطرناک سانپ' ناگ راجا ہوتا ہے۔
کہتے ہیں کہ اگر یہ ہاتھی کو کاٹ لے تو ہاتھی تین
گھنٹے میں مر جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں افریقہ میں
ایسے سانپ بھی نظر آئے جن کا کاٹا ہوا تین منٹ
کے اندر ختم ہو گیا۔

پانی کے سانپوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ
اُن میں زہر نہیں ہوتا۔ لیکن آسٹریلیا کے سمندر
میں ایسے زہریلے سانپ ملے ہیں جن کے کاٹنے
سے آدمی مر سکتا ہے۔ لیکن پانی کے سانپ جب
پانی میں ہوتے ہیں تو وہ کبھی کسی پر حملہ نہیں کرتے۔

افتخار عالم خاں

قربانی

اسپتال سے پچیس سپاہی اچھے ہو کر نکلے۔ یہ لوگ دشمن کے خلاف نہ جانے کتنے محاذوں پر لڑ کر زخمی ہوئے تھے۔ اور یہ بالکل تندرست ہو کر اسپتال سے جا رہے تھے۔ اسپتال میں ان سب کی ایک دوسرے سے بڑی گہری دوستی ہوگئی تھی۔ ان میں ایک شخص لیبرایون نیکولین نامی تھا۔ جو بڑا بہادر اور نڈر تھا۔

ریل اسٹیشن سے روانہ ہوگئی۔ لیکن پھر اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی کیونکہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر پٹری اُکھاڑ دی گئی تھی۔

ایون نیکولین نے ڈبے سے باہر جھانک کر دیکھا تو دشمنوں کے سپاہی قریب کے جنگل سے نکل نکل کر بھاگ رہے تھے۔ اور گولیاں چلا رہے تھے۔

"ساتھیو! یہ دشمن ہماری طرف آرہے ہیں" نیکولین نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"اب ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟" کسی نے پوچھا۔

"ہمیں ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے" ان ہی سپاہیوں میں سے ایک نے جواب دیا۔

لیکن ہمارے پاس مقابلہ کرنے کے لئے ہے ہی کیا ــــ اُن کے پاس ہتھیار بھی ہیں ؟" ایک سپاہی نے گھبراتے ہوئے کہا ۔

نیکولن نے بڑی ہمت اور استقلال کے ساتھ کہا "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ تم سب میرے اُوپر بھروسہ رکھو ۔ بس جیسا میں کہوں ویسا ہی کرو ۔ اور سب چپ چاپ اپنی اپنی جگہ پر لیٹ جاؤ ۔"

تمام سپاہی نیکولن کے کہنے کے مطابق اپنی اپنی جگہ پر بالکل خاموشی کے ساتھ لیٹ گئے۔

نیکولن نے اِن سب کو دوبارہ ہدایت کی کہ جب دشمن کے سپاہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوں تو اُن پر ٹوٹ پڑیں ۔ اور جیسے ہی کسی کے ہاتھ میں دشمن کی بندوق آجائے بس وہ پھر اُن پر نشانہ لگائے ۔

اَب دشمنوں کے سپاہی اور قریب آگئے تھے اور جتنے قریب آتے جاتے تھے ۔ اتنی ہی بندوقوں اور رائفلوں کی آوازیں کم ہوتی جا رہی تھیں ۔ یہاں تک کہ فائرنگ بالکل بند ہوگئی۔ اَب ڈبے کے اندر اُن کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا ۔ کہ وہ بہت قریب آگئے ہیں ۔

ذرا سی دیر میں دروازہ کھُلا اور سات آٹھ سپاہی اندر داخل ہوئے تو نیکولن کے ساتھی اپنے چھروں اور گھونسلوں سے اُن پر پل پڑے ۔ اور ذرا سی دیر میں وہ تمام سپاہی مارے گئے۔ نیکولن اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ اُن کا سارا سامان آگیا ۔ بندوقوں کا ملنا تھا کہ پھر تو اُنھوں نے ڈبے کی آڑ میں بیٹھ کر تمام دشمن کے سپاہیوں کا خاتمہ کر دیا ۔ پندرہ بیس منٹ میں لڑائی ختم ہوگئی ۔ اَب ریل کی پٹری کی مرمت کا کام شروع ہوا ۔

آخر پٹری ٹھیک ہوگئی ۔ لیکن نیکولن اور اُن کے ساتھیوں نے طے کر لیا کہ وہ یہیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں گے ۔ اس طرح بہت دن گزر گئے ۔ نیکولن کا یہ دستہ اپنی دوسری بڑی فوجوں سے الگ ہوکر روز بروز طاقتور ہو رہا تھا ۔ پاس پڑوس کے اکثر لوگ اُن کے اس دستے میں شامل ہوگئے تھے ۔

اب اُن لوگوں نے سوچا کہ کسی بڑے فوجی دستے میں جا کر مل جائیں ۔ جب وہ آگے بڑھے تو اُن کی مڈبھیڑ دشمنوں کی ایک بڑی فوج سے

ہوئی جو دریا پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی ۔
نیکولن کے دستے نے فیصلہ کیا کہ حالانکہ دشمنوں
کی فوج کے مقابلے میں ہمارے دستے کی طاقت
بہت کم ہو گئی لیکن پھر بھی ہم اُن پر حملہ کر کے
ان کو لڑائی میں اُلجھائے رہیں گے ۔ دشمن کے
افسروں نے بڑی تعداد میں توپیں اور ٹینک مقابلہ
کرنے کے لئے روانہ کئے ۔ نیکولن نے ٹینکوں کے
روکنے کے لئے ایک ترکیب سوچی اُس نے اپنے
سینے پر ہر طرف ٹینک اُڑانے والے گولے
باندھے اور سامنے سے پوری رفتار سے آنے
والے دشمنوں کے ٹینک کے نیچے گھس گیا ۔ ایک
دھماکہ ہوا اور کچھ ٹینک صاف اُڑ گئے ۔ اور
کچھ اُلٹ گئے ۔ سامنے والے ٹینکوں کے [illegible]
جانے کی وجہ سے پیچھے سے آنے والے ٹینک
بھی آپس میں ٹکرا گئے ۔ اور سینکڑوں دشمن
سپاہی جو ان ٹینکوں میں بیٹھے تھے مر گئے ۔
جو بچ گئے تھے وہ بھاگ رہے ۔ نیکولن کے
ساتھیوں نے اپنی رائفلوں اور مشین گنوں سے اُنھیں موت
کے گھاٹ اتار دیا ۔ یہ تھی وہ قربانی جو روس کے ایک
جانباز نے پچھلی بڑی لڑائی میں جرمنوں کے مقابلے میں دی ۔

بقیہ صفحہ ۴ سے آگے :۔ **پرچھائیں**

بے حد خوش ۔ اس نے آتے ہی اپنا
کھانا مانگا ۔
لیکن نیند کے مارے اس کی آنکھیں
جھپکی جا رہی تھیں ۔ آخر وہ یہ کہہ کر بستر
پر جا لیٹا کہ " اماں مجھے سویرے ہی جگا
دینا "
بستر پر لیٹتے ہی نیند نے پوری طاقت
سے آن دبایا ۔ پر موہن ابھی سویا نہیں تھا
کہ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی پرچھائیں
اس کو پکار رہی ہے ۔ " موہن ۔ موہن ۔
مگر موہن نے آنکھ کھولنے کی تکلیف
گوارا نہ کی اور صرف ایک مسکراہٹ سے
پرچھائیں کا جواب دے کر بے خبر سو
گیا ۔
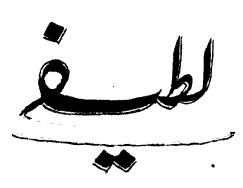
اُستاد ۔ (اپنے لڑکے سے) جاؤ بیٹا برما لیتے آؤ۔
لڑکا :۔ ابا برما تو بہت بڑا ملک ہے اسے
کیسے لاؤں ۔
عثمان غنی ۔ جگسلائی ۔ ٹاٹانگر

لڑکا :۔ (روتے ہوئے) ہائے اب میں کیا
کروں گا ۔
ایک آدمی :۔ کیوں بیٹا کیوں رو رہے ہو ؟
لڑکا :۔ میری اٹھنی گر گئی نالی میں ، اب میں
کیا کروں گا ۔
ایک آدمی ۔ اچھا یہ لو ۔۔۔ (لڑکا پھر رو
پڑتا ہے) کیوں بھائی اب کیا ہوا ہے
کیوں رُو پڑے ۔
لڑکا :۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اگر روپیہ
کہتا تو روپیہ مل جاتا ۔
سبھاش چندر ۔ دہلی

امیر :۔ (جو ہکلاتا تھا) اررر رے مَ مَ مَ م منگو
دَ دَ دَ دیکھو گ گ گ گ گ گھر میں
چَ چَ چَ چَ چَ چور گھسا ہے ۔ بَ بَ بَ
بھدوق ل ل ل لاؤ ۔
منگو :۔ (جو خود بھی ہکلاتا تھا) سَ سَ سَ سَ سَر
سرکار بَ بَ بَ بَ بَ بندوق کَ کَ
کَ کَ کہاں ہے ۔

امیر:۔ ﭺ ﭺ ﭺ ﭺ جانے دو دو۔ ﭺ ﭺ ﭺ چور ﭗ ﭗ ﭗ بھاگ گیا۔

(نصرت اللہ بیگ۔ دارود)

میاں:۔ بیگم آج تم نے باورچی خانے میں جھاڑو نہیں دی۔

بیگم:۔ باورچی خانے میں رکھا ہی کیا ہے جو جھاڑو دوں۔ سارا کھانا تو پہلے ہی ختم ہو گیا۔

میزبان:۔ (ایک پیٹو مہمان سے) بزرگوں کا کہنا ہے کہ آدھے پیٹ کھانا کھانے کے بعد پانی پینا صحت کے لئے مناسب ہے۔

پیٹو مہمان:۔ جی میں خود اس پر عمل کرتا ہوں۔

میزبان:۔ مگر آپ نے تو ۴۵ منٹ کے بعد بھی ایک قطرہ پانی نہیں پیا۔

پیٹو مہمان:۔ جی، ذرا آدھا پیٹ تو کھا لوں۔

(قیصر حسین۔ کھرگون)

اختر:۔ ابا جان! اب تو ہم مالا مال ہو جائیں گے۔

باپ:۔ وہ کیسے؟

اختر:۔ ہمارے ریاضی کے ماسٹر صاحب نے آنوں کے روپے بنانے سکھا دیئے ہیں۔

گاہک:۔ کیوں صاحب یہ لالٹین ٹھیک ہے۔

دکاندار:۔ جی ہاں! بس ذرا پیندے میں چھید ہے۔

پہلا دوست:۔ تم یہ روٹی کیوں تول رہے ہو۔

دوسرا دوست:۔ ڈاکٹر نے مجھے ہلکی غذا کھانے کو بتائی ہے۔

(مسعود احمد۔ رتلام)

احمد:۔ کیوں حمید! اگر شیر آ جائے اور بکری وہاں کھڑی ہو تو بتاؤ بکری کیا کرے گی؟

حمید:۔ ارے تم کو اتنا نہیں معلوم۔ بکری جھٹ زمین پر لیٹ جائے گی اور سانس روک لے گی۔

(حفیظ الدین۔ کھرگون)

بلبل کے آنسو

صفدر نقوی

ایک شاعر صبح کے وقت باغ میں سیر کرنے کے لئے گیا۔ اس نے دیکھا کہ چڑیاں چہچہا رہی ہیں، پھول کھلے ہیں، اور پھولوں کی نازک نازک خوبصورت پنکھڑیوں پر صاف پانی کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ:-

"بلبل پھول سے محبت کرتی ہے اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی ہے لیکن پھول چپ رہتا ہے۔ جواب نہیں دیتا۔ اس سے بلبل کو رنج ہوتا ہے۔ وہ روتی ہے۔ اور روز صبح کو اس کے آنسوؤں کی ننھی ننھی بوندیں پھولوں پر نظر آتی ہیں۔"

——— بعض پھولوں کی پنکھڑیوں پر ننھی ننھی بوندیں تو "بلبل کے آنسو" ہیں۔ لیکن ذرا سویرے سویرے ہری ہری گھاس پر ننگے پاؤں تو چلیئے ——— ایں ہمارے پیر کو پانی سا لگ رہا ہے۔ بھئی گھاس کو دیکھیے تو ——— ارے اس پر بھی ننھی ننھی خوبصورت سی بوندیں رکھی ہوئی ہیں۔

اور رات تو آپ صحن ہی میں سوئے تھے ——— ہاں ہاں صحن میں سوئے تھے۔ گرمی کے دن جو ہیں کیا کمرے میں بند ہو کر سوتے ——— ٹھیک ہے۔ لیکن رات جب سونے لیٹے تھے تو بستر سوکھا ہوا تھا یا گیلا ——— بالکل سوکھا ہوا ——— لیکن ——— صبح اٹھے تو ——— ارے یہ کیا بستر کچھ سیلا ہوا سا ہے۔ یہ گیلا

ہم بتادیں — کیوں ؟ — ایک بات بتا دیجئے
آپ کو سارا معاملہ معلوم ہو جائے گا — کل دن میں
آپ کی امی نے کپڑے دھوئے ہیں، برتن دھوئے
ہیں، مسالہ پیسے ہیں، اور ہم سب نے منھ دھوئے
ہیں، نہانے میں بہت سا پانی خرچ کیا۔ کہاں گیا
یہ پانی —؟ — کچھ تو نالیوں کے ذریعے بہتا ہوا
اور بڑی بڑی نالیوں میں سے ہوتا ہوا کہیں چلا گیا
لیکن سب نہیں۔ پانی کا کچھ حصہ غائب بھی تو ہو گیا
دو چیزیں سورج دیوتا کی گرمی کی وجہ سے پیاسی تھیں۔
ان دونوں نے اپنی پیاس بجھا لی۔ ان میں سے
ایک زمین ہے اور دوسری ہوا — کچھ پانی جو
زمین پر پڑا تو اس نے جذب کر لیا۔ باقی کو لگی
گرم، پیاسی ہوا۔ پانی کی عادت تو آپ جانتے ہی
ہیں۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ فوراً بھاپ
بن گیا — آپ کی امی نے کل سالن پکانے کے
لئے دیگچی میں پانی ڈالا تھا — ایں یہ کیا۔ سالن
توخشک ہے۔ کہاں گیا پانی — بات تو آسان
سی ہے۔ آگ کی گرمی سے پانی بھاپ بن کر اڑ گیا
اور ہوا میں مل گیا۔ اب آپ اسے دیکھ نہیں سکتے
اسی طرح کل آپ نے کپڑے دھوئے تھے نا۔ اور
پھر انھیں سوکھنے کے لئے ڈال دیا تھا۔ اور کپڑے
سوکھ گئے تھے۔ یعنی ان میں سے پانی کہیں چلا گیا تھا۔
یا دو تین دن ہوئے بارش ہوئی تھی۔ زمین گیلی تھی۔
لیکن اب تو زمین سوکھی ہوئی ہے۔ کہاں گیا اس کا
پانی — سورج کی گرمی سے زمین کا جذب کیا ہوا،
کچھ اور کپڑوں میں کا سب پانی بھاپ بن کر اڑ گیا
اور ہوا میں مل گیا۔

تو بھئی بات یہ ہے کہ زمین پر جو پانی گرا اس
میں سے کچھ بھاپ بنا اور ہوا میں مل گیا — کپڑے
سوکھے تو، سالن کی دیگچی میں سے پانی بھاگا تو یہ
سارے کا سارا پانی گرمی پا کر بھاپ بنا اور ہوا کے
کاندھوں پر اڑ کر سیر کرنے لگا — پر بھئی یہ باتیں
تو روز ہی ہوتی ہیں۔ ہر روز بہت سا پانی بھاپ
بن کر ہوا میں مل جاتا ہے۔ روز ملتا رہتا ہے،
اور اب سے نہیں ہمیشہ سے۔ جب سے دنیا بنی
جب سے اس پر سورج چمکا۔ جب سے پانی نے
بھاپ بننا شروع کیا۔ اگر یہ ساری کی ساری بھاپ
جمع ہوتی رہتی تو — تو پھر کیا ہوتا — ہمیں تو پتہ
نہیں آپ ہی بتائیے۔

بھئی پانی کی عادتوں سے آپ واقف ہی ہیں
ذرا زیادہ گرمی لگی بھاپ بن گیا۔ ذرا زیادہ سردی
لگی برف بن گیا۔ برف کو گرمی لگی تو اس نے پھر پانی

کی شکل اختیار کرلی ـــــ اور بھاپ کو ذرا سردی لگی تو وہ پھر پانی بن گئی ـــــ ایں بھاپ کو ذرا سردی لگی تو وہ پھر سے پانی بن گئی ـــــ اور یہ تو بتائیے بھئی کیا رات اور دن میں ہر وقت برابر گرمی رہتی ہے اور ہر وقت پانی بھاپ بن کر اڑتا رہتا ہے ـــ نہیں صاحب ۔ دن میں گرمی ہوتی ہے زیادہ ۔ اور رات کے وقت سورج دیوتا چھپ جاتے ہیں ۔ ان کی گرمی نہیں ہوتی ۔ اس لئے دن کے مقابلے میں رات کو ٹھنڈ رہتی ہے ۔ گرمیوں کے زمانے میں بھی ـــ اور سردیوں کے زمانے میں بھی ۔

تو بھئی معاملہ یہ ہے کہ دن کو گرمی سے یا آگ سے پانی بھاپ بن کر ہوا میں مل گیا ۔ دن بھر ملتا رہا ۔ ملتا رہا ـــــ اور یہ بھاپ ڈرتی رہی کہ کہیں سردی نہ لگے ۔ ورنہ پھر وہی پانی ـــــ اور جناب رات کو ہوئی دن کے مقابلے میں ٹھنڈ ۔ اور یہ ٹھنڈ لگی بھاپ کو ۔ کیا ہوا ـــــ ؟ ساری بھاپ پانی بننے لگی ـــــ لیکن بھئی تم جانتے ہو کہ ہوا اور بھاپ کی دوستی اسی وقت چلتی ہے جب تک وہ پانی نہ بنے ۔ بھاپ پانی بنی اور ہوا نے اسے نیچے پھینکا اور وہ دن بھر کی بنی ہوئی بھاپ رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ اتنے ہلکے ہلکے پانی بن کر زمین پر گرنے لگی کہ پتہ نہ چلے ۔ ننھی ننھی بوندیں بن کر ۔ اتنی ننھی کہ نظر نہ آئیں ۔ اور ہمارے بستر، کپڑے، زمین سب چیزیں گیلی سی ہوگئیں ۔

اور بھئی آج کل برسات کا زمانہ ہے ۔ خوب بارش ہو رہی ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دن میں تو بارش خوب ہوتی ہے پھر رات کو بادل تک نہیں ہوتا ۔ خوب تارے چمکتے ہیں اور اس رات کو امی صحن میں نہیں سونے دیتیں ۔ کہتی ہیں آج اوس بہت گرے گی ۔ اور جب صبح کو اٹھ کر دیکھا تو امی کا کہنا سچ معلوم ہوا ۔ ہر چیز پر نمی ۔ ہر چیز سیلی ہوئی ۔ آخر ایسا کیوں ہوا ـــ ؟ ـــــ بھئی بات یہ ہے کہ دن میں بادل تھا اور خوب بارش ہوئی تھی بادل تو چھٹ گیا ۔ لیکن ہوا میں نمی بہت تھی ـــــ یا یوں کہہ لو کہ ہلکی ہلکی بہت صاف سی بھاپ جو نظر بھی نہ آئے ہوا میں ملی ہوئی تھی ۔ رات کو ہوئی ٹھنڈ اور وہ نمی، پانی بن کر نیچے گرنے لگی ۔ یعنی اس رات کو اوس زیادہ پڑی ـــ زور سے، زیادہ بہت زیادہ ۔

ہاں تو بھئی دن بھر کی بنی ہوئی بھاپ پانی بن کر زمین پر اترتی ہے ۔ اترتی رہتی ہے ۔ رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ ـــــ جن چیزوں نے پا [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible])

نثار احمد تبسم بازید پوری

بے وقوف سارس اور ہوشیار کیکڑا

ایک سارس بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ اسی لئے وہ مچھلیوں کو بھی نہ پکڑ سکتا تھا۔ لیکن وہ بہت چالاک تھا۔ وہ ایک جھیل کے کنارے گیا۔ اور مچھلیوں سے بولا۔ میرے پیارے دوست اب تم سب کیا کرو گی، اس جھیل کا سارا پانی نکالنے کے لئے کچھ آدمی آ رہے ہیں۔ تم پکڑی جاؤ گی اور اس طرح تمھاری جان چلی جائے گی۔

مچھلیاں ڈر گئیں انھوں نے سارس سے پوچھا کہ ہم لوگوں کو اب کیا کرنا ہو گا؟

چالاک بوڑھا سارس بولا۔ "میں تم لوگوں کو بچانے کی کوشش کروں گا۔ مجھ پر شک و شبہ نہ کرو میں یہاں ایک دوست کی طرح آیا ہوں۔ میں تو کبھی کبھی تم میں سے ایک دو کو ہی کھاتا ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سب ایک ساتھ ماری جاؤ۔ اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا۔ پاس ہی ایک تالاب ہے کہو تو میں تم کو اس محفوظ جگہ لے جاؤں۔

چالاک بوڑھا سارس مچھلیوں کو ایک ایک کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا چاہتا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا مچھلیوں نے اس پر یقین کر لیا۔ سارس پہلے ایک کیکڑے کو اٹھا لایا۔ یہ کیکڑا اس سے کہیں زیادہ

چالاک تھا۔ جب وہ کچھ راستہ طے کر چکے تب کیکڑے
نے کہا ــــ "آپ مجھے اپنی چونچ میں پکڑے ہیں۔
آپ ضرور تھک گئے ہوں گے۔ مجھے آپ اپنی
گردن پکڑ لینے دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کیکڑے چیزوں
کو مضبوطی سے پکڑ سکتے ہیں۔

سارس نے کیکڑے پر شبہ نہیں کیا۔ وہ
راضی ہو گیا۔ کیکڑے نے اس کی گردن پکڑ لی۔
وہ آگے بڑھے۔ کیکڑے نے پوچھا ــــ "تالاب
کدھر ہے؟"

سارس بولا۔ تالاب! کیسا تالاب؟ میں
تم لوگوں کو ایک ایک کرکے اس درخت کے نزدیک
لے جاؤں گا۔ اور اس کے نیچے بیٹھ کر تم لوگوں کو
کھاؤں گا۔"

کیکڑے نے کہا ــــ "میں اسے جانتا تھا
اسی لئے تو میں نے تیری گردن پکڑ لی"۔ اس کے بعد
کیکڑے نے اپنے پنجوں کو اس کی گردن میں گھسیڑ
دیا۔ اور اسے مار ڈالا۔

بے وقوف سارس اپنے جال میں خود ہی
پھنس گیا۔

بقیہ صفحہ ۲۰ سے آگے: بلبل کے آنسو

جذب کر لیا ــــ جیسے جاذب سیاہی کو جذب کر لیتا
ہے ــــ وہ تو گیلی سی ہو گئیں ــــ جن چیزوں نے
پانی کو جذب نہ کیا ان پر یہ ننھی ننھی بوندیں ٹھاٹ
سے بیٹھ گئیں۔ اور پانی اوپر سے آتا رہا۔ بوندیں
بڑی ہوتی گئیں۔ اس کا نام لوگوں نے شبنم یا
اوس رکھ دیا ــــ اور جب شاعر صبح ہی صبح باغ
کی سیر کو گیا تو گھاس پر، پھولوں پر پانی پر صاف
صاف ننھی ننھی بوندیں نظر آئیں ــــ اور اس نے
کہہ دیا کہ:-

"بلبل پھول سے محبت کرتی ہے۔ اس کے
پاس بیٹھ کر باتیں کرتی ہے۔ لیکن پھول چپ رہتا
ہے۔ جواب نہیں دیتا۔ اس سے بلبل کو رنج
ہوتا ہے۔ وہ روتی ہے۔ اور روز صبح کو اس
کے آنسوؤں کی ننھی ننھی بوندیں پھولوں پر دکھائی
دیتی ہیں۔"

اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ یہ "اوس" ہے
یا "بلبل کے آنسو"؟

نجمہ سلطان

میرابائی
گیتوں کی رانی

ڈگمگ ڈگمگ ڈولے نیا پار لگاؤ تو جانوں کھیویا۔

جب گیت کے بول ہمارے کانوں میں پڑتے ہیں تو میرا بائی ہماری آنکھوں میں گھوم جاتی ہے آخر کون ہے؟ جو، ان رسیلے گیتوں میں رچی ہوئی ہے۔

میرابائی راجپوتانہ کی ایک ریاست کے مالک راجہ رتن سنگھ کے یہاں ۱۵۵۷ء میں پیدا ہوئی۔ اس کے خاندان کا نام رانٹھور تھا اور یہ خاندان شروع سے کرشن جی کی پوجا کیا کرتا تھا۔ اس لئے جب میرا نے آنکھ کھولی تو گھر میں کرشن جی کی پوجا ہوتے دیکھی۔ اور وہ بچپن سے ہی کرشن جی کی پوجا کرنے لگی۔ ان کے گیت گانے لگی۔

کہتے ہیں کہ جب وہ چار سال کی تھی۔ اس کے گھر کے پاس سے ایک برات نکلی۔ دولہا خوب چمکیلے بھڑکیلے کپڑے پہنے جا رہا تھا۔ میرا نے دولہا کو دیکھ کر اپنی ماں سے کہا۔ "ماں میرا دولہا کونسا ہے؟" اس کی ماں نے ہنس کر کہا۔ "بیٹی تیرے دولہا تو کرشن بھگوان ہیں"۔

اس مذاق کا اثر ننھی بچی کے دل پر بہت ہوا اور اس نے کرشن جی کو اپنا دولہا سمجھ کر ان کی

مورتی کی پوجا شروع کر دی ۔ وہ مورتی کو ہمیشہ
اپنے ساتھ رکھتی ۔ اور شوہر کی طرح اس کی
عزت کرتی اور خدمت کرتی ۔ گھنٹوں مورتی کے
سامنے گاتی ناچتی رہتی ۔

اسی طرح ناچتے گاتے میرا بڑی ہو گئی ۔ عمر
کے ساتھ اس کی محبت اور خدمت بھی بڑھتی
گئی ۔ لیکن بڑے ہونے پر اس کی شادی چتوڑ
کے رانا سے کر دی گئی ۔ شادی کے بعد مہارانی
میرا نے شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری میں
کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ۔ وہ نیک عورتوں کی طرح
اس کی خدمت کرتی ۔ لیکن اب بھی کرشن جی کی پوجا
کرتی رہتی ۔ جب بھی اسے فرصت ملتی فوراً مندر
میں جا کر پوجا میں مصروف ہو جاتی ۔ جب مندر
میں جا کر پوجا کرتی اور بھجن گاتی تو اسے ایسا محسوس
ہوتا جیسے کرشن جی اس کے سامنے کھڑے ہیں ۔

مگر سسرال میں میرا کو کرشن بھگتی راس نہ
آئی اس کی ساس کو جو درگا دیوی کی پوجا کرتی
تھی ۔ کرشن بھگتی بہت بری معلوم ہوئی ۔ اس نے
سختی سے میرا کو منع کیا اور کہا کہ وہ درگا کی پوجا
کرے ۔ اس کے علاوہ اس کی نند اودے بائی
کو اس سے سخت جلن پیدا ہوئی ۔ اس نے میرا
کو نیچا دکھانے کا ارادہ کیا ۔ اور اس نے رانا سے
کہا کہ میرا اچھی عورت نہیں ہے ۔ وہ مندر میں
جا کر غیر مردوں سے باتیں کرتی ہے ۔ اس پر رانا
کو بہت غصہ آیا ۔ اس نے میرا کو سخت سزا دینے
کا حکم دیا ۔ لیکن اس کے ایک سمجھدار عزیز نے کہا کہ
میرا دیکھنے میں تو ایسی عورت نہیں معلوم ہوتی ہے
پھر بغیر ثبوت کے یقین کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے ۔
اس لئے بے سوچے سمجھے سزا دینا ٹھیک نہیں ہے
اس پر رانا چپ ہو گیا ۔ مگر رات کے اندھیرے
میں جب میرا مندر میں گئی تو وہ اس کے پیچھے
ہو لیا ۔ وہ حسب معمول بھجن گانے میں مصروف ہو گئی
اور کرشن جی سے باتیں کرتی رہی ۔ اس پر رانا کو
بڑا غصہ آیا ۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر جا گھسا لیکن
سوائے مورتی کے اور کچھ نہ پایا ۔ اس پر وہ کھسیا کر
باہر آ گیا ۔ مگر میرا سے نفرت کرنے لگا ۔ اور اس
کو طرح طرح سے دکھ دینے لگا ۔ میرا ساری تکلیفوں
کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کرتی رہی ۔ اور
اپنے کنہیا کے گن گاتی رہی ۔

رانا نے کئی دفعہ اس کو مارنے کا ارادہ کیا
مگر نیک میرا پر اس کے حملوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا
اس کے بھجنوں کی تعداد بڑھنے لگی ۔ رانا کبھی [illegible]

کے بستر کے نیچے پانی سے رکھوایا تا کبھی کبھی رکھوایا مگر میرا نے اُف تک نہ کی۔ اس کی نیکی اور سچائی میں فرق نہ آیا۔ اسی طرح اپنے پاکیزہ راستے پر چلتی رہی۔ اس کے گیت سارے دیس میں گونج اُٹھے۔ اور ایک دفعہ اکبر بادشاہ بھیس بدل کر اس کے بھجن سننے کے لئے آیا۔ اس پر تو رانا اور بھی جل اُٹھا اس نے میرا کو ندی میں ڈوب جانے کا حکم دیا۔ شوہر کے حکم کو خدا کا حکم سمجھ کر میرا ڈوبنے کے لئے چل دی۔ لیکن کہتے ہیں کہ کرشن جی نے اس سے کہا کہ وہ بندرا بن آجائے۔ اس پر میرا نے بندرا بن کا راستہ اختیار کیا۔ راستے میں ہزاروں عورتیں بچے مرد اس نیک عورت کے درشن کرتے۔ اور آخر میرا بندرا بن پہنچ گئی۔ یہاں آکر وہ گووند مندر میں رہنے لگی۔

اپنا پیٹ پالنے کے لئے وہ دن بھر بھیک مانگا کرتی اور پھر اپنے کرشن کی پوجا کرتی۔

آخر سچائی اور نیکی کی جیت ہوئی۔ رانا کو یقین ہو گیا کہ میرا اچھی عورت ہے۔ وہ شرمندہ ہو کر میرا سے معافی مانگنے بندرا بن گیا۔ اور میرا سے واپس چلنے کے لئے کہا۔ لیکن میرا نے جانے سے انکار کر دیا۔

اور پھر میرا سکون کے ساتھ بھجن لکھتی گاتی رہی۔ آج بھی جب ہم میرا کے بھجن سنتے ہیں۔ تو ہمارے دل پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ آپ نے بھی سنے ہوں گے۔

"میرا کے پربھو گردھر ناگر" وغیرہ

میرا اور اس کی محبت آج بھی اس کے گیتوں میں زندہ ہے۔ اور جب تک دنیا کرشن جی کا نام لیتی رہے گی۔ اس کے مدھر بول دیس میں گونجتے رہیں گے۔

بقیہ صفحہ ۲۹ سے آگے۔۔ روشنائی اور جاذب

جب تک نواب صاحب کے متعلقین جمع ہوں، ملازم چونک کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ حضور! اب آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ ایک بڑے تجربے کی ترکیب میری سمجھ میں آگئی ہے۔ اور جھٹ نواب صاحب کے کمرے میں جا کر الماری سے ایک تختہ جاذب نکال لایا۔ نواب صاحب جاذب دیکھ کر خوش ہو گئے کہ ان کا بھی یہ تجربہ تھا کہ جاذب روشنائی چوس لیتا ہے وہ فوراً آنا فاناً ایک تختہ جاذب کا لے گئے۔

اختر مشتاق

روشنائی اور جاذب

نواب صاحب بیمار تھے۔ ان کے ڈاکٹر نے ایک بوتل میں انھیں جو دوا بھیجی تھی اتفاق سے وہ سیاہ رنگ کی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے ملازم سے بڑی چوک ہوگئی۔ رات کا وقت تھا۔ بجائے دوا کے، روشنائی کی بوتل سے ایک خوراک انڈیل کر نواب صاحب کو دیدی۔ نواب صاحب زبردستی پینے کو تو پی گئے لیکن دوا اور روشنائی میں فرق نہ کرسکے بے چارے آرام کرسی پر لیٹے سوچ ہی رہے تھے کہ ممکن ہے کئی دن کی رکھی ہوئی دوا ہوجانے کی وجہ سے ذائقہ تبدیل ہوگیا ہو کہ اتنے میں ان کا ملازم ہانپتا، کانپتا آیا کہ "حضور بڑا غضب ہوگیا" نواب صاحب گھبراکر اُٹھ بیٹھے۔ "ارے کیا غضب ہوا، کیا بات ہے" ملازم نے اس مرتبہ پہلے سے زیادہ روتے پیٹتے ہوئے کہا۔ "حضور بڑا غضب ہوگیا ہے" نواب صاحب اب تو اپنی چھڑی کا سہارا لے کر کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "آخر کچھ بتائے گا بھی۔ اپنے منھ سے تو کہہ کیا ہوا ہے" "حضور دوا کے دھوکے میں آپ کو روشنائی پلادی ہے۔ اب کیا ہوگا" ملازم نے رو رو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب نے جو روشنائی کا نام سنا تو خود بھی "اب کیا ہوگا" کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

ہاجرہ بیگم

پرچھائیں

موہن کا کوئی دوست نہ تھا۔ گھر میں دونوں بھائی موہن سے بہت بڑے تھے۔
پھر وہ ہر وقت اس کو چڑھاتے اور ستاتے بھی رہتے تھے۔ چھوٹی بہن ابھی بچی تھی وہ
اماں کی گود سے ہی چپٹی رہتی تھی۔ اور اسکول میں وہ نہ کسی کے ساتھ کھیلتا تھا،
نہ بات کرتا تھا۔

موہن کا دوست اور ساتھی اس کی پرچھائیں تھی۔

سویرے جب موہن اسکول جاتا تو پرچھائیں اس کے پیچھے پیچھے اسکول جاتی۔
موہن ایک ہاتھ سے بستہ کو پکڑے دوسرے سے اپنی ڈھیلی نیکر کو تھامے دوڑتا چلا جاتا
اور پرچھائیں سے کہتا جاتا۔

دیکھا نا! پھر دیر کر دی تم نے۔ روز تمھاری وجہ سے مجھے ڈانٹ کھانی پڑتی ہے
کبھی وقت پر تم تیار نہیں ہوتے۔ پاجی۔ آج پھر مجھے دیر ہو گئی۔
لیکن پرچھائیں اس کے پیچھے پیچھے دوڑتی جاتی اور کچھ نہ بولتی۔ موہن اسکول پہنچا

تو حاضری ختم ہو چکی ہوتی اور استاد پھر
اپنی عینک میں سے گھور کر کہتے۔
"موہن آج پھر دیر سے آئے؟ میں
تم پر کتنا جرمانہ کروں؟ کتنی بار تمھاری
رپورٹ کروں؟"
اور موہن چپ چاپ سب سے
پچھلی لائن کے ڈسک پر جا بیٹھتا۔ اور اپنی
کتاب نکال کر سامنے رکھ لیتا۔ اور اسکول
کے گھنٹے بجتے جاتے اور ماسٹر آتے جاتے
اور ہر ایک اپنی اپنی بولی بول کر چلا جاتا
اور موہن چپ بیٹھا رہتا۔
"موہن جواب دو"
"موہن سوال حل کیا یا نہیں؟"
"موہن سبق یاد ہے یا نہیں؟"
"موہن آج نہیں، پھر سزا ملتی ہے"
"موہن۔ بدھو۔ بیوقوف ...."
اور موہن اپنی قمیص کی میلی آستین
سے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کو پونچھ لیتا اور
دامن سے ناک صاف کر لیتا اور بت
کی طرح۔ اُلّو کی طرح بیٹھا رہتا۔ یا بنچ پر
کھڑا رہتا۔ یا کونے میں سسکیاں بھرتا رہتا

مگر جب کھیل کا گھنٹہ بجتا تو ایک
لمبی سانس بھر کر موہن بھی دوڑ کر کلاس
سے باہر نکلتا گراؤنڈ میں جاتے ہی باقی
لڑکوں کی ٹولیاں بن جاتیں۔ کبڈی اور
بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی۔ مگر موہن جلدی
جلدی بھاگتا گراؤنڈ کے اس کونے میں پہنچتا
جہاں دیوار تھی وہاں اس کی پرچھائیں اسے
مل جاتی۔ وہ دیوار کے سامنے بیٹھ کر جیب
سے گولیاں نکال کر کھیلنے لگتا لیکن یہ صرف
پرچھائیں سے بات کہنے کا بہانا ہوتا۔
وہ کہتا۔
"دیکھا۔ آج پھر تم نے مجھے سزا دلوائی
نا! روز میں کہتا ہوں مجھے سبق یاد کر لینے
دو مگر تم کو تو کھیل کی پڑی ہے نا۔ اب
تم خوش ہوئے کہ میں پوری کلاس کے
سامنے شرمندہ ہوا۔ ہاں تم تو خوش ہوگے
ہی۔ بے حیا۔ بے شرم۔ نہ لکھنے کے نہ
پڑھنے کے۔ نرے بدھو۔ بیوقوف ...
اور جو جو ماسٹر اُسے کہتے وہ سب
پرچھائیں کو سناتا جاتا اور اور ساتھ ہی
ایک ایک گولی کو صفائی سے چلتا جاتا

اور جب اسکول ختم ہوتا تو اکثر موہن کو کلاس میں رکنا پڑتا کیونکہ روز ہی اس کو سزا ملتی تھی اور پھر جب وہ ۱۲ بجے کے قریب اسکول سے گھر کو بھاگتا تو اس کی پرچھائیں۔ چھوٹی سی سکڑی ہوتی جیسے دھوپ کی تیزی سے پگھل گئی ہو۔ اس کے آگے آگے بھاگتی اور اس وقت موہن پورا غصہ اس پر اتارتا وہ پیر پٹک پٹک کر پرچھائیں کے سر پر مارتا اور کہتا۔

"کم بخت تو میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابھاگا نہ معلوم کس گھڑی میں پیدا ہوا تھا تیری وجہ سے میں ذلیل ہوتا ہوں۔ مگر تجھے اس کی کیا پرواہ ہے۔ تو تو چاہتا ہے کہ میں مار کھاؤں۔ ذلت اٹھاؤں..... اور نہ جانے غصہ میں کیا کیا بکتا وہ گھر پہنچا۔ گھر پر اُسکے بھائی اس کو آڑے ہاتھوں لیتے۔

"کیوں، بھیا۔ آج پھر پِٹ لی؟ کتنے ڈنڈے پڑے؟"

"ارے گدھے اب تو کتنی کلاسیں آگے گیا ہے؟"

اور اس کی ماں کہتی "ارے موہن کم بخت تو کبھی تو وقت سے آجایا کر۔"

اور اس کے پتا کہتے "یہ کیا ہے موہن۔ دو روپیہ پھر جرمانہ۔ اور پھر حساب میں فیل۔ انگریزی میں فیل؟ مجھے کیا فائدہ ہوا تمھیں اسکول بھیج کر؟ کیا میرا روپیہ مفت کا ہے؟"

اور موہن سر جھکائے آنکھوں سے آنسو بھرے اپنی تھالی میں سے آلو چُن چُن کر کھاتا جاتا۔

شام کو جب بھائی کھیلنے چلے جاتے اماں باورچی خانے میں سوتی اور پتا جی دوستوں سے گپ شپ کرتے ہوتے تو موہن باغ میں نکل جاتا۔ اس وقت وہ اور پرچھائیں خوب کھیلتے۔

موہن کرکٹ کا بلّا ہاتھ میں لے کر رَن بناتا اور پرچھائیں اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی۔ موہن ہنستا اور کہتا۔

"شاباش! کوشش تو خوب کی تم نے مگر بھلا مجھ سے کہاں جیت سکتے ہو؟"

یا موہن بھائی کی سائیکل چرا کے

لے آتا اور اس پر چڑھتا اور پرچھائیں اس کے ساتھ ساتھ چڑھتی اور گرتی اور موہن ہنستا اور کہتا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ سیکھ لو گے تم بھی سائیکل"

باہر موہن کسی باغ کے کونے میں جا بیٹھتا اور پرچھائیں کو کہانیاں سناتا یا بے سر پیر کے لطیفے اور قصے بتاتا۔ اور موہن اور پرچھائیں ان فضول قصوں پر خوب ہنستے۔

اور پھر رات کو جب موہن سونے کے لئے اپنے بستر پر کودتا تو پرچھائیں اس سے پہلے کود کر بستر میں گھس جاتی اور موہن پرچھائیں سے لپٹ جاتا اور کہتا۔

"جب میں بڑا ہوں گا تو میں انجن چلایا کروں گا۔ اور ہم تم دونوں انجن میں بیٹھے تمام دنیا میں گھومیں گے۔ اور جب میں بڑا ہوں گا تو میں کبھی اسکول نہیں جاؤں کیونکہ مجھے تو سب کچھ آتا ہی ہوگا، جب میں بڑا ہوں گا تو مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ کیونکہ میں سب سے طاقتور ہوں گا اور جب میں بڑا ہوں گا۔۔۔۔

اور موہن سوچاتا اور دوسرے دن جب وہ پھر دیر سے اٹھتا۔ پھر اس کی قمیض کا بٹن ٹوٹا ہوتا۔ اس کی جوتی کا پیر کھو گیا ہوتا۔ اس کا سبق یاد نہ ہوتا۔ اس کے ناشتہ میں دیر ہوتی اور وہ دیر سے اسکول جاتا اور اس کی پرچھائیں اس کے پیچھے پیچھے دوڑتی جاتی۔

مگر ایک دن جب موہن اسکول بھاگا بھاگا جا رہا تھا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر اس کی پرچھائیں نہیں تھی۔

موہن تھک کر بیچ میں کھڑا ہو گیا اور قریب قریب ایک سائیکل والے سے ٹکرا ہی گیا تھا۔ کچھ دیر بھونچکا رہنے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اوپر آسمان پر نظر کی کہ شاید بادل ہوں۔ مگر نہیں۔ اس کی پرچھائیں کا کہیں پتہ ہی نہیں تھا۔

موہن اسکول پہنچا تو دیر سے ہی تھا۔ آج بھی دن بھر طرح طرح جھڑکیاں اور ڈانٹ پڑتی رہی۔ مگر وہ کچھ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اور تفریح کے وقت وہ اس

یقین سے باہر دوڑا کہ پرچھائیں ضرور باہر ہوگی۔ لیکن پرچھائیں باہر بھی نہ تھی۔ اب تو موہن سناٹے میں آ کر کلاس میں بیٹھ گیا اور اسکول ختم ہونے پر جب وہ گھر چلا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت بڑے بیابان یا لق ودق صحرا میں تن تنہا چلا جا رہا ہے کیونکہ آج کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

گھر پہنچتے ہی دیر سے گھر آنے پر ڈانٹ پڑی کیونکہ آج موہن بھاگتا ہوا گھر نہیں گیا تھا۔ مگر موہن خاموش اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا بیٹھا رہا۔ اور تھالی میں سے آلو بین بین کر کھاتا رہا۔ اور پھر جب شام کو موہن کرکٹ کا بلاّ اور گولیاں لے کر باہر نکلا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ آج وہ اتنی بڑی دنیا میں اکیلا تھا۔ اس کا کوئی دوست کوئی ساتھی نہ تھا۔

رات کو جب موہن سونے گیا تو اس کو کچھ یونہی سی امید تھی کہ شاید پرچھائیں اس سے پہلے کود کر بستر میں گھس جائے۔ لیکن جب پرچھائیں اس کو نظر نہ آئی تو وہ بستر پر لیٹ گیا اور اس کی آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسو اس کی پلکوں پر ہی سوکھ گئے اور وہ سو گیا۔

نہ معلوم رات کتنی بیت چکی تھی کہ ایک دم سے موہن کی آنکھ کھلی اور وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا سامنے دیوار پر اس کی پرچھائیں تھی۔ بہت بڑی۔ بہت ہی بڑی اور پرچھائیں کہہ رہی تھی۔

"اٹھو موہن۔ اور میری بات سنو۔ میں تم سے تنگ آ گئی ہوں میں نے بہت چاہا کہ تم کچھ ہی سدھر جاؤ۔ کچھ تو انسان بنو اور اسی لئے میں اتنے دن چپ رہی۔ اور بولی نہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ تم اپنی عادتیں رتی بھر بھی بدلنے کو تیار نہیں ہو۔

پہلی عادت تمھاری جس سے مجھے نفرت ہے وہ تمھارا اکیلا پن ہے تم اپنے ساتھ کے بچوں سے کیوں نہیں کھیلتے ہو؟ کیوں تمھارے دل میں خیال ہے کہ تم ان کے ساتھ کھیلو گے تو ہار جاؤ گے؟ نہیں معلوم کیسے ہو۔ تم تو اپنی پرچھائیں

ہو جیت پا کر خوش ہو جاتے ہو،
کبھی یہ بھی سوچا کہ تمہاری پرچھائیں بھی
چاہتی ہوگی کہ دوسری پرچھائیوں کے ساتھ
کھیلے۔ دوڑے۔ بھاگے اور ان سے بھی
بازی جیتے؟

میں تم سے ناراض ہوں۔ سستی
کرتے ہو۔ سبق پڑھتے نہیں۔ دماغ کو کام
میں نہیں لاتے اور اس سب کا الزام
مجھ پر ہے۔ تم فیل ہو جاتے ہو اس کا
مجھے افسوس نہیں لیکن اگر تم کوشش کرتے
اور ہر بار پہلے سے کچھ بہتر نمبر پا کر پھر
فیل ہو جاتے تو میں تمھیں دلا سا دیتی رہتی۔
تمہاری ہمت بندھاتی۔ لیکن۔ تم نے تو
مان لیا ہے کہ تمھیں فیل ہونا ہے۔ بدھو
رہنا ہے۔

اور آخری بات جس پر مجھے غصہ
آتا ہے وہ یہ کہ تم ہر ایک کی ڈانٹ مار
کھا لیتے ہو اور چپ بیٹھے رہتے ہو، تم
اگر بے قصور ہوتے ہو تو اس کو ثابت کرنے
کی تکلیف بھی نہیں اٹھاتے۔ تمہارے بھائی
تمھیں بے وجہ ستاتے ہیں تم ان کو جواب
نہیں دیتے۔ اسکول کے لڑکے تمہاری
ٹانگ کھینچتے ہیں تمہاری کرسی پر سیاہی
ڈال دیتے ہیں۔ تمہاری جھوٹی چغلی کھاتے
ہیں۔ تم زبان نہیں ہلاتے۔ یہ کون سی بہادری
ہے....؟

ابھی پرچھائیں نہ جانے اور کیا کیا
کہتی لیکن موہن کو غصہ آ رہا تھا کہ اس کا
ایک ہی دوست وہ بھی اس کو لگے ڈانٹنے
اور نصیحت کرنے' اس نے بگڑ کر کہا۔

"اچھا معاف کیجئے۔ مجھے آپ کی
نصیحتیں نہیں چاہیئے۔ آپ بڑے بہادر
ہیں اور سب کو جواب دے لیتے ہیں اور
سب سے جیت جاتے ہیں۔ بس مجھے آپ
کی دوستی کی ضرورت نہیں۔ آپ رہنے
دیجئے اپنا لکچر"

اور یہ کہہ کر موہن اپنا منہ لحاف
میں چھپا کر لیٹ گیا۔

وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ
کیسے پرچھائیں سے اس کی بد تمیزی
بدلہ لے۔ آخر اس نے طے کر لیا کہ
پرچھائیں کی ذرا بھی پروا نہیں کرے

اور اپنا کام اچھی طرح کر کے اس کو جھوٹا ثابت کر دے گا۔

دوسرے دن موہن کی آنکھ جیسے ہی کھلی وہ بستر سے کود کر اٹھا۔ اور وہیں سے چلّایا "اماں جی! مجھے فوراً ناشتہ دو مجھے اسکول جانا ہے"!

پھر بھی تیار ہونے میں موہن کو دیر لگی۔ جوتے کا فیتہ باندھتے ٹوٹ گیا۔ قمیص اس کے بھائی نے رات کو لمپ پر پیٹ دی تھی۔ بستہ کسی نے میز کے پیچھے ڈال دیا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وقت سے پہلے تیار ہو کر موہن اسکول بھاگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو نہیں لیکن اس کو خیال تھا کہ پرچھائیں اتنی جلدی اُٹھ نہیں پائی ہوگی۔

دوسرے بچوں کے آنے سے بہت پہلے وہ اسکول پہنچ گیا۔ اور چونکہ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اس لئے وہ چپ چاپ اپنے ڈسک پر بیٹھ کر کتاب کھول سبق دوہرانے لگا۔

کلاس ماسٹر آیا اور موہن کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

"کہا! آج وقت سے پہلے پہنچ گئے ہو! شاباش"!

اس دن موہن کو سبق اور دن سے اچھا یاد تھا اس کو ڈانٹ بھی کم ملی اور جب تفریح ہوئی تو موہن ہمّت کرکے اپنی جماعت کے ایک نئے لڑکے کے ساتھ باہر نکلا اور کہنے لگا "آؤ گولی کھیلتے ہو، میرے پاس بہت سی گولیاں ہیں۔ میں تمھیں دے سکتا ہوں"!

گولی کھیلتے میں پرچھائیں کا خیال موہن کو نہیں آیا لیکن جب چھٹی ہوئی اور موہن بستہ کمر پر ڈال کر گھر کو بھاگا تو اس کی پرچھائیں چھوٹی سی گول مٹول خرگوش کی طرح آگے آگے بھاگ رہی تھی۔ مگر اب موہن کا غصہ کم ہو گیا تھا وہ پرچھائیں کو دیکھ کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

"آؤ دوست ریس کرتے ہو؟"

"چلو" کسی نے کہا۔ اور موہن نے دیکھا کہ صبح کا اس کا نیا دوست اس کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔

گھر پہنچتے ہی بھائیوں نے آواز لگائی۔
"کہیئے مسٹر کیا خبر ہے؟"
"خبر یہ ہے"، موہن نے جی کڑا کرکے
کہا "کہ اگر آج سے کسی نے میری قمیص لیمپ
پر باندھ دی تو میں اس کا پائجامہ لیمپ سے
باندھ دوں گا اور مہربانی سے آپ لوگ اپنی
اپنی میز پر کام کیا کیجئے۔ میرا بستہ میری میز پر
سے مت پھینکا کیجئے مجھے صبح کو تیار ہونے
دیر ہوتی ہے۔

دونوں بھائی حیرت سے موہن کو دیکھ
رہے تھے۔ ان کے منہ کھلے کے کھلے تھے اور
کوئی جواب بن نہیں آ رہا تھا۔

اس دن کھانے کے وقت سنّاٹا تھا
موہن کے بھائی چپ چاپ منہ میں لقمے
ڈال رہے تھے اور کن انکھیوں سے موہن
کو دیکھتے جا رہے تھے۔ اور ماتا جی بھی چونک
پڑی جب موہن نے کہا۔

"مجھے آم نہیں چاہیئے ہیں۔ میں اچار
سے روٹی کھاؤں گا۔

کھانا کھا کر بھائی اپنی پڑھائی میں
لگ گئے اور موہن بھی بجائے کونے میں
گھس کر گڑیاں کھیلنے کے ماتا جی کے پاس
پہنچ گیا اور بڑے دُلار سے کہنے لگا "ماتا جی
ذرا میری کویتا تو سن لیجئے۔ مجھے اسکول کے
لئے یاد کرنی ہے۔"

کسی نہ کسی طرح شام ہوئی اور اب
موہن کا جی پھر بیٹھنے لگا کہ دیکھئے یہ پہاڑ
سی شام اکیلے کیسے کٹے گی لیکن ابھی موہن
ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ دروازے سے پر
کسی نے پکارا "موہن، موہن" اور موہن
کا نیا دوست دو چار لڑکوں کو لئے سامنے
کھڑا تھا۔

"موہن چلتے ہو ہم لوگ سائیکل سے
ندی پر جا رہے ہیں۔

موہن نے پڑھائی میں محو بھائی کی
طرف دیکھا اور بڑی دیدہ دلیری سے آواز
دی "بھیا تم تو ابھی پڑھ رہے ہو میں
تمہاری سائیکل لے کر جا رہا ہوں اور
اس سے پہلے کہ بھائی کے منہ سے ایک
بھی لفظ نکلے موہن سائیکل لے کر غائب
تھا۔

رات کو موہن لوٹا۔ تھکا ہارا۔ لیکن

بقیہ صفحہ ۱۵ پر

عبدالواحد بیدل

گنگا ندی کی آپ بیتی

ہمالیہ کا اونچا پربت میرا دیس ہے اور گنگوتری میرا گھر۔ بچپن میں وہاں پلی اور بڑھی۔ میرا گھرانہ اونچا۔ میرے گھر والے اونچے، پھر کیوں نہ میرا مان ہو۔ میں نے ہمالیہ پر وہ چیزیں دیکھیں جو بس دیوتاؤں کے بس کی ہیں۔ پھر کیوں نہ مجھے سب پیار کریں۔ مجھ سے پوچھتے ہو، میں یہاں تک کیسے آئی، وہاں کیسے رہتی تھی۔ کیا بتاؤں یہ لمبی کہانی ہے۔

میری پیدائش ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں پر ہوئی۔ وہاں چھوٹی چھوٹی جھیلوں کے بیچ میں آنکھ کھولی، اور ان ہی کی گود میں پلتی رہی۔ پھر دوڑتی کھیلتی، کچھ سہیلیوں کے ساتھ آگے جو بڑھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ چاروں طرف اجلی اجلی برف پھیلی ہوئی ہے۔ سورج کی کرنیں پڑتی تھیں تو گلابی رنگ عبیر کی طرح چمکتا تھا اور میں وہ چلو پانی کی ایک چھوٹی سی دھارا تھی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ آخر میں اتنی بڑی کیوں کر ہوگئی جو بڑی سی ناویں میری گود میں پھرتی ہیں۔

جب گنگوتری سے نکلی تو میرے ساتھ میری دوسری سہیلیاں بھی تھیں۔ ہم سب آپس میں مل کر ایک ہوگئیں۔ برف کی چوٹیوں سے اتر کر جب میں پتھر کی چٹانوں پر پہنچی تو میں سیانی اور بڑی ہو چکی تھی۔

مجھ میں زور بھی بہت آگیا تھا ۔ اور میں اب خوشی
میں پھولی نہ سماتی تھی ۔ جلدی جلدی کودتی پھاندتی
اچھلتی چلتی آگے بڑھ رہی تھی ۔ سامنے پتھر آئے تو
میں نے پورا زور لگایا ۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں
کے ٹکڑے بہالے گئی ۔ اور اپنا راستہ بناتے
ہوئے نیچے اتر آئی ۔ یہ تھی میری پہاڑی چال'
میں گاتی شور مچاتی آگے بڑھتی رہی ۔

پہاڑوں سے جب اتری تو سامنے لمبا چوڑا
میدان تھا ۔ میں اب ننھی منھی بچی نہ تھی ۔ میں
بڑی ہو چکی تھی ۔ اس لئے بچپن کا وہ الھڑپن
باقی نہ تھا ۔ میدان میں پہنچتے ہی میں دھیرے
دھیرے چلنے لگی ۔ کیونکہ یہاں آدمیوں کی آنکھ
بھی تو پڑتی تھی ۔ جب میں پہاڑوں سے اتری
تو گرمیوں میں میرے لئے اوپر سے برف کا
پانی آتا رہا ۔

اس طرح میں گرمیوں میں بھی نہیں سوکھتی
برسات میں ہندوستان کے میدانوں میں پانی
برستا ہے تو میں پھول اٹھتی ہوں ، اور آپ
لوگ اسے باڑھ کہتے ہیں ۔ میں یو' پی' ، بہار
اور بنگال کے میدانوں میں سیر کرتی رہی ۔ دور
سے سمندر دکھائی دیا تو جی للچانے لگا ۔ کہا آؤ
لگے ہاتھوں اس کے بھی درشن کرلوں ۔ اب
میدان کی سیر ختم ہوچکی تھی ۔ اور میں سمندر میں
ڈبکیاں لینے لگی ۔

سمندر میں نہاکر اور میل چھڑاکر ایک جگہ
جمع کر دیا ۔ راہ کی گرد اور کیچڑ ایک جگہ جمع ہوگئی ۔
تو وہاں ڈیلٹا بن گیا ۔ اور اس پر پیڑ پودے
اُگ آئے ۔ یہی سندربن ڈیلٹا ہے ۔

مجھ سے کتنا کام نکلتا ہے ۔ میں نے جہاں
اپنی گندی کیچڑ بھی چھوڑی وہاں کی زمین اپجاؤ
ہوگئی ۔

اب آپ ہی بتائیے کہ میری عزت کیوں
نہ ہو ۔

بابر کے مرنے کے بعد
ہمایوں نے کیا کیا؟
جی۔ اُسے دفن کر دیا

محمود پرویز

انوکھا خزانہ

بہت زمانہ گذرا کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ وہ نہایت محنت و جانفشانی سے کھیت میں کام کرتا اور اس سے جو کچھ پیدا ہوتا' اس سے اپنے بال بچّوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ مگر تینوں اس کی طرح محنتی نہ تھے۔ بلکہ کاہل اور آرام طلب تھے۔ اور اپنا سارا وقت یونہی برباد کرتے۔ کسان انہیں لاکھ سمجھاتا' اونچ نیچ بتاتا۔ مگر اُن کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔

اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ اَب کسان کافی بوڑھا ہوگیا تھا۔ وہ دن رات پلنگ ہی پر پڑا رہتا۔ اور اس کے نکمّے لڑکے گھر پر ہی بیٹھے تمام دن گپّیں مارتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ باپ اتنا بوڑھا ہوگیا ہے کہ اس میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ چل پھر سکے! مگر وہ تو جنم کے کاہل تھے۔ کچھ بھی نہ کرتے۔ ماں بے چاری بھاتی۔

مگر بے سود! گھر میں جو کچھ رکھا ہوا تھا بس وہی کام آ رہا تھا۔ ایک دن بوڑھے کسان نے سوچا "آخر اس طرح کیسے کام چلے گا۔ میں تو اب کچھ دنوں کا مہمان ہوں۔ میرے بعد اس گھر کا کیا حال ہوگا۔ لڑکے ایسے نکمّے ٹھیرے کہ کچھ نہیں کرتے۔ یہ اناج آخر کب تک چلے گا۔ کچھ ایسی ترکیب نکالی جائے کہ ان کا نکمّا پن دور ہو جائے اور

یہ کچھ کرنے لگیں۔

سوچتے سوچتے آخر ایک بڑی اچھی سی ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔

ایک روز اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا۔ اور اُن سے کہا

"پیارے بیٹو! میں اب دو گھڑی کا مہمان ہوں۔ موت کا فرشتہ مجھے یہاں سے لے جانے والا ہے۔ اس لئے مرنے سے قبل میں تمہیں ایک راز بتانا چاہتا ہوں۔ یہ راز میرے باپ نے مجھے مرتے وقت بتایا تھا۔ جسے میں نے اب تک اپنے سینہ میں چھپائے رکھا۔ اب جبکہ اس دنیا سے میں سفر کر رہا ہوں، اس راز کو تمہیں بتا دینا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔ تاکہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور اپنے مستقبل کو روشن اور حسین بناؤ۔ لیکن تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم اپنی کاہلی اور سستی چھوڑ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کروگے ـــ وعدہ کرو"

پہلے تو لڑکے خاموش رہے۔ آخر باپ نے اُن سے پھر کہا۔

"کیوں؟ بولتے کیوں نہیں۔ اگر تم سچے دل سے میرے کہنے پر عمل کرنے کا وعدہ کروگے تو میں تمہیں وہ راز بتا دوں گا۔ جس سے تمہاری غربت دور ہو جائے گی"

بولو! "وعدہ کرتے ہو"

باپ کی باتوں نے ان پر اچھا اثر کیا۔ وہ بولے۔

"ہم سچے دل سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی بات پر عمل کریں گے"

یہ سُن کر بوڑھے کسان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی تازگی پھیل گئی۔ اس نے باری باری تینوں بیٹوں کو پیار کیا اور کہا۔

"یہاں سے ایک میل دور مشرق کی طرف ایک پرانا برگد کا درخت ہے۔ جس کے پاس ایک کنواں ہے۔ وہ زمین جس میں برگد کا درخت اور کنواں ہے میری ہی ہے۔ اس زمین کے اندر خزانہ چھپا ہوا ہے۔ وہ خزانہ جس کے پانے بعد تم عیش و آرام سے رہوگے۔ مگر وہ خزانہ اُسی وقت ملے گا جب کہ تم اس پوری زمین کو کھود ڈالوگے۔ اس لئے کہ اس زمین میں کہیں نہ کہیں پر وہ خزانہ دفن ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ اس معاملہ میں جو وقت پیش آئے اس کا تذکرہ ماں سے کرنا۔ اور وہ

جو مشورہ دے اس پر چلنا "

آخر ایک دن بوڑھا کسان مرگیا۔ اس کے مرنے پر لڑکے چپ چاپ گھر بیٹھے رہے۔ آخر کب تک! گھر میں جو کچھ رہا سہا تھا سب کا سب ختم ہوگیا۔ اور فاقے کی نوبت آگئی۔ سچ ہے مصیبت میں ساری سستی ہرن ہو جاتی ہے۔ اُنھوں نے بھی بھوک سے تنگ آکر باپ کے بتائے ہوئے راز سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہمت کی۔ اور ایک روز سورج نکلتے ہی اس مقام پر پہنچے۔ دن بھر جانفشانی سے زمین کھودتے رہے۔ مگر خزانہ نہ ملا۔ دوسرے روز بھی آئے اور ایسا ہی کیا۔ مگر ناکام رہے۔ آخر ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے کہا۔

"اور کھود ڈالو۔ شاید مل جائے"۔۔۔

تینوں پھر گئے۔ مگر بے سود!

ماں برابر اُن کے حوصلے بڑھاتی رہی۔ اور اُنھوں نے زمین کو اچھی طرح کھود ڈالا۔ مگر خزانے کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر مایوس ہوکر ماں کے پاس آئے۔

"ماں! اب ہم لوگ خزانے کی تلاش کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔ مگر کہیں پتہ نہیں چلتا "

"میرے پیارے لڑکو!" ماں نے محبت سے کہا۔ "تم لوگ مایوس کیوں ہوتے ہو۔ خزانہ نہ ملا تو کیا ہوا۔ میں تمھیں ایک بات بتاتی ہوں۔ جہاں تم نے اتنی محنت کی ہے وہاں تھوڑی سی اور سہی!"

"وہ کیا؟"۔۔۔

"برسات کا موسم اب شروع ہی ہونے والا ہے۔ تم نے زمین اچھی طرح کھود ہی ڈالی ہے۔ پھر اناج کیوں نہیں بو لیتے۔ اس میں زیادہ دشواری بھی نہیں!"

"مگر خزانہ!" لڑکے چلائے۔

"میں تمھیں دوں گی!" ماں نے کہا۔

اور لڑکے ماں کے کہنے کے مطابق کام کرنے لگے۔

زمین خوب گہری کھودی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فصل بڑی اچھی ہوئی۔ دھان کے ننھے ننھے پودے اُگ آئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑھ گئے۔ اور زمین جو پہلے چٹیل میدان تھی اب ہرے بھرے پودوں سے ڈھکی پڑی تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ پھر [illegible]

وہاں میں خوشے لگے۔ اور وہ خوشے سورج کی
زریں شعاعوں سے چمکنے لگے۔

کچھ دنوں بعد جب کھلیان سے اناج آیا
تو سارا گھر بھر گیا۔

اور ماں لڑکوں سے کہہ رہی تھی۔

"لڑکو! ــــ یہی ہے وہ خزانہ جس کا راز
تمہارے مرحوم باپ نے تمہیں بتایا تھا۔ اور
اسی خزانہ سے تمہاری مصیبت دور ہوگی۔ تمہاری
غربت ختم ہوگی ــــ پیارے بچو! یہ بہت
قیمتی اور گراں خزانہ ہے۔

تینوں لڑکے کھڑے مُسکرا رہے تھے۔
اُنہیں اپنی محنتوں، مشقتوں اور کوششوں کی
بدولت بہت بڑا خزانہ ہاتھ آیا تھا۔

لکڑبگھا

اس کا اوپر کا حصہ بھاری ہوتا ہے۔ اگلی دونوں ٹانگیں پچھلی ٹانگوں سے لمبی ہوتی ہیں۔ گردن پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں اور جسم پر دھاریاں ہوتی ہیں۔ بھٹوں میں رہتا ہے۔ عام طور پر رات کے وقت شکار کے لیے نکلتا ہے۔ جانوروں میں کتے گدھے، اس کا من بھاتا کھاجا ہے۔

حبیب تنویر

اندھیر نگری

کردار

۱۔ باباجی
۲۔ چیلا
۳۔ دوکاندار
۴۔ راجا
۵۔ وزیر
۶۔ فریادی
۷۔ معمار
۸۔ مزدور
۹۔ سقہ
۱۰۔ کوتوال
۱۱۔ چوبدار

منظر:- پہلا- اندھیر نگری کا بازار۔ — کھیل کی مدت:- سات منٹ

دوسرا- اندھیر نگری کا دربار۔

(انیسویں صدی کے آخری دور میں پارسی تھیٹر کمپنیاں ہندوستان میں گھوم گھوم کر ناٹک دکھایا کرتی تھیں۔ ان ناٹکوں میں بیچ بیچ میں ہنسی مذاق کی نقلیں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ اندھیر نگری اس
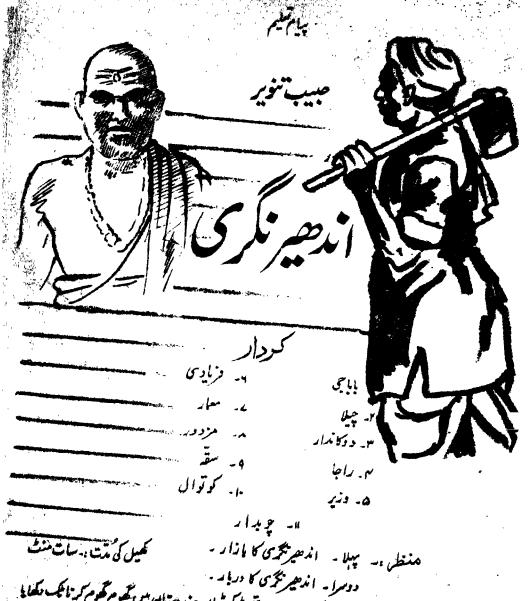
قسم کی ایک نقل ہے۔ جس کا تذکرہ اردو کے مشہور ادیب پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے ناول "فسانۂ آزاد" میں کیا ہے۔ یہاں ہم نے سرشار کے بیان کئے ہوئے قصے کو تھوڑی بہت تراش خراش کے ساتھ ناٹک کا روپ دے دیا ہے)

پہلا منظر

(اندھیر نگری کا بازار گرم ہے۔ ایک بابا جی گیروے کپڑے پہنے ایک موٹے تازے چیلے کو ساتھ لئے بھجن گاتے کھنجڑی بجاتے بائیں راستے سے وارد ہوتے ہیں۔ اور اسٹیج کے پیچھے بائیں کونے میں ایک دوکان کو دیکھ کر کہتے ہیں)

بابا جی:۔ بچہ جاؤ کچھ نون تیل لکڑی لاؤ۔ روٹی پکاؤ خود بھی کھاؤ، ہم کو بھی کھلاؤ اور دند ناؤ۔

چیلا:۔ جو آگیا، گرو جی!

(بابا جی اسٹیج کے پیچھے دائیں کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بھجن گاتے ہیں۔ چیلا دوکان کی طرف بڑھتا ہے)

چیلا:۔ یہ کیا ہے؟

دوکاندار:۔ کرارے تل کے لڈو ہیں۔

چیلا:۔ کیا بھاؤ ہیں؟

دوکاندار:۔ ٹکے سیر

چیلا:۔ اور یہ کیا ہے؟

دوکاندار:۔ یہ مصالے کے مٹر ہیں۔

چیلا:۔ کیا بھاؤ؟

دوکاندار:۔ ٹکے سیر

چیلا:۔ اور یہ گول گپے کیا بھاؤ ہیں؟

دوکاندار:۔ ٹکے سیر

چیلا:۔ اور یہ گنڈیریاں؟

دوکاندار:۔ ٹکے سیر

چیلا:۔ یہ ریوڑیاں بھی ٹکے سیر ہیں؟

دوکاندار:۔ جی ہاں۔ یہ گلاب ریوڑیاں بھی ٹکے سیر ہیں۔

چیلا:۔ اور یہ مربّا بھی ٹکے سیر ہوگا؟

دوکاندار:۔ جی ہاں۔

چیلا:۔ یہ اچار بھی ٹکے سیر؟ یہ دال موٹھ بھی

ٹکے سیر

دوکاندار :- جی !

چیلا :- اور یہ کیا ہے ؟

دوکاندار :- بیسن کے لڈو ۔

چیلا :- اور یہ ؟

دوکاندار :- کھاجا !

چیلا :- کھاجا تو کھاجا ۔ کہوں ؟

(یہ کہہ کر ایک کھاجا چکھ گئے، پھر دوسرا اڑایا اسی طرح خوب مٹھائی ٹونگی ۔ اور کچھ کھائی کچھ باندھی ۔ دام ادا کئے ۔ اور وہاں سے چلے باباجی کے پاس)

بابا :- کیوں بچہ کچھ گھی شکر آٹا لایا ؟

چیلا :- ہونہہ گھی کیا کروگے کھاجا کھاجا ۔ مٹھائی چکھو ۔

بابا :- اس نگری کا نام کیا ہے ؟

چیلا :- باباجی یہیں تو مٹھائی کھانے سے کام ہے ۔ اندھیر نگری چوپٹ راجا ۔ ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا ۔

بابا :- ہاں بچہ، یہ نگری رہنے کے لائق نہیں ۔ چلو بھاگ چلیں ۔

چیلا :- واہ ! تم جاؤ ۔ میں تو مٹھائی چھوڑ کر نہ جاؤں گا ۔

(باباجی دائیں راستے سے چلے جاتے ہیں چیلا کونے میں بیٹھا مٹھائی کھا رہا ہے)

پردہ

دوسرا منظر

(اندھیر نگری کے چوپٹ راجا کا دربار لگا ہے بیچ میں راجا کی مسند ہے ۔ دائیں بائیں وزیر، چوبدار کوتوال اور دوسرے درباری اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان ہیں ۔ دو دروازے ہیں ایک دائیں ایک بائیں ۔ دائیں دروازے سے راجا برآمد ہوئے ۔ واہ واہ بھئی واہ اچھے راجا ہیں تو اندھیر نگری کیوں نہ ہو ۔ راجا صاحب شرابی، مدکئے، چرسئے، گنجڑیئے بھنگڑیئے، چانڈو باز، افیمچی، نشے میں چور مست اور مخمور کرسی پر بیٹھے ہیں ۔ گر گر پڑتے ہیں ۔ اتنے میں دائیں دروازے سے ایک فریادی آتا ہے)

وزیر :- جہاں پناہ، ایک فریادی آیا ہے ۔

راجا :- تمھارا دادی آیا ہے ؟

وزیر :- نہیں ۔ جہاں پناہ ایک فریادی آیا ہے ۔

راجا :- اچھا ۔ ہوں — ایک آیا ہے ؟ اچھا تو پانچ بلاؤ ۔

(وزیر فریادی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا ہے)

فریادی :- (جو اب تک ایک کونے میں کھڑا تھا آگے بڑھ کر کہتا ہے) حضور، [illegible] میرا

لڑکا دب کر مر گیا۔

راجا:۔ ہاں دیوار مر گیا۔ لڑکا دب گیا۔ دیوار کو سولی دے دو!

وزیر:۔ جہاں پناہ! دیوار گر پڑی، اور اس کا لڑکا مر گیا۔

راجا:۔ ہاں ہاں جہاں پناہ گر پڑا اور دیوار پر لڑکا مر گیا۔ اچھا لڑکے کو پھانسی دے دو۔

وزیر:۔ نہیں خداوند، دیوار گر پڑی لڑکا دب کر مر گیا۔

راجا:۔ معمار کو سولی دے دو۔

(وزیر باہر جا کر فوراً معمار کو گھسیٹ لاتا ہے)

معمار:۔ (گڑگڑا کر) پیر و مرشد، میں بے قصور ہوں یہ مزدور کی شرارت ہے۔

راجا:۔ مزدور کو سولی دے دو۔ اس نے گارا ہی ایسا بنایا تھا پتلا پتلا۔ پانی جیسا۔

(وزیر مزدور کو پکڑ لاتا ہے۔)

مزدور:۔ (آتے آتے وزیر سے کہتا ہے) میں نے کیا کیا حضور۔ میں نے تو گارا ٹھیک بنایا تھا۔ سقے نے اس میں زیادہ پانی ڈال دیا۔ اُسی سقے کا قصور ہے۔

راجا:۔ اچھا جاؤ سقے کو سولی دے دو۔

(وزیر سقے کو لاتا ہے)

سقہ:۔ حضور میری کیا خطا ہے؟ آپ کے کوتوال صاحب ادھر سے گزر رہے تھے میری نظر جو اُن پر پڑی تو مارے ڈر کے پانی زیادہ گر گیا۔ حضور میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے پھانسی نہ دیجئے۔ میرے بال بچے بھو کے مر جائیں گے۔ کوتوال کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔

راجا:۔ کوتوال کو سولی دے دو۔

(وزیر چوبدار کو اشارہ کرتا ہے۔ چوبدار کوتوال کو پکڑ کر سیڑھیوں پر سے ہوتا ہوا بائیں دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اب تک آنا جانا دائیں طرف کے دروازے سے ہو رہا تھا۔ چوبدار کوتوال کو لئے سیڑھیوں سے ہی الٹے پاؤں واپس آتا ہے۔ اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہے)

چوبدار:۔ سرکار! پھانسی کا منھ بڑا ہے، اور کوتوال دبلا پتلا۔

راجا:۔ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پکڑ کر پھانسی دے دو۔

(چوبدار کوتوال کو چھوڑ دیتا ہے اور

بائیں دروازے سے نکل جاتا ہے ایک
لمحہ بعد باباجی کے چیلے کو لئے واپس
آتا ہے)

چیلا :۔ (آتے آتے) ہائے غضب بھئی ہم
نے کیا کیا کہ پھانسی پر چڑھائے جائیں!

چوبدار :۔ (سیڑھیوں پر چیلے کو گھسیٹتے ہوئے)
واہ تم سب میں موٹے ہو۔

چیلا :۔ ارے تو یارو، یہ بھی کوئی جرم ہے
کہ موٹا تازہ ہوں۔

(اتنے میں باباجی گھبرائے ہوئے تیزی
سے داخل ہوتے ہیں)

باباجی :۔ ہائیں یہ کیا؟ ارے بابا یہ کیا؟
پھانسی؟ کیوں بچہ۔ میں نے کیا کہا تھا
کہ یہ اندھیر نگری چھوڑ دو۔ نہ مانا۔
آخر وہی آگے آیا نا؟

چیلا :۔ باباجی بچاؤ۔ میری طرف سے پھانسی
پر چڑھ جاؤ۔

بابا :۔ ارے آج اچھا دن ہے۔ جو پھانسی
پر چڑھے وہ سیدھا سورگ لوک کو جائے
میں پھانسی پر جاتا ہوں۔

چیلا :۔ کیا؟ سورگ لوک؟ میں پھانسی پر
جاتا ہوں۔

بابا :۔ نہیں میں جاتا ہوں۔

چیلا :۔ نہیں نہیں۔ میں جاؤں گا۔ باباجی
میں جاؤں گا۔

بابا :۔ میں ہی جاؤں گا۔ یہ میرا ادھیکار
ہے۔ مجھے نہ روکو۔

چیلا :۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ کبھی نہیں ہوسکتا۔

بابا :۔ ایسا ہی ہوگا۔ میں سورگ لوک
جاؤں گا۔

چیلا :۔ میں سورگ لوک جاؤں گا۔ چلو
چوبدار۔

بابا :۔ نہیں چوبدار۔ مجھے لے چلو۔

(دونوں وہیں سیڑھیوں پر لڑتے رہتے
ہیں۔ ایک دوسرے کو سیڑھی سے نیچے
گھسیٹ رہے ہیں۔ کبھی باباجی نیچے
آجاتے ہیں تو کبھی چیلا۔ اتنے میں راجا
آنکھ کھول کر یہ منظر دیکھتا ہے۔
اور وزیر سے کہتا ہے۔)

راجا :۔ وزیر پھانسی نہیں ہوئی۔

وزیر :۔ خداوند۔ گرو اور چیلے لڑ رہے ہیں
کہ ہم پھانسی چڑھیں۔ وہ کہتا ہے

میں پھانسی چڑھوں۔ آج بڑا تیرتھ کا
دن ہے، جو پھانسی چڑھے وہ بیکنٹھ
میں جائے۔

راجا:۔ ہاں، تو چل میں خود پھانسی پر چڑھ
جاؤں!

(دیکھئے چوپٹ راجہ کھٹ کھٹ کرتے
سیڑھیوں پر سے ہوتے ہوئے بائیں
دروازے سے نکل گئے اور پھانسی
پر چڑھ گئے۔

سب درباریوں نے مل کر قہقہہ
لگایا۔ باباجی اپنے چیلے کو لئے یہ کہتے
ہوئے دائیں دروازے سے نکل گئے)

باباجی:۔ اندھیر نگری چوپٹ راجا!

چیلا:۔ ٹکے سیر بھاجی، ٹکے سیر کھاجا!

(پردہ)

صفحہ ۴۵ سے آگے "بھول"

پوچھا: تم یہاں اس وقت کیسے؟"

سرکار آپ ہی تو مجھے باغ دکھلانے
لائے تھے۔ پھر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ یہ
سن کر امیر مسکرایا۔ کہنے لگا۔ افسوس میں بھول
گیا تھا کہ تم باغ میں موجود ہو۔ مگر اب تمھیں
معلوم ہوا کہ ذرا سی بھول سے کتنی تکلیف ہوتی
ہے۔ آئندہ اگر کسی سے وعدہ کرو تو اس کو وقت
پر پورا کر دینا۔"

پھر اپنے نوکروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔
جاؤ۔ اس شخص کو گرم چائے اور کچھ کھانا کھلاؤ"

اس واقعے کے بعد کہتے ہیں کہ پھر کبھی رامو
کسی سے وعدہ کر کے نہیں بھولا۔

سالنامہ ملا

محترم و مکرم جناب اڈیٹر صاحب دام اقبالہٗ

السلام علیکم۔

"پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ شکریہ

سالنامہ میں ممالکِ دیگر کے آنکھوں دیکھے حالات بے حد دلچسپ ہیں۔ مجھے دونوں ڈرامے بہت ہی پسند آئے۔ کیونکہ یہ اپنی طرز میں انوکھے ہیں۔ جنابِ واثق اور جنابِ تاباں کے مضامین پُر لطف ہیں۔

فوٹو نہایت دلفریب ہیں۔ نظمیں قابلِ تحسین اور باعثِ تسکین ہیں۔ آپ کی اُردو نوازی کی میں دل سے تعریف کرتی ہوں۔ یہ ناچیز رائے ہے۔

ثریا ہمدانی

"پیام تعلیم" کا سالنامہ دیکھا اور امیدوں سے کئی گنا بہتر پایا۔ اگر اسی طرح آپ کی کوششیں کامیاب رہیں تو وہ دن دور نہیں کہ پیام تعلیم آسمانِ ادب میں چاند بن کر چمکے گا اور بچوں کو جاہلیت کی اندھیری راتوں میں راہ راست پہ لائے۔ اور یہ حقیقت ہے۔ آپ کی کوششیں ضائع نہیں ہوئیں۔ میری بھول بھلیاں اور کارٹون دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی سالنامہ دیکھ کر یا نظموں کا حصہ خوب رہا۔ سراج انور صاحب کے تصاویر سچ مچ بہترین ہیں۔ ٹائیٹل حالانکہ سادہ ہے مگر خوبصورت ہے گلیڈون میسی صاحب کی تصویریں اچھی ہیں کاش کہ وہ تھوڑی اور توجہ کے ساتھ بنائیں! تصاویر کو الگ الگ رکھا یہ آپ نے اچھا کیا۔ کیوں نہ کوئی تصویری کہانی پیام تعلیم میں شروع کی جائے۔

یوسف اکولوی

میں نے پیامِ تعلیم کا نیا سالنامہ شروع سے آخر تک بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ بعض ادیب اور شاعر بچوں کی محفل کی رونق بڑھا رہے ہیں۔

یوں تو کون سا کام ہے جس میں بہتری اور ترقی کی گنجائش نہ ہو۔ تاہم جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے۔ اس سالنامہ کو ترتیب دینے والوں نے بچوں کی عام دلچسپی کے ساتھ اُن کے لئے مفید معلومات بہم پہنچانے کا خاص انتظام کیا ہے۔ اس سلسلے میں وامق صاحب جونپوری، غلام ربانی صاحب تاباں، عبداللہ ولی بخش قادری صاحب اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی وغیرہ کے مضامین قابلِ ذکر ہیں۔

نظموں میں اُمید ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی نظم بچے مزے لے لے کر پڑھیں گے۔ اور مولانا اسلم صاحب کی نظم سے سبق حاصل کریں گے۔

محمد شفیع الدین نیّر (ایم اے)
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

پیامِ تعلیم کی یہ خصوصیت کہ اس میں بچوں کے لئے عام معلومات کا ایک خزانہ ہوتا ہے، سالنامے میں بہت نمایاں ہے۔ دوسرے پرچوں کے مقابلے میں پیامِ تعلیم کی یہ شانِ امتیازی ہے اور اس لحاظ سے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ زمین کی کہانی، چین کا آنکھوں دیکھا حال، بھاکڑہ ننگل پروجکٹ، اور انگلستان کا آنکھوں دیکھا حال بہت اچھے اور مفید مضامین ہیں۔

نظموں کا حصّہ بھی بہت عمدہ ہے۔ میری بچی نے نظم "بونگالی بابو" بہت پسند کی اور اُس کے انتخاب کو میں بہرحال اپنی پسند سے زیادہ معیاری سمجھتا ہوں۔

مجموعی طور پر سالنامہ مفید دلچسپ اور خوبصورت ہے اور میری طرف سے آپ کو اس کاوش پر مبارکباد۔

محمد انس
شعبۂ جغرافیہ علی گڈھ

رومان انصاری

بھول

کسی قصبے میں ایک موچی رہتا تھا۔ اس کا نام تو رام لال تھا۔ لیکن لوگ اسے رامو کہتے تھے۔ رامو بڑے اچھے جوتے بناتا تھا۔ سارے قصبے کے بڑے لوگ رامو ہی سے اپنے لئے جوتے تیار کراتے تھے۔

ایک دن ایک امیر آدمی رامو کی دوکان میں آیا اور بولا۔ "کیا تم میری ناپ کا جوتا بہت جلد بنا دو گے؟"

"ضرور سرکار۔" رامو نے ادب سے جواب دیا۔

"تو بتاؤ۔ کب تک تیار کر دو گے؟" اس نے دریافت کیا۔

"سرکار! آج سے چوتھے دن آپ کو جوتے مل جائیں گے۔"

"وعدہ خلافی نہ ہو۔" امیر آدمی نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ پیشگی روپیہ اور ناپ دے کر چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے اپنے مکان کا پتہ بھی بتا دیا۔ تاکہ رامو جوتے تیار کر کے لے آئے۔

رامو نے چوتھے دن جوتے تو تیار کر لئے مگر وہ کام کی زیادتی اور اپنی کاہلی کے سبب مقررہ وقت پر پہنچانا بھول گیا۔ دو روز کے بعد اُسے یاد آیا۔

تو وہ جوتے لے کر امیر آدمی کے مکان پر پہنچا۔ امیر نے جوتے دیکھ کر ان کی بے حد تعریف کی۔ پھر رامو سے کہا۔ "جوتے ہر طرح سے قابلِ اطمینان ہیں لیکن آئندہ تم سے کبھی جوتے نہ بنواؤں گا۔"

"سرکار! کیا بات ہے؟" رامو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم نے اپنے وعدے کے مطابق جوتے نہ پہنچائے۔" امیر نے کہا۔

"سرکار! جوتے تو میں نے پرسوں تیار کر لئے تھے۔ مگر ان کو لانا بھول گیا تھا۔"

"اوہ۔ تو تم بھول گئے تھے۔ مگر یہ تو سوچو کہ تمھاری اس بھول سے مجھے کس قدر تکلیف اُٹھانی پڑی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر رامو سے کہنے لگا۔

"رامو! کیا تم نے کبھی کوئی باغ دیکھا ہے؟"

رامو نے جواب دیا۔ "نہیں سرکار۔ لیکن میں نے بہت سے خوبصورت باغ ضرور دیکھے ہیں۔"

"خوب۔ اچھا تو آج میرا بھی باغ دیکھو کہ کیسا ہے۔" باغ کا پھاٹک کھول کر وہ دونوں اندر گھس گئے اور باغ کی سیر کرنے لگے۔ یکایک امیر آدمی رکا اور کہنے لگا۔ افسوس مجھے ابھی ایک ضروری کام یاد آگیا۔ تم ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی لوٹ کر آتا ہوں۔

امیر آدمی ذرا سی دیر میں باغ سے باہر چلا گیا۔ اور جاتے وقت پھاٹک بند کر گیا۔

شام کے وقت چاروں طرف اندھیرا چھا گیا اور سردی بڑھنے لگی۔ مگر امیر آدمی واپس نہ لوٹا۔ رامو بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا۔ اور ٹہلتا ہوا باغ کے پھاٹک کے پاس پہنچا۔ اور اُسے کھول کر باہر نکلنا چاہا۔ مگر وہاں تو کسی نے تالا ڈال دیا تھا اب تو رامو بہت گھبرایا۔ سردی کی شدت سے کانپنے لگا۔ اس نے زور زور سے آوازیں دیں۔ تاکہ کوئی آکر پھاٹک کھول دے۔ لیکن وہاں نہ آدمی نہ آدم زاد۔ اب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اور سردی بھی بہت بڑھ گئی۔ یکایک باغ کا دروازہ کھلا۔ اور امیر نے روشنی سے باغ کو دیکھا۔ جب اس کو رامو نظر آیا، تو اس نے اپنے نوکروں سے کہا۔ "ارے باغ میں کوئی چور گھسا ہے اس کو گولی مار دو۔"

گولی کا نام سن کر رامو کا خون خشک ہو گیا۔ اور وہ چلا کر کہنے لگا۔ "ارے سرکار! میں جوتے والا ہوں۔ چور نہیں۔"

"ارے رامو موچی" امیر نے حیرت سے

بچوں کی دلچسپ کتابیں

لنگڑا دیو	۵ر
آفتاب عالم	۳ر
پیارے نبیؐ	۳ر
خدائی پریڈ	۳ر
سلطانِ زمن	۴ر
سرکارِ دو عالم	۵ر
سیرت علیؓ	۵ر
سیرت عثمانؓ	۵ر
نیلم پری	۳ر
اندھیر نگری چوپٹ راج	۳ر
شہزادی نیلوفر	۳ر
جادو کی چھڑی	۳ر
شہزادی نیلم	۴ر
ناگ شہزادہ	۴ر
جادو کا باغ	۴ر
مداری کا ڈنڈا	۴ر
بدھو سیٹھ	۴ر
قاضی اور ٹھگ	۴ر
مسٹر گڑبڑ خاں	۵ر
سونے کا راجہ	۵ر
رستم چور	۵ر
شہر کی بندہ	۳ر
[illegible]	۳ر

کہانی میں کہانی	۵ر
جادو کی کہانی	۵ر
انوکھی شہزادی	۵ر
شہزادی کا ہار	۵ر
بوڑھا جادوگر	۵ر
گھڑی ساز کی بیٹی	۴ر
پھولوں کی شہزادی	۵ر
خرگوش کا ہونٹ	۳ر
سنہری کھال	۳ر
راموموچی	۳ر
شاہی لباس	۴ر
شاہی موچی	۴ر

بچوں کی اپنی زبان میں لکھی ہوئی !

امت کی ماں

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مختصر سوانحعمری

قیمت سات آنے (۷ر)

شیخ چلی نے شادی	۳ر
بچوں کی بیت بازی	۳ر
بھائی بہن	۳ر
علم کی قیمت	۳ر
اکبر اور بیربل کے لطیفے	۶ر
چٹ پٹے لطیفے	۳ر

ہر قسم کی علمی ادبی، مذہبی، اصلاحی کتابیں مندرجہ ذیل پتہ سے منگائیے

ملنے کا پتہ

عارف پبلشنگ ہاؤس۔ اردو بازار دہلی

چھومنتر	۳ر
فقیر کی دعا	۵ر
خدا کی لاٹھی	۵ر
جادوگر کی کہانی	۵ر
نوشیرواں کا انصاف	۵ر
چھم چھم پری	۵ر
شہزادی گوہر بار	۵ر
گوہر پری	۵ر
مزیدار لطیفے	۵ر
چٹ پٹی پہیلیاں	۵ر
سردار گاپڑ	۳ر
کبڑا فرشتہ	۳ر
آفت کا پرکالہ	۳ر
مسٹر بھوت	۳ر
ماں کا ظلم	۳ر
جن پکڑا گیا	۳ر
شاہ صاحب کی بد دعا	۳ر
ظالم بادشاہ	۳ر
ہیبت خاں	۳ر
شام نگر میں سینا آیا	۴ر
جادو کی انگوٹھی	۵ر

بچوں کی کہانیاں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سرداں کا پتر	۳ر	شام نگر میں سینما آیا	۴ر	بچوں کی بیت بازی	۳ر	سونے کا راجہ	۵ر
چھو منتر	۳ر	جادو کی انگوٹھی	۵ر	شیخ چلی نے شادی کی	۳ر	رستم چور	۵ر
کبڑا فرشتہ	۳ر	شیخ چلی کا مشاعرہ	۵ر	شہزادی نیلوفر	۳ر	کہانی میں کہانی	۵ر
آفت کا پرکالہ	۳ر	نیلم	۶ر	جادو کی چھڑی	۳ر	جادو کی کہانی	۵ر
مسٹر بھوت	۳ر	گھڑی ساز کی بیٹی	۴ر	اندھیر نگری	۳ر	کایا پلٹ	۵ر
مال کا طلسم	۳ر	سفید ہاتھی	۴ر	نیلم پری	۳ر	بوڑھا جادوگر	۵ر
جن پکڑا گیا	۳ر	شاہی لباس	۴ر	شہزادی نیلم	۴ر	گوہر پری	۵ر
شاہ صاحب کی بددعا	۳ر	شاہی موچی	۴ر	جادو کا باغ	۴ر	لنگڑا دیو	۵ر
ظالم بادشاہ	۳ر	شہزادی گوہر بار	۵ر	مداری کا ڈنڈا	۴ر	فقیر کی دعا	۵ر
ہیبت خاں	۳ر	مٹی کی شہزادی	۳ر	بدھو سیٹھ	۴ر	خدا کی لاٹھی	۵ر
اکبر بیربل کے لطیفے	۶ر	گرم چائے	۳ر	قاضی اور ٹھگ	۴ر	جادوگر کی کہانی	۵ر
دو بھائی	۵ر	لال بجھکڑ (بچوں کا ناول)	۱۰ر	ناگ شہزادہ	۴ر	چھم چھم پری	۵ر
ہوائی گھوڑا	۵ر	بنی خرگوش	۳ر	انوکھی شہزادی	۵ر	مزیدار لطیفے	۵ر
وفاداری کا امتحان	۵ر	سنہری کھال	۳ر	شہزادی کا ہار	۵ر	چٹ پٹی پہیلیاں	۵ر
تین ٹھگ	۵ر	رامو موچی	۳ر	ضدی شہزادہ	۵ر	نوشیرواں کا انصاف	۵ر
لاڈلا بچہ	۵ر	سنہری پرندہ	۳ر	پھولوں کی شہزادی	۵ر	مکار بھائی	۵ر
ایماندار کا پھل	۵ر	آنکھ مچولی	۳ر	مسٹر گڑبڑ خاں	۵ر	بھائی بہن	۳ر
دو بہنیں	۵ر	علم کی قیمت	۳ر				

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی

پیامی معمّا نمبر ۲۹ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل پیامی معمّا۔ (۱) مہر (۲) شریف (۳) انتظام (۴) بھاگو (۵) گندہ (۶) آٹے

اس بار صحیح حل ۳۱ موصول ہوئے۔ لہٰذا پہلا انعام عہ فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) عبدالاحد رائے پور (۲) محمد شفیق حیدرآباد (۳) جمیل احمد جمشید پور (۴) عبدالغفور حیدرآباد (۵) آفتاب حسن ناگپور (۶) شکیل الرحمان سرینگر (۷) زینت بانو کلکتہ (۸) عبدالحبیب مظفرنگر (۹) زیب النساء مظفرنگر (۱۰) غلام احمد علی گڈھ۔ (۱۱) دین محمد مرادآباد (۱۲) کلیم احمد بریلی (۱۳) محمد اخلاق دہلی (۱۴) محمد ذکی دہلی (۱۵) اُوتار سنگھ دہلی (۱۶) نصیر احمد دہلی۔ (۱۷) ناظر عباس مرادآباد (۱۸) خورشید احمد کلکتہ (۱۹) محمد اشرف لکھنؤ (۲۰) اصغری خانم دہلی (۲۱) فیض احمد نبی دہلی (۲۲) امیرالدین شاہجہانپور (۲۳) سرداری لال دہلی (۲۴) محمد اسلم الہ آباد (۲۵) محمودہ پٹنہ (۲۶) محمد سلطان حیدرآباد (۲۷) شہاب الدین الہ آباد (۲۸) سعید اختر کلکتہ ۱۹ (۲۹) اسمٰعیل بھائی بمبئی (۳۰) محمد ناصر شکارپور (۳۱) محمد رؤف سہارنپور۔

اس بار ایک غلطی والے ۳۲ حل موصول ہوئے۔ لہٰذا دوسرا انعام بحساب دس آنے فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) ایم۔ ایف۔ مجاور۔ انکولہ (۲) شوکت حسین رامپور (۳) خیرالعباد خاں حیدرآباد (۴) عبدالرزاق کلکتہ (۵) محمد علی جبل پور۔ (۶) عزیز احمد جامعہ نگر (۷) فیاض احمد بریلی (۸) کریم الدین الہ آباد (۹) انعام الحق پٹنہ (۱۰) عبداللطیف حسن رتنا گری۔ (۱۱) عبدالغنی رائے پور (۱۲) بشیر احمد دہلی (۱۳) شریف احمد دہلی (۱۴) خدابخش آگرہ (۱۵) نثار علی رائے پور (۱۶) خورشید خاں ایلنبر (۱۷) محمد یوسف جموں (۱۸) فردوس جہاں دہلی (۱۹) احمد علی پونہ (۲۰) اقبال حیات گریڈیہ (۲۱) محمد راشد سیتاپور (۲۲) عبدالسبحان خاں کانپور (۲۳) عبداللطیف لکھنؤ (۲۴) شمیم احمد لکھنؤ (۲۵) امتیاز احمد دہلی۔ (۲۶) مبین الزماں گورکھپور (۲۷) عبداللہ قنوج (۲۸) شرافت علی علی گڑھ (۲۹) سید طاہر علی۔ کلکتہ (۳۰) محمد بیگ جمشید پور (۳۱) فیروز حسین رائے پور (۳۲) شفیق حسین کراوٹی۔

(ایڈیٹر پیامی معمّا)

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

پچاس ۵۰ روپے کے نقد انعامات

فیس فی حل ایک آنہ منی آرڈر کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس چار آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے | دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۲ فروری ۵۵ء

پیامی معمّا نمبر ۴۰

■	■	م	ا	ی	۱ پ
ی	ک	ی	ر	ا	۲
			کھ		۶

اشارے

۱۔ بچوں کا سب سے پیارا ماہنامہ ــــ تعلیم (پیام)

۲۔ ہمارے وزیرِ اعظم ملک کے ہر اہم مسئلے کو گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ اس کی ــــ فوراً سامنے آجاتی ہے۔

(...ی ـ ...ی)

۳۔ بہت سے بچّے ــــ زیادہ پسند کرتے ہیں۔

(شیر ـ کھیر)

۴۔ بعض لوگ تو ــــ کے نام سے گھبراتے ہیں۔

(ریل ـ جیل)

۵۔ ــــ کی خاطر اپنے نیک ارادوں کو کبھی نہیں بدلنا چاہیے۔

(دولت ـ دوست)

۶۔ بعض بچّے اپنی کم عمر میں ہی بہت کچھ ــــ جاتے ہیں

(سوکھ ـ سیکھ)

کوپن پیامی معمّا نمبر ۴۰

نام: . . . .

پتہ: . . . .

کوپن پیامی معمّا نمبر ۴۰

نام: . . . .

پتہ: . . . .

پتہ: پیامی معمّا نمبر ۴۰
ماہنامہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی

PAYAM TALEEM

Title Printed at The Fine Press DELHI.

پیامِ تعلیم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

لوئی پاسچر اپنی تجربہ گاہ میں
(اندر کے صفحات میں مضمون پڑھئے)

صدر دفتر فون نمبر ۳۲۱۹۰
برانچ آفس فون نمبر ۲۳۲۶۸

مارچ سنہ ۵۵ء

پیام تعلیم

فہرست

ادارہ

حامد علی خاں ۔ بی ۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز ۔ ایم ۔ اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ چار روپے
فی پرچہ ۶ر چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

بچّوں سے باتیں

پیام تعلیم کے پڑھنے والے "ایک دن کے مدرسے" سے تو واقف ہوں گے۔ یہی وہ دن ہوتا ہے جس روز استاد چھٹی مناتے ہیں اور بچے اپنا مدرسہ خود چلاتے ہیں۔ یہ موقع سال میں ایک بار آتا ہے۔ اس بار ۳ رفروری کو مدرسہ ثانوی کے طلبار نے "ایک دن کا مدرسہ" بڑی کامیابی سے چلایا ہم ادارے کی جانب سے طلبار کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مدرسہ ثانوی کے تمام استاد اس روز پک نِک پر چلے گئے تھے۔ سارا انتظام طلبار کے سُپرد تھا۔ مدرسے کے نگراں سے لے کر چپراسی تک کا کام لڑکے ہی کر رہے تھے۔ گو اس بار یہ مدرسہ پچھلے سال کے مقابلے میں بہتر رہا۔ لیکن بہتری کے امکانات پھر بھی رہتے ہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ثانوی کے طلبار کچھ اور زیادہ سوجھ بوجھ سے کام لیں تو اگلے سال اس سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس بار مدرسے میں آنے والے مہانوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ یہاں تک کہ نگراں کے کمرے میں کافی آدمی اکٹھا ہو گئے تھے۔ بہتر ہوتا کہ باہر بیٹھنے کے کمرے میں لوگوں کو بٹھایا جاتا۔

تاکہ لوگ تھوڑے تھوڑے اور باری باری نگرانِ مدرسہ سے ملتے ۔
ایک چیز اور بھی آئندہ کے لئے غور کے قابل نظر آئی ۔ اور اس کی وجہ بھی معلوم ہوئی۔ ہم نے
دیکھا کہ بعض درجوں میں پڑھائی نہیں ہو رہی تھی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سب سے اونچے درجے کے تقریباً
سب لڑکوں کو کوئی نہ کوئی عہدہ دے دیا گیا تھا اس لئے شاید استاد بننے کے لئے کچھ کم لڑکے رہ گئے
تھے ۔ مدرسہ میں رونق اور چہل پہل کافی تھی اور دیواری اخبار تو بہت اچھا نکالا گیا تھا ۔ رات کو
کیمپ فائر بھی ہوا تھا ۔ کیمپ فائر کے سلسلے میں ہماری جامعہ نے ایک بڑا اچھا معیار قائم کر لیا
ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اس کو اور زیادہ بلند اور قابلِ رشک بناتے رہیں ۔ اگلے سال کیمپ
فائر کی نقلوں پر اور زیادہ توجہ دینی چاہیے ۔ تاکہ کوئی چیز اعتراض کے قابل سامنے نہ آئے ۔

اس بار جامعہ میں آنے والوں میں پاکستان کے گورنر جنرل ہز ایکسیلینسی جناب غلام محمد صاحب
خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ آپ ہمارے راشٹرپتی کی دعوت پر ۲۶ جنوری کے جشن کی شرکت کے لئے
ہندستان تشریف لائے تھے ۔ آپ کے ساتھ سرحد کے ہردلعزیز رہنما خان عبدالغفار خاں کے بڑے بھائی
ڈاکٹر خان صاحب بھی تھے ۔
آپ دونوں حضرات ۲۵ جنوری کی شام کو جامعہ تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری کے مزار
پر فاتحہ پڑھی ۔ اس کے بعد بچوں کے شاعر جناب شفیع الدین صاحب نیّر کی ایک نظم پڑھی گئی ۔
جو ہم اس پرچے میں شائع کر رہے ہیں ۔

نذر

بتقریب تشریف آوری جناب محترم غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان

ہماری جامعہ میں جب محمدؐ کے غلام آئیں
سلامی کیوں نہ بن کر ہند کے سب خاص و عام آئیں

تم آئے یا بہارِ نو سی آئی اپنے گلشن میں
نوید آشتی کے پھول لائی بھر کے دامن میں

نسیم جاں فزا ہر ہر طرف پھرتی ہے اتراتی
چلی آتی ہے ہنستی کھیلتی اور ناچتی گاتی

فرشتوں کی زبانوں پر بھی ہے صلِ علیٰ جاری
مسرت اور خوشی کے قہقہے ہیں ہر طرف طاری

زمین و آسماں تک کیف و مستی کے پیامی ہیں
سنا ہے آپ سعیِ امن میں نہرو کے حامی ہیں

تمہاری دید سے ہر دل کی کلیاں مسکرا اٹھیں
تمہیں دیکھا تو دل کی حسرتیں بن کر دعا اٹھیں

خدایا ہند و پاکستان دونوں ہی پھلیں پھولیں
یہ دونوں ملک جھولے میں ترقی کے سدا جھولیں

رہے ہر مملکت مصروف دائم سعیِ سبقت میں
صداقت میں، عدالت میں، مروت میں، اخوت میں

کچھ ایسا درس ہو، ہر مملکت کی درسگاہوں میں
محبت ہی محبت بس جگہ پائے نگاہوں میں

یہ ہو جائے تو پیدا ہی نئی بیگانگی جائے
ترانے امن کے اور آشتی کے ایشیا گائے

سلامِ شوق لیجئے، ارضِ پاکستان کے رہبر
یہی پیغام دیجئے، اہلِ پاکستان کو جاکر

محمد شفیع الدین نیر استادِ جامعہ

یہ نظم جامعہ کی طرف سے گورنر جنرل موصوف کی خدمت میں جامعہ کے پرچم میں لپیٹ کر پیش کی گئی۔

۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء

حامد علی خاں

سردار کی عزّت

ایک بار آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ صلعم نے ایک
لشکر کا سردار حضرت اسامہ رض کو بنایا۔ حضرت اسامہ رض
بہت بہادر اور سچے مسلمان تھے۔ یہ آنحضرت صلعم
کے غلام تھے۔ ان کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اس
لشکر میں بڑے بہادر اور چنے ہوئے لوگ شامل تھے۔

لشکر ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ آنحضرت بیمار ہو گئے
پھر آپ کا انتقال ہو گیا اس لئے یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔

آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکر رض خلیفہ ہوئے
لوگوں نے حضرت ابوبکر رض سے کہا "اس وقت یہ
لشکر روانہ نہ کیجئے۔ اس میں چنے ہوئے مسلمان
ہیں۔ یہ لوگ شہید ہو گئے تو مسلمانوں کا بہت نقصان ہوگا۔"

حضرت ابوبکر رض نے یہ بات نہ مانی۔ پھر لوگوں
نے کہا۔ "کسی بڑی عمر والے اور بڑے گھرانے کے آدمی
کو سردار بنا دیجئے۔"

حضرت ابوبکر رض نے یہ بات بھی نہ مانی اور فرمایا
کہ "جس شخص کو آنحضرت نے سردار مقرر کیا ہے میں
اسے بے طرف نہیں کر سکتا۔"

اس جواب سے سب کے دل پر اچھا اثر ہوا۔ اور
مسلمانوں کی ہمت بہت بڑھ گئی۔

آخر لشکر روانہ ہوا۔ حضرت اسامہ رض گھوڑے پر
سوار تھے اور حضرت ابوبکر رض ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔

حضرت اسامہ رض نے حضرت ابوبکر رض سے کہا یا تو آپ
گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔ ورنہ مجھے اپنے ساتھ پیدل
چلنے کی اجازت دیجئے۔

حضرت اسامہ رض اس وقت لشکر کے سردار تھے اس
لئے حضرت ابوبکر رض سب کو بتانا چاہتے تھے کہ لشکر
کے سردار کی کتنی عزّت کی جاتی ہے حضرت ابوبکر رض پیدل
چلتے رہے اور حضرت اسامہ رض گھوڑے پر سوار رہے۔

چالیس روز بعد یہ لشکر کامیاب ہو کر واپس آیا۔
حضرت ابوبکر رض نے مدینہ شہر سے باہر نکل کر لشکر کا
استقبال کیا۔

حضرت ابوبکر رض کی ان باتوں سے سب لوگ
بہت خوش ہوتے تھے اور ان کے دل خدمت کے
جوش سے بھر جاتے تھے۔

شاہد علی خاں

"لوئی پاسچر"

۲ر جون ۱۸۸۱ء کی شام کو چند سائنسدان، کچھ سرکاری افسر، اور کاشتکار، فرانس کے ایک گاؤں میں ایک باڑہ میں کھڑے ہوئے، ۵۰ بھیڑوں کا معائنہ کر رہے تھے اور کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک بوڑھا جس کے ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے کمرے سے باہر آیا۔ سب نے ایک آواز ہو کر کہا: "لیجئے وہ آگئے۔" سب کی نظریں اوپر اُٹھ گئیں۔ اس اجنبی نے آتے ہی مری ہوئی بھیڑوں کو دیکھا۔ اور ان کو گنتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ۔ مر گئیں۔" پھر لوگ اس کو دوسری طرف لے گئے۔ بڈھے نے ان کو دیکھا یہ پچیسوں زندہ ہیں۔ اب تو بڈھے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے کہا۔ "دیکھا آپ نے، جن بھیڑوں کے میں نے انجکشن دئے تھے وہ بچ گئیں۔ میرا تجربہ کامیاب رہا۔"

یہ بوڑھا فرانسیسی سائنس داں لوئی پاسچر تھا جس نے یہ دریافت کیا تھا کہ اکثر بیماریاں ان ننھے منے کیڑوں سے پیدا ہوتی ہیں جو صرف خوردبین سے نظر آتے ہیں۔ ان کو جراثیم کہتے ہیں۔ اور انہیں جراثیم کے انجکشن سے ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ وبائی بیماریوں سے بچنے کے لئے اگر پہلے ہی سے ان ہی جراثیم کے انجکشن دے دئے جائیں تو یہ باہر سے آنے والے جراثیم

کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پہلی بار جب پاسچر نے یہ بات کہی تو فرانس کے سائنسدانوں نے اس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن پاسچر نے اپنے دعوے کو سچا ثابت کر دیا۔

اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے لوئی پاسچر خوردبین کے ذریعے ان جراثیم کو دیکھا کرتا تھا۔ ایک بار اس کے استاد نے اس سے کہا بھی کہ "ان جراثیم کے پیچھے وقت خراب کرنے سے کیا فائدہ؟"

لیکن پاسچر نے وہ وقت خراب نہیں کیا تھا بلکہ ان کو معلوم کر کے انسانیت کو اتنا زبردست فائدہ پہنچایا کہ آج تک ہم اس کی اس تحقیقات کی بدولت بیماریوں سے بچ رہے ہیں۔

پاسچر اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے باپ کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا تعلیم حاصل کر کے اپنے شہر کے کالج میں پروفیسر ہو جائے۔ وہ اپنے باپ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ اپنے باپ سے زیادہ دن علیحدہ رہنے کی وجہ سے بیمار ہو گیا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو اس نے خود ہی کہا۔ اگر میں اپنے باپ کے گھر کی بُو ہی سونگھ لوں تو اچھا ہو جاؤں۔ جب اسے کالج سے گھر لے جایا گیا تو پاسچر دو تین ہی روز میں بالکل تندرست ہو گیا۔

بیس برس کی عمر میں پاسچر نے پیرس یونیورسٹی سے سند حاصل کر لی۔ پھر اس نے پیرس کے ایک کالج کی تجربہ گاہ میں نوکری کر لی۔ وہاں وہ برابر کتابیں پڑھتا اور تجربے کرتا رہا۔ مسلسل محنت کے بعد وہ چند نئی چیزیں معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر تو وہ ایک کالج میں پروفیسر ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کام کے علاوہ دُنیا کی کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ اس کو اپنی شادی کی تاریخ بھی یاد نہ رہی۔ وہ اپنے کام میں اس وقت بھی لگا ہوا تھا جب برات تیار تھی۔ لیکن دولھا غائب تھا۔

انگور یا گنے کے رس سے سرکہ اور دودھ سے دہی کیسے بن جاتا ہے؟ آٹے میں خمیر کیسے اُٹھتا ہے؟ اس قسم کی اور بھی کئی باتیں تھیں جن کا اصلی سبب اس زمانے کے سائنس داں معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی معلوم نہ کر سکا۔ اس کا سہرا بھی پاسچر ہی کے سر رہا۔ اس نے یہ بات معلوم کی کہ خمیر ننھے منے جراثیم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

جنھیں ہم آنکھ سے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ جراثیم سڑنے والی چیزوں میں پیدا ہوئے۔ اس نے اپنے تجربوں میں یہ بات ثابت کردی کہ جراثیم ہمیشہ مٹی یا ہوا میں موجود رہتے ہیں اور موقع پاکر ہر چیز میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر یہ وہیں پرورش پانے لگتے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

پاسچر کے زمانے میں فرانس میں ایک وبا پھیلی۔ جس سے ریشم کے کیڑے مرگئے۔ ریشم فرانس کی بہت بڑی صنعت تھی۔ اس بیماری سے صنعت پر بہت خراب اثر پڑا۔ لیکن پاسچر نے دن رات کی محنت کے بعد ایسا علاج معلوم کرلیا جو مفید ثابت ہوا۔

پاسچر کا ایک بہت بڑا کارنامہ پاگل کتے کے کاٹنے کا علاج ہے۔ اس نے ایک ایسا انجکشن تیار کیا جس کے لگانے سے اس کا علاج ہوسکتا ہے۔

اب تو پاسچر کی شہرت دُور دُور پہنچ گئی۔ اور فرانس میں تو اس کا نام نپولین کی طرح لیا جانے لگا۔

۱۸۹۲ء میں جب پاسچر کی عمر ۷۰ سال کی ہوگئی تو فرانسیسیوں نے اس کی جوبلی منائی۔ جس میں دنیا بھر کے سائنس دانوں کے نمائندے آئے۔ اور ایک "سائنس کانفرنس" ہوئی۔ جس میں پاسچر کی خدمات کو سراہا گیا۔

۸ ر ستمبر ۱۸۹۵ء میں اس عظیم سائنس داں کا انتقال ہوگیا اور پیرس میں پاسچر انسٹیٹیوٹ میں دفن کردیا گیا۔

پاسچر کا مقولہ تھا "کام کرو اور سدا کام کرو" اور یہ مقولہ نہ صرف فرانسیسیوں کے لئے شمع ہدایت ہے بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کے لئے۔

انیس مرزا

میں راجا ہوں، میں راجا ہوں

ایک مرتبہ تمام چڑیوں نے مل کر طے کیا کہ ہم بھی کسی ایک پرندے کو اپنا راجا بنائیں۔ آخر انسانوں میں بھی تو بادشاہ ہوتا ہے۔ جنگل کے جانوروں کا راجا، شیر ہوتا ہے تو پھر ہم بھی کیوں پیچھے رہیں۔ اس خیال سے جنگل کے سارے پرندے ایک دن ایک خاص جگہ جمع ہو گئے۔ ننھی منی چڑیوں سے لے کر بڑے بڑے پرندوں تک۔ سب کے سب وہاں اکٹھا تھے۔ ان میں کوّے، چکور، مور، چیل، باز، عقاب، فاختہ، کبوتر، مرغ، اُلّو، بلبل، غرض ہر طرح کی چڑیاں شامل تھیں۔ ہر چڑیا یہی چاہتی تھی کہ اُسے ہی راجا بنا دیا جائے۔ لیکن کسی طرح اُن میں آپس میں اتفاق نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ مار پیٹ کی نوبت بھی آگئی۔

جب فاختہ نے دیکھا کہ جھگڑا بڑھتا جا رہا ہے تو اس نے انھیں مشورہ دیا کہ اس طرح لڑنے جھگڑنے سے کام نہیں چلے گا۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے جس سے جو سب سے زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہو اسی کو راجا بنایا جائے۔

یہ بات تمام پرندوں کی سمجھ میں آگئی اور سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جو پرندہ سب سے اونچا اُڑ سکے اسی کو ہم اپنا راجا بنائیں۔

اب سارے پرندے ایک ساتھ اُڑے ان میں ننھی منی چڑیاں تو زرا سی دور جا کر ہی لوٹ آئیں۔ مقابلے میں صرف چیل، عقاب چکور، فاختہ اور کبوتر ہی رہ گئے۔ لیکن کچھ اور اوپر جا کر یہ بھی تھک کر لوٹ پڑے۔ اب تو لے دے کر عقاب اور چیل ہی تھے جو برابر اڑ رہے تھے۔ لیکن عقاب کی اُڑان کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔ آخر کار چیل کو بھی ہار ماننا پڑی اب عقاب ہی تھا جو اتنی بلندی پر اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ تمام چڑیاں ایک ساتھ چیخ پڑیں "ہمارا راجا عُقاب ہے عُقاب"! لیکن زرا سی دیر میں جو انھوں نے آسمان کی طرف پھر سے دیکھا تو وہاں انھیں ایک اور چڑیا نظر آئی جو عقاب سے بھی اونچی اڑتی چلی جا رہی تھی۔ حالانکہ یہ دیکھنے میں ننھی منی سی تھی۔ سب چڑیاں چونک پڑیں۔ کمال ہو گیا، یہ چھوٹی سی چڑیا کہاں سے آ گئی جس کا کوئی نام بھی نہیں"۔

ننھی چڑیا نے کہا "میں راجا بنوں گی، میں عقاب کے اوپر بیٹھی تھی اور اسے پتہ بھی نہ تھا۔ عقاب بالکل تھک چکا تھا لیکن چڑیا تازہ دم تھی۔ وہ عقاب سے کافی اوپر نکل گئی۔

یہاں تک کہ جیت چھوٹی چڑیا کی ہی رہی۔ چھوٹی چڑیا کہنے لگی کہ میں راجا بنوں گی کیونکہ میں عقاب سے زیادہ عقل مند ہوں اور اپنی عقل کے زور پر اس سے زیادہ اونچائی پر پہنچی۔

آخر کسی طرح اس کا فیصلہ نہ ہو سکا اور اب سب چڑیوں نے مل کر یہ طے کیا کہ چناؤ کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، اتنی چھوٹی سی چڑیا کا کوئی نام بھی نہیں ہے اُسے کون راجا بنائے۔

اب سب نے یہ سوچا کہ جو چڑیا سب سے زیادہ گہرائی میں جا سکے۔ اس کو ہی راجا بنا دیا جائے۔ یہ بات سُن کر بطخ اور مرغ بڑے خوش ہوئے۔ انھوں نے ایک گڈھے میں جا کر بہت پر پھڑ پھڑائے لیکن وہ بھی اندر کہاں جا سکتے تھے۔ یہ امتحان اتنا سخت تھا کہ کوئی پرندہ بھی اس میں پورا نہ اتر سکتا تھا۔ وہی ننھی منی چڑیا پھر دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے زمین پر اِدھر اُدھر پھدکنا شروع کر دیا۔ آخر اُسے ایک چوہے کا بِل نظر آ گیا اور وہ اس کے اندر

گھس گئی اور وہیں سے چلائی "میں راجا ہوں
میں راجا ہوں"
یہ سُن کر تمام پرندوں کو غصہ آیا۔
اور انھوں نے کہا کہ یہ چڑیا جس کا کوئی
نام تک نہیں ہے۔ ہم اسے کس طرح اپنا
راجا بنالیں۔ آخر انھوں نے چڑھ کر کہا
"اچھی بات ہے تم باہر نکلو تو ہم تمھارا
کام تمام کردیں۔ بے چاری چڑیا ڈر کے
مارے اُس بل میں پڑی رہی۔ پرندے
انتظار کرتے کرتے تھک گئے اور جب شام
ہوئی تو انھوں نے اُلّو سے کہا کہ تم رات بھر
یہاں بل کے پاس پہرہ دو اور جیسے ہی
یہ نکلے اُسے پکڑ لو۔ صبح صبح اس کا مقدمہ
پیش ہوگا اور اِسے مُناسب سزا دی
جائے گی" یہ کہہ کر سب پرندے اپنے
اپنے گھونسلوں میں چلے گئے۔ اُلّو میاں بل
کے پاس بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔
جب رات زیادہ ہوئی تو انھیں نیند آنے
لگی۔ اُلّو میاں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک
آنکھ بند کرکے سوجاؤں۔ یہ سوچ کر انھوں
نے ایک آنکھ بند کرلی۔ چڑیا نے جو بل میں
سے جھانک کر دیکھا تو اس کی دوسری آنکھ
کھلی ہوئی تھی۔ وہ پھر بل کے اندر گھس
گئی۔ ذرا سی دیر میں اُلّو کو اور گہری نیند
آئی اور اس نے وہ آنکھ بھی بند کرلی۔

چڑیا کو جو یہ موقع ملا تو وہ پھُر سے
اُڑ گئی اور پیڑ پر جا کر چوں چوں کرنے
لگی۔ اُلّو میاں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔
اس کے پیچھے دوڑے لیکن وہ کہاں ہاتھ
آتی۔ یہ جا وہ جا۔ جھاڑی میں جا کر چھپ
گئی۔

اب اُلّو میاں بہت ڈرے۔ وہ دن
تھا اور آج کا دن ہے کہ اُلّو میاں نے پھر
کبھی دن کے وقت اپنی شکل نہ دکھائی کہ چڑیاں
پوچھیں گی کہ اس قیدی کا کیا ہوا۔ جب رات
کو سب پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں بسیرے
کے لئے چلے جاتے ہیں تو اُلّو میاں نکلتے ہیں اور
سورج نکلنے سے پہلے پہلے غائب ہو جاتے
ہیں۔ اسی لئے تو دن میں نظر نہیں آتے۔

اب اس ننھی منی چڑیا کا حال سنئے
وہ بیچاری بھی ڈر کے مارے باہر نہیں نکلتی
اور جھاڑیوں میں چھپتی پھرتی ہے۔

سید منیر الحسن

آبی قوت

پانی بڑی ضرورت کی چیز ہے، اس کے بغیر ہمارا جینا مشکل ہے۔ یہ ہمارے پینے، نہانے اور دھونے کے علاوہ اور دوسرے استعمال کے کام میں تو خیر آتا ہی ہے لیکن ان سب چیزوں کے علاوہ بھی سائنس دانوں نے جو ہماری ضرورتوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں، پانی سے نئے نئے کام لینا شروع کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اب یہی دیکھئے کہ جو پانی پہاڑوں سے آبشاروں کی شکل میں نیچے گرتا ہے اور پھر بہہ کر دریا بن جاتا ہے۔ اس کو انہوں نے نیچے گرنے کے بعد ہی روک لیا۔

یہ کام انہوں نے اس طرح کیا کہ آبشاروں سے گرے ہوئے پانی کو پہاڑیوں پہ حوض یا تالاب بنا کر روکا اور پھر یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بلندی پر بنے ہوئے تالابوں کے پانی کو بڑے بڑے نلوں کے ذریعہ نیچے لا کر ایسی جگہ پہ چھوڑا جہاں پر پہلے ہی سے بڑے بڑے پن پہیئے (واٹر وہیلس) لگا رکھے تھے۔ ان پن پہیوں (واٹر وہیلس) کی مدد سے

ڈائنمو چلاتے ہیں۔ جن سے برقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اب اس برقی قوت یعنی برقی رو کو تاروں کے ذریعہ مختلف مقامات میں پہنچایا جاتا ہے جس سے چھوٹے چھوٹے ڈائنمو چلتے ہیں۔

دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے ملک ہندوستان کو بھی آبی قوت پر قابو پانے کے لئے مختلف مدارج طے کرنے پڑے ہیں۔ ہمارے یہاں آبی قوت کا سب سے بڑا گھر ریاست بمبئی میں ہے۔ جو آبی برقی اسٹیشن یا (HYDRO ELECTRIC STATION) کہلاتا ہے۔

یہاں ٹاٹا کے مشہور و معروف کارخانے کی طرف سے مغربی گھاٹ پہ پانی کے خزانے بنائے گئے ہیں۔ یہ زمین سے کوئی سولہ ہزار فٹ اونچے ہیں۔ وہاں سے بڑے بڑے نلوں کے ذریعے پانی نیچے لایا جاتا ہے جس سے دو لاکھ تیس ہزار اسپی قوت HORSE POWER کی بجلی پیدا ہوتی ہے۔

اسی قوت سے بمبئی میں روشنی ہوتی ہے۔ اسی سے کارخانے چلتے ہیں۔ اسی سے یہاں کی ٹریم گاڑیاں چلتی ہیں اور اسی قوت سے بمبئی سے ایک جانب پونا اور دوسری جانب اگت پوری تک ریل چلائی جاتی ہے۔ یہ انتظام صرف ریاست بمبئی میں ہی نہیں ہے بلکہ اس طرح کی آبی قوت سے سارے ہندوستان میں بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ جس سے بجلی کے قمقمے رات میں دن کی سی کیفیت پیدا کر رہے ہیں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ملک کے ہزاروں کل اور کارخانے رات دن اسی آبی قوت کے بل بوتے پر چل رہے ہیں۔

یوں تو کوئلے اور تیل سے بھی بجلی پیدا ہوتی ہے پھر بھی ایک دن ایسا آ سکتا ہے جب کہ کوئلہ اور تیل جل کر ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک ہماری زمین گردش کرتی رہے گی، آسمان چمکتا رہے گا اور پانی برستا رہے گا۔ آبی قوت کا ذریعہ پانی کبھی ختم نہیں ہو سکے گا۔ گویا دوسرے لفظو میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئلے اور تیل کی ایک عارضی حیثیت ہے اور آبی قوت کی دائمی۔ ہاں تو صاحب دیکھا آپ نے یہ ہیں پانی کی کرشمہ سازیاں۔

احمد حسین

چاند میں خرگوش

کہتے ہیں کہ بنارس کے پاس ایک جنگل میں چار جانور رہتے تھے۔ ایک خرگوش، ایک گیدڑ، ایک بندر اور ایک اودبلاؤ ــــ یہ چاروں بڑے سمجھدار تھے اور خیرات دینے کے معاملے میں بڑے دل والے جانور تھے۔ جو کچھ اُن کے پاس ہوتا تھا خوشی خوشی دے دیتے تھے۔ اور جب اُن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو وہ روزہ رکھتے۔

ایک دن اُس جنگل میں ایک آدمی کا گزر ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ گیدڑ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں بیٹھا ہوا ہے۔

"بھائی گیدڑ، اگر ہو سکے تو مجھے دان میں کچھ دے دو۔ میں کئی روز کا بھوکا ہوں۔"

"ضرور ــــ ضرور ــــ اچھے وقت سے آگئے میرے پاس بچھڑے کا مزیدار گوشت ہے۔ تم لے جاؤ پکا کر کھاؤ۔"

"مگر میں یہ گوشت نہیں کھاتا۔" اس کا مُنہ اُتر گیا اور ایک طرف کو چل دیا۔

آگے چل کر اس نے دیکھا کہ ایک اودبلاؤ بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے بھی اُس نے اسی طرح کا سوال کیا۔ اودبلاؤ نے کہا "میرے پاس مچھلی ہے لو تم لے جاؤ۔" مگر اس آدمی نے

اُسے بھی لینے سے انکار کر دیا ۔ اب وہ آگے بڑھا تو اُسے ایک بندر صاحب نظر آئے ۔ اس نے بندر سے بھی یہی کہا ۔ بندر نے آم اُن کے سامنے رکھا اور کہا "لے جاؤ ۔ خوب مزے لے لے کر کھاؤ ۔" لیکن اس آدمی نے کہا کہ میں پھل نہیں کھاتا ۔ یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا ۔

آخیر میں اُسے خرگوش ملا ۔ جو گھاس پر لیٹا ہوا سو رہا تھا ۔ اُس آدمی نے بڑی عاجزی سے کہا " بھائی جان میں بہت بھوکا ہوں ۔ مجھے کچھ کھانے کو دو ۔" خرگوش چونک پڑا ۔ اس نے کہا کہ اس وقت سوائے گھاس کے میرے پاس ہے کیا اور آدمی گھاس تو کھاتا نہیں ۔ اس نے سوچا کیوں نہ میں اپنے آپ کو پیش کر دوں ۔

خرگوش نے کہا " آگ جلاؤ ابھی ذرا سی دیر میں تم کو کھانا ملتا ہے ۔"

اس آدمی نے آگ جلائی ۔ جیسے ہی آگ جلی خرگوش اس میں چھلانگ لگا کر کود پڑا ۔ لیکن جلنے کے بجائے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ٹھنڈے پانی میں پڑا ہو ۔ اس نے فقیر سے کہا "تم نے کیسی آگ جلائی ذرا پھر جلاؤ ۔"

یہ سُننا تھا کہ وہ آدمی اچھل کر بہت اونچا ہو گیا ۔ پیڑوں اور پہاڑوں سے بھی لمبا اور بولا :-

" پیارے خرگوش ، میں تو تمہارا امتحان لے رہا تھا ، اب میں تم کو آسمان پر پہنچادوں گا تاکہ ساری دنیا تم کو ہمیشہ دیکھ سکے ۔

یہ کہہ کر اس نے ایک پہاڑ کو اپنی مٹھی میں اُٹھا کر جو بھینچا ہے تو اس میں سے عرق نکل پڑا ۔ اب تو اس نے پہاڑ کی چوٹی کا قلم بنایا اور اس عرق سے پورے چاند پر ایک خرگوش کی تصویر بنا دی ۔ کیا آپ نے کبھی چاند میں اس خرگوش کی تصویر دیکھی ہے ۔

آپ نے فلم تو بہت دیکھیں ہوں گے، مگر کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اتنی مقبول چیز کا موجد کون ہے۔ اور سب سے پہلے کس نے اور کس طرح پہلی فلم بنائی لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ اتنی دلچسپ اور عجیب و غریب چیز کی ایجاد کا سہرا کس ملک کے سر ہے۔ جس ملک کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ وہی فلمی صنعت کا موجد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکہ انگلینڈ اور فرانس میں تقریباً ایک ساتھ اس صنعت کی ابتدا ہوئی۔ امریکہ میں سب سے پہلے اڈیسن کے ذہن میں فلم بنانے کی دُھن سوار ہوئی۔ شروع میں تو لوگ اس کو سائنس کی ایک عجیب و غریب ایجاد ہی سمجھ رہے تھے۔ اس وقت کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ فلم ایک دن لوگوں کی زندگی کا ایک ضروری حصّہ بن جائے گا۔ اور دنیا کے ۳۰ کروڑ آدمی ہر ہفتے اسے دیکھا کریں گے۔

ایڈیسن کی اس عجیب و غریب ایجاد سے ہندوستان والے ابھی تک بے خبر تھے۔

چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک بمبئی
کمپنی لومیئر براورز یہاں سب سے پہلا فلم لائی۔
جس کا پہلا شو ۱۴ر جولائی ۱۸۹۴ء میں بمبئی
کے ناولٹی سینما میں دکھایا گیا۔ چلتی پھرتی، زندہ
تصویروں کو پردہ پر دیکھ کر لوگ مارے خوشی
کے حیرت میں پاگل سے ہو گئے۔ مگر ان کی سمجھ
میں کچھ نہ آیا کہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور
ناچتی ہوئی لڑکیاں کس طرح پردہ پر دکھائی
جا سکتی ہیں۔

اِن دنوں ایک ہندُستانی طالب علم
دادا پھالکے کو تصویریں کھینچنے کا شوق پیدا
ہوا۔ یہ شوق ان کو یورپ لے گیا۔ وہاں انھوں
نے حضرت عیسٰی کے بارے میں ایک فلم دیکھی
یہاں آکر انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ وہ
خود ایک ہندُستانی تصویر بنائیں۔ چنانچہ انھوں
نے ایک فلم کمپنی کھولی۔ اس میں وہ خود ہی
ہر کام کرتے تھے۔ وہ مستقل طور پر اسی دھن
میں لگے رہے۔ دن رات محنت کر کے انھوں
نے ۱۹۱۳ء میں ہندستان کی پہلی فلم "ہریش
چندر" تیار کر ڈالی۔ یہ تجربہ بے حد کامیاب
ثابت ہوا۔ پھر تو انھوں نے اپنی زندگی میں
تقریباً ۲۰۰ تصویریں تیار کیں۔

دادا پھالکے نے جس کام کو شروع کیا
اس کو آگے لے جانے کے لئے بہت سے
لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں فلم
بنانے پر بہت کم روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ مگر
وہ تو زمانہ ہی اور تھا۔ ہر چیز سستی ملتی تھی۔
مگر آج کل تو کم سے کم چار لاکھ روپے میں
فلم تیار ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض بعض
اداکار ایک فلم میں کام کرنے کے ایک ایک
لاکھ روپیہ لے لیتے ہیں۔

فلموں کے ابتدائی زمانے میں تصویر اتارنے
کا کام میدانوں، سڑکوں، اور باغات میں
ایسی جگہوں پر ہوتا تھا جہاں سورج کی
روشنی خوب اچھی طرح پہنچتی ہو۔ گویا فلم
بننے کا انحصار قدرت پر تھا۔ جہاں بادل
آتے اور شوٹنگ بند ہو جاتی۔ برسات میں
تو یہ کام بالکل ہی بند رہتا۔ لیکن ۱۹۲۰ء
میں جب فلمی تصویریں لینے میں بجلی کی روشنی
کا استعمال شروع ہوا تو سارے فلم میدانوں
اور سڑکوں کے بجائے اسٹوڈیو کے اندر بننے
لگے۔ اگر آپ نے اسٹوڈیو دیکھا ہے تو آپ

(بقیہ صفحہ ۳ پر دیکھئے)

نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ فلم لینے کے لئے ایک بہت لمبا ہال بنایا جاتا ہے اور چھت کے نیچے ایک گیلری ہوتی ہے اس پر روشنی کے بڑے بڑے بلب لگے رہتے ہیں۔ جب فلمیں بنائی جاتی ہیں تو اسٹوڈیو کو اچھی طرح بند کر دیا جاتا ہے تاکہ سورج کی روشنی کی ایک کرن تک اندر نہ آنے پائے۔ اس کے بعد فلم والے اپنی بجلی کی روشنی کو استعمال کر کے فلمیں بناتے ہیں۔ یہ روشنی فوٹوگرافر کے اختیار میں ہوتی ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جتنی روشنی چاہتا ہے، ڈالتا ہے۔ اور پھر تصویریں کھینچتا ہے۔

اسٹوڈیو کے اندر بڑے بڑے مکان بنائے جاتے ہیں۔ انھیں میں فلم کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ مکان توڑ دئے جاتے ہیں اور دوسرے منظر کے لئے دوسرے مکان بنائے جاتے ہیں۔ ایک اک فلم میں پچاسوں طرح کے مکان بازار، پہاڑ اور دریا دکھائے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب اسٹوڈیو میں کرنے پڑتے ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے فلموں کو ترقی کے چار دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور وہ تھا جب کہ لوگ صرف ایسی چیزوں کی فلمیں تیار کرتے تھے جن کا تعلق حرکت سے تھا۔ اس لئے عام طور پر سمندر کی موجیں، آندھی کے مناظر، اچھل کود اور مہا بھارت اور راماین کی کہانیوں کی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔

فلموں کے اس ابتدائی دور کے بعد جب لوگ اس سے تھوڑا بہت مانوس ہو گئے تو جاسوسی کہانیوں، طلسمانی قصوں کا سلسلہ شروع ہوا اور لوگوں نے شمشیر زنی، تیغ بازی، شہ سواری، اور تیراکی وغیرہ کی ایسی فلمیں بنانا شروع کیں جن میں ایک ہیرو نہ جانے کتنے بدمعاشوں کو بھگا دیتا ہے۔

تیسرے دور میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد قسم کی کہانیوں کی فلمیں بنیں۔ ان میں تصویروں کے ذریعے ساری کہانی دکھائی گئی۔

لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب خاموش تصویریں بن رہی تھیں لیکن اسی زمانے میں یورپ میں بولتی ہوئی فلمیں بن رہی

تھیں چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ہندستان میں ایک
فن کار "اردشیر ایرانی" نے پہلی بولتی ہوئی
فلم بنائی۔

فلمیں بولتی ہیں یہ بات لوگوں کو حیرت
میں ڈال دیتی ہیں لیکن اگر آپ سینما کی کسی
فلم کا ٹکڑا اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایک
سائز کے چھوٹے چھوٹے چھپے نظر آئیں گے
پس اسی لائن میں آواز بھری ہوتی ہے۔
فلم بناتے وقت تصویریں اتارنے اور آواز
بھرنے کا کام ایک ساتھ مگر الگ الگ جگہوں
پر ہوتا ہے۔ جس جگہ اداکار کھڑے ہو کر
ایکٹنگ کرتے ہیں ان کے سر کے کچھ اوپر
ایک آلہ لگا دیا جاتا ہے جس کو "مائک"
کہتے ہیں۔ اس مائک کا تعلق اسٹوڈیو سے
باہر آواز بھرنے والی مشین سے ہوتا ہے۔
وہاں بیٹھا ہوا آدمی اندر کی ساری آوازوں
کو اپنے فلم کے فیتے میں بھرتا رہتا ہے۔
اس پر باریک اور موٹی اور کالی لکیریں بنتی
رہتی ہیں۔ اگر آواز بھاری ہوگی تو موٹی لکیر
بنے گی ورنہ باریک۔ اس طرح اسٹوڈیو کے
باہر آواز بھرنے کا کام ہوتا رہتا ہے۔
اور اسٹوڈیو کے اندر کیمرہ اداکاروں کی تصویریں
اتارتا رہتا ہے۔

ہاں تو ہمارے ہندستان کی سب سے
پہلی فلم اردشیر ایرانی کی "عالم آرا" تھی۔
فلم کے معاملے میں ہمارے دیس میں بمبئی
سب سے آگے رہا ہے۔ چنانچہ ۱۴ مارچ
۱۹۳۱ء کو عالم آرا بمبئی کے میجسٹک ہال میں
دکھائی گئی۔ فلمی پردے کے گونگے پتلوں کو
گویا زبان مل گئی۔ اس انوکھی فلم کی سارے
ہندستان میں دھوم مچ گئی۔ "عالم آرا"
کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا فلموں کی
مقبولیت بڑھتی گئی۔ ہندستان میں ہر
سال ۲۰ کروڑ آدمی فلم دیکھتے ہیں۔ اور اب
تو شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جہاں سینما
ہال نہ ہوں۔ بلکہ اب تو حکومت کی طرف
سے تعلیمی فلموں کے دکھانے کا بھی انتظام
ہو گیا ہے یہ لوگ گاؤں گاؤں موٹروں میں
سینما کی مشین فٹ کر کے لے جاتے ہیں اور
کسی بڑے میدان میں پردہ لگا کر فلمیں
دکھاتے ہیں۔ اس طرح فلم سے دیہاتی

سید اختر ملک

بہادر حجام

کسی زمانے میں ایک راجا تھا وہ بہت ظالم تھا اور غصہ تو ہر دم اس کی ناک پر رکھا تھا۔
اپنی رعایا کو معمولی معمولی باتوں پر قتل کروا دیتا تھا۔ اُس کے دربار میں اور دوسرے لوگوں کے
ساتھ ساتھ حجاموں پر تو خاص طور پر ظلم ہوتا تھا۔ جب یہ راجا حجامت بنواتا تو داڑھی بنواتے
وقت اگر زرا سا بھی خون نکل آتا تھا تو وہ اس حجام کو قتل کروا دیتا تھا۔ جب بہت سے
حجام اس طرح بے گناہ قتل کر دیے تو اب کوئی بھی حجام راجا کی داڑھی بنانے کے لئے تیار نہ
ہوا کچھ حجاموں نے تو ڈر کے مارے وہ ریاست ہی چھوڑ دی۔

آخر ایک دن ایسا آ گیا کہ راجا کو داڑھی بنانے کے لئے کوئی حجام نہ ملا۔ اب تو راجا
بہت پریشان ہو گیا اس نے حجاموں کے چودہری کو بلایا اور اس سے کہا کہ تم کو میری حجامت
بنوانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ تم یہاں کے چودہری ہو اور اگر تم نے دو روز کے
اندر اندر یہ انتظام نہ کر دیا تو تم قتل کر دیے جاؤ گے۔ یہ حکم سُن کر چودہری کانپ اٹھا
آخر اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مہاراج! اب تک جس کسی نے آپ کی داڑھی بنائی اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ سارے حجام ریاست چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ میں کہوں تو کس سے کہوں"۔

لیکن راجا بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ ظالم تو تھا ہی یہ بات سُن کر بہت ناراض ہوا اور بولا "میں کچھ نہیں جانتا اگر تم تین دن کے اندر انتظام نہیں کر سکے تو تم کو کل اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا"۔

اب تو چودھری کی حالت اور خراب ہو گئی۔ اس کو یقین ہو گیا کہ اس کی بس ایک ہی دن کی زندگی اور ہے۔ اسی پریشانی کی حالت میں وہ گھر آیا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پڑ گیا۔ اس کی لڑکی کو جب معلوم ہوا کہ اس کا باپ کیوں پریشان ہے تو اس نے کہا "ابا جان! آپ غم نہ کریں، آپ مجھے راجا کے دربار میں لے چلئے میں خود راجا کی حجامت بناؤں گی"۔

چودھری نے روہانسی ہنسی ہنس کر کہا "بیٹا! تو کیوں بیوقوفی کی بات کر رہی ہے۔ اتنے اچھے اچھے حجام اپنی جان سے گئے، تو جا کر کیا حجامت بنائے گی۔ ذرا سا خون نکلنے پر وہ قتل کر دیتا ہے۔ میں تجھے کیسے اجازت دے دوں"۔ مگر لڑکی ایک نہ مانی۔ اُس نے کہا کہ چاہے کچھ ہو میں تو اب راجا کی حجامت ضرور ہی بناؤں گی۔ بیچارا چودھری کیا کرتا، مجبوراً اس نے اجازت دے دی۔

اگلے دن چودھری کی لڑکی حجام کا بھیس بدل کر دربار میں پہنچی، اور بولی "مہاراج! مجھے چودھری نے آپ کی حجامت بنانے کے لئے بھیجا ہے"۔

راجا نے کہا "تم کو معلوم ہے کہ میرے دربار کا کیا اصول ہے۔ اگر میری داڑھی بناتے وقت خون کا ایک قطرہ بھی نکل آیا تو تم قتل کر دئے جاؤ گے"۔

نوجوان حجام نے بڑی ہمت سے کہا "آپ کوئی نئی بات نہیں سُنا رہے ہیں، مجھے یہ بات پہلے سے معلوم ہے۔ اگر خون کا ایک قطرہ بھی نکل آئے تو آپ

بے شک مجھے قتل کر دیجئے۔ لیکن مجھے تو اپنے فن اور اپنی ہمت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔

الغرض راجا اس کے سامنے حجامت بنوانے کے لئے بیٹھا۔ ذرا سی دیر میں اس کی حجامت بن گئی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ راجا کی داڑھی سے بوند بھر خون بھی نہ نکلا۔ سارے درباری حیرت میں پڑ گئے۔ راجا بہت خوش ہوا اور اس نے اُسے درباری حجام مقرر کردیا۔ فوراً ہی راجا نے کہا "لیکن ایک بات تو بتاؤ، ہمارے دربار میں آج تک ایک سے ایک حجام آئے لیکن تمھارے سوا کسی کو کامیابی نہ ہوئی اس کی کیا وجہ ہے؟"

حجام نے نڈر ہو کر کہا "حضور اگر جان بخشی کریں تو کچھ عرض کروں؟"

راجا نے کہا "اچھا ہم جان بخشی کرتے ہیں لیکن بات صحیح بتانا۔"

اس نے کہا "مہاراج! آج تک جتنے حجام بھی آتے رہے وہ آپ سے بے انتہا ڈرتے تھے۔ اور آپ کا چہرہ دیکھ کر ان کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ڈر کے مارے ان کا ہاتھ کانپ اٹھتا ہے اور استرا لگ جاتا تھا۔ اسی لئے جب میں نے داڑھی بنانی شروع کی تو ڈر کو بالکل ہی دل سے نکال دیا۔ اور طے کر لیا کہ اگر ذرا سا بھی خون نکلا تو اسی استرے سے آپ کی گردن کاٹ ڈالوں گا۔ کیونکہ خون نکلنے پر آپ میری جان ویسے بھی لے لیتے اور آپ کی جان چلی جانے سے میری برادری کے بہت سے لوگوں کی جان بچ جاتی اور نہ جانے کتنوں کا بھلا ہوتا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا مردانہ لباس اتار دیا۔ اس لڑکی کی ہمت اور بہادری دیکھ کر راجا بہت خوش ہوا اور اس نے اُسے اپنی منہ بولی بیٹی بنا لیا۔

لڑکی کا باپ جو حجاموں کا چودھری تھا اپنی لڑکی کی بہادری سے بہت خوش ہوا۔

سید حسن

اولمپیائی کھیل

آج کل یورپ کے سب ہی کھیلوں کا ہندوستان میں رواج ہو گیا ہے۔ مگر ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ہاکی تو ہندوستان والے اتنی اچھی کھیلتے ہیں کہ دنیا کا کوئی ملک ان سے بہتر نہیں کھیل سکتا۔ دھیان چند کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ یہ ہاکی میں دنیا کے سب سے اچھے کھلاڑی مانے گئے ہیں۔ ان کا کھیل کیا تھا بس جادو ہی سمجھیے۔ گیند ان کی غلام ہوتی۔ جہاں چاہتے، جیسے چاہتے پورے میدان میں لئے پھرتے اور کیا مجال جو کوئی چھین لے۔ پھر گول اس خوبصورتی سے کرتے کہ مخالف ٹیم بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اکثر انھیں ہاکی کے جادوگر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہماری ہاکی ٹیم اولمپیائی کھیلوں میں کئی دفعہ جا چکی ہے۔ اور ہر بار جیت کر آئی ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ ہم نے ان کھیلوں میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت سے ہم ہی ہاکی کے چیمپئن بنے بیٹھے ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک آج تک ہمیں ہرا نہیں سکا ہے۔ اور یہ کارنامہ کھیلوں کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔

لیکن کبھی اولمپیائی کھیلوں کا مطلب بھی آپ سمجھے؟

اولمپیائی ایک یونانی لفظ اولمپیا سے بنا ہے
اولمپیا یونان کی ایک وادی کا نام ہے، جس میں
دریائے الفیوس بہتا ہے۔ یہ وادی بے حد خوبصورت
اور سرسبز ہے۔ پہلے زمانے میں یونانیوں کا
خیال تھا کہ وہ دیوتاؤں کے رہنے کی جگہ ہے۔
چنانچہ یہاں انھوں نے دو مندر بہت عالیشان
تعمیر کئے۔

یہ واقعات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش
سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے کے ہیں۔ اس
زمانے میں یونان کی تہذیب بہت ترقی پر تھی۔
سینکڑوں فلسفی، سائنسدان، حکیم اور سورما اس
سرزمین میں پیدا ہوئے۔

یونان کے لوگ بہت سمجھدار تھے۔ وہ
سمجھتے تھے کہ ہمارا دماغ چاہے کتنا ہی ترقی کر جائے
لیکن جسم مضبوط نہ ہو تو ہم پوری ترقی نہیں کر سکتے۔
ان کا خیال تھا کہ ترقی کے لئے علم ضروری ہے
جس کا تعلق دماغ سے ہے لیکن دماغ کا تعلق
جسم سے ہے۔ اس لئے اچھے اور صحت مند
دماغ کے لئے اچھا اور صحت مند جسم ضروری
ہی نہیں ناگزیر ہے۔ بغیر اس کے انسان صحیح
معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انھوں نے
جگہ جگہ ایسے اکھاڑے تیار کئے جن میں بچوں
سے لے کر بوڑھے تک جمع ہوتے اور طرح
طرح کی ورزشوں سے اپنے جسم کو سڈول اور
مضبوط بناتے۔ اس قسم کی ورزش گاہوں میں
سے ایک زبردست ورزش گاہ اولمپیا کے میدان
میں بھی قائم کی گئی تھی۔

جب ورزش اور کھیلوں کا زیادہ چرچا ہوا
تو آپس میں مقابلے بھی ہونے لگے۔ مقابلے کے
دوسرے کھیل مثلاً لمبی کود، اونچی کود، لنگڑی کود
رکاوٹی دوڑ، سائیکل دوڑ، کشتی، گھونسہ بازی
نیزہ بازی، ہاکی، فٹ بال، باسکٹ بال اور
تیراکی وغیرہ تو بعد کی چیزیں ہیں۔ ابتدا میں تو
صرف معمولی دوڑ ہوا کرتی تھی۔

شروع شروع میں یہ مقابلے جگہ جگہ ہوا کرتے
تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی چھ سو
برس پہلے ایک تہوار کی صورت میں اولمپیا کے
میدان میں ہونے لگے۔ ملک کے ہر گوشے سے
لوگ آ آکر اس میں شریک ہوتے۔ یہ تہوار
سب سے پہلی مرتبہ ۷۷۶ ق م میں بہت بڑے
پیمانے پر منایا گیا۔ اور اس کے بعد سے یہ
قاعدہ بن گیا کہ ہر چار سال کے بعد اولمپیا کے

میدان میں یہ مقابلے ہوتے۔ تہوار شروع ہونے سے چند روز پہلے ڈھنڈورچی تمام یونان میں اعلان کرتے کہ اولمپیا کے مقابلے شروع ہونے والے ہیں۔ آپس کے تمام جھگڑے اور لڑائیاں روک دی جائیں۔ یہ اعلان اس لئے ہوتا تھا کہ ملک کے ہر گوشے سے لوگ بے خوف خطر مقابلے میں شرکت کے لئے آسکیں۔

یہ مقابلے عام نہ تھے شرکت پر خاص پابندیاں تھیں۔ عورتیں، بدیسی یعنی غیر یونانی اور غلاموں کو حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح حصہ لینے والے کے لئے ضروری تھا کہ وہ کبھی کسی جرم کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ اچھے اور پاکیزہ اعمال کا مالک ہو۔ کم سے کم دس مہینے سے مقابلے کی تیاری کر رہا ہو۔ اور آخری مہینہ اولمپیا ہی میں گذارا ہو۔ پھر مقابلے سے پہلے ان سب کا معائنہ ہوتا۔ اور یہ مقابلے میں دیانتداری سے حصہ لینے کا وعدہ کرتے۔ بھلا سوچئے تو جو اِن تمام منزلوں سے گذر کر اپنے حریفوں سے بازی لے جاتا ہوگا اس کی کتنی قدر و منزلت ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شاعر حضرات ان پر نظمیں کہتے تھے۔ سنگ تراش ان کے مجسمے بناتے تھے۔ عوام ان کا جلوس نکالتے تھے اور یہ ملک کے بہادر فرزند کہلاتے تھے۔ کپ اور تمغوں کے بجائے زیتون کی مقدس پتیوں کا تاج بنا کر ان کے سروں پر رکھا جاتا تھا۔ یہ یونانیوں کے نزدیک سب سے بڑا اعزاز و انعام تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اعزاز و انعام سے پہلے اس کا حق پیدا کرنا کوئی ان سے سیکھے۔

یونانی کھیلوں کا یہ سلسلہ ۳۹۴ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد بند ہوگیا۔ یونان کی تہذیب مٹنی شروع ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک کے بہادر فرزندوں کے کارنامے بھی تاریخ کی کتابوں میں دفن ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۶ء میں ان کھیلوں میں پھر ایک مرتبہ روح پھونکی گئی۔ مقابلے جاری کئے گئے۔ یونان کی سرزمین ایتھنز میں پہلا مقابلہ ہوا۔ جس میں نہ صرف یونان بلکہ دوسرے ملکوں کے کھلاڑیوں نے بھی حصہ لیا۔ گویا شرکت عام کر دی گئی۔ اور یہ مقابلے بھی بین الاقوامی قرار پائے۔ ۱۹۱۲ء سے عورتوں پر سے بھی پابندی اُٹھا دی گئی۔ اور وہ بھی اب اولمپیائی مقابلوں میں شریک ہونے لگیں۔

اس وقت سے جنگِ عظیم کے زمانے کو چھوڑ کر ہر چار سال کے بعد مختلف ملکوں میں کھیلوں کا

یہ بین الاقوامی مقابلہ اولمپیائی کھیلوں کے نام سے ہوتا رہتا ہے۔ اس کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی ہے جس میں ہر حصہ لینے والے ملک کا کوئی نہ کوئی نمائندہ ہوتا ہے۔ اب تو ہر ملک میں صوبے وار اور ہر صوبے میں شہروں کے مقابلے بھی اولمپیائی کھیل ہی کے نام سے ہوتے ہیں۔ تاکہ ان مقابلوں کو عام کرکے ایک طرف یونان کے اس تصور کو عام کیا جائے کہ حقیقی ترقی کے لئے صحت مند و توانا جسم کی ضرورت ہے اور دوسری طرف بین الاقوامی اولمپیائی کھیلوں کے لئے ملک میں بہتر سے بہتر کھلاڑی تیار کئے جاسکیں۔

اولمپیائی کھیلوں کا مقصد کھلاڑی میں تیزی بلند پروازی اور توانائی پیدا کرنا ہے، تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی اس احساس کو جگہ دے سکے۔ چاق چوبند رہے۔ تندرست و توانا بنے اور اعلیٰ خیالات کو اپنائے۔ قومی جھنڈوں کی طرح اب اولمپیائی کھیلوں کا بھی اپنا ایک خاص جھنڈا ہے۔ اس کی زمین سفید ہے۔ یہ امن کی نشانی ہے۔ پھر اس نیلے، پیلے کالے سبز اور لال رنگوں کے پانچ دائرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ جو دنیا کے پانچ براعظموں ایشیا، افریقہ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکہ کو ظاہر کرتے ہوئے یہ دائرے اور جھنڈے کا سفید رنگ دنیا کے سب ملکوں کے میل جول کو ظاہر کرتا ہے۔

مقابلے کے دنوں میں دنیا کے کونے کونے سے کھلاڑی ایک جگہ جمع ہوکر عالمگیر اخوت اور دوستانہ تعلقات کی وہ مثال پیش کرتے ہیں کہ وقت کے سارے جھگڑے بے حقیقت اور بے معنی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہر کھلاڑی امن و سلامتی کا ایک پیامبر نظر آتا ہے۔

افتتاح کے دن اولمپیائی جھنڈے کی سلامی کھلاڑیوں کا مارچ پاسٹ یعنی قدم ملائے ہوئے اسٹیڈیم میں چکر لگانا، کبوتروں کا اڑانا، اور ایک کھلاڑی کا مشعل لے کر اسٹیڈیم میں داخل ہونا دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر تمام کھلاڑیوں کی طرف سے ایک کھلاڑی کا آگے بڑھ کے حلف وفاداری اٹھانا کہ:-

"ہم دل سے عہد کرتے ہیں کہ کھیلوں کے اس مقابلے میں دیانتداری سے قاعدے قانون کی پابندی کرتے ہوئے، سچے کھلاڑی کی شان سے حصہ لیں گے۔ تاکہ ہمارے ملک کا نام روشن ہو اور کھیل کا بول بالا ہو۔"

خوش قسمت ہیں وہ جنھیں ان کھیلوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا ہے۔

ایک انگریز:۔ (ہوٹل کے بیرے سے) یہاں کھانے کو کیا کیا چیزیں ملتی ہیں ؟
بیرہ:۔ پلاؤ، ڈبل روٹی، گوشت، قورمہ، بریانی وغیرہ وغیرہ۔
انگریز:۔ تو صاحب ہمیں وغیرہ وغیرہ ہی دو۔ یہ کوئی نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔

استاد:۔ بتاؤ برف کا مونث کیا ہے ؟
شاگرد:۔ جناب برفی !

استاد:۔ سلیم ! بتاؤ سکندر ہندستان کب آیا ؟
سلیم:۔ جناب محمود سے پوچھ لیجئے اسی کا بھائی ہے۔

استاد:۔ بتاؤ دُنیا کی سب سے ٹھنڈی جگہ کونسی ہے؟
شاگرد:۔ جی ! برف خانہ

استاد:۔ پھول حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے؟
شاگرد:۔ مالی سے دوستی کر لی جائے۔

استاد:۔ آج تم نے کسی کے لئے کوئی ایثار کیا ہے۔
شاگرد:۔ جی میں نے اپنے حصے کی دوا اپنی ننھی بہن کو پلا دی۔

(خدیجہ تارا اروئی۔ برہان پور)

ایک دوست:۔ بنگالی (زبان) اور پنجابی (زبان) میں کیا فرق ہے
دوسرا:۔ بنگالی چاول کھاتے ہیں اور پنجابی روٹی۔

ماسٹر صاحب:۔ بچو! سالانہ امتحان آج سے دو تین دنوں کے بعد ہونے والا ہے۔ اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لے۔
ایک لڑکا:۔ ماسٹر صاحب پرچے کس چھاپے خانے میں چھپ رہے ہیں۔

انجم

ستاروں کی باتیں

جب چاند نہیں نکلتا اور رات اندھیری ہوتی ہے' آسمان پر ہر طرف تارے ہی تارے چھٹکے نظر آتے ۔ اتنے سارے کہ اگر آپ ان کو مسلسل گنتے رہیں تو نہ جانے کتنے سال گزر جائیں بلکہ تاروں کی سائنس جاننے والوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ اگر یہ سارے تارے آپ کو نظر آجائیں اور کوئی شخص اِن کو گن سکے تو کم از کم ایک ہزار سال کی تین لاکھ ۶۵ ہزار راتیں اُسے گنتے گزر جائیں گی۔ لیکن تاروں کی گنتی پھر بھی ختم نہ ہوگی ۔ اب بھلا بتائیے کہ کون ایک ہزار سال زندہ رہ سکتا ہے ۔ جو تارے ہی گنے لیکن اس بات سے یہ تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ تارے کتنے بہت سے ہیں۔ پھر ایک دلچسپ بات، یہ بھی ہے کہ یہ تارے آپ کو نظر ہی کب آتے ہیں ۔ ہم بلا دوربین کے زیادہ سے زیادہ ڈھائی ہزار ستارے تک آپ دیکھ سکتے ہیں۔

ہم آپ انکو ننھے منے تارے کہتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ننھے منے نہیں ہیں یہ تو اتنے بڑے ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے. چھوٹے تو اس لئے نظر آتے ہیں کیونکہ ان کا

فاصلہ ہی کروڑوں کیا بلکہ اربوں میل ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ فاصلہ کتنا بہت ہے کہ اس کو میلوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اسی لئے ستاروں کی سائنس کے ماہروں نے اس کے فاصلے کے ناپنے کا نیا طریقہ نکالا ہے اور وہ ہے روشنی کی رفتار سے۔ دلّی سے بمبئی کا فاصلہ ۸۶۱ میل ہے لیکن اگر آپ اس کو انچوں میں بتائیں تو یہ ۵ کروڑ انچ سے بھی زیادہ ہوگا۔ یہ فاصلہ سُن کر لوگوں کو کتنی ہنسی آئے گی اور یہی وجہ ہے کہ آپ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے یہ بتائیں کہ یہ فاصلہ ۸۶۱ میل کا ہے۔ اسی طرح ستاروں کے فاصلے کچھ اتنے ہوتے ہیں کہ سائنس والوں نے میلوں کے بجائے روشنی کی رفتار سے اس کا پیمانہ بنایا ہے۔ اس کو سائنس داں "روشنی سال" یا (LIGHT YEAR) کہتے ہیں۔ روشنی سال وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ جب سائنس داں یہ کہتے ہیں کہ ایک ستارہ ایک روشنی سال کے فاصلے پر ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ روشنی کو یہ سفر کر کے ہم تک پہنچنے میں ایک سال لگتا ہے۔

اس سے آپ نے اندازہ لگایا کہ ستارے کتنے فاصلے پر ہیں۔ واقعی یہ کتنی حیرت کی بات ہے جو ستارہ سب سے نزدیک ہے وہ سوا چار روشنی سال کے فاصلے پر ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ستارے کتنے بڑے ہوں گے۔ ہماری زمین سے اُن کا کیا مقابلہ؟ یہ تو سورج سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑے ہیں۔

اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے (اور اس کی روشنی زمین تک تقریباً ۸ منٹ میں آتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اگر ہمارا تیز سے تیز جہاز سفر کرے تو اُسے اتنے فاصلے پر پہنچنے کے لئے ۲۵ سال لگیں گے۔ ویسے تو نو کروڑ تیس لاکھ میل کا فاصلہ بھی بہت ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کو یہ بتائیں کہ بے شمار ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی کو دنیا میں پہنچتے پہنچتے سو سال یا اس سے بھی زیادہ لگ جاتے ہیں۔ تو آپ کیا کہیں گے۔ ایک

چمکدار ستارہ جس کو انگریزی سائنس داں "انتاریز" کہتے ہیں اس کی روشنی کو یہاں آتے آتے چار سو سال لگتے ہیں۔ جب کہ یہ بات معلوم ہے کہ سب سے زیادہ تیز رفتار روشنی ہی کی ہے۔ ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا سفر طے کر لیتی ہے۔ اس کے باوجود "انتاریز" سے روشنی کو یہاں پہنچتے پہنچتے چار سو سال لگ جاتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ انتاریز ستارے کے پاس کوئی سیارہ ہے جس میں ہماری زمین کی طرح کے انسان بستے ہیں۔ اگر ان کے پاس ایسی دوربین ہو جس سے وہ ہماری دنیا کو دیکھ سکیں تو آج کل وہ ہمایوں کا آخری زمانہ دیکھ رہے ہوں گے۔ ان کو آج اس زمانے کے ہندوستان کے مناظر نظر آ رہے ہوں گے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ بعض دوسرے ستاروں کے مقابلے میں "انتاریز" بھی قریب ہے۔ اس لئے کہ ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی لاکھوں سال میں یہاں تک پہنچتی ہے اور بہتوں کی روشنی ابھی تک یہاں پہنچ بھی نہیں سکی۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ تارے نہ جانے کیسے ہوتے ہیں۔ ستارے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے سورج۔ اس لئے کہ سورج بھی تو ایک ستارہ ہے۔ آگ کا دہکتا ہوا شعلہ۔ جس طرح سورج میں زندگی ناممکن ہے اسی طرح ستاروں میں بھی کوئی نہیں رہ سکتا۔ آگ کے تیز شعلوں میں بھلا کون جی سکتا ہے۔

ستاروں کی باتیں کتنی عجیب و غریب ہیں یہ تو سائنس دانوں کو بھی حیرت میں ڈال دیتی ہیں کبھی کبھی سائنس داں یہ بھی سوچتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض ستاروں کا اپنا کوئی "نظام شمسی" ہو۔ جیسے ہمارے سورج کا یہ نظام جس میں ہماری زمین کے علاوہ آٹھ سیارے اور شامل ہیں جو سورج کے اِرد گرد چکّر کاٹتے ہیں۔ اب آپ ہی سوچئے کہ اگر کسی ستارے کا ایسا نظام شمسی ہو اور اس میں ہماری زمین کی طرح کی کوئی زمین ہو اور اس زمین میں زندگی ہو، تو کیسا معلوم ہوگا۔ آپ کہیں گے کہ پھر یہ زمین دکھائی کیوں نہیں دیتی تو بھی اگر کچھ

سیارے اور ہوں گے بھی تو وہ اتنی دور سے کہاں نظر آسکتے ہیں کیونکہ سیاروں کی اپنی روشنی نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی کہ وہ ستاروں کے مقابلے میں بہت چھوٹے بھی تو ہوں گے لیکن بھائی یہ سب ہوائی باتیں ہیں کون جانے کہ کوئی اور دنیا ہے یا نہیں - یہ باتیں تو محض فرضی ہیں۔

ایک سوال اور پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض ستارے زیادہ چمکدار کیوں ہوتے ہیں۔ اس کے تین سبب ہیں۔ بعض ستارے دوسرے ستاروں کے مقابلے میں نزدیک ہوتے ہیں اور نزدیک کی روشنی آپ جانتے ہیں کہ زیادہ تیز نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض ستارے بڑے ہوتے ہیں اور تیسری وجہ ہے کہ بعض سیارے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گرم اور روشن ہوتے ہیں۔

ستاروں کی یہ باتیں کتنی انوکھی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ انوکھی بات یہ ہے کہ ہماری سائنس کتنی ترقی کر رہی ہے۔ ہمارے سائنس داں ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگے ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ جب ہم کو ستاروں کے بارے میں ساری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ چاند پر جانے کی تیاریاں تو کئی ترقی یافتہ ملکوں میں ہو رہی ہیں۔

عبدالحبیب ملک

سچّی دوستی

بہت دنوں کی بات ہے کہ دو بچے صبح کے وقت باغ میں ٹہلنے کے لئے نکلے لیکن ان کا دل باغ کی سیر میں نہ لگا اور وہ باغ سے باہر کھلے میدانوں میں گھومنے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے کافی دور نکل آئے اور اُنہیں پتہ نہ چلا کہ وہ کتنی دور آئے تھے۔ دونوں بھائی بہن تھے۔ لڑکے کا نام نپولین تھا اور لڑکی کا ایلنیری۔ ماں نے اُنہیں تاکید کر دی تھی کہ باغ کے باہر نہ جانا ورنہ دونوں کا جیب خرچ بند کر دیا جائے گا۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی اس کا خیال نہ رہا۔

دوسری طرف سے ایک لڑکی اپنے سر پر انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکری رکھے اُسی راستے سے گزر رہی تھی۔ اتفاق سے ایلنیری سے اُس لڑکی کو دھکا لگا اور اس کی ٹوکری گر گئی سارے انڈے پھوٹ گئے۔ لڑکی بے چاری رونے لگی۔ ایلنیری ڈری کہ کہیں ماں کو پتہ چل گیا تو شامت ہی آ جائے گی۔ لیکن نپولین کو اِس غریب لڑکی پر ترس آیا۔ اُس نے پوچھا "بہن تم روتی کیوں ہو؟ تمہارے انڈے پھوٹنے کا مجھے بہت افسوس ہے۔ گھبراؤ مت! میرے پاس کچھ پیسے ہیں انھیں لے لو۔ اور میرے ساتھ گھر چلو وہاں تمہارے سب انڈوں کی قیمت مل جائیگی۔ ایلنیری فوراً بول اُٹھی "بھیّا! یہ کیا کہتے ہو؟ امی کو جب یہ بات معلوم ہوگی تو نہ جانے

وہ کتنا خفا ہوں گی اور پھر نہ معلوم کیسی سزا ملے گی۔
نیپولین نے جواب دیا " اِس سے کیا ہوتا ہے ۔ ہم سے غلطی ہوگئی ہم سچ سچ کہہ دیں گے کہ ہم سے انڈے ٹوٹ گئے ۔ اِس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ۔ امّی ہی نے تو کہا ہے کہ جھوٹ کبھی نہ بولنا چاہیئے ۔ پھر اس لڑکی کا نقصان بھی تو ہوا ہے ۔ اس لئے ہمیں اس کی قیمت دینی چاہیئے ۔

غریب لڑکی کو ساتھ لے کر دونوں بھائی بہن گھر پہنچے ۔ نیپولین نے ماں کو سب کچھ بتا دیا لیکن قصور اپنا ہی ٹھیرایا ۔ ماں نے نیپولین کی باتیں سُن کر کہا " میں نے تم لوگوں کو کتنی بار سمجھایا کہ باغ کے باہر نہ جایا کرو ۔ لیکن تم دونوں مانتے ہی نہیں ۔ اچھا ! اس ہفتہ تم کو جیب خرچ نہیں ملے گا ۔ یہ پیسے اِس غریب لڑکی کو دیئے جائیں گے ۔ نیپولین کے ماموں بیٹھے سب باتیں سُن رہے تھے ۔ اُنہوں نے کہا کہ اِن کا قصور معاف کر دیا جائے کیونکہ اُنہوں نے سب باتیں سچ سچ کہہ دی ہیں ۔ ایلینیری کھڑی بھائی سب باتیں سُن رہی تھی ۔ اِس سے نہ رہا گیا اور وہ بولی کہ " امّی ! بھائی جان تو بالکل بے قصور ہیں دھکا مجھ سے لگا تھا ۔ مجھے بچانے کے لئے اُنہوں نے سارا الزام اپنے اُوپر لے لیا ۔

ماں نے اپنے بھائی کے کہنے پر دونوں کو معاف کر دیا ۔

غریب لڑکی یہ سب تماشہ حیرت سے دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی —— " انڈوں کی پوری قیمت تو یہیں وصول ہوگئی ۔ اَب مجھے انڈوں کے پیسے نہیں چاہیئں ۔ راستے میں نیپولین نے مجھے کچھ پیسے دیئے تھے یہ بھی لے لیجئے ۔

نیپولین کی ماں کو بڑا تعجب ہوا ۔ خاص طور پر یہہ سُن کر کہ وہ بہت بیمار ہے ۔ اِسی لیئے وہ غریب لڑکی انڈے بیچ کر دوا خریدنے کے اِرادے سے جا رہی تھی ۔ نیپولین کی ماں پر اس کی تکلیف دہ حالت کا بڑا گہرا اثر پڑا اور وہ نیپولین اور ایلینیری کو لئے ہوئے اس غریب لڑکی کے گھر روانہ ہوئی تاکہ اس کی ماں کو تسلی دے ۔

اُن کی جھونپڑی پہاڑ کے نیچے ایک خوبصورت جگہ پر تھی ۔ جھونپڑی کو دیکھتے ہی غریب لڑکی

چلا اُٹھی! وہ دیکھئے ہمارا گھر نظر آ رہا ہے! تھوڑی دیر میں سب لوگ جھونپڑی کے اندر پہنچ گئے۔ جھونپڑی بہت ہی خراب حالت میں تھی۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی چیزیں ایک طرف سلیقے سے رکھی تھیں پھٹے پرانے کپڑے بھی ایک کونے میں نظر آ رہے تھے۔ غریب ہونے کے باوجود وہ سلیقہ سے رہتے تھے۔ اُس کی ماں ایک کونے میں چارپائی پر لیٹی تھی۔ بیماری سے اُس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں نیپولین کی ماں اُس سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دور پر اس لڑکی کا بھائی بیٹھا جال بُن رہا تھا نیپولین اس کے پاس چلا گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

نیپولین پر اس لڑکے کی باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ اُسی دن سے دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔

اَب تو نیپولین اکثر اس کے گھر جاتا رہا۔ اس کے ساتھ کھیلتا مزے مزے کی باتیں کرتا اور خوش ہوتا۔ لیکن اگلے سال اُسے اپنے وطن کو چھوڑنا پڑا۔ جب نیپولین اپنے دوست سے رخصت ہوا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نیپولین نے اپنے دوست کو یادگار کے طور پر آبنوس کا ایک خوبصورت چھوٹا سا کھلونے کا بکس دیا اور کہا کہ جب یاد آیا کروں تو اس کو دیکھ لیا کرو۔

بہت دِن گذر گئے۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ ہی نیپولین بڑا ہو کر اس کا بادشاہ ہو جائے گا۔ نیپولین اپنے سلطنت کے کاموں میں مشغول ہو کر اپنے دوست کو بھول گیا تھا لیکن اس کا دوست اُسے نہیں بھولا تھا۔ جب بھی نیپولین یاد آتا تو اُس کے خوبصورت بکس کو دیکھ لیتا۔

کہتے ہیں کہ ایک بار آسٹریا اور فرانس میں زبردست جنگ چھڑی ہوئی تھی دونوں فوجیں جان توڑ کر لڑ رہی ہیں۔ گولیوں کی بارش ہو رہی ہے سپاہی بری طرح زخمی ہو رہے ہیں۔ دشمن کی فوج کا ایک سپاہی نیپولین کے سامنے آ گیا اور اُس نے نیپولین پر گولی چلائی لیکن گولی نیپولین پر لگنے کے بجائے ایک اور شخص کے لگی جو اسی دوران میں دوڑ کر آسٹریا کے سپاہی اور نیپولین کے درمیان کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

نپولین نے اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا
لڑائی ختم ہوتے ہی فوراً وہ اپنے بچانے والے کے
قریب گیا۔ خوش قسمتی سے وہ بہادر سپاہی مرا نہیں
تھا۔ مگر اس کے کافی چوٹ آئی تھی۔ نیپولین کو
دیکھتے ہی سپاہی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نیپولین
نے اُسے بڑے غور سے دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا
کہ اُس نے اس شخص کو پہلے کہیں ضرور دیکھا ہے
ایک آبنوس کا چھوٹا سا بکس اس کے قریب ہی
پڑا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی نیپولین نے پہچان لیا۔
اُس کے بچپن کے ساتھی نے اس کی جان بچانے کے
لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا یہ سوچ کر وہ
رونے لگا اس کی آنکھوں میں بچپن کا گذرا ہوا زمانہ
پھرنے لگا۔ اُس نے سب باتیں بتا دیں کہ کس طرح
اپنا نام فوج میں لکھایا تاکہ وہ اپنے دوست کے
قریب رہ سکے۔ وہ ہمیشہ اپنے بچپن کے ساتھی کو
دیکھتا تھا لیکن کبھی ملاقات کا اتفاق نہ ہوا۔ اور
اس نے اس کے بچپن کے تحفے کو کبھی اپنے پاس سے
الگ نہ کیا۔

نیپولین نے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی
اور وہ جلد ہی اچھا ہو گیا۔ اس کے اچھے ہونے پر
نیپولین نے اُسے اپنا باڈی گارڈ مقرر کر لیا۔
اس نے نیپولین کی موت کے بعد بھی اس کا ساتھ
نہ چھوڑا۔ مرنے کے بعد اس کی قبر کی رکھوالی کرتا
رہا۔ سب لوگ دیکھتے تھے کہ ایک سفید بالوں
والا بوڑھا نیپولین کی سمادھی کے چاروں طرف
گشت لگا رہا ہے۔
وہ یہی نیپولین کے بچپن کا ساتھی تھا۔

(بقیہ دودھ کا گلاس صفحہ ۳۶ سے آگے)
بٹو کی آنکھ کھلتی ہے۔ نظر سب سے پہلے
دودھ کے گلاس پر پڑتی ہے۔ وہ پہلے تو فوراً
گلاس کو ڈھانپ دیتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر
کھولتی ہے اور گلاس میں جھانک کر غور سے
دیکھتی ہے۔ پھر اس کے اندر منہ ڈال کر چیخ
سے کہتی ہے)
بٹو۔ شیریں باجی، جلو آپا! کمو بیگم۔ بی پرویشن
بولتی کیوں نہیں (جب کوئی جواب نہیں
دیتا تو گلاس اٹھا کر دودھ پی جاتی ہے
اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ
سوچتی ہے اور مسکراتی ہے)

* پردہ *

بیربل ایران میں

ہندستان میں تو خیر سب ہی بیربل کو جانتے تھے لیکن ہوتے ہوتے اس کی شہرت ہندوستان کے باہر بھی پہنچ گئی ۔ ایران کے بادشاہ نے جب اس کی عقل مندی کا چرچا سنا تو اس نے اکبر اعظم کو ایک خط لکھا جس میں بیربل کو ایران آنے کی دعوت دی ۔ اکبر اس دعوت نامے سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے بیربل کو ایران روانہ کر دیا ۔ دارالسلطنت پہنچتے ہی بیربل نے شاہ کو اپنے آنے کی اطلاع پہنچا دی۔

بادشاہ تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے، اور اس کی ذہانت اور عقل مندی کا امتحان لینا چاہتے تھے ۔ اس نے اپنے تمام درباریوں سے کہا کہ وہ شاہی لباس پہن لیں ۔ تاکہ جب بیربل دربار میں داخل ہوں تو ان کے لئے اصل بادشاہ کا پہچاننا ناممکن ہو جائے ۔

جب سب لوگ اس طرح شاہی لباس میں بیٹھ گئے تو بیربل کو دربار میں بلایا گیا ۔ جیسے ہی بیربل دربار میں داخل ہوئے، وہ سمجھ گئے کہ بادشاہ نے میرا امتحان لینے کے لئے یہ ترکیب کی ہے ۔ بیربل ایک لمحے کے لئے رُکے اور پھر انھوں نے بادشاہ کی طرف قدم بڑھائے اور قریب پہنچ کر سلامی دی ۔

بادشاہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بیربل نے
اُسے کیسے پہچانا۔ اُس نے بیربل سے پوچھا کہ
"تم نے مجھے کیسے پہچانا؟"
بیربل نے کہا۔ "جہاں پناہ! یہ کوئی
حیرت کی بات نہیں ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا
کہ سارے دربار کی نگاہیں آپ کی طرف ہیں۔
اور آپ سب کو یکساں طور پہ دیکھ رہے ہیں"۔
یہ جواب سُن کر بادشاہ بہت خوش ہوا
اور بیربل کی ذہانت اور عقل مندی کا قائل ہوگیا۔

(بقیہ سینما کی کہانی صفحہ ۱۹ سے آگے)

سدھار، کھیتی باڑی کے موجودہ سائنسی طریقے
اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی بھی تبلیغ
ہو رہی ہے۔ آدمی تفریح کے طور پہ فلم
دیکھتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
اس سے فائدہ بھی اٹھاتا جاتا ہے جیسے
جیسے کوئی صنعت یا فن ترقی کرتا ہے اس
کی باریکیاں اور اس کی خوبیاں، کمزوریاں
سامنے آتی جاتی ہیں۔

نثار احمد تبسم

گھوڑا اور لومڑی

کسی کسان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ وہ اپنے مالک کے پاس بہت دن تک رہا تھا اور اس نے کسان کی بڑی خدمت کی۔ اب وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ کسی کام کے لائق نہیں تھا۔ اس لئے کسان بھی اس کو کھانا کھلانے میں کوتاہی برتنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن اُس نے گھوڑے کا کھانا بند کر دیا۔ وہ بولا "مجھے تمھاری اب کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارے اصطبل سے چلے جاؤ جب تم شیر کی طرح طاقتور ہو جاؤ گے تو میں تمھیں رکھوں گا۔ اتنا کہہ کر اُس نے بوڑھے گھوڑے کو بھگا دیا۔

بے چارہ گھوڑا جنگل میں گھومتا رہا۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک لومڑی سے ہوئی لومڑی بولی "کیا بات ہے دوست اتنے اُداس کیوں ہو؟

گھوڑے نے کہا "میں نے اپنے مالک کی بڑی خدمت کی لیکن وہ اس نے سب کچھ بھلا دیا۔ اب وہ کہتے ہیں کہ جب تک میں شیر کی طرح طاقتور نہیں ہو جاؤں گا اس وقت تک وہ مجھے نہیں رکھیں گے۔"

لومڑی نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا "میں تمھاری مدد کروں گی۔ تم اس طرح لیٹ جاؤ کہ جو بھی تمھیں دیکھے وہ سمجھے تم مرے ہوئے ہو۔"

گھوڑے کو جس طرح کہا گیا تھا اس نے ویسا ہی کیا۔ لومڑی شیر کے پاس گئی جو نزدیک ہی ایک کھوہ میں رہتا تھا۔ شیر سے لومڑی بولی "تھوڑی دور پر ایک گھوڑا پڑا سو رہا ہے ہمارے ساتھ آئیے۔"

شیر بہت خوش ہوا۔ جب وہ گھوڑے کے نزدیک پہونچا تو لومڑی بولی "اس جگہ آپ اسے اطمینان سے نہیں کھا سکتے ہیں۔ دوسرے جانور آئیں گے۔ اس سے بہتر ہے میں آپ کو اس کے دُم سے کس کر باندھ دیتی ہوں آپ اِسے گھسیٹ کر اپنی ماند میں لے جائیں اور اطمینان سے کھائیں۔

شیر کو یہ بات پسند آگئی۔ وہ چُپ چاپ لیٹ گیا۔ لومڑی نے شیر کے پیروں کو ایک ساتھ مضبوطی سے کس کر باندھ دیا اور اُسے گھوڑے کی دُم سے باندھ ڈالا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو لومڑی نے فوراً گھوڑے کو تھپکی دی۔ اور بولی "اٹھو جلدی کرو۔ جتنی تیزی سے ہو سکے اپنے مالک کے گھر جاؤ اب وہ تمھیں اپنا لیں گے۔ گھوڑا اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور شیر کو گھسیٹتے ہوئے دوڑ پڑا۔ شیر گرجنے لگا۔ جانور اور پرندے ڈر کر روپوش ہو گئے لیکن گھوڑا اس وقت تک دوڑتا رہا جب تک کہ وہ اپنے مالک کے گھر نہیں پہنچا۔

مالک نے اپنے بوڑھے گھوڑے کو اپنی دم سے ایک شیر کو گھسیٹ کر لاتے ہوئے دیکھا تو اُسے گھوڑے کو اپنانا پڑا۔ گھوڑے نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ شیر سے زیادہ طاقتور ہے۔

مالک نے گھوڑے سے کہا "تم اپنے اصطبل میں رہ سکتے ہو جس چیز کی تمھیں ضرورت ہو گی میں اُسے مہیا کر دوں گا۔"

دودھ کا گلاس

حبیب تنویر

ڈراما پڑھنے سے پہلے تین باتوں کا خیال رکھا جائے

(۱) طوفان اُٹھنے سے پہلے جو حبس ہوتا ہے اس سے اکثر دودھ پھٹ جاتا ہے
یہ خرابی بادل کی گرج یا بجلی کے اثر سے نہیں بلکہ فضا کی گرمی سے پیدا ہوتی ہے

(۲) اگر کھلا دودھ آدھ گھنٹے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا جائے تو اس کا VITAMW
فنا ہو جاتا ہے

(۳) ایک گیلن گائے کے دودھ میں ۱۴۴ اونس پانی ۔۶ اونس چربی ۔ ۶ اونس
پروٹین، ۷ ۳/۴ اونس شکر اور ۱ ۳/۴ اونس مختلف قسم کے نمک ہوتے ہیں
نمک میں کیلشیم سب سے زیادہ اور اہم ہوتا ہے۔

کردار:۔ ۱۔ بٹو ۔ ایک بچی ۲۔ شیریں ۔ شکر
۳۔ بی پروٹین ۔ پروٹین ۴۔ بھو بیگم ۔ چربی
۵۔ جلّو آپا ۔ پانی ۶۔ چند اور لڑکیاں

(کیا یہ کسی پری کی خواب گاہ ہے۔ ننھا سا پلنگ۔ صاف شفاف بستر ا۔ چادر۔ غلاف

پردے۔ ہر چیز دودھ کی طرح سفید، اجلی، جھلکتی
ہوئی۔ دروازے کھڑکیوں پر خوبصورت جالی دار
پردے۔ دھیمی دھیمی دودھیا رنگ کی روشنی۔
روشنی نہیں ہے دودھ کی نہر ہے، جو دروازے
کھڑکیوں اور چھت سے پھوٹ پھوٹ کر کمرے
کے اندر ہر طرف بہہ نکلی ہے۔ یہ کمرہ معلوم ہی
نہیں ہوتا۔ پرستان ہے یا جنت کا نمونہ۔
پلنگ پر بٹو سو رہی ہے۔ پاس ہی میز
پر کھلا ہوا دودھ کا گلاس رکھا ہے۔ شیریں چپکے
سے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور بٹو کے پلنگ
پر جھک کر آہستہ سے اُسے جگاتی ہے)

(آنکھیں کھول کر)

بٹو :۔ کون ہے؟
شیریں :۔ میں ہوں شیریں۔
بٹو :۔ کون شیریں؟ میں تو آپ کو نہیں پہچانتی۔
شیریں :۔ مگر میں تو تمھیں خوب پہچانتی ہوں۔ اور
جلو آپا بھی تمھیں اچھی طرح جانتی ہیں اور
میری چھوٹی بہنیں بھی۔
بٹو :۔ میں تو ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتی۔
شیریں :۔ کہیں گئی ہیں۔ آتی ہی ہونگیں، مل لینا۔
وہ سب تمھیں دیکھنے کے لئے بے چین ہیں

بٹو :۔ وہ بھی آپ کی طرح پیارے پیارے
سفید ریشم کے کپڑے پہنتی ہیں، جالی دار؟
شیریں :۔ جلو آپا تو آب رواں پہنتی ہیں۔ مکھو کو
سفید اطلس پسند ہے۔
بٹو :۔ میں بھی کہوں گی امی سے، میرے لئے
ایسے ہی سفید سفید ریشمی کپڑے بنا دیں
ایسا معلوم ہوتا ہے آپ دودھ میں نہا
کر نکلی ہیں۔
شیریں :۔ میں نکلتی نہیں۔ بس دودھ میں تیرتی
رہتی ہوں۔
بٹو :۔ آپ کی باتوں میں کتنی مٹھاس ہے۔
ہے نا؟ محمودہ ہے نا۔ وہ بھی آپ ہی
کی طرح میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہیں۔
شیریں :۔ کون محمودہ؟
بٹو :۔ میری ایک سہیلی ہے۔ جب بات کرتی
ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شربت کے
گھونٹ پی رہی ہے۔
شیریں :۔ شربت تمھیں پسند ہے؟
بٹو :۔ ہوں!
شیریں :۔ اور دودھ کیوں پسند نہیں؟
بٹو :۔ آپ کو کیسے معلوم کہ مجھے دودھ پسند نہیں؟

شیریں:۔ مجھے تمھارے بارے میں سب معلوم ہے۔

بٹو:۔ ہائے اللہ!

شیریں:۔ تم اصل میں بہت شریر ہو۔

بٹو:۔ جائیے ہم آپ سے بات نہیں کرتے۔

شیریں:۔ (کچھ وقفے کے بعد) کچھ کھاؤگی؟

بٹو:۔ اوں ہوں!

شیریں:۔ روٹھ گئیں (بٹو خاموش رہتی ہے) اچھا ایک کہانی سنوگی۔

بٹو:۔ (یکایک باچھیں کھل جاتی ہیں) کہانی؟

شیریں:۔ ایک مرتبہ میں چین گئی۔

بٹو:۔ چین؟ ہائے اللہ! اکیلی؟

شیریں:۔ نہیں۔ اپنی بہنوں کے ساتھ۔ منگولیا کے صحرا میں سے ہمارا گزر ہوا۔ ٹٹوؤں کے اوپر۔ کیا دیکھتی ہوں لوگوں نے دودھ کا سفوف بنا کر اس سفوف کی ایک بڑی سی اینٹ بنا لی ہے!

بٹو:۔ ہائے اللہ! کسی کو پھینک کر ماردیں تو اس کا سر پھوٹ جائے۔ ہے نا؟

شیریں:۔ اور کیا! پھر میں نے کیا دیکھا کہ ایک آدمی نے اس اینٹ میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر پانی میں ڈال دیا اور پانی کی بوتل کو ٹٹو کی زین سے باندھ دیا۔

بٹو:۔ کیوں؟

شیریں:۔ بس باندھ دیا۔ بوتل زین سے بندھی تھی جب ہم لوگ کئی میل چل چکے تو کھولی گئی۔ بوتل انڈیلی تو اس میں سے سفید سفید گاڑھا دودھ نکلا۔ بالکل وہی، جو روز شام کو امی تمھیں دیتی ہیں اور تم ہاتھ بھی نہیں لگاتیں۔

بٹو:۔ آپ کو کیسے معلوم؟

شیریں:۔ کہہ تو دیا مجھے سب معلوم ہے۔ ہاں تو لوگ وہ دودھ پیتے رہے۔ سینکڑوں میل کا سفر تھا۔ مہینوں میں راستہ طے ہوا مگر یہ دودھ کی اینٹ ختم نہ ہوئی۔

بٹو:۔ بوتل کو زین سے کیوں باندھ دیا تھا؟

شیریں:۔ ٹٹو کی چال تو بڑی بے ڈھنگی ہوتی ہے نا۔ بس اس کی وجہ سے پانی ہلتا رہا اور اس سے دودھ کا ٹکڑا پانی میں گھل گیا۔

بٹو:۔ ہماری استانی کہہ رہی تھیں کہ بہت سے بچے چین جا رہے ہیں۔ ہمارے اسکول سے بھی جائیں گے۔ اگر میں گئی تو ٹٹو پر ضرور بیٹھوں گی۔

شیریں:۔ میں آج کی بات تھوڑی کہہ رہی ہوں میں تو آج سے چھ سو سال پہلے کی بات کہہ رہا ہوں۔

بٹو:۔ ہائے اللہ تو تم چھ سو سال کی ہو؟

شیریں:۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ

بٹو:۔ باجی کے برابر معلوم ہوتی ہو۔

شیریں: میں تو تمھاری امی سے بھی بڑی ہوں۔

بٹو:۔ میں تو ابھی چھوٹی سی ہوں، ہے نا؟

شیریں: بہت چھوٹی

بٹو:۔ میں آپ کے برابر کب ہو جاؤں گی

شیریں:۔ جو بچے اپنے بڑوں کا ادب نہیں کرتے ان کو بڑے ہونے کا شوق کیوں ہو؟

بٹو:۔ میں تو آپ کا بہت ادب کرتی ہوں۔

شیریں:۔ مگر اپنی امی کا تو نہیں کرتیں۔

بٹو:۔ آپ کو کیسے معلوم۔

شیریں:۔ بھلا کوئی اپنی امی سے اس طرح بات کرتا ہے؟ آج شام تم ان سے کتنی زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔

بٹو وہ بھی تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی تھیں

شیریں:۔ انھوں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ سونے سے پہلے دودھ پی لو۔

بٹو:۔ اور میں نے تو بس اتنا کہا تھا کہ مجھے دودھ زہر لگتا ہے۔

شیریں: اچھا ٹھہرو۔ (باہر سے کچھ مٹھائیاں لے کر آتی ہے) لو کھاؤ۔ کھالو۔ کھا کر تو دیکھو بڑی اچھی مٹھائی ہے (اپنے ہاتھ سے بٹو کو مٹھائی کھلاتی ہے)

بٹو:۔ یہ مٹھائی آپ نے بنائی ہے؟

شیریں:۔ پسند آئی؟

بٹو:۔ بہت اچھی، بہت ہی اچھی!

شیریں:۔ اچھی کیسے نہ ہوتی دودھ کی بنی ہوئی ہے؟

بٹو:۔ ہائے اللہ! (منھ کھلا کا کھلا۔ ہاتھ کی مٹھائی ہاتھ ہی میں رہ جاتی ہے۔)

شیریں:۔ زہر تو کھا ہی لیا۔ اب اسے بھی زہر مار کرو۔

بٹو:۔ یہ دودھ کی بنی ہوئی ہے؟

شیریں:۔ کہہ تو دیا!

بٹو:۔ سچ؟ سچ بتائیے نا یہ کیا ہے! بتائیے نا۔ سچ سچ دودھ کی ہے؟ بتائیے نا!

شیریں:۔ میں اور کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تم بتاؤ اچھی یا بری ہے؟

بٹو:۔ اچھی تو ہے!

شیریں:۔ بس تو پھر کھاؤ (چمکار کر) اچھی بٹو! اسے

ہاتھ سے مٹھائی کھلاتی ہے۔)

(مکھو بیگم اور بی پروٹین سفید سفید خوبصورت لباس پہنے۔ کھلکھلاتی ہوئی داخل ہوتی ہیں)

بی پروٹین: (پہلی بار بٹو پر نظر پڑتی ہے) ارے کون! بٹو!

شیریں:۔ ہاں آج بٹو بیگم ہمارے گھر تشریف لائی ہیں۔

بٹو:۔ آپ لوگ شیریں باجی کی بہنیں ہیں نا؟

بی پروٹین: ہاں بہنیں ہی ہیں۔

بٹو:۔ اور آپ کا نام کیا ہے؟

مکھو بیگم:۔ پروٹین، ہرگز مت بتانا۔

شیریں۔ مکھو! بٹو ہماری مہمان ہے۔ مہمان سے ایسی باتیں کرتے ہیں؟

مکھو بیگم۔ شیریں باجی، ہم لوگ بٹو سے ناراض ہیں۔

بٹو:۔ میں جانتی ہوں۔ میں دودھ نہیں پیتی ہوں اسی لئے۔ ہے نا؟

مکھو بیگم اور کیا؟

بی پروٹین: میرا نام پروٹین ہے۔ میں دودھ میں رہتی ہوں۔

بٹو:۔ جی؟

شیریں: میں خون پیدا کرتی ہوں۔ مکھو بیگم چہرے پر چکنائی لاتی ہیں۔

بی پروٹین: اور میں ہاتھ پاؤں میں طاقت اور گولائی۔

بٹو:۔ اچھا؟

شیریں: اسی لئے میں میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہوں،

مکھو بیگم: اور میں چکنی چپڑی باتیں کرتی ہوں۔

شیریں: بی پروٹین کی باتوں میں وزن ہوتا ہے اور جلو آپا کی باتوں میں غضب کی روانی۔

بٹو:۔ آپ سب دودھ میں رہتی

شیریں: ہم سب دودھ میں رہتے ہیں

(بی جلو گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہیں)

جلو آپا: غضب ہو گیا۔

شیریں: کیا ہوا جلو آپا۔

جلو آپا: بڑے زور کا طوفان آنے والا ہے۔

شیریں:۔ یا اللہ رحم کر!

بٹو:۔ یہی ہیں جلو آپا؟

جلو آپا: بٹو۔ اس وقت مجھ سے بات نہ کرو!

شیریں! مکھو! پروٹین! آؤ یہاں تھوڑی دیر بیٹھ جائیں (سب پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں) اور اب کی جھگڑا کروگی تو مار کھاؤگی۔

مکھو بیگم:۔ (جھلا کر) ذرا ہٹ کر بیٹھ بی پروٹین!

(پروٹین رونے لگتی ہے)

جلّو آپا:۔ پھر تم لوگ لڑنے لگے؟

بی پروٹین:۔ کھو بیگم ہمیشہ مجھ سے تنک کر بات کرتی ہیں!

شیریں:۔ (دانت پیس کر) یا اللہ! خدا کا قہر نازل ہو ان دونوں پر۔

بی پروٹین:۔ یہی تو یہ چاہتی ہیں کہ ہم سب بے موت مرجائیں۔

کھو بیگم:۔ اوہ! دم گھٹا جا رہا ہے۔

جلّو آپا:۔ گھر سر پہ نہ اٹھاؤ۔ خاموش رہو۔ اور لڑکیاں کدھر ہیں؟

شیریں:۔ جانے کہاں مرگئی ہیں!

(چار پانچ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں دوڑتی ہوئی اندر آتی ہیں۔ ان کے لباس بھی سفید ہیں مگر دوسروں کے مقابلے میں معمولی)

سب ایک ساتھ:۔ باجی مبارک ہو۔ باجی مبارک ہو

ایک لڑکی:۔ بادل چھٹ گئے۔ طوفان رک گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے

جلّو آپا:۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

بٹّو:۔ (جو اب تک سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ایک ایک کی صورت تک رہی تھی) آپ لوگ طوفان سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟

جلّو آپا:۔ (ساری جھنجھلاہٹ جاتی رہی۔ بڑی شفقت سے کہتی ہے) بیچاری بٹّو! تم بھی تو گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہو؟

بٹّو:۔ سب کو دیکھ کر میں بھی ڈر گئی تھی

شیریں:۔ بات یہ ہے کہ طوفان اٹھنے سے پہلے بہت گرمی پڑتی ہے اور اس سے ہم لوگوں میں آپس میں پھوٹ پڑجاتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں پہلے ہم سب کیسے شیروشکر تھے؟

بٹّو:۔ وہی تو میں سوچ رہی تھی۔

جلّو آپا:۔ طوفان سے پہلے جو حبس اور گرمی ہوتی ہے اس سے دودھ پھٹ جاتا ہے۔

بٹّو:۔ ہائے اللہ! تو آپ لوگ ایسی پھٹنے والے تھے کیا؟

شیریں:۔ اور کیا؟

بٹّو:۔ تو جب دودھ پھٹنے لگتا ہے تو اس کے اندر بہت لڑائی ہوتی ہے؟

شیریں:۔ ہوں!

بٹّو:۔ اور سردی میں؟

شیریں:۔ سردی میں بڑا مزا آتا ہے

کھو بیگم:۔ سردیوں میں ہم بھی ملائی کا ایک موٹا

لحاف اوڑھ کر سو جاتے ہیں

ایک لڑکی۔ باجی، پھر دم گھٹا جا رہا ہے

بٹو۔ (لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے) یہ لوگ کون ہیں؟

شیریں۔ یہ تو کیلشیم بانو ہیں۔ ان سے ہڈیاں اور دانت مضبوط ہوتے ہیں۔ باقی مختلف قسم کے نمک ہیں۔ یہ بھی دودھ میں پائے جاتے ہیں اور جسم کے لئے بہت مفید ہوتے ہیں۔

بی پروٹین۔ (باہر اشارہ کر کے) وہ دیکھئے! میں مر جاؤں گی۔

بٹو۔ پھر طوفان آنے والا ہے کیا؟

شیریں۔ (باہر دیکھ کر) نہیں طوفان نہیں ہے۔ بٹو تم ایک کام کروگی ہمارا؟ تمھاری امی نے میز پر جو دودھ کا گلاس تمھارے لئے رکھا تھا نا وہ کھلا چھوڑ دیا ہے۔ اب سورج نکل رہا ہے اور اس کی کرنیں سیدھی ہم لوگوں پر پڑ رہی ہیں۔ دھوپ سے بی پروٹین کی طبیعت فوراً خراب ہو جاتی ہے۔ اور ہم لوگوں کو بھی الجھن ہوتی ہے۔ تم جاتے ہی گلاس کو ڈھانپ دینا۔ اچھا؟

بٹو۔ آپ لوگ میرے گلاس میں ہیں کیا؟

شیریں۔ اور کہاں ہیں؟

بٹو۔ ہائے اللہ! اور میں؟

شیریں۔ تم بھی دودھ کے گلاس میں ہو۔

بٹو۔ میرے اوپر نیچے، چاروں طرف دودھ ہی دودھ ہے؟ میں دودھ میں بالکل ڈوب گئی ہوں؟

شیریں۔ اور کیا؟

بٹو۔ مگر دیکھو میں تو بالکل نہیں بھیگی!

شیریں۔ بھیگو گی کیسے؟ تم سچ مچ دودھ کے گلاس میں تھوڑی ہو۔ تم تو خواب دیکھ رہی ہو

(جہاں تھے سب وہیں بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ روشنی دھیمی ہوتی ہے اور تھوڑی دیر میں بالکل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ گھڑی بھر کے بعد پھر آہستہ آہستہ روشنی ہوتی ہے۔ پہلے کی روشنی اگر چاند کی سی تھی تو یہ نکلتے ہوئے سورج کی پہلی تیز کرن ہے۔ جو سیدھی دودھ کے گلاس پر پڑ رہی ہے۔ دودھ کا گلاس پلنگ کے پاس میز پر کھلا رکھا ہے۔ پلنگ پر بٹو سو رہی ہے۔ کمرے میں اب اور کوئی نظر نہیں آتا۔ یکایک

(بقیہ صفحہ ۳۵ پر دیکھئے)

انوکھی سیڑھی

مگرمچھ

ریحان احمد عباسی

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مگرمچھ پانی میں رہتا ہے۔ آپ نے اگر اسے کبھی نہیں دیکھا تو یوں سمجھئے کہ وہ چھپکلی کی طرح کا ایک بڑا سا جانور ہوتا ہے۔ اس کا رنگ ہلکا ہرا ہوتا ہے۔ منہ، گردن اور کمر سے لے کر دُم تک تہہ بہ تہہ ہڈیاں چڑھی رہتی ہیں۔ پیٹ، گردن اور سر کے نیچے کی کھال نرم ہوتی ہے اور نازک بھی۔ شکاری اسی کھال پر نشانہ لگایا کرتے ہیں باقی جسم پر چاروں طرف ایک سخت اور موٹی کھال ہوتی ہے۔ ہاتھوں اور دُم کے نیچے کی کھال بھی اسی طرح سخت ہوتی ہے۔ سر، گردن یا کمر پر تو گولی کا اثر ہی نہیں ہوتا صندوق کی گولی ٹکرا کر اچھل جاتی ہے اس کی کھال اور چربی کافی قیمتی ہوتی ہے۔ مگرمچھ کا سر لمبا اور پتلا ہوتا ہے۔ ناک کا سوراخ اور آنکھیں کچھ ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اسی لئے یہ پانی میں چھپ کر صرف اپنی ناک اور آنکھیں اوپر کر کے تیرتا رہتا ہے اور باہر کی ہر چیز سے باخبر رہتا ہے۔ اس کے ہونٹ نہیں ہوتے اس لئے یہ اپنا منہ پوری طرح بند نہیں کر سکتا۔

مگرمچھ کے اوپر والے جبڑے میں ستائیس سے لے کر انتیس تک دانت ہوتے ہیں۔ یہ دانت بہت نکیلے اور سخت ہوتے ہیں۔ ان دانتوں سے وہ چباتا نہیں بلکہ بڑی سے بڑی چیز کو پکڑ کر

یونہی نگل جاتا ہے۔ اس کا قد ۲ فیٹ سے لے کر ۲۰
فیٹ تک بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے۔

عام طور پر مگرمچھ چھوٹے چھوٹے جانور،
مچھلیاں کچھوے اور پانی کے پرندے ہی کھاتا ہے
لیکن داؤں لگ جانے پر گائے بھینس اور آدمی
تک کو پکڑ کر نگل جاتا ہے۔ یہ بھی آدمی سے ڈرتا ہے
لیکن جب ایک آدھ بار انسانی گوشت منہ کو لگ
جائے تو پھر نہیں چھوڑتا اس لئے بعض مگرمچھ آدم
خور بھی ہو جاتے ہیں۔

ایسی جگہ پر جہاں تنہائی ہو اور پانی کا کنارا
بھی اس کا ہوتا اور بڑی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔
جو جانور پانی کے بالکل قریب ہو اس کا پکڑنا تو
اس کے لئے آسان ہے ہی لیکن کنارے سے کچھ فاصلہ
پر بھی وہ اپنے شکار کو بڑی پھرتی سے جا دبوچتا ہے
اگر شکار بڑا ہے اور نکل بھاگنے کی کوشش کرتا
ہے تو اپنی دُم سے دبا لیتا ہے اور پھر اسی طرح
نگل لیتا ہے۔ اس کی دُم تیرنے میں تو مدد دیتی
ہی ہے لیکن وہ اس کے لئے ایک طاقتور ہتھیار
بھی ہے۔

گرمیوں کے دنوں میں تو اکثر مگرمچھ پانی
کے کنارے خشکی پر جہاں سایہ اور ٹھنڈک ہو پڑے
رہتے ہیں۔ پانی میں جب تھک جاتے ہیں اور
پیٹ بھرا ہو تب بھی گھنٹوں ریت کے اوپر لیٹے
رہتے ہیں۔

اس کی مادہ بھی چھپکلی کی طرح انڈے دیتی ہے
وہ تیس سے لے کر ساٹھ انڈے تک دیتی ہے بعض
مگرمچھ سو انڈے تک دیتے ہیں۔ یہ انڈے زیادہ بڑے
نہیں ہوتے بس یہ سمجھئے جیسے مرغی کا سب سے بڑا
انڈا۔ مادہ پانی کے قریب ہی کسی گڈھے میں انڈے
رکھ دیتی ہے۔ اور اس کے بعد کیچڑ، ریت، یا کوڑا
کرکٹ اور پتیاں وغیرہ ڈال دیتی ہے۔ سورج کی
گرمی سے ان میں سے بچے نکل آتے ہیں۔ ویسے وہ
خود بھی انڈوں کی حفاظت کرتی رہتی ہے بچے خود
ہی انڈا توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔ مادہ مگرمچھ انھیں
پانی کی طرف لے جاتی ہے اور اس کے بعد تو یہ
بچے اپنی فکر آپ کرنے لگتے ہیں۔ بچہ جب انڈے میں
سے نکلتا ہے تو آٹھ انچ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔

مگرمچھ کی عمر بہت ہوتی ہے۔ یہ سَو سال سے
لے کر دو سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ سب سے
بڑا مگرمچھ جو اب تک مارا گیا ہے ۳۳ فٹ لمبا
تھا یعنی چھ آدمیوں کو اگر ایک کے اوپر ایک کر کے
کھڑا کر دیا جائے تو تقریباً ان کے برابر ہو سکتا ہے

مظفر الدین ظفر

بلّی اور چڑیا

ننھّی چڑیا ننھّی چڑیا
نیچے آ کر بات تو سُن جا
کتنی پیاری تیری صورت
کتنا پیارا رنگ ہے تیرا
چڑیا بولی نیچے آؤں !!
نیچے آ کر دھوکا کھاؤں !
تم ہو بلّی جگ کی خالہ !
خدا نہ ڈالے تم سے پالا
وہیں سے بولو میں سنتی ہوں
نیچے آ کر یعنوں توالا !!!
صورت دیکھو بھولی بھالی
تن کی اُجلی من کی کالی !
باتیں کتنی میٹھی میٹھی !!
تم ہو خالہ حکمت والی
نیچے میں تو کبھی نہ آؤں گی
اب کہو تم میاؤں میاؤں

کارٹون

بھیڑیا

بھیڑیا بنگال اور شمالی مغربی بھارت کی ریاستوں میں پایا جاتا ہے۔ لمبائی تقریباً تین یا چار فٹ ہوتی ہے۔ یہ کافی خطرناک ہوتے ہیں۔ کبھی کسی بستی میں گھس کر چھوٹے چھوٹے بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ بکریوں اور بھیڑوں کے تو خاص دشمن ہوتے ہیں۔

پیام تعلیم

بچوں کی کہانیاں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سردار کا پٹہ	۳ر	شام نگر میں سینما آیا	۴ر	بچوں کی بیت بازی	۳ر	مسٹر گڑبڑ خاں	۵ر
چھومنتر	۳ر	جادو کی انگوٹھی	۵ر	شیخ چلی نے شادی کی	۳ر	سونے کا راجہ	۵ر
کیڑا فرشتہ	۳ر	شیخ چلی کا مشاعرہ	۵ر	شہزادی نیلوفر	۳ر	رستم چور	ھر
آفت کا پرکالہ	۳ر	نیلم	۶ر	جادو کی چھڑی	۳ر	کہانی میں کہانی	ھر
مسٹر بھوت	۳ر	گھڑی ساز کی بیٹی	۴ر	اندھیر نگری	۳ر	جادو کی کہانی	ھر
ماں کا ظلم	۳ر	سفید ہاتھی	۴ر	نیلم پری	۳ر	کایا پلٹ	۵ر
جن پکڑا گیا	۳ر	شاہی لباس	۴ر	شہزادی نیلم	۴ر	بوڑھا جادوگر	ھر
شاہ صاحب کی بددعا	۳ر	شاہی موچی	۴ر	جادو کا باغ	۴ر	گوہر پری	ھر
ظالم بادشاہ	۳ر	شہزادی گوہر بار	۵ر	مداری کا ڈنڈا	۴ر	لنگڑا دیو	۵ر
ہیبت خاں	۳ر	مٹی کی شہزادی	۳ر	بدھو سیٹھ	۴ر	فقیر کی دعا	۵ر
اکبر بیربل کے لطیفے	۶ر	گرم چائے	۳ر	قاضی اور ٹھگ	۴ر	خدا کی لاٹھی	ھر
دو بھائی	۵ر	لال بجھکڑ (بچوں کا ناول)	۳ر	ناگ شہزادہ	۴ر	جادوگر کی کہانی	۵ر
ہوائی گھوڑا	۵ر	بی خرگوش	۳ر	انوکھی شہزادی	۵ر	چھم چھم پری	ھر
وفاداری کا امتحان	ھر	سنہری کھال	۳ر	شہزادی کا ہار	۵ر	مزیدار لطیفے	۵ر
تین ٹھگ	۵ر	رامو موچی	۳ر	ضدی شہزادہ	۵ر	چٹ پٹی پہیلیاں	۵ر
لاڈلی بیٹی	۵ر	سنہری پرندہ	۳ر	پھولوں کی شہزادی	ھر	بھائی بہن	۳ر
ایمانداری کا پھل	۵ر	آنکھ مچولی	۳ر				
دو بہنیں	۵ر	علم کی قیمت	۳ر				

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی

پیامی معمّا نمبر ۴ کا نتیجہ

(۱) پیام (۲) باریکی (۳) کھیر (۴) ریل (۵) دوست (۶) سیکھ

نوٹ:۔ بعض وجوہات کی بنا پر اس بار انعام پانے والوں کے نام نہیں دیئے جا رہے ہیں۔ اگلے ماہ کے شمارے میں شائع کر دیئے جائیں گے۔ لیکن انعام حسب دستور ۱۵ مارچ ۵۵ء تک روانہ کر دیا جائے گا۔

۔۔ منیجر ۔۔

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں	پچاس ۵۰ روپے کے نقد انعامات	فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس چار آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے || دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۲ مارچ ۵۵ء

پیامی معمّا نمبر ۱۴۱

۱ ج	ہ	ا			
۲	ا	ن	ے		
۳	ر	ا		م	
۴ س		ا		ہ	ی
۵ ج		ل			
۶	ی				

اشارے

(۱) سارے ــــ سے اچھا ہندوستاں ہمارا

(۲) چوری کا مال ــــ والا خود ہی اقبال نہیں کرتا۔ (کھانے۔ لانے)

(۳) رات دن محنت کرنے والے کو ــــ کی کمائی کھانے کے طعنہ دینا بہت ہی بُری بات ہے۔ (آرام۔ حرام)

(۴) کچھ تو بچے ایسے ہوتے ہیں جو ــــ کے قریب بھی نہیں جاتے۔ (سیاہی۔ سپاہی)

(۵) قیدی بھی ــــ کے نام سے کانپ جاتا ہے۔ (جال۔ جیل)

(۶) ادھار ــــ ہوئی رقم کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے۔ (دی۔ لی)

ٹوکن پیامی معمّا نمبر ۱۴۱

نام ....

پتہ ....

ٹوکن پیامی معمّا نمبر ۱۴۱

نام ....

پتہ ....

پتہ:۔ پیامی معمّا نمبر ۱۴۱ ماہنامہ پیامِ تعلیم جامعہ نگر۔ نئی دہلی

امی ذرا مجھے بھی

March 1955 **Regd. No. D. 96**

PAYAM TALEEM

Title Printed At The Fine Press DELHI

بشکریہ
شنکرز و

میرا دوست

پرنند و مکرجی عمر ۱۲ سال
نئی دہلی

فہرست

اپریل ۵۵ء

صدر دفتر فون نمبر ——— ۴۳۱۹۰

برانچ آفس فون نمبر ——— ۲۴۳۶۵

پیام تعلیم

ادارہ

حامد علی خاں — بی۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز — ایم۔ اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ ——— چار روپے

فی پرچہ ——— ۶ر چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی

اپریل کا پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس زمانے میں آپ امتحانوں کی تیاری میں لگے ہوں گے۔ لیکن کھیل کود، سیر و تفریح بھی تو اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ جس طرح ایک طالب علم کو پڑھائی سے غافل نہ ہونا چاہیے اسی طرح اس کے کھیل کود اور تفریح میں بھی فرق نہ آنا چاہیے۔

جیسے آپ پہلے پیام تعلیم پڑھتے تھے، اسی طرح پڑھیے۔ اس بار ہماری بزم میں جناب خالد صدیقی اور جناب البصار عبدالعلی پہلی بار شرکت کر رہے ہیں۔ ان کے مضمون دوسرے پرچوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ آئندہ بھی پیام تعلیم میں لکھتے رہیں گے۔

اس مہینے سے ہم نے "پیامی معمے" کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ لیکن رسالے کی دلچسپی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ بلکہ ہم اس کو اور بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پیامی بچے شنکرز ویکلی کے انعامی مقابلوں سے واقف ہیں۔ یہ انعامی مقابلے ہر سال ہوتے ہیں جس میں دنیا کے مختلف ملکوں کے بچے حصہ لیتے ہیں۔ تصویریں بناتے ہیں کہانیاں لکھتے

ہیں۔

اس بار ان مقابلوں میں دنیا کے ۵۶ ملکوں کے بچوں نے حصہ لیا اور تقریباً ۲۴ ہزار تصویریں اور کہانیاں بھیجیں۔ ہم پیام تعلیم میں ان میں سے کچھ تصویریں اور دو کہانیوں کے ترجمے شائع کر رہے ہیں۔

پیام تعلیم کے خریدار بنانے کے سلسلے میں ہم نے پچھلے پرچے میں لکھا تھا۔ اس سلسلے میں جناب مصلح الدین صاحب (اسلام پور) نے تین خریدار بنائے۔ یہی نہیں بلکہ ابھی کچھ اور مدد کا وعدہ بھی کیا ہے۔

بہن بلقیس ناظرہ نے ناگپور سے لکھا ہے کہ وہ بہت جلد کچھ خریدار بنا دیں گی۔ اسی طرح کچھ اور بہن بھائیوں کے خط آئے ہیں جو خریدار بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم اگلے پرچے میں ان کا ذکر کریں گے۔

مارچ کا مہینہ جامعہ نگر میں بڑی سرگرمیوں کا زمانہ رہا ہے۔ تین مشاعرے ہوئے۔ جن میں ہندستان اور پاکستان کے مشہور شاعروں نے حصہ لیا۔ حضرت جگر مرادآبادی، جناب مجروح سلطان پوری، محترمہ زہرہ نگاہ، جناب سید محمد جعفری، جناب ظریف جبل پوری، جناب ادیب سہارن پوری، جناب شمیم کرہانی، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، جناب عشرت کرتپوری، جناب غلام ربانی تاباں، جناب قیصر زیدی، اور جناب حبیب تنویر وغیرہ نے اپنا کلام سنایا۔

---

۱۹ مارچ کو انجمن ترقی پسند مصنفین نے اردو کے ایک باکمال شاعر انشاء اللہ خاں انشا کا یادگار دن بڑے شاندار طریقے سے منایا۔ اس جلسہ میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، بیگم انیس قدوائی، جناب تقی صاحب، اور رشید نعمانی صاحب نے انشا پر اپنے مقالے پڑھے۔ اس بزم کی صدارت ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے فرمائی۔

رات کو مشاعرہ ہوا جس میں شعرا نے اپنا اپنا کلام پڑھا۔ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

محمد شفیع الدین نیّر (ایم، اے)

یادِ شفیق

۲۰ مارچ ۵۵ء کو شفیق کلب جامعہ نے "یومِ شفیق" منایا۔ اسی سلسلہ میں یہ نظم لکھی گئی۔

شفیقِ خوش سیَر، دمِ جامعہ کا بھرنے والے ہیں
وہ اُن کا حق کی خاطر دکھ اُٹھانا یاد آتا ہے
وہ اُن کا قول کو اپنا نبھانا یاد آتا ہے
شفیقِ خوش سیَر، دم جامعہ کا بھرنے والے ہیں
وہ جن کاموں کی خوبی اور بھلائی جان لیتے تھے
وہ اپنی فہم سے نیکی بدی پہچان لیتے تھے
شفیقِ خوش سیَر، دم جامعہ کا بھرنے والے ہیں
وہ سرتاسر محبّت اور مروّت کے پیامی تھے
رفیقوں میں وہ اپنے، خوش دلی میں اپنی حامی تھے
شفیقِ خوش سیَر، دم جامعہ کا بھرنے والے ہیں
ہمیں اُن کا خلوص اُن کی عنایت یاد آئے گی
وہ خوش طبعی، وہ باتوں کی ظرافت یاد آئے گی
شفیقِ نیک، دمِ انسانیت کا بھرنے والے ہیں

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
وہ آزادی کی خاطر جیل جانا یاد آتا ہے
دُکھوں میں بھی وہ اُن کا مُسکرانا یاد آتا ہے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
بس اُن کا کر گزرنا اپنے دل میں ٹھان لیتے تھے
جو اچھی بات ہوتی اُس کو فوراً مان لیتے تھے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
وطن والوں میں باہم دوستی کے دل سے حامی تھے
وہ اِس جمہوریت کے دور میں لیڈر عوامی تھے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
عمل کی راہ میں اُن کی رفاقت یاد آئے گی
ہمیں نیّر سدا اُن کی محبّت یاد آئے گی
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

محمد شفیع الدین نیّر (ایم، اے، اُستاد جامعہ)

خالد صدیقی

ربر کی کہانی

دنیا کی تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ جن چیزوں کو بہت چھوٹا اور معمولی سمجھتے ہیں ان کی بدولت بڑے بڑے کام ہوئے ہیں۔ اور انسانی تہذیب کی کایا پلٹ ہوگئی ہے

اسی طرح آج آپ ایک ننھے مُنّے کیڑے کی بدولت موٹروں کو پچاس ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتا دیکھتے ہیں۔ آپ سوچیں گے کہ اتنی بڑی موٹر کا ایک ننھے منے کیڑے سے کیا تعلق ہے؟ آئیے ہم آپ کو وہ تعلق بتاتے ہیں۔

ایک ننھے مُنّے کیڑے نے ایک درخت کو نقصان پہنچانا چاہا۔ اب وہ درخت یا تو چپ چاپ اس تکلیف کو برداشت کر لیتا یا اس کا مقابلہ کرتا۔ اس نے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے اسی زخم سے ایک لسدار دودھ جیسی چیز نکالی جس سے اس کا زخم بھی ٹھیک ہو جاتا اور کیڑا بھی پھنس کر مرجاتا۔ اور یہی لسدار دودھ بعد میں دنیا کی ایک بہت بڑی صنعت بن گئی۔ ربڑ کی صنعت۔ اس پیڑ کے اسی لسدار دودھ سے ربر تیار ہوتا ہے۔ ان پیڑوں کی چھال اور لکڑی کے [illegible] میں دودھ بھرا ہوتا ہے۔ کسی تیز دھار

کی مدد سے پیڑ میں سوراخ کر دیا جاتا ہے اور نیچے بالٹی رکھ دی جاتی ہے ۔ بالٹی میں یہ دودھ اکٹھا ہو جاتا ہے ۔ بعد میں اس کو خشک کر لیا جاتا ہے ۔ اور پھر اس ربر سے مختلف قسم کی چیزیں بنتی ہیں ۔

ربر کے یہ درخت پہلی بار امریکہ میں نظر آئے ۔ کہتے ہیں کہ پندرھویں صدی میں کولمبس نے جب امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس نے وہاں کے باشندوں کو ایک عجیب و غریب قسم کی گیند سے کھیلتے دیکھا جو بڑی اونچی اچھل جاتی تھی ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ گیند اسی ربر کے پیڑ کے دودھ سے بنی تھی ۔ پھر سترھویں صدی میں آدمیوں نے اس کا استعمال سیکھا ۔ انھوں نے اس ربر کے دودھ کو کپڑوں میں اس طرح لگا کر خشک کیا کہ اس میں سے پانی نہ چھن سکتا ۔ یہ انسان کی پہلی برساتی تھی ۔ اٹھارویں صدی میں جب فرانس کا ایک سائنس دان "لیکن دی مائن" جب جنوبی امریکہ گیا تو اس نے وہاں کے لوگوں کو اس قسم کی برساتی استعمال کرتے دیکھا ۔ اب تک لوگوں نے ربر کے پیڑوں کا صحیح مصرف نہ سمجھا جاتا تھا ۔ اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی ۔ اب معلوم ہوا کہ اس کو پنسل کے نشانات کے مٹانے کے کام میں بھی لا سکتے ہیں ۔ وہی ربر جس کو ڈرائنگ بناتے وقت آپ استعمال کرتے ہیں ۔ 'ربر' انگریزی میں مٹانے والے کو کہتے ہیں ۔ اس لئے اس کا نام 'ربر' پڑا ۔

۱۷۹۱ء میں اس صنعت کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی اور بڑے پیمانے پر برساتیاں بننے لگیں ۔ لیکن جب برساتیاں بن رہی تھیں تو دوسری طرف انگلستان میں چارلس گڈایر ربر میں گندھک ملا کر ربر کے ٹائر بنانے میں مصروف تھے ۔ چارلس گڈایر کی مالی حالت بہت خراب تھی ۔ لیکن وہ دھن کے پکے تھے اس کام میں لگے رہے ۔ اور آخر انھوں نے ٹھوس ٹائر بنا لیا جس کو گاڑیوں میں استعمال کیا جا سکتا تھا ۔ اور اس ٹائر کی گاڑیاں لکڑی کے پہیے والی گاڑیوں سے زیادہ تیز رفتاری سے چل سکتی تھیں ۔

۱۸۸۸ء میں جانوروں کے ڈاکٹر مسٹر ڈنلپ نے اس ٹائر میں ایک عجیب و غریب تبدیلی کی ۔ اب اس ٹائر کے اندر ٹھوس

ہونے کے بجائے خول تھا۔ اس کے اندر
ایک باریک ربر کا ٹیوب رکھا گیا جس میں
ہوا بھر دی گئی۔ ڈنلپ نے اپنے لڑکے کی
سائیکل میں یہ پہلا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب
ثابت ہوا اور یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر
موٹریں اور سائیکلیں چلنے لگیں۔ ہوائی جہاز کے
پہیوں میں بھی یہ ٹائر استعمال ہوتا ہے۔

آپ سوچئے کہ یہ ربڑ کتنے کام کی چیز
ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی کتنی چیزیں اس
سے بنتی ہیں۔ ڈرائنگ یا نقشہ بناتے وقت
آپ اس کا استعمال کرتے ہیں۔ موٹر، لاری
ٹریکٹر، موٹر سائیکل اور ہوائی جہاز کے پہیوں
کے ٹائر، سب اسی ربر سے بنتے ہیں۔

آج کل ایک موٹر سو میل فی گھنٹے کی
رفتار سے دوڑ سکتی ہے۔ لیکن اگر ٹائر نکال
دیا جائے تو یہ موٹر دس میل فی گھنٹے کی رفتار
سے بھی مشکل تمام دوڑ سکتی ہے۔ آپ نے ربر
کے جوتوں کے تلے دیکھے ہوں گے۔ بازار
میں ربر کے کھلونے اور گیندیں ملتی ہیں۔
ڈاکٹروں کے پاس آپ نے ایک آلہ دیکھا
ہوگا جس سے وہ مریض کا سینہ دیکھتے ہیں
اس آلے میں بھی ربڑ کا استعمال ہوتا ہے
غرض سینکڑوں بڑی چھوٹی چیزیں ہیں جن میں
ربر کا استعمال ہوتا ہے۔ ربر کا یہ استعمال
روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ ربر ملایا،
ساترا، جاوا، بورنیو اور جنوبی امریکہ میں
پیدا ہوتی ہے۔

بقیہ "بچوں سے باتیں"

نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔

۲۰ مارچ کو شفیق کلب کے زیر اہتمام
ہمارے پرانے استاد اور ساتھی جناب
شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کی یاد میں
"یومِ شفیق" منایا گیا۔ اس میں دلّی ریاست
کے وزیرِ اعلیٰ سردار گرمکھ نہال سنگھ صاحب
نے بھی شرکت فرمائی۔ چودھری برہم پرکاش
صاحب وزیرِ داخلہ۔ جناب کرشنا نائر صاحب
اور رانا جنگ بہادر سنگھ صاحب وغیرہ نے
بھی تقریریں کیں۔ جلسہ بڑا سلیقہ کا تھا
اور بہت کامیاب رہا۔

دھول نہ لگے

کہتے ہیں کہ بھارت ورش کے ایک راجا جتو چندر نے اپنے وزیر گبتو چندر سے ایک دن کہا "دیکھو کل رات میرے دل میں ایک خیال آیا کہ جب میں دھرتی پر پیر رکھتا ہوں تو میرے پاؤں ۔دھول سے خراب ہو جاتے ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا انتظام ہو جائے۔ جس سے میرے پاؤں نہ خراب ہوں ورنہ یاد رکھنا کہ کسی کی بھی خیر نہیں"

راجا کا یہ حکم سن کر اُن کے وزیر کے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ وزیر نے شہر کے تمام عالموں سے مشورہ کرلیا مگر کسی کے بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ترکیب کرنی چاہیئے۔ آخر سوچتے سوچتے وزیر کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ اس نے جا کر راجا سے کہا "مہاراج ۔ زمین پر دُھول نہ ہو تو پھر آپ کی پرجا کے پاؤں کی خاک کیسے چھوئیں۔ اِس لئے دُھول کا ختم کرنا ٹھیک نہیں"

راجا نے کہا "یہ تو تم صحیح کہتے ہو لیکن تم پہلے اس کا انتظام کر دو کہ میرے پاؤں میں دھول نہ لگے۔ میں اُس کا انتظام کردوں گا"

اب تو گبتو جی کی آنکھوں کے سامنے پھر

ندھیرا چھا گیا۔ انھیں دن میں تارے نظر
نے لگے۔ آخر پریشان ہو کر انھوں نے
ر دوسرے شہروں میں اپنے آدمی بھیجے۔
نہ وہ گھوم پھر کر لوگوں سے اُس کی
وئی ترکیب معلوم کر سکیں۔ آخر لوگوں
نے سوچ بچار کے بعد کہا کہ "دُھول کو مٹانا
ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اگر دُھول نہ ہوگی
غلّہ کیسے پیدا ہوگا"

راجا نے کہا کہ "میں غلّہ اُگانے کا
ں کوئی اور انتظام کروں گا۔ تم پہلے دھول
خاتمہ کرو" آخر ہوتے ہوتے یہ طے
ہا کہ ۱۷ لاکھ جھاڑویں منگائی جائیں۔ اور
ن سے دھول کا صفایا کیا جائے۔ جھاڑوؤں
ے آنے پر جو گرد جھاڑنے کا سلسلہ شروع
ا تو ہر طرف میں دُھول ہی دُھول اُڑنے
ی۔ راجا یہ دیکھ کر بہت ناراض ہوئے
ور بولے کہ میں دھول ختم کرنا چاہتا ہوں،
م لوگ تو اور دھول اُڑانے لگے"

اب وزیر کے سمجھ میں ایک اور
ترکیب آئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہزاروں
بہشتی مشکیں اپنے پیٹھ پر لئے ہوئے

سڑکوں پر پانی چھڑک رہے ہیں۔ دن بھر میں
شہر کے سارے کنویں خالی ہوگئے اور
سڑکوں پر تمام کیچڑ ہی کیچڑ نظر آنے
لگی"

اب بادشاہ اور ناراض ہوا اور بولا
"کمبختو! ایک ذرا سا کام نہیں کر سکتے۔
میں دُھول ختم کرنے کو کہتا ہوں تم اور
کیچڑ اِکٹھا کر رہے ہو"

آخر ایک درباری کے سمجھ میں ایک
ترکیب آئی اور اس نے کہا "اگر سارے شہر
میں چٹائی بچھادی جائے تو کیسا رہے۔
پھر یہ کہ راجا صاحب زیادہ نہ چلیں
پھریں"

یہ سُن کر راجا کو بہت غصّہ آیا۔
اس نے کہا "واہ کیا ترکیب سوچی ہے کہ
میں نکلنا بند کردوں اور حکومت کا کام
آپ چلائیں؟"

پھر وزیر کو کچھ خیال آیا اور وہ بولے
"ارے یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں
کہ اگر ساری زمین کو چمڑے سے ڈھک دیا
جائے تو کیسا رہے گا" آپ ہی نہیں

بلکہ کبھی کسی کے بھی دھول نہ لگے گی "

یہ بات تو راجا کے دل میں بھی اتر گئی اور انھوں نے کہا " بھئی واہ کیا کہنے یہ بات تو ہم لوگ بھول گئے تھے " بس پھر کیا تھا چاروں طرف چمڑے کی تلاش شروع ہوگئی۔ اور حکم دے دیا گیا کہ جتنا چمڑہ بھی کہیں ہو لوگ اُسے راج محل میں دے جائیں"

اگلے دن شہر کے سارے چمار چمڑا لے کر دربار میں پہنچے۔ ایک چمار جو چمڑا لے کر آیا جب اُسے معلوم ہوا کہ اس سے زمین ڈھکی جائے گی تو اُس نے ہنس کر وزیر سے کہا کہ "سرکار زمین کو ڈھکنے کے بجائے اگر ہر ایک اپنے اپنے پیر ڈھک کر چلے پھرے تو ساری زمین پر چمڑا بچھانے کی ضرورت نہ پڑے گی اور تھوڑے سے چمڑے سے بھی کام چل سکے گا "

وزیر نے کہا " آخر کو ہے نا چمار۔ بے وقوفی کی بات کرتا ہے۔ یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے "

اس روز تو چمار چپ چاپ گھر چلا گیا۔ دو روز کے بعد وہ ایک جوڑا جوتا لے کر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اس نے بادشاہ کے پیروں میں یہ جوتے پہنا دئے اور کہا " اب دھول پر پیر رکھیے کبھی جو دھول لگ جائے "

راجا نے دھول پر پیر رکھے۔ دھول اُسی جوتے پر لگی اور راجا کا پیر ویسا ہی صاف کا صاف رہا۔

بادشاہ بہت خوش ہوا اور اُس نے چمار کو بہت انعام و اکرام دیا۔

اس طرح پہلی بار جوتا بنا۔

احمد جمال پاشا

نیا کھیل

کام کرنے والے

للن — چھمی
چھبن — منن
اچھن ______ متفرق بھائی بہن
تلا ______ گھر کا ملازم
بچوں کے ماں باپ

(گھر کے کمرے میں کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ دن کا وقت ہے)

للن :۔ بھائیو اور بہنو! آؤ آج ایک نیا کھیل کھیلا جائے۔

چھمی :۔ کون سا کھیل بھائی

للن :۔ بتلاتا ہوں۔ دیکھو میں تو بتا ہوں۔

ابّا میاں۔ اور چھبّن تم بنو امّی جان چھبّن
تم میرے دوست بن کر آنا اور للّا تم
خیال رکھنا جیسے ہی ابّا میاں اور امّی جان
آنے لگیں فوراً بتلا دینا۔ چھبّن میاں تم سے
جب میں کہوں تو تم خوب شور کرنا۔ لیکن
اچھّن میاں تم شور مت کرنا۔ مگر تھوڑی دیر
کے لئے مجھے اپنا باپ مان لینا۔ آئیں
ٹھیک ہے! اچھا اب میں سب کو بتلاتا
ہوں کہ کس کو کیا کرنا ہے۔

(سب کے کان میں باری باری کچھ
کہتا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد باہر سے
کنڈی کھٹ کھٹانے کی آواز آتی ہے)

للّن:۔(اپنے باپ کے لہجے میں گرج کر) کون؟

آواز:۔ میں ہوں۔

للّن:۔ (جھنجھلاکر) میں تو میں ہی ہوں، تو
کون ہے؟

آواز:۔ (آہستہ سے) جی میں للّن کا دوست
ہوں۔

للّن (گرج کر) کون؟ دوست؟ اور وہ بھی
اس ٹانگ برابر چھوکرے کا۔ ارے میں
تو سو برس کا ہونے کو آیا مگر آج تک
کمبخت کوئی میرا دوست ہی نہیں ہوا اور
آپ کے ابھی سے سینکڑوں دوست پیدا
ہوگئے۔

چھبّن (آواز بناکر ڈرتے ڈرتے) جی میں ان
کے ساتھ اسکول میں پڑھتا ہوں۔

للّن:۔(رعب دار آواز میں) مگر اسکول کی
دوستی اسکول تک ٹھیک ہے۔ یہاں پر
کیوں آئے ہو یہ کوئی پاٹ شالہ ہے۔

چھبّن:۔ (مری ہوئی آواز میں) جی وہ میری
کتاب لے آئے تھے۔

للّن:۔ کیا آپ کتب فروش ہیں؟

چھبّن (آہستہ سے) جی وہ کتاب میں نے
انھیں پڑھنے کو دی تھی۔

للّن:۔ (ڈانٹ کر) کیوں دی! میں نے اس
کو جولائی میں سب کتابیں لاکر دی تھیں۔

چھبّن:۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) جی چھبّن صاحب
ہوں گے

للّن:۔ (اینٹھ کر) نہیں۔

چھبّن:۔ اور منّن صاحب

للّن:۔ (گرج کر) آپ آتے ہیں للّن کے پاس،
پوچھتے چھبّن کو ہیں اور بلاتے منّن کو،۔

چھبن :۔(پریشان ہوکر) اچھا اب اجازت ہے
للن :۔ (ڈانٹ کر) اجازت کا بچہ جا دور ہو، خبردار، پھر کبھی اس گلی کا رُخ کیا۔
(اندر سے چھمی کے پکارنے کی آواز آتی ہے)
چھمی :۔ ارے للن کے ابا میں کہتی ہوں آخر کیوں تمھاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں، جو پرائے بچے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔
للن :۔ اچھا اچھا بس رہنے بھی دو للن کی اماں تم وکالت کرنے کو۔ میں یہ جانتا ہوں کہ بحث میں تو تم سے کوئی ہائی کورٹ کا وکیل بالسٹر بھی نہیں جیت سکتا۔ تمھاری تو جرح کی عادت ہے۔ کیوں خواہ مخواہ ہر بات میں ٹانگ اڑاتی ہو۔
چھمی :۔ (سر پیٹ کر) ہے ہے خدا کی مار نوج، دور پار میں نے کیا کہہ دیا جو تمھارے مرچیں لگ گئیں۔
للن :۔اچھا اب بک بک نہ کرو ذرا یہاں آؤ۔
چھمی :۔ آتی ہوں ذرا دم تو لینے دو۔
للن :۔ کیا میں پاگل ہوں جو ایک گھنٹے سے چلا رہا ہوں۔ ابھی تک آ ہی نہیں چکتیں کیا لندن سے آ رہی ہو۔
چھمی :۔ کیا ہے جو میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ آتے ہی آتے آدن گی کوئی مشین تو ہوں نہیں۔
للن :۔ ایک پان تو بنا دو۔ ہاں کتھا چونا برابر کا لگانا۔
چھمی :۔ کیا تمھارے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں میرے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ میں نہیں آنے کی۔
للن :۔(گرج کر) ارے او نافرمان تجھ پر خدا کی مار۔ لاکمبخت ادھر پاندان ہائے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی۔ جب میں تجھ کو بیاہ کر لایا تھا۔ ہائے میں چالیس سال سے ایک پہیے کی گاڑی کھینچ رہا ہوں۔ میں جاتا ہوں مشرق کو تو یہ جاتی ہے مغرب کو، اگر اس سے آم منگواؤ تو یہ املی لاتی ہے۔ نہیں نہیں بلکہ املی تک نہیں لاتی، اچھا رہنے دے تیری ٹانگوں پر بجلی گرے، میں خود ہی اب پان بناؤں گا۔
چھمی :۔ خوب ہم انسان نہ ہوئے جانور سے بدتر ہو گئے۔ کام بھی کریں اور جوتیاں بھی کھائیں۔ تمھاری خود زبان پر

بجلی گرے واہ واہ ۔ کیوں گرے ہماری ٹانگوں پہ بجلی ۔

تلّا :۔ (پان دیتے ہوئے) لیجئے میاں پان۔

للّن :۔ (چونک کر) ارے کمبخت ڈرا دیا ۔ چل دُور ہو ۔ ارے ارے دور بعد میں ہونا پہلے پان تو دیتا جا ۔ اور سن کمبخت نالائق رات ہونے کو آئی مگر سب کواڑ ابھی تک پاٹو پاٹ کھلے ہیں ۔ اگر کوئی چور گھس آئے تو سب کے گلے کاٹ کر رکھ دے گا ۔

تلّا :۔ میاں کواڑ تو میں نے دیر ہوئی تب ہی بند کر دئے تھے ۔

للّن :۔ ہائے مگر کنڈی تو لگانا بھول ہی گیا ۔

تلّا :۔ نہیں میاں کنڈی بھی لگا دی ہے ۔

للّن :۔ اچھا اچھا چل دور ہو، آکر میرے سر پہ سوار ہوگیا ۔ بڑا تیر مار لیا ۔ چل دفان ہو کمبخت ۔

تلّا :۔ میاں باہر آپ کے پاس کوئی آدمی آئے ہیں ۔

للّن :۔ ابے نالائق کے بچے ہمارے پاس کوئی آدمی نہیں تو کیا جانور آئے گا ۔ جا جاکر نام پوچھ کر آ ۔

تلّا :۔ جی وہ اپنا نام منّن بتاتے ہیں ۔

للّن :۔ منّن تو میرے لڑکے کا نام ہے ۔

تلّا :۔ جی نہیں، وہ کسی اور کے لڑکے معلوم ہوتے ہیں ۔

للّن :۔ اچھا جاؤ کہہ دو کہ وہ نہیں ہیں ۔

تلّا :۔ بہت اچھا ۔

چھمّی :۔ ارے سنتے ہو ۔ ذرا میں ببّو آپا کے گھر تک ہو آؤں ۔

للّن :۔ نہیں کسی آپا ٹاپا کے یہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے ۔

چھمّی :۔ کیوں ضرورت نہیں ہے ۔ تم جو رات دن باہر آتے جاتے ہو تو کیا ہمارا دل نہیں چاہتا ہم آدمی نہیں ۔

للّن :۔ بس میں جو کہتا ہوں ۔ تم آدمی بالکل نہیں ہو ۔ عورت ہو عورت ۔ مجھ میں اور تم میں بڑا فرق ہے ۔

(منّن کے شور مچانے کی آواز آتی ہے دونوں اندر جاتے ہیں اچھن بیٹھا پڑھ رہا ہے منّن اس کے پاس کھڑا شور مچا رہا ہے)

للن :۔ کیوں بے کیا تیری سورج سے دشمنی
ہے جو سارا پہاڑ ایسا دن کھیل کود
میں گنوا کر اب بجلی جلا کر پڑھنے بیٹھا
ہے۔ تجھے کیا ہے ججوا بھر بھر کر
بجلی کا بل تو ہمیں ادا کرنا پڑتا ہے
بس بہت پڑھ چکا۔ چل چل کے شمال
رخ کونے میں مرغا بن، کیوں بے
منن کے بچے! فیس تو ہم کو دینا پڑتی
ہے۔ تیرے باپ کا کیا جاتا ہے۔
جب تک زندہ ہیں خوب عیش کر لو۔
ابے ہنستا ہے۔ چل چل کر تو بھی جنوب
رُخ کونے میں مرغا بن جا۔ اور وہ
للن کا بچہ کہاں مر کے رہ گیا۔

چھمی :۔ جی وہ تو آپ کی دوا لینے گیا ہے۔

للن :۔ ابھی تک آیا نہیں۔ خود اپنا علاج
کرانے لگا۔

(اتنے میں بچوں کے ماں اور باپ
پردے کے پیچھے سے آجاتے ہیں
سب بچوں کا ڈر کے مارے بُرا حال
ہو جاتا ہے۔ للن اور چھمی ان کے
قدموں میں گر کر معافی مانگتے ہیں
وہ ان کو گلے لگا لیتے ہیں)

باپ :۔ (بچوں سے) میں نے سب کچھ اپنی
آنکھ سے دیکھ لیا۔ میرے بچو! تم
نے میری آنکھیں کھول دیں۔ آج سے
میری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا
ہے۔ آج سے میں ایک نیک باپ،
نیک شوہر اور نیک انسان کی طرح
زندگی بسر کرنے کا عہد کرتا ہوں۔

ماں :۔ اور بچو! میں بھی۔

(سب بچے مارے خوشی کے ناچنے
لگتے ہیں اور تالیاں بجانے لگتے ہیں
ماں باپ باری باری گود میں اُٹھا کر
سب کو پیار کرتے ہیں)

(پردہ گرتا ھے)

وزیر حسین شاہ

اصغر نے بلّی پالی

ابّا جان گئے جاپان — لے آئے تھوڑے سے دھان

دُودھ منگایا کھانڈ منگائی — ڈال کے چاول کھیر پکائی

مُنّی اور جاوید بشیر — کھا گئے اپنی اپنی کھیر

اصغر کھیلنے جاتا تھا — رات گئے گھر آتا تھا

صُبح کو جب اصغر جاگا — الماری کی طرف بھاگا

لیکن پائی نہ کھیر وہاں — کھیر کہاں اب کھیر کہاں۔

ہنستے تھے جاوید بشیر — چوہے کھا گئے اس کی کھیر

اصغر نے بِلّی پالی — آنکھیں لال اور دُم کالی

اُس کو گوشت کِھلاتا تھا — لسّی دُودھ پِلاتا تھا

بِلّی تاک میں رہتی تھی — مُنہ سے کچھ نہ کہتی تھی

جو چوہا باہر آتا تھا — اُس کا لُقمہ بن جاتا تھا

چوہا شور مچاتا تھا — اصغر کہتا جاتا تھا

کھالے کھیر اب کھالے کھیر

ہنستے تھے جاوید بشیر
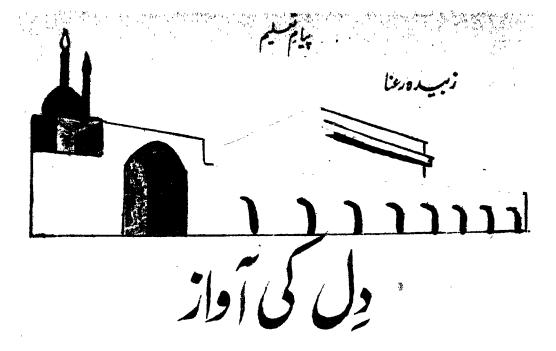
زبیدہ رعنا

دِل کی آواز

مہدی مشہور عباسی خلیفہ گزرے ہیں۔ ان کی ایک ملکہ فرزان تھی جو بڑے عالیشان محل میں رہتی تھی۔ ایک دن ملکہ کے محل کے دروازے پر ایک عورت آئی اور دربان سے بولی۔ "جاؤ! اپنی ملکہ سے کہو کہ ایک غریب قسمت کی ماری ہوئی عورت آپ کو دیکھنے کی تمنّا لے کر آئی ہے اور وہ بغیر ملے واپس نہیں جائے گی۔" دربان محل میں گیا اور اس کا پیغام ملکہ کو سنا دیا۔

ملکہ یہ سن کر حیرت میں پڑ گئی کہ نہ جانے کون عورت ہے اور کیا چاہتی ہے۔ اس نے ایک کنیز سے کہلا بھیجا "جاؤ اس سے پوچھو کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے۔ مجھ سے ایسا کون سا کام ہے"

اس عورت نے کنیز سے کہا "میں سوائے ملکہ کے اور کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے صرف ملکہ ہی سے کام ہے۔ اور اسی سے بات کرنے کے لئے یہاں آئی ہوں۔

جب ملکہ نے دیکھا کہ وہ کسی طرح بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے تو اسے اندر آنے کی اجازت دیدی۔

اس کو فرزاناں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے بڑھ کر ملکہ کو سر جھکا کے سلام کیا اور

کہنے لگی۔

"اے ملکہ میں صرف یہ بتانے کے لئے آئی ہوں کہ میں مروان بن محمد کی لڑکی مذآنہ ہوں جو بنی اُمیہ کا آخری تاجدار تھا۔" یہ سنتے ہی ملکہ برہم ہوگئی اور غصّے سے کہنے لگی۔

"اے کمبخت عورت! اگر تیرے داخل ہونے سے پہلے میں جانتی تو تجھ کو اپنے سامنے ہرگز نہ آنے دیتی ـــــ لیکن تجھے میرے سامنے آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ کیا تو بھول گئی جب ابراہیم بن محمد عباسی کی لاش کو دفن کرنے کے لئے ایک بوڑھی عورت کچھ زمین مانگنے کے لئے تیرے والد کے پاس آئی تھی تو اس نے اس کو لوٹا دیا تھا۔ تم ہمارے دشمن تھے اور تم لوگوں نے اپنے دشمن کو ذلیل کیا تھا۔ اس پر بھی تمھیں میرے پاس آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ کیا تم نہیں جانتی تھیں؟ ـــــ کیا تمھیں اس کا انجام معلوم نہ تھا! ـــــ میرے سامنے سے دُور ہوجا۔"

اس نے ملکہ کے غضب ناک الفاظ نہایت خاموشی سے سُنے اور پھر زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی ـــ اور بولی "بہن! ـــ کسی زمانے میں، میں بھی تمھاری ہی طرح مغرور تھی۔ دولت اور طاقت نے مجھے بھی سنگ دل بنادیا تھا۔ لیکن خدا نے مجھے میری ناانصافیوں اور ظلم کی سزا دیدی۔ جیساکہ اب تم دیکھ رہی ہو۔ اب میری دولت کہاں ہے؟ ـــ میری طاقت میرا وقار اور وہ میرا غرور سب کچھ ختم ہوگیا۔ وہ سب مجھ سے چھین لیا گیا ـــ کیا تم بھی یہی چاہتی ہو کہ اس بوڑھی کی طرح مجھ کو بھی اپنے محل سے ذلیل وخوار کرکے نکال دو"؟

یہ کہہ کر وہ واپس چلی ـــ لیکن اس کے الفاظ ملکہ فروزاں کے دماغ میں گونج اُٹھے۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور اس کو گلے لگانے کے لئے دوڑی۔

فروزاں نے ایک کنیز سے کہا کہ انھیں حمام میں لے جاؤ۔ عطر کے پانی سے نہلاؤ۔ بہترین اور قیمتی لباس پہناؤ۔ سر میں خوشبودار تیل ڈالو۔ ہاتھ اور پاؤں میں حنا (مہندی) لگاؤ۔

جب وہ لباس فاخرہ پہن کر آئی تو ایک ملکہ معلوم ہو رہی تھی ـــ ملکہ نے اس کو اپنے برابر بٹھایا اور پھر شریفانہ برتاؤ کیا۔

ولیم لوائڈ گیریسن
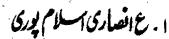
گیریسن اور گاندھی جی دنیا کے اُن بڑے انسانوں میں سے ہیں، جنہوں نے خود غرضی کو ٹھکرا کر انسانیت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اور اس کے لئے بڑی سخت تکلیفیں برداشت کیں۔

گیریسن اُنیسویں صدی کے عیسیٰ اور گاندھی جی بیسویں صدی کے گوتم بُدھ کے نام سے نہایت احترام و عقیدت کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کے خیالات اور اُصول حضرت عیسیٰ اور مہاتما بدھ کی تعلیمات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے امریکہ کے ایک شہر نیو بری پورٹ میں ولیم لوئڈ گیریسن ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا ان کے والد ایک جہاز پر کپتان کا کام کیا کرتے تھے۔ باپ کے مر جانے پر گیریسن کی پرورش کا سارا بوجھ اُن کی بوڑھی ماں پر آ پڑا۔ سات برس کی عمر میں ماں نے انھیں ایک جُوتا بنانے والے کی دوکان پر کام سیکھنے کے لئے بٹھا دیا۔ لیکن گیریسن کا دل اس

کام میں بالکل نہ لگا۔ اس کے بعد وہ ایک بڑھئی کے یہاں رہنے لگے۔ یہاں بھی وہ زیادہ دن نہ رہ سکے۔ اب وہ ایک چھاپہ خانے میں کمپوزیٹر کا کام کرنے لگے۔ کمپوزیٹر کا کام چھاپے کے حروف جمانے کا ہوتا ہے۔ اس کام میں وہ جی جان سے لگ گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک ماہر اور کامیاب کمپوزیٹر بن گئے۔ گیریسن کے اچھے چال چلن، اچھے کام اور اچھی سُوجھ بُوجھ سے خوش ہوکر چھاپہ خانے کے مالک نے اُن کی تنخواہ بڑھا دی۔ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے بعد اُن کے پاس جو پیسے بچتے اُن سے وہ طرح طرح کی کتابیں اور اخبار وغیرہ خرید لیتے اور چھٹی کے وقت میں اُنھیں خوب غور سے پڑھا کرتے۔ اسی چھاپہ خانہ سے ایک اخبار نکلتا تھا جس کا نام تھا "ہیرالڈ"۔ آپ نے اس میں فرضی نام سے مضمون لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد دوسرے رسالوں اور اخباروں میں بھی آپ کے مضمون چھپنے لگے۔ اخبار اور رسالے والے اُن کے مضمونوں کو بہت ہی عزت اور خوشی کے ساتھ اپنے اخبار اور رسالے میں چھاپنے لگے۔ اس لئے کہ ملک میں اُن کی بڑی قدر ہوتی تھی۔

ایک بار ایک مشہور اخبار نے اُن کی سیاسی قابلیت کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا ——— "نوجوان گیریسن کے لکھے ہوئے سیاسی مضامین ایسا معلوم ہوتے ہیں گویا بوڑھے سیاست داں بڑھتی پک رگ کے لکھے ہوئے ہیں"

چھاپہ خانہ والوں کو جب پتہ چلا کہ یہ مضامین لکھنے والا گیریسن ہی ہے۔ تو وہ حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اُن کے یہاں اتنا بڑا ادیب اور اخبار نویس کام کر رہا ہے۔ اُنھوں نے اُن کو اپنے اخبار "ہیرالڈ" کا سب سے بڑا ایڈیٹر بنا دیا۔ ایک معمولی کمپوزیٹر سے اتنے مشہور اور بڑے اخبار کا سب سے بڑا ایڈیٹر بن جانا کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ یہ بڑے فخر کی بات تھی۔

۱۸۲۶ء تک امریکہ میں حبشیوں کی غلامی کے رواج کے خلاف کچھ بولنا اور لکھنا گناہ سمجھا جاتا تھا، لیکن نوجوان گیریسن نے سب

سے پہلے نڈر ہو کر اس کے خلاف آواز بلند کی اور اس رواج کو مٹانے کے لئے اُنھوں نے اُسی سال خود اپنا اخبار نکالا۔ اس کا نام "فری پریس" تھا۔ اس اخبار نے غلامی کے رواج کے خلاف تحریک کو آگے بڑھانے میں بڑا زبردست کام کیا۔

گیریسن کو اس تحریک چلانے کے سلسلے میں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ وہ پادریوں کی نظر میں گناہ گار اور احمق تھے۔ ایک دن عیسائی مذہب کے ٹھیکیداروں نے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو کر اچانک اُن کے دفتر پر دھاوا بول دیا اور اُنھیں باندھ کر شہر بوسٹن کی سڑکوں پر گھسیٹا۔ اُن کا سارا جسم لہولہان ہوگیا۔ پھر بھی اُن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اِن عیسائیوں کی اس کھلی ہوئی زیادتی پر عام لوگوں میں سخت ناراضگی پھیل گئی اور اُنھوں نے اُن کے مخالفوں کو سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن فرشتوں جیسے رحمدل اور نیک گیریسن نے لوگوں کو سمجھا بجھا کر ایسا کرنے سے روک دیا۔

۱۸۳۷ء میں گیریسن نے "لبریٹر" کے نام سے ایک اور اخبار جاری کیا، جو سچائی اور صبر و برداشت کے پاک اور اُونچے اُصولوں کے علاوہ غلامی کے رواج کے خلاف زوردار تبلیغ کرتا تھا۔ اس اخبار کا نعرہ تھا "دُنیا ہمارا وطن ہے، اور سارے انسان ہمارے بھائی ہیں۔" ۱۸۳۸ء میں امریکہ میں عالمی امن کا جلسہ ہوا۔ اس میں ایک اعلان نامہ جاری کیا گیا، جو گیریسن ہی کا لکھا ہوا تھا۔ اُن کی عقل و بصیرت اور دُوراندیشی کی بڑائی کو امریکہ والے ہی نہیں، بلکہ سارے یورپ کے لوگ ماننے لگے۔ اس اعلان نامے میں موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "ہم سارے انسانوں سے محبّت کرتے ہیں۔ سچائی اور صبر و برداشت ہماری زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ وطن پرستی اور قومی توہین کے نام پر کسی سے بدلہ لینے کے لئے ہم کبھی تیار نہ ہوں گے۔ ہم اپنے دشمنوں سے محبّت اور عزّت کا برتاؤ کرتے ہیں۔"

گیریسن کا یہ بہت ہی مضبوط خیال تھا کہ نرم اور نیک دل انسان ہی دُنیا کے حاکم ہوں گے۔ اور جو ظلم و تشدد کرنا بُرا نہیں سمجھتے

اُن کا خاتمہ تلوار ہی سے ہوگا ۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے "خدمت کرنی سیکھو صرف اسی سے تم دُنیا کے حاکم بن سکتے ہو"

گیریسن اپنے آپ کو انسانوں کا خادم سمجھتے تھے ۔ ایک بار ایک اخبار نویس نے اُن سے سوال کیا "آپ خدا سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟" جواب ملا۔ "میں اُس سے اس لئے محبت کرتا ہوں، کیونکہ اُس نے مجھے محبت کرنا سکھایا ہے"۔ اُن کی باتوں میں سچائی دہکتے ہوئے انگارے کی طرح چمکتی نظر آتی تھی۔

گیریسن کی بیوی بہت ہی وفادار اور جاں نثار بیوی تھی ۔ اُسے اپنے شوہر کے خیالات کی وجہ سے ہمیشہ نت نئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ نہایت ہی خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کرتی تھی ۔ گیریسن کو بھی اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اُن کی بیوی ہی نے اُن کے گھر کو جنّت بنایا اور اُن کے دل کو سچّا اطمینان بخشا۔ اُن کی "فینی" نام کی ایک لڑکی تھی ۔ اُس نے بڑے ہونے پر باپ کی موت کے بعد اُن کے اصولوں کی زبردست تبلیغ کی ۔

۱۸۶۳ء میں غلامی کا رواج ختم ہوگیا اور گیریسن نے اپنا اخبار "لبریٹر" بند کر دیا ۔ کیونکہ اُس کے جاری کرنے کا مقصد پورا ہوگیا تھا ۔

۱۸۷۹ء میں ولیم لوائڈ گیریسن نے امریکہ کے مشہور شہر نیویارک میں وفات پائی ۔ موت کے وقت اُن کی عمر قریب قریب چوہتر برس کی تھی ۔

کارٹون

میاں سپاہی تمھارے ساتھ چلنے میں یہی تو بات ہے کہ
خواہ مخواہ لوگ مجھے بھی دیکھتے ہیں

سفیرا احمد قادری

رحمدل لڑکی

ایک گھنے جنگل کے کنارے ایک لکڑہارا رہتا تھا ۔ اس کے تین لڑکیاں تھیں وہ صبح ہی صبح رات کا بچا کھچا کھانا کھاکر، کلہاڑی کندھے پر رکھ جنگل کی راہ لیتا اور شام کو لکڑیاں کاٹ کر لاتا ۔

لکڑہارے کی بیوی اور اُس کی تینوں لڑکیاں اس کی مدد کرتی تھیں لکڑہارا کسی دن صبح کھاکر نہ جاتا تو اس کی بیوی دوپہر کو جنگل میں کھانا لے جاتی ۔

لکڑہارے کو اِسی طرح رہتے رہتے کئی سال بیت گئے ۔ اب اس کی تینوں بیٹیاں بڑی اور ہوشیار ہوگئیں ۔

ایک بار لکڑہارے کی بیوی بیمار ہوگئی چلتے وقت لکڑہارے نے اپنی بیوی سے کہا "کھانا کسی لڑکی کے ہاتھ بھیج دینا ۔ میں اپنے ساتھ کچھ جوار کے دانے لے جاتا ہوں ۔ راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈالتا جاؤں گا ۔ لڑکی آسانی سے اس راستے پر چلتے چلتے میرے پاس پہنچ جائے گی اور جنگل میں راستہ نہیں بھولے گی ۔"

دوپہر کے وقت لکڑہارے کی بیوی نے

اپنی لڑکی کو بلایا اور کہنے لگی ۔ "بیٹی تم اپنی بہنوں سے عمر میں بڑی ہو اور سمجھدار بھی ہو۔ جنگل کا راستہ شہر کی طرح سیدھا سادا تو ہوتا نہیں اس لئے تم کھانا لے جاؤ ۔ جس راستے پر جوار کے دانے پڑے ہوئے ملیں ، اُسی راستے پر چلنا ، ورنہ راستہ بھول جاؤگی "

لکڑہارے نے تھوڑی سی دور پر دانے ڈال دیئے اس کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ صبح ہوتے ہی جنگل کے پرندے بھی دانہ دُنکا تلاش کرنے کی فکر میں اُڑنے لگتے ہیں ۔ پرندوں نے جوار کے دانے جگہ جگہ بکھرے ہوئے دیکھے تو ایک ایک دانہ کر کے تمام دانے چُن لئے لکڑہارے کی بیٹی نے ہر طرف دیکھا ۔ مگر ایک دانہ بھی کہیں نہ تھا ۔ وہ بے چاری بہت پریشان ہوئی ۔ گھبراہٹ میں غلط راستے پر چل پڑی ۔ چلتے چلتے شام ہوگئی ۔ لکڑہارے کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ جنگل میں آدم نہ آدم زاد ۔ بے چاری راستہ پوچھتی تو کس سے اور گھر جاتی تو کیسے ؟ رات ہوئی اندھیرا بڑھا تو پیڑوں کے بیچ میں دور سے روشنی دکھائی دی ۔ وہ اسی طرف چل دی۔

جب وہ قریب پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ ایک جھونپڑی میں روشنی ہو رہی ہے ۔ اُس نے دروازے پر جاکر آواز دے ہی دی ۔ اندر سے آواز آئی ۔

"کون ہے ؟ ...... اندر آؤ "

آواز اتنی سخت تھی کہ اُسے سُن کر وہ اور ڈر گئی ۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے کواڑ کھولے ۔ اندر گئی ۔ دالان میں ایک بوڑھا بیٹھا تھا ۔ دو ہاتھ لمبی ڈاڑھی ۔ بال ایسے سفید جیسے روئی کے گالے ۔ اس کے قریب ایک کبوتر ، ایک مرغی اور ایک بلی بیٹھی تھی ۔ لڑکی نے سوچا یہ کتنی عجیب بات ہے ۔ کبوتر بلی کے پاس مزے میں بیٹھا ہے ، اور بلی اس کو ہڑپ نہیں کرتی ۔ کچھ دیر بعد لڑکی ڈرتے ڈرتے بولی " میں راستہ بھول گئی ہوں ۔ رات کا وقت ہے میں نے سوچا کہ جنگل میں کہاں ماری ماری پھروں گی ، دن نکلتے ہی گھر کا راستہ تلاش کروں گی ۔ اگر آپ اجازت دیں تو آج کی رات یہاں ٹھہر جاؤں " لڑکی چپ ہوئی تو بڈھے کی گردن ہلی اُس نے کچھ سوچا پھر کبوتر ، مرغی ، اور بلی سے بولا ۔

"ساتھیو! تمھاری کیا رائے ہے؟"
کبوتر بولا "غٹرغوں — غٹرغوں۔"
مرغی بولی "کٹ کٹ کڑاک۔"
بلّی بولی "میاؤں میاؤں۔"
یعنی ٹھیک ہے۔ بڈھا بولا "ہاں ٹھیک ہے لیکن تم باورچی خانے میں جا کر ہمارے لئے کھانا تیار کر دو۔ ہم بھوکے ہیں۔" کچھ دیر بعد کھانا تیار ہوا۔ لڑکی نے خوب مزے لے کر کھایا نہ بڈھے کو کھلایا نہ کبوتر کو پوچھا اور نہ بلّی مرغی کو۔ پیٹ بھر گیا تو سونے کی سوجھی اور ایک پلنگ پر لیٹ کر خراٹے لینے لگی۔ بڈھے کو بھوک لگی۔ مرغی کو بھوک لگی۔ نیند پھر کہاں آتی۔ اللہ میاں بھوکا تو اٹھاتے ہیں لیکن بھوکا سُلاتے نہیں۔ بڈھے کو غصّہ آیا اُس نے اپنے جی میں کہا جو لوگ صرف اپنے آرام کا خیال رکھتے ہیں اُن کو سزا ملنی چاہیئے اُس نے اس خود غرض لڑکی کو ایک تہہ خانے میں بند کر دیا۔

ادھر لکڑہارا کھانا نہ ملنے کی وجہ سے تمام دن بھوکا رہا جیسے تیسے دن گزارا۔ شام کو گھر آیا۔ بہت بگڑا، بیوی بولی "اے واہ، میرے اوپر کیوں بگڑتے ہو۔ میں نے بڑی لڑکی کو کھانا لے کر بھیجا تو تھا۔

لکڑہارے کو معلوم ہوا کہ لڑکی کھانا لے گئی اور واپس نہیں آئی تو اور پریشان ہوا۔ اِدھر اُدھر تلاش بھی کیا، لیکن لڑکی نہ ملی۔

اگلے دن لکڑہارے کی دوسری بیٹی کھانا لے کر گئی۔ لکڑہارے نے اپنے دل میں سوچا کہ جوار کے دانے چھوٹے تو ہوتے ہیں اِسی لئے آسانی سے نظر نہیں آتے کیوں نہ آج مٹر کے دانے راستے میں ڈالوں۔ لکڑہارا اسی طرح تمام راستے مٹر کے دانے بکھیرتا گیا۔ جنگل کے پرندے اور چڑیاں اگلے دن بھی اسی طرح دانے چگ گئیں۔ دوسری لڑکی بھی راستہ بھول گئی۔ شام ہوئی اُسے بھی بڈھے کا مکان مِلا۔ اس نے بھی اپنی بڑی بہن کی طرح خود کھایا پیا اور سو گئی۔ بڈھے کبوتر، بلّی اور مرغی کو پوچھا تک نہیں۔ بڈھے کو اِس پر بڑا غصّہ آیا۔ اس کو بھی بڈھے نے اِسی تہہ خانے میں قید کر دیا۔ تیسری

لڑکی نے جب اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا تو بولی ۔ "مصیبت میں ایک سے دو اچھے" دونوں مل کر اس قید خانے سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگیں ۔

تیسرا دن ہوا تو لکڑہارے نے کہا ۔ "دونوں لڑکیاں تو کہیں کھیل کود میں لگ گئیں اور راستہ بھول گئیں ۔ مجھے تمام دن بھوکا رہنا پڑا اور اس مرتبہ چنے کے دانے ساتھ لے جاؤں گا وہ جلدی نظر آئیں گے ۔ تیسری بیٹی ہوشیار ہے اور کہنا بھی مانتی ہے ۔ مجھے کھانا ضرور پہنچا دے گی ۔" آخر اس دن لکڑہارے کی سب سے چھوٹی بیٹی کھانا لے کر گئی ۔ لکڑہارے کی بیوی بے چاری ڈرتی رہی کہ کہیں یہ اپنی بہنوں کی طرح راستہ نہ بھول جائے ۔

لکڑہارے نے تمام راستے چنے کے دانے بکھیرے ۔ پرندوں نے یہ چنے کے دانے بھی چگ لئے اور لکڑہارے کی تیسری لڑکی بھی راستہ بھول گئی ۔ رات ہو گئی ۔ راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ بھی اسی بڈھے کی طرف جا نکلی ۔ لڑکی بڈھے سے بولی "بڈھے میاں ، بڈھے میاں ۔ کیا میں

تمہارے مکان میں ٹھہر جاؤں ؟" بڈھا کبوتر ، مرغی بلی سے بولا "کہو تمہاری کیا رائے ہے ؟"

مرغی ، بلی اور کبوتر اپنی اپنی زبان بولے "ٹھیک ہے ۔"

بڈھا بولا "اچھا تم ذرا باورچی خانے میں جا کر ہم سب کے واسطے کھانا پکاؤ ۔"

کھانا پک کر تیار ہوا ۔ لڑکی نے دل میں سوچا کہ بڈھے نے مہربانی کر کے اپنے گھر میں ٹھہرا لیا ۔ ورنہ اس اندھیری رات میں میرا کیا حال ہوتا ۔ اس نے سوچا کہ جب بڈھا اور اس کا ساتھی کھانا کھالیں گے تو میں کھاؤں گی ۔

بڈھے اور اس کے ساتھیوں نے کھانا کھا لیا اور سب سو گئے ۔ لکڑہارے کی لڑکی نے دیکھا کہ سب سو گئے تو خود بھی لیٹ گئی اور سو گئی ۔

صبح ہوئی ، وہ سو کر اٹھی ۔ ایں ۔ یہ ایک رات میں کیا سے کیا ہو گیا ۔ نہ وہ جھونپڑی تھی اور نہ وہ بڈھا تھا ، نہ کبوتر نہ مرغی اور نہ بلی تھی ۔ جھونپڑے کی جگہ

ایک عالی شان محل تھا ۔ بڈھے کی جگہ ایک خوبصورت شہزادہ کھڑا تھا ۔ تین غلام بھی کھڑے تھے اُس نے سوچا کہیں یہ خواب تو نہیں ہے ۔

لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں ۔ کھولیں پھر بند کرلیں ۔ لیکن وہاں تو سچ مچ دنیا ہی بدل گئی تھی ۔ لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ بےچاری گھبرا گئی تھی ۔ شہزادہ اُس کی گھبراہٹ پر زور سے ہنس پڑا اور کہنے لگا "اے رحمدل لڑکی یہ سب تمھاری ہی وجہ ہے ۔ تم اگر میرے تینوں غلاموں پر رحم نہ کھاتیں اور دانا نہ ڈالتیں تو کالے جادوگر کا جادو نہ ٹوٹتا اور ہم لوگ وہاں اسی طرح پڑے رہتے ۔

شہزادے نے کچھ دن بعد نہایت دھوم دھام سے اس رحم دل لڑکی سے شادی کرلی اور دونوں مزے سے رہنے سہنے لگے ۔ بعد میں شہزادے نے اس کی دونوں بہنوں کو بھی رہا کردیا ۔ اور اس کے ماں باپ کے رہنے کے لئے ایک محل دے دیا ۔ سب لوگ مزے سے رہنے سہنے لگے ۔

ابصار عبدالعلی
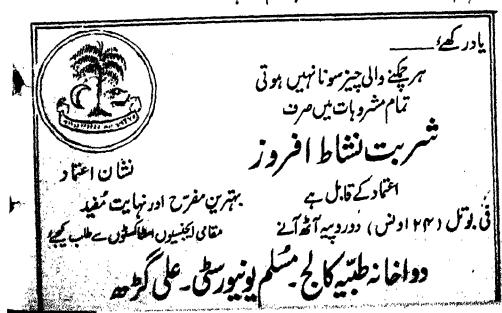
وعدہ اور فرض

گھر کے سب لوگ ایک تقریب کے سلسلے میں کئی دن کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ دو چار دن بعد میرے امتحان شروع ہونے والے تھے۔ اس لئے وہ سب مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ بلکہ انھوں نے میرے سر ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپ دی۔ وہ ذمہ داری تھی گھر کی حفاظت۔

میں امتحان کی تیاری میں مشغول تھا۔ گھر کے ہر کمرے میں تالے ڈال کر ان کی کنجیاں میں نے اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے اور میں کمرہ بند کر کے پڑھنے میں مشغول تھا کہ اچانک کسی نے باہر سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ میں چونک پڑا اتنی رات گئے کون آسکتا ہے، میں نے پوچھا — "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو"۔ ایک بھدی سی آواز میں جواب ملا۔

"کون ہیں آپ؟"۔ دوبارہ میں نے پوچھا۔

"سیدھی طرح دروازہ کھول دو ورنہ..."

"ورنہ — ورنہ کیا ہوگا؟؟؟" — میں نے سوچا اور سر سے پیر تک کانپ گیا۔

"کھولو دروازہ" — پھر آواز آئی۔

"نہ نہ نہیں" — میں نے ہمت کر کے

ہکلاتے ہوئے جواب دیا — پھر ایک گھونسا پڑا۔ اس کے دونوں پٹ ٹوٹ کر گر پڑے۔ ایک دیو قامت شخص سُرخ کپڑے پہنے ہوئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اپنے داہنے ہاتھ میں پستول لئے وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی خوفناک آواز میں سوال کیا — "روپے اور زیور کہاں رکھے ہیں ؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ان کی کنجیاں میرے حوالے کر دو۔" پستول اب بالکل میرے سینے پر تھا۔ لیکن میرے ہونٹ اب بھی بند تھے۔

وہ پھر گرجا — "جلدی بولو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"مار دینے دو۔" جیسے میرا ضمیر چلّایا۔ اور بڑھ کر اس نے میرے ذہن کو بھی جھنجھوڑ ڈالا۔ اور بھٹکی ہوئی ایک یاد تیزی سے اُبھر آئی۔ ابّا جان سے کیا ہوا وعدہ یاد آگیا کہ میں گھر کی حفاظت کروں گا۔ اور پھر آسمان سے کتنے ہی فرشتے اتر کر اپنی نورانی آواز میں چیخنے لگے، فرض — فرض — فرض! — وہ کھڑا ہوا شیطان ڈکار رہا تھا کنجیاں اس کے حوالے کر دو ورنہ یہ تمھیں مار ڈالے گا۔ فرض بھول جاؤ — فرض بھول جاؤ!

"واقعی ٹھیک ہے" — میں نے سوچا — "فرض بھول جانے ہی میں بھلائی ہے۔ دولت تو پھر بھی مل سکتی ہے۔ لیکن زندگی نہیں مل سکتی۔"

یہ سوچ کر میرا ہاتھ خود بخود تکیے کی طرف کو بڑھنے لگا۔ جس تکیے کے نیچے کنجیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بچھو نے میرے ہاتھ میں ڈنک مار دیا۔ گویا ایک آواز میرے کانوں میں گھستی چلی گئی۔ "فرض جان سے پیارا ہے۔"

میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور بولا "ہرگز نہیں تمھیں کنجی نہیں مل سکتی۔"

یہ سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ "کل میں پھر اسی وقت آؤں گا۔ سارا سامان یہیں ملے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔

اب میری آنکھوں کے سامنے ایک کمرہ بہت سجا سجایا ہوا تھا لیکن اس کی ہر چیز سے شعلے نکل رہے تھے۔ ڈاکو بے دھڑک اس میں گھس گیا۔ اس کے گھستے ہی شعلے نکلنا بند ہو گئے اور وہ سامنے پڑی ہوئی ایک گول میز کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے کی ایک الماری

کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک شربت کا گلاس چکر کھاتا ہوا اس کے سامنے میز پر آ گیا۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا تو اس کے منہ سے گہرے سُرخ رنگ کا دھواں نکل کر کمرے میں چاروں طرف پھیل گیا اور اس سرخ دھویں میں بارہ پستول ناچتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے پورا شربت کا گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے ان بارہ پستولوں کو ایک تھیلے میں رکھ لیا اور زور زور سے بڑبڑانے لگا ۔" اگر کل مجھے اس گھر کی تمام دولت نہ ملی تو میں ان بارہ پستولوں سے اس لڑکے کے چیتھڑے اڑا دوں گا ۔ بڑا آیا فرض شناس۔ ہوں ! اپنے ابّا جان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا۔"

اس کی یہ باتیں سن کر میرا دل پتے کی طرح ہلنے لگا ۔ پورے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی ۔ اور سخت سردی ہوتے ہوئے بھی میرے کپڑے پسینے سے بھیگ گئے ۔

وہ اب بھی بڑبڑائے جا رہا تھا ۔ کچکچا کر اس نے زور سے گھونسا تانا اور میز پر دے مارا جس جگہ گھونسا پڑا تھا وہاں ایک پلیٹ ابھر آئی اس میں بہت سے خوش رنگ کیک رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سب کیک ڈرائیور کتے کی طرف پھینک دیئے۔ جنھیں وہ ایک ہی سانس میں نگل گیا ۔ صرف ایک بڑا سا کیک بچ گیا تھا جسے اُٹھا کر اس نے میری طرف پھینکا ۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میری چیخ نکل گئی ۔ اس کیک میں بہت سے سانپ لپٹے ہوئے تھے ۔ ڈاکو نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ اور ذرا سی دیر میں غائب ہو گیا ۔

کیک اب میرے کمرے میں آ چکا تھا ۔ میں خوف سے آگے آگے بھاگ رہا تھا ۔ اور وہ میرے پیچھے ۔ اچانک اس میں لپٹے ہوئے ایک سانپ نے اپنا خوفناک پھن آگے بڑھایا اور مجھے مسہری پر ڈھکیل دیا ۔ میرے گرتے ہی وہ کیک بھی میرے قریب ہی گر پڑا لیکن اب وہ کیک نہیں ایک کاغذ بن چکا تھا ۔ سانپ غائب ہو گئے تھے ۔ ہمت کر کے میں نے وہ کاغذ اُٹھا لیا اس کے اٹھاتے ہی چنگاریاں غائب ہو گئیں ۔ خط میں لکھا تھا :۔

احمق لڑکے !

اپنی جان سے زیادہ تم اپنے ابّا جان سے کئے ہوئے وعدے کو عزیز سمجھ رہے ہو۔ تم چکھلے ہوئے چند ہو ۔ فرض پورا کرتے

ہوئے جان دینا بے وقوفوں کا کام ہے۔ کل جب میں واپس جاؤں گا تو گھر کی تمام دولت لے کر یا تمھاری جان!

— یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔

خط پڑھ کر میں نے قدم بڑھانا چاہے تاکہ گھر کا تمام قیمتی سامان لاکر اس کمرے میں جمع کروں ورنہ کل میری زندگی کی خیر نہیں۔ لیکن نہ معلوم کیوں میرے قدم آگے نہیں بڑھے۔ وہ ایک ہی جگہ جم کر رہ گئے۔ ایک آواز میرے کانوں میں گھستی چلی گئی — بھول گئے وعدہ — بھول گئے فرض!!

"نہیں ہرگز نہیں"— میں زور سے چلایا۔

تیزی سے رات گزر گئی، دن ہوا اور پھر دوسری رات گزر گئی۔ لیکن میں بالکل خوف زدہ نہیں تھا۔ گیارہ بجے دروازے پر کچھ آہٹ معلوم ہوئی اور دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ وہ بھیانک ڈاکو اپنے چاروں طرف بڑے بڑے کانٹے لپیٹے ہوئے اندر داخل ہوا۔ آج اس کے دو ہاتھوں کے بجائے بارہ ہاتھ تھے اور ان بارہ ہاتھوں میں بارہ پستول تھے — آتے ہی وہ گرجا۔

"لاؤ کہاں ہے روپیہ اور زیور"

"وہ تمھیں نہیں ملے گا"۔ میں نے بھی گرج کر جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے جان سے زیادہ فرض پیارا ہے — وعدہ عزیز ہے"

"تو یہ تمھارا قطعی فیصلہ ہے؟"

"ہاں"

اور دوسرے ہی لمحے اس نے ان بارہ پستولوں سے یکے بعد دیگرے بارہ فائر کئے جنھوں نے میرے پورے جسم کو چھلنی کر دیا۔ ایک چیخ میرے منھ سے نکلی — اور جیسے میں کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑا۔

نہ کوئی ڈاکو تھا، نہ بارہ پستول، نہ میرے جسم پر کوئی زخم تھا اور نہ کمرے میں خون۔ کمرے میں لگے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجے کا اعلان کیا تھا۔ اور یہی اس بھیانک ڈاکو کے بارہ فائر تھے۔

کتابوں پر جھکا ہوا میں سوچ رہا تھا۔ کتنا نصیحت آمیز تھا میرے خیالات کا ڈراما۔ اگر میں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا، اپنا فرض انجام نہ دیا تو کہیں سچ مچ ایسا نہ ہوجائے۔ وہ خوفناک ڈاکو — اُف خدا!

— اور میں نے مضبوطی سے کنجیوں کا گچھا اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

فقیر: بابا ترس کھاکر ایک پیسہ دے دو۔
آدمی: ترس بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔
راجہ نواب، لکھنؤ۔

اُستاد: بتاؤ جب کوئی بادشاہ یا بہادر مرتا ہے تو کہاں جاتا ہے۔
شاگرد: (جلدی سے) تاریخ کی کتاب میں۔

باپ: تمہارے ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ تم تاریخ نہیں یاد کرتے۔
بیٹا: آپ ہی نے تو کہا تھا کہ گزری ہوئی باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہیے۔

مریض: (ڈاکٹر سے) کیوں صاحب فیس پہلے کیوں دوں؟
ڈاکٹر: کل ایک آدمی دوا پیتے ہی مرگیا اور میں اس سے فیس نہ لے سکا۔ تم مریضوں کا کوئی اعتبار نہیں۔
جمیل اشرف نعمانی، جامعہ نگر

باپ: اپنے اُستاد کا کہنا مانا کرو۔ وہ بڑے لائق آدمی ہیں۔
بیٹا: وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔
باپ: کیا بک رہے ہو
بیٹا: سچ کہتا ہوں ابا جان! ہر بات تو

لڑکوں سے پوچھتے ہیں۔ وہ شہر کہاں ہے، اس دریا کا نام کیا ہے۔ فلاں لفظ کے کیا معنی ہیں۔

مالک: جب تم کام نہیں جانتے تو زیادہ تنخواہ کیوں مانگتے ہو؟
نوکر: مجھے محنت بھی تو زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

استاد: بتاؤ سب سے ٹھنڈی جگہ کون سی ہے؟
شاگرد: برف خانہ!

خدیجہ ہاشمی

ایک دفعہ ایک بے وقوف شخص نے ایک آدمی کو کنوئیں سے نکال کر اس کی جان بچائی اور پھر اسے اٹھا کر دریا میں ڈال دیا۔ لوگوں نے کہا تو نے یہ کیا کیا۔ بے وقوف شخص نے جواب دیا کہ "ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ نیکی کر دریا میں ڈال"۔

ایک آدمی: (وکیل سے) وکیل صاحب! ذرا دیکھئے یہ روپیہ کھرا ہے یا کھوٹا۔
وکیل: (روپیہ جیب میں ڈال کر) ایک روپیہ اور لائیے۔ میں رائے دینے کی فیس دو روپیے لیا کرتا ہوں۔

جج: تم جانتے ہو اگر تم نے جھوٹ بولا تو اس جھوٹے حلف پر خدا تمھیں کیا سزا دے گا۔
گنوار: ہاں سرکار دوزخ میں جھونک دیا جاؤں گا۔
مجسٹریٹ: اور اگر تم نے سچ بولا تو
گنوار: حضور مقدمہ ہار جاؤں گا۔

پھل والا: آنے کے دو سنترے۔ آنے کے دو سنترے۔
شریر لڑکا: جانے کے کتنے۔

شریر لڑکا: (تانگے والے سے) چاندنی چوک جاؤ گے۔
تانگے والا: جی ہاں سرکار۔
شریر لڑکا: اچھا تو جاؤ۔

رجیت سنگھ آزاد

جاپان کی ایک قدیم کہانی

آئینہ ہے یا تصویر

اب سے ہزاروں سال پُرانی بات ہے کسی گاؤں میں ایک آدمی تھا، جس کا نام تھا، شو شو۔ وہ اپنی بیوی شی شی کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بڑی محبّت کرتے تھے۔ ایک دن شو شو کسی کام سے باہر جا رہا تھا۔ راستے میں اُسے ایک آئینہ پڑا ملا۔ شو شو نے پہلے آئینہ کہاں دیکھا تھا۔ وہ تو اُسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس میں ایک آدمی کی شکل نظر آ رہی تھی۔ صورت ایسی تھی جو اُس نے پہلے کبھی دیکھی تھی۔ شو شو نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا۔ پھر اُس نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا اور یہ سوچنے لگا کہ اس کی شکل کس سے ملتی جلتی ہے۔ آخر اس کو یاد آیا کہ اس کے باپ کی شکل بالکل ایسی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ اس نے آئینہ نکال کر پھر ایک بار دیکھا، واقعی اُس کے باپ کی شکل ہے جو کسی نے بنا دی ہے۔ اس کو جب اپنا باپ یاد آیا تو اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ وہ بڑی دیر تک اپنے باپ کو یاد کر کر کے روتا رہا۔

شام کو جب شو شو گھر واپس آیا تو اس نے بڑی احتیاط سے وہ آئینہ اپنے تکیے کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔ اب تو روزانہ شو شو جب بھی اپنے کام سے واپس آتا تو اپنے تکیے

شی شی سے چھپ چھپا کر اس کو ضرور دیکھتا
اور اپنے باپ کو یاد کرتا۔ اور جب اسے
اپنا باپ یاد آتا تو پھر اسے اپنی ماں بھی
یاد آنے لگتی جو اس سے بہت محبت کرتی
تھی۔ شی شی کو پچھلے سات دن تک تو کچھ پتہ
نہ چلا لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ کئی
دن سے شو شو کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے
وہ اس سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتا۔
نہ پہلے کی طرح ہنستا بولتا ہے۔ آخر ایک دن
جب شام کو شو شو اپنے کام سے واپس
آیا تو شی شی دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے
گئی۔ جب شو شو کمرے کے اندر چلا گیا تو شی
شی چھپ کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہو
گئی۔ اس نے دیکھا کہ شو شو نے اپنے تکیے کے
نیچے سے کوئی چیز نکالی ہے اور اسے بڑے
غور سے دیکھا اور پھر ذرا سی دیر کے بعد
اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ شو شو نے
رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اس چیز کو پھر
تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
شی شی اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی
تھی۔ اس کا شوہر پریشان ہو، وہ یہ کیسے
برداشت کر سکتی تھی۔ آخر اس سے نہ رہا
گیا اور اس نے بڑھ کر کہا۔
"شو شو، کیا بات ہے، تم کیوں پریشان
ہو؟"
"نہیں کوئی بات نہیں تم اپنا کام کرو"
شو شو نے کپڑے سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے
کہا۔
"نہیں کوئی بات ضرور ہے، تم کو بتانا
پڑے گا، تم کو میری جان کی قسم، بتا دو نا"
شی شی نے بڑی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، مجھے
اپنا باپ یاد آ گیا"
"مجھے بیوقوف بناتے ہو، باپ کو مرے
ہوئے نہ جانے کتنا زمانا گزرا، اب اسے
یاد کرنے بیٹھے ہو؟"
"اچھا چلو کھانا کھائیں" شو شو نے بات
ٹالتے ہوئے کہا۔

اگلے دن جب شو شو اپنے کام پر چلا
گیا تو شی شی نے سوچا کہ اب دیکھنا چاہیے
کہ شو شو نے اپنے تکیے کے نیچے ایسا کون

سی چیز رکھ دی ہے، جسے دیکھ کر اس کی
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب جو اس نے
تکیہ دیکھا تو اس میں سے ایک عجیب و غریب
چیز نکلی جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی
تھی۔ اس نے جو غور سے دیکھا تو اس میں
اسے ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ جس کے
بال بڑے خوبصورت اور گھنگھریالے تھے۔
لانبی لانبی کالی پلکیں۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھیں
اور گورے گورے گال۔ اب تو جیسے وہ
ساری بات سمجھ گئی۔ غصّے میں اس نے وہ
آئینہ ایک طرف بستر پر پھینک دیا، لیکن
ذرا سی دیر کے بعد جب غصہ کم ہوا تو
اس نے احتیاط سے آئینہ اپنے پاس چھپا
کر رکھ لیا۔ اور لگی انتظار کرنے کہ جب شو
شو آئے گا تو اس سے جھگڑا کروں گی۔ اب
اُسے یقین ہو گیا کہ ضرور شو شو اس سے
محبت کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کئی
روز سے اس سے ٹھیک سے بات بھی نہیں
کرتا، اور یہ سوچ کر تو اُسے اور بھی غصہ آیا
کہ شو شو نے اُس کی جان کی قسم کی بھی پروا
نہیں کی اور جھوٹ موٹ کہہ دیا، حالانکہ روزانہ
اسی لڑکی کو دیکھتا ہے۔

شام کو جب شو شو واپس آیا تو شی شی
بڑے زور سے بگڑی۔

"جھوٹ بولتے ہو، شرم نہیں آتی، مجھ
سے کہتے ہو کہ مجھے اپنا باپ یاد آتا ہے۔"

شو شو بے چارا یہ سن کر بالکل گھبرا
گیا۔ اس نے کہا "شی شی، یہ تم کو ہو کیا
گیا جو اتنی ناراض ہو۔"

"مجھے ہو گیا یا تم کو، جو روز شام کو
روتے ہو" شی شی سے غصے میں بولا بھی
نہیں جا رہا تھا۔

"آخر بات تو بتاؤ۔ اتنے غصے کی وجہ
کیا ہے" اس نے اور زیادہ گھبرا کر پوچھا

"وجہ مجھ سے پوچھتے ہو، اپنے آپ
سے پوچھو، جو ایک لڑکی کی تصویر تکیے کے
نیچے چھپا کر رکھتے ہو۔" اب شی شی سے زیادہ
صبر نہ ہو سکا اور اس نے بتا ہی دیا۔

شو شو سمجھ گیا کہ شی شی کا اشارہ
کدھر ہے، اس نے بڑی خوشامد کرتے ہوئے
کہا "ارے وہ تصویر ـــــ شی شی وہ تصویر
تو میرے باپ کی ہے، جسے تم ایک لڑکی

کی تصویر سمجھ رہی ہو۔"
"وہ تمھارے باپ کی تصویر ہے؟
مجھے جھٹلاتے ہو؟"
"اجی وہ لڑکی کی تصویر نہیں ہے۔ واقعی
میرے باپ کی تصویر ہے میرا باپ بالکل ایسا
ہی تھا۔" شوشو نے پریشان ہو کر کہا۔
"تمھارے باپ کی، جیسے میں کوئی
بیوقوف ہوں، جو عورت اور مرد کی تصویر میں
فرق نہیں کر سکتی۔ وہ ایک لڑکی کی تصویر ہے۔
میں خوب پہچانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ
تم اس سے محبت کرتے ہو۔"
"تم بھی عجیب آدمی ہو۔ خواہ مخواہ شک
کرتی ہو۔ میں تم کو کیسے یقین دلاؤں، ارے شی
شی، تم نے میرے باپ کو نہیں دیکھا، یہ تصویر
واقعی اسی کی تصویر ہے۔"
"وہ لڑکی کی تصویر ہے" شی شی نے بڑے
یقین سے کہا۔
"وہ لڑکی کی تصویر نہیں ہے" شوشو نے
بھی اتنے ہی یقین سے کہا۔
اب تو دونوں میاں بیوی میں خوب زوروں
سے جھگڑا ہونے لگا۔ اور شی شی نے جلدی سے

کمرے کے اندر سے آئینہ لا کر سامنے کر دیا
اور بولی "یہ لڑکی ہے یا تمھارا باپ۔"
شوشو نے بڑے غور سے دیکھ کر کہا کیسی
بیوقوف ہو تم بھی، اس کو لڑکی کی تصویر کہہ رہی
ہو، یہ تو زرا اور غور سے، آنکھیں کھول کر دیکھو
یہ کہہ کر اس نے آئینہ شی شی کی طرف
بڑھا دیا۔
اب شی شی نے اُسے بڑے غور سے
دیکھا اور بولی "تم منہ پر جھوٹ بولتے ہو،
تم خود ہی دیکھو، مجھے کیا دکھاتے ہو، عورت
کی تصویر کو مرد کی تصویر کہتے ہو دیکھتے نہیں،
مجھے دیکھ کر کیسی جلی جا رہی ہے۔"
اتفاق سے اسی راستے سے ایک بڈھا بہت
گزر رہا تھا اس نے جو یہ دیکھا کہ دو میاں
بیوی آپس میں اس بری طرح لڑ رہے ہیں
تو اس نے بھی سوچا کہ کیوں نہ ان کا جھگڑا
طے کرا دوں۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور بولا
"کیوں بھئی، ایسی کیا بات ہے جو تم
لوگ آپس میں لڑ رہے ہو۔ لڑائی جھگڑا بہت
برا ہوتا ہے۔"
شی شی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے

اسی مہاپُرش کے انتظار میں تھی، اس نے کہا "باباجی! ان کے پاس سے ایک لڑکی کی تصویر نکلی ہے، جس سے یہ محبت کرتے ہیں اور اکثر اُسے دیکھ دیکھ کر روتے ہیں۔ اب جو میں نے دیکھ لیا تو کہتے ہیں کہ یہ میرے باپ کی تصویر ہے۔ آپ ہی دیکھئے، یہ عورت کی تصویر ہے یا مرد کی۔ صاف عورت کی تصویر ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے وہ آئینہ پروہت کو دے دیا۔

پروہت نے اُسے جو ہاتھ میں لیا تو اُسے بڑے زور سے ہنسی آئی اور بولا "تم دونوں بڑے بیوقوف ہو، نہ تو یہ تمھارے باپ کی تصویر ہے اور نہ یہ کسی عورت کی۔ یہ تو کسی بڑے مہاپرش کی تصویر ہے۔ اس کا تمھارے گھر میں کیا کام؟"

پروہت کی زبان سے یہ سُنتے ہی شو شو اور شی شی، دونوں اس آئینے کی طرف بڑھے، اب تو وہ تینوں گھبرا گئے، شو شو بولا "ارے شی شی تم میرے باپ اور باباجی کے ساتھ —— ارے یہ کیسے!"

باباجی بولے "تم دونوں میاں بیوی، مہاپُرش کے ساتھ یہ کیسے!"

شی شی "ارے شو شو تم اور وہ لڑکی باباجی کے ساتھ کیسے!"

اور پھر تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

باباجی نے کہا "یہ ضرور کوئی جادو کی چیز ہے۔ کسی جادوگر نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ بہتر ہے کہ اِسے کہیں پھینک دیں" اور پھر تینوں نے لے جا کر اسے پاس والے کنویں میں پھینک دیا اور پھر جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اس خطرناک جادو کی چیز کا خاتمہ کر دیا جس نے اُن کے گھر میں جھگڑا کر دیا تھا اور پھر شو شو اور شی شی ایک دوسرے سے گلے ملے، اور آپ جانتے ہیں کہ دو روٹھے جب گلے ملتے ہیں تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔

بُوجھ

۱۔ سنترہ	۲۔ گھڑی
۳۔ ٹماٹر	۴۔ جوتے

دیہاتی کی مصیبت

ایک دیہاتی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک شیر، ایک گائے اور گھاس کا ایک گٹھر تھا۔ راستے میں ایک دریا پڑا۔ دریا پار کرنے کے لئے سب سے بڑی شرط یہ تھی کہ اپنے ساتھ ایک وقت میں ایک چیز ہی لے جاؤ۔ تینوں کو ایک ساتھ لے نہیں جا سکتے۔ تین تو بڑی دور دو بھی نہیں لے جا سکتے۔ بس صرف ایک کو جانے کی اجازت تھی۔ اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شیر کو لے جائے تو گائے گھاس کھا جائے گی اور گھاس کو لے جائے تو شیر گائے کو ہڑپ کر لے گا ہاں اگر گائے کو لے جائے تو شیر گھاس تو نہیں کھائے گا۔ البتہ جب دوبارہ وہ شیر کو لے جائے گا تو شیر اس پار جا کر گائے کو کھائے گا یا گھاس کو لے جائے گا تو گائے گھاس نہ چھوڑے گی بے چارا مصیبت میں پھنس گیا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو حفاظت کے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

آخر آدمی تھا سوجھ بوجھ والا اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔

وہ ترکیب کیا تھی پہلے دماغ پر زور ڈالئے اور اگر پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو صفحہ ۴۸ پر دیکھئے۔

احمد حسین

گُلنار پری

کوہ قاف کے پرستان میں گُلنار نام کی ایک پری رہتی تھی ۔ یہ پری جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی خوش مزاج بھی تھی ۔ لیکن ایک بار جھوٹ بولنے پر پرستان کی ملکہ اس سے ناراض ہوگئی اور بولی: "تم نے جھوٹ بول کر پرستان کے خوب صورت نام پر بٹّا لگایا ہے اس لئے تم کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ تم پانچ سال تک کسی پرند کی شکل میں رہو اور اس کے بعد اپنی ذات سے دو آدمیوں کو فائدہ پہنچاؤ ۔ جب یہ شرطیں پوری ہوجائیں گی تب تم پری کی شکل اختیار کرسکوگی۔"

ابھی اس کی زبان سے یہ جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ گلنار فوراً ایک خوب صورت چڑیا بن گئی ۔ دھنک کے ساتوں رنگ اس کے پروں میں سمائے تھے اور خوب چمکتے تھے ۔ اس طرح وہ چڑیا پانچ سال تک چڑیوں کے ساتھ جنگل جنگل ماری ماری پھرتی رہی ۔ جب پانچ سال پورے ہونے کو آئے تو ایک

دن وہ ایک چڑی مار کے جال میں پھنس گئی یہ چڑی مار بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس نے جو یہ خوب صورت اور انوکھی چڑیا دیکھی تو پھولا نہ سمایا اور سوچنے لگا کہ یہ چڑیا تو بڑے اچھے داموں بکے گی۔ اسی لئے اگلے دن وہ اُسے بیچنے کے لئے بغداد کے بازار میں لے گیا۔

اتفاق سے اُس روز شہر بغداد کا سب سے بڑا سوداگر ادھر سے گزر رہا تھا اُس نے یہ انوکھا پرندہ دیکھا تو گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اور جب سوداگر نے اس پرندے کو اپنے ہاتھ میں لیا تو دیکھتا کیا ہے کہ داہنے بازو پر لکھا ہے کہ "جو کوئی میرا سر کھائے گا، وہ بادشاہ بنے گا"۔ اور بائیں بازو پر یہ لکھا ہے۔ کہ جو آدمی میرا دل کھائے گا اس کے سرہانے ہر صبح ایک ہزار اشرفی کی تھیلی نکلے گی۔"

یہ پڑھ کر سوداگر کی باچھیں کھل گئیں اس نے چڑی مار سے منھ مانگے دام پر وہ چڑیا خرید لی۔ گھر لاکر اُس نے یہ چڑیا اپنے باورچی کے حوالے کی لیکن شام کو جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو طشتری میں نہ تو پرندے کا سر تھا اور نہ اس کا دل۔ یہ دیکھ کر وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اور خاص طور پر جب اُسے معلوم ہوا کہ باورچی کے دونوں لڑکوں نے اُسے کھا لیا ہے۔ تو اس کو اور بھی غصّہ آیا اور اس نے سوچ لیا کہ ان دونوں لڑکوں کو جان سے مار ڈالنا چاہیے۔ لیکن باورچی بے وقوف نہ تھا اس نے تو پرندے کے بازوؤں میں جو کچھ لکھا تھا وہ پہلے ہی پڑھ لیا تھا اور جان بوجھ کر لڑکوں کو کھلایا تھا اسی لئے اس نے سوداگر کے سامنے کھانا لانے سے پہلے ہی دونوں لڑکوں کو شہر سے باہر چلے جانے کے لئے کہہ دیا تھا اور ان کو سمجھا دیا تھا کہ الگ الگ راستوں پر جائیں۔ جب سوداگر کا غصّہ ختم ہو جائے گا، تو دیکھا جائے گا۔

اب یہ دونوں الگ الگ راستوں پر چل پڑے۔ چھوٹا لڑکا، جس نے

دل کھایا تھا وہ چلتے چلتے شام کو ایک کُٹیا
کے سامنے پہنچا۔ اس کُٹیا کے اندر ایک
بڑھیا اپنی لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ بڑھیا
نے اِس کی خوب خاطر کی۔ جب صبح ہوئی
تو اس کے سراہنے ایک ہزار اشرفی کی
تھیلی نکلی۔ یہ لڑکا اُسی بڑھیا کے ساتھ
رہنے لگا۔ اس نے بڑھیا کی لڑکی کے ساتھ
شادی کرلی۔ روزانہ اس کے سراہنے اسی
طرح اشرفیوں کی تھیلی نکلنے لگی۔ یہاں
تک کہ اس کے پاس کئی تھیلیاں ہوگئیں۔
اور اس نے بغداد میں ایک خوب صورت
کوٹھی بنوائی۔

دوسرا لڑکا جس نے چڑیا کا سر
کھایا تھا وہ کئی دن کے مسلسل سفر
کے بعد ایک دن ایک نئے شہر میں داخل
ہوا۔ جیسے ہی وہ داخل ہوا دیکھتا کیا
ہے کہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہے جیسے
یہ سب لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہوں
اس کو دیکھ کر سب لوگوں نے خوشی میں
نعرے لگانے شروع کردئے "ہمارا
بادشاہ آگیا" ـــــ یہ کہہ کر ایک
آدمی نے بڑھ کر اس کے سر پر سونے کا
تاج رکھ دیا۔ دراصل اس ملک کا
بادشاہ بے اولاد مرگیا تھا۔ اور لوگوں
کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس کو بادشاہ
بنائیں۔ آخر انھوں نے یہ طے کیا کہ آج
جو آدمی بھی پہلے شہر پناہ سے داخل
ہوگا اسی کو اپنا بادشاہ بنالیں گے۔
اس طرح یہ لڑکا بادشاہ بن گیا۔

اِدھر اس کے سر پر تاج رکھا گیا
اور اُدھر گلنار کی سزا کی مدت پوری
ہوگئی تھی۔ اور وہ پری کی شکل میں آکر
پرستان میں ہنسی خوشی رہنے لگی،
اور پھر وہ ہمیشہ سچ بولتی تھی۔

بقیہ "چاچا نے گاڑی پکڑی"

اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے۔ اور بولے۔
مدراس ایکسپرس کتنی دیر میں آئے گی۔

اسٹیشن ماسٹر نے اپنے چشمے میں سے
جھانکتے ہوئے کہا۔ مدراس ایکسپرس آئی
بھی اور چلی بھی گئی۔ اور اب کل صبح نو
بجے آئے گی۔"

کھلونا کے مقابلے میں انعام پانے والی کہانی

کے سروج
عمر ۱۰ سال
نئی دہلی

چاچا نے گاڑی پکڑی

وہ موٹا سا آدمی جو ہر دم اپنے مکان کے برامدے میں ایک آرام کرسی بچھائے بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔ اس کا نام راما سوامی ہے۔ لیکن گاؤں کے لوگ اُسے رامو چاچا کہتے ہیں۔

ایک دن رامو چاچا کھانا کھاکر لیٹے تھے۔ پڑوس میں کرشن بابو زور زور اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور رامو چاچا کان لگائے سُن رہے تھے۔ اتنے میں ڈاکیے نے آواز دی "رامو چاچا تمھارا تار ہے۔" رامو چاچا نے اُچھل کر ڈاکیے کے ہاتھ سے تار لے لیا اور ذرا دیر میں شور مچ گیا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے کہ رامو چاچا کا تار آیا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ چاچی بھی پریشان دوڑی ہوئی آئیں۔ کرشن بابو آگئے۔ اُنھوں نے پڑھا اور بولے "چاچا

رمت کرو۔ یہ گوپال وکیل کا تار
ہے۔ انھوں نے تم کو پرسوں بلایا
ہے۔ لکھا ہے کہ پرسوں پہنچ جاؤ۔"
یہ سُن کر سب کو اطمینان ہوا
لیکن چاچی پریشان ہوگئیں کیوں کہ
وہ جانتی تھیں کہ رامو چاچا کے
مدراس جانے کے کیا معنی ہیں۔
رامو چاچا بولے "کرشن بابو
مجھے کل صبح مدراس اکسپرس سے
جانا چاہیئے۔ کے بجے گاڑی چھوٹتی
ہے تمھیں معلوم ہے؟"
"۹ بجے ٹھیک" کرشن بابو نے
جواب دیا۔
"۹ بجے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔
بالکل غلط۔ میں اب سے سات برس
پہلے بھی جب گیا تھا تو مجھے خوب
یاد ہے کہ ساڑھے چھے بجے گاڑی
جاتی تھی۔
اسٹیشن یہاں سے تین میل کے
فاصلے پر تھا۔ اس لئے چاچا نے طے
کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے یہاں
سے روانہ ہوجائیں گے۔ انھوں نے
اپنا سامان باندھا اور اپنے لڑکے
راجو سے بولے "راجو! کل صبح کے
لئے ایک بیل گاڑی کا انتظام کرلو۔
یوں تو گوپال کی گاڑی کے لئے
کہہ سکتے ہو وہ آدمی اچھا ہے۔
لیکن اُس کے بیل بوڑھے ہیں۔
رامن کے بیل تو اچھے ہیں مگر وہ
کمبخت بڑا کاہل ہے۔ وہ سوتا
رہے گا۔ اور گاڑی چھوٹ جائے گی
اس لئے گووند سے طے کرلو۔ لیکن
رامن سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی تیار
رہے۔ ضرورت پڑی تو اس کی گاڑی
منگوالیں گے۔ اور ہاں احتیاطاً
گووند سے کہہ دو کہ وہ اپنی
گاڑی رات ہی کو یہاں لے آئے۔
رات کو چاچا جب سونے گئے
تو زرا سی دیر کے لئے بھی انھیں
نیند نہ آئی۔ پھر ایک دم سے
اٹھ کر باہر آئے اور آسمان کی
طرف دیکھ کر ہڑبڑاتے ہوئے

...چاچا کو اٹھا دیا: "ارے جلدی
...گووند اپنی گاڑی لے کر نہیں
گیا۔ کہیں میری گاڑی نہ چھوٹ جائے۔"
...چاچا اپنی آنکھ ملتا ہوا اٹھا اور نصف
کے گھر گیا کیوں کہ سارے گاؤں
میں بس اسی کے یہاں گھڑی تھی
اور آکر کہا: "بابا ابھی تو بارہ بجے
ہیں، سو جاؤ۔"
لیکن چاچا کہاں ماننے والے تھے بولے
"...ارے گھڑی بند ہوگئی ہوگی
چار سے کم نہیں بجے۔ صبح ہو رہی ہے
تم تو فوراً جاکر گاڑی لے آؤ۔"
چاچا سوئے نہیں۔ آخر گاڑی آئی
اور صبح ہونے سے پہلے ہی چاچا روانہ ہوگئے
دو تین منٹ کے بعد چاچا چلائے: "ارے
جلدی چلاؤ۔ کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔"
جب اسٹیشن آدھا میل رہ گیا تو گووند
نے سگنل کی طرف اشارہ کیا اور بولا: "چاچا
تم خواہ مخواہ پریشان ہو۔ ابھی سگنل بھی نہیں گرا۔"
چاچا نے کہا: "اور جو گاڑی آکر چلی گئی
ہو پھر" اس خیال کا آنا تھا کہ چاچا فوراً گاڑی
سے اترے اور بھاگنے لگے۔
گووند نے سمجھاتے ہوئے کہا: "چاچا دوڑنے
سے کیا فائدہ۔ سامان تو میرے پاس ہے۔"
چاچا نے کہا: "بیل مجھے بھاگتا دیکھ کر خود بھی
تیز دوڑیں گے۔" ___ اس طرح
چاچا اسٹیشن پہنچے اور پیچھے پیچھے گووند کی
گاڑی جب اسٹیشن ماسٹر سے انھوں نے پوچھا
کہ مدراس ایکسپریس کب آئے گی تو اسٹیشن ماسٹر
نے جواب دیا: "نو بجے، ابھی تو ڈھائی گھنٹہ
باقی ہے۔" ___ چاچا نے ٹکٹ خریدنا
چاہا مگر اس کے لئے بھی اسٹیشن ماسٹر نے کہا کہ ٹکٹ
تو گاڑی آنے سے دس منٹ پہلے بکتے ہیں۔"
اس لئے اب چاچا نے سوچا کہ جب اتنا وقت باقی
ہے تو پھر کیوں نہ تالاب پر جاکر نہائیں۔ جو اسٹیشن سے
آدھے میل کے فاصلے پر ہے۔" بس وہ نہانے پہنچے
اتفاقاً تالاب کے پاس دلدل تھی۔ چاچا اس دلدل
میں پھنس گئے۔ اب اس دلدل سے جتنا ہی نکلنا
چاہتے ہیں اتنا ہی اور پھنستے ہیں۔
آخر بڑی کوشش کے بعد چاچا اس میں
سے نکلے اور بھاگتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔
اسٹیشن پر ابھی تک بھیڑ نہ تھی۔ چاچا سیدھے

۱

سنہری رنگ کے بنچے میں ہیں کچھ بوتلیں ایسی
خدائے پاک نے جس میں بھرا ہے زندگی کا رس
بہت ارزاں بہت عمدہ ذرا کھٹّی ذرا میٹھی
بتائیں اور کیا تعداد ہو گی اُن کی نو یا دس

۲

نہیں آپس میں یکساں اس کی دو ٹانگیں مگر پھر بھی
خوشی سے ہر گھڑی چلتے ہی رہنا کام ہے اس کا
وہ طے کرتی ہے بارہ منزلوں کا وقت پر اپنے
پہیلی خود بتا دے گی تمھیں کیا نام ہے اس کا

۳

نہ پوچھو کس قدر طاقت ہے دیسی لال انڈے میں
جو کھاتا ہے جواں دل سرخ رُو ہو کر مٹکتا ہے
سفیدی اور زردی کی جگہ کچھ بیج ہیں اس میں
اسے مُرغی نہیں دیتی یہ پودے سے نکلتا ہے

۴

یہ دو ساتھی ہیں جن کی شکل بالکل ایک جیسی ہے
سنو تم غور سے دلچسپ حال ان کا ادھر آؤ
انھیں ہو شوق پھرنے کا ہمیں جانا ہو جب باہر
ہمارے پاؤں پڑتے ہیں کہ ہم کو ساتھ لے جاؤ

حل

دیہاتی کی مصیبت

یہ دیکھیے دیہاتی نے مصیبت سے نکلنے کی ترکیب معلوم کرلی۔ آپ بھی تصویر کی مدد سے سمجھ لیجیے۔ اور جب سمجھ میں آجائے تو اسے اپنی زبان میں لکھ ڈالیے۔

ادارہ

امّاں کی ساری

شنکرز ویکلی کے بچّوں کے نمبر میں انعام پانے والی کہانی

میری امّاں نے ایک روز مجھ سے کہا کہ "رامو! تم اتنا اچھا لکھتے ہو پھر شنکرز ویکلی کے بچّوں کے نمبر میں کہانی کیوں نہیں لکھتے۔"

میں دیر تک یہی سوچتا رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔

پھر میں نے امّاں سے پوچھا: "اماں تم ہی بتاؤ کس چیز پر لکھوں"

امّاں نے کہا: "جو چاہے لکھو۔" پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں امّاں کی ساری پر لکھوں۔ اس پر تو میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ میری اماں گھر میں ایک سفید ساری پہنتی ہیں۔ صبح صبح جب وہ ہمارے ننھے منّے بھیّا کا منھ دھوتی ہیں تو اُسے غسل خانے میں لے جاتی ہیں پھر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بب کہیں کھو گیا ہے۔ یہ بب تو ہمیشہ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو ہماری اماں اپنی ساری کا پلو اس کے گلے میں لپیٹ دیتی ہیں اور پھر اس کا منھ دھوتی ہیں پھر دوسرے پلو سے اس کا منھ پونچھتی ہیں۔ میں بھی جب منھ ہاتھ دھوتا ہوں تو اماں کے پلو ہی سے پونچھتا ہوں۔

جب اماں دودھ گرم کرتی ہیں اور
دودھ اُبلنے لگتا ہے تو اپنی ساری کے
پلو سے پکڑ کر دیگچی اتارتی ہیں۔ ایک بار
تو اُن کی ساری میں آگ لگ گئی تھی۔
لیکن زیادہ نہیں لگی۔ صرف ساری
میں کچھ سوراخ ہوگئے تھے۔ جب وہ
ہمارے کپڑے دھوتی ہیں تو اُن کی
ساری پانی میں بالکل تر ہوجاتی ہے
کبھی کبھی ہمارے دوست، ہمارے
چچا، چچی بھی گھر پر آتے ہیں اس
وقت آپ جانتے ہیں امّی کا کیا
حال ہوتا ہے۔ اور وہیں سے چلّاتی
"رامو جلدی سے میری کنجیاں
لیتے آؤ۔"
لیکن کنجیاں مجھے کہاں مل سکتی ہیں
اس لئے کہ اماں کو خود یاد نہیں ہے
کہ انھوں نے کہاں رکھی ہیں۔

رام کمار نائر
(عمر، سال، نئی دہلی)

بقیہ "انوکھی پچکاری"

ہاتھ تک پہنچنے میں کچھ دیر لگتی ہے اس لئے
یہاں دھڑکن ذرا دیر میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ
حرکت صرف ہاتھوں ہی میں نہیں بلکہ جسم کے اکثر
حصّوں میں ہوتی ہے۔

ہمارے جسم میں یہ خون نسوں کے ذریعے
دوڑتا ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے
کہ اگر کبھی چاقو سے کوئی نس کٹ جائے تو بہت
سا خون نکل جاتا ہے۔ دوسری جگہ سے اتنا خون
نہیں نکل سکتا۔ اس لئے کہ یہ نسیں تو دراصل خون
کی نالیاں ہیں جن سے خون گزرتا ہے۔

اسی لئے تو ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر
نس کٹ جائے تو کسی صاف کپڑے کو فوراً اس
پر رکھ کر انگلی سے دبا لینا چاہیئے۔ تاکہ خون
نہ نکل سکے۔ پھر ڈاکٹر کو بُلا لیجئے ڈاکٹر اس کا
مناسب علاج کرے گا۔

جسم کا سارا کام دل اور دوران خون
کی بدولت چلتا ہے۔ اگر یہ اپنا کام ختم
کردے تو جسم کی ساری مشین رک جائے گی
اور انسان کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ دل ہی
ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے۔

انوکھی پچکاری

شاہد علی

ہر جاندار کے جسم میں ایک انوکھی پچکاری ہوتی ہے جس کو ہم آپ دل کہتے ہیں ۔ یوں تو جانوروں اور انسانوں کے دل مختلف ہوتے ہیں لیکن خصوصیت اُن سب کی ایک ہی ہوتی ہے ۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دل کی دھڑکن جو آپ محسوس کرتے ہیں، اس کا تعلق زندگی کے ساتھ ہے ۔ جب تک دل میں دھڑکن ہوتی ہے، آدمی زندہ رہتا ہے ۔ جہاں یہ حرکت ختم ہوئی، آدمی مرا ۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ باوجودیکہ ہزاروں برس سے لوگ دل کی اس حرکت کو محسوس کرتے تھے لیکن یہ اس کی اہمیت اور اس کے کام کو بالکل نہ سمجھتے تھے ۔ اب سے صرف تین سو سال پہلے ولیم ہاروی نے دن رات کی محنت کے بعد دل کا فعل معلوم کیا ۔ لیکن ولیم ہاروی کے زمانے میں اتنی اچھی خوردبین نہیں تھی کہ خون کی گردش کو صحیح طور پر دیکھا جا سکتا ۔

ہاروی کی موت کے چار سال بعد ایک اطالوی سائنس دان نے ایک اچھی خوردبین سے ایک مینڈک کی نسوں اور نالیوں کو دیکھا جن سے خون گزرتا ہے ۔ یہ بال سے بھی باریک ہوتے ہیں ۔

ہمارا دل سچ مچ کی ایک پچکاری ہے جس

کے چاروں طرف پھیلے ہوتے ہیں اور یہ پٹھے ہمارے
جسم کے تمام پٹھوں سے اہم ہیں اور ہمارا دل دن
رات دھڑکتا رہتا ہے ۔ اس لئے کہ بغیر تازہ خون
کے ہماری رگیں اپنا کام نہیں کر سکتیں ۔ جو کھانا ہضم
ہو جاتا ہے اس کا جوہر خون میں شامل ہو کر جزو
بنتا ہے ۔ اور دل اس خون کو جسم کے ہر حصے میں
پہنچاتا رہتا ہے ۔ اگر یہ دل زرا سی دیر کے لئے
بھی آرام کرنے لگے تو ہماری خیر نہیں ہے ۔ یہ بڑا
محنتی ہے ۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ لوگ اچانک
بیٹھے بیٹھے کام کرتے کرتے مر جاتے ہیں دراصل
ان کا دل اک دم سے اپنا کام بند کر دیتا ہے
بغیر کچھ کہے سنے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر
معلوم کرتے رہ جاتے ہیں اور مرنے کی کوئی
وجہ نہیں معلوم ہوتی ۔ لیکن وجہ یہی ہوتی ہے
کہ دل حرکت بند کر دیتا ہے ۔

یوں تو ہر جاندار کا قلب بہت نازک
ہوتا ہے لیکن انسان کا قلب تو ان سب سے
زیادہ نازک ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ خون کی
ضرورت سب سے زیادہ دماغ کو ہوتی ہے
اور انسان کا دماغ دوسرے جانداروں کے
مقابلے میں زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے ۔ انسان
چونکہ کھڑا ہو کر چلتا ہے اس لئے دل کا کام
یہ ہوتا ہے کہ وہ خون کو اوپر پہنچائے ۔ دل
اپنی پچکاری سے یہ کام بڑی مستعدی سے
کرتا ہے اور خون کو برابر اوپر پہنچاتا رہتا ہے
اس کا کام سخت اور محنت طلب ہے ۔ اور
صرف یہی نہیں بلکہ اُسے کچھ خون نیچے پیروں
میں اور ہاتھوں میں بھی بھیجنا پڑتا ہے ۔ اور
یہ خون گردش کر کے پھر واپس آتا ہے ۔

اگر آپ اپنی کلائی پر ہاتھ رکھیں تو وہاں
بھی آپ کو کوئی چیز چلتی ہوئی محسوس ہوگی ۔ لیکن
یہ آپ کی نبض ہے دل نہیں ہے ۔ ہاں اس کا
تعلق بھی دل سے ہی ہے ۔ دونوں کی دھڑکن کی
رفتار ایک ہی ہوتی ہے ۔ اگر آپ اپنے ایک
ہاتھ کی دو انگلیاں دوسرے ہاتھ کی نبض پر
رکھیں اور اُسی ہاتھ سے دل کی دھڑکن کو محسوس
کرنے کے لئے دو انگلیاں سینے پر رکھیں تو آپ
کو پہلے دل کی دھڑکن محسوس ہوگی اور اس کے
فوراً بعد نبض ۔ دراصل دل کی حرکت ہی سے
نبض میں یہ حرکت پیدا ہوتی ہے ۔ اس لئے
کہ دل ہی ہے جو نسوں کے ذریعے سارے
جسم میں خون بھیجتا ہے ۔ اور اس خون کو

شیریں مجتبیٰ

سچّی کہانی

ہمارے محلے میں ایک شیخ جی رہتے تھے وہ ہمیشہ جنوں اور بھوتوں کے چکر میں رہتے تھے۔ پان کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ ایک دن پان کھانے کے شوق میں محلے بھر کا چکر کاٹ آئے۔ لیکن انھیں کہیں پان نہ ملا۔ بات یہ تھی کہ محلے کی تمام لڑکیوں کا اسکول میں داخلہ ہوگیا تھا۔ مائیں تو گھر کا کام کاج کرتی تھیں ان کو پان بنا کر کون دیتا۔ شیخ جی کو لڑکیوں اور ان کے والدین پر بہت غصہ آیا۔

اب شیخ جی کا روزانہ کا معمول تھا، کہ محلے بھر کا چکر لگاتے لڑکیوں کے والدین کو سمجھاتے کہ لڑکیوں کو مت پڑھاؤ۔ انھیں گھر کا کام کاج کرنا چاہیئے۔ لوگ شیخ جی کو پاگل سمجھ کر ٹال دیتے تھے۔ لیکن فریدہ کے والد شیخ جی کی بات کا بڑا اثر ہوا۔ فریدہ کے والد خود بھی پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگلے دن انھوں نے اسکول سے فریدہ کا نام کٹوا دیا۔ فریدہ کو بہت رنج ہوا۔ فریدہ کی خالہ کا لڑکا وحید اس کا ہم جماعت تھا اس نے فریدہ سے وعدہ کیا کہ میں تمھاری مدد کروں گا۔

آخر دونوں نے مل کر ایک ترکیب سوچی۔ اگلے دن وحید شیخ جی کے مکان پر گیا اور بولا

"شیخ جی میں ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں۔"
شیخ جی نے کہا۔" جلد کہو کیا خبر لائے ہو۔"
وحید نے کہا۔" سامنے والی مسجد میں ایک شہید بابا آئے ہوئے ہیں لوگ ان سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔"
شیخ جی شہید مردوں کے پہلے ہی سے قائل تھے۔ وحید کی باتوں میں آگئے۔ اور بولے۔
" مجھے آج ضرور ان کے پاس لے چلو۔"
وحید نے کہا۔ آپ تیار رہیئے گا۔ میں آؤں گا تو آپ کو لے جاؤں گا۔"
شام کو وعدے کے مطابق شیخ جی کو لے کر وحید مسجد میں پہنچا۔ اور مسجد کے اندر ایک قبر کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اور بڑے زور سے چیخا۔" شہید بابا سلام۔ شیخ جی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔"
اتنا کہنا تھا کہ اس شکستہ قبر میں سے ایک سفید چادر پہنے ہوئے کوئی شخص آیا جس کا منھ اسی چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور اس نے کہا کیوں جی تم ہی ہو جو لڑکیوں کو پڑھنے نہیں دیتے اچھی بات ہے۔"
یہ سننا تھا کہ شیخ جی بے ہوش ہوکر زمین پر دھڑام سے گر پڑے۔
اس شہید مرد نے جو نقاب اُٹھا تو وہ فریدہ تھی۔ وحید نے کہا" بس تم اب سیدھی گھر جاؤ۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"
وحید نے پانی کے کچھ چھینٹے شیخ جی کے منھ پر دیے خدا خدا کرکے شیخ جی کو ہوش آیا۔
وحید نے کہا۔" کمال کرتے ہیں آپ بھی شیخ جی۔ بے ہوش ہونے کی کیا بات تھی۔
شیخ جی کچھ شرمندہ سے ہوئے لیکن پھر بات بناتے ہوئے بولے۔ بھائی شہید بابا کے جلال کی تاب نہ لاسکا۔"
وحید دل ہی دل میں خوش ہوئے اور بولے" خیر تو بابا نے مجھ سے کہا کہ جس لڑکی کا نام مدرسے سے کٹا ہوا اس کا داخلہ دو روز کے اندر ہوجائے، ورنہ جان کی خیر نہ ہوگی۔"
اب تو الٹے پیروں شیخ جی فریدہ کے گھر پہنچے اور ان کے والد سے منت وسماجت کرنے لگے کہ" تم کل ہی کسی طرح فریدہ کا داخلہ کرادو۔ شہید بابا کا حکم ہے۔"
فریدہ کے والد پہلے تو تیار نہ ہوئے مگر پھر شیخ جی کے کہنے سے انھوں نے فریدہ کا داخلہ کرادیا۔
محلے کے بچے اب بھی شیخ جی سے پوچھتے ہیں۔" کیوں شیخ جی لڑکیوں کو اسکول میں پڑھانا چاہیئے یا نہیں؟"
اور جب سے ان کی یہی چڑھ ہوگئی ہے۔

معمّا نمبر ۴۰ کا نتیجہ

صحیح حل ۹ نکلے۔ فی کس ۴/۵/۳

۱۔ ثریّا خاتون، ایلچپور۔ ۲۔ فیاض احمد، رائے پور۔ ۳۔ عبدالرحیم، کلکتہ۔ ۴۔ کریم داد خاں حیدر آباد۔ ۵۔ سید قیصر حسین زیدی، کھرگون۔ ۶۔ مشہور عالم صدّیقی، گردیہہ۔ ۷۔ انوار احمد، دہلی ۸۔ طفیل احمد صدّیقی، علی گڑھ۔ ۹۔ عبدالاحد، رائے پور

ایک غلطی والے ۲۵ حل نکلے۔ فی کس ۹/۱۲/-

۱۔ محمد سُلیمان، کلکتہ۔ ۲۔ محمد طاہر، جامعہ نگر۔ ۳۔ ظفر محب۔ برہان پور۔ ۴۔ محمد اظہار الحق، پاکر۔ ۵۔ نورالسعید اختر، کھام گاؤں۔ ۶۔ سیّد عبدالعزیز، آسنسول۔ ۷۔ محمد اسلم خواجہ، علی گڑھ۔ ۸۔ عبدالقادر، چکوڑی۔ ۹۔ حبیب جانی، گرمٹکال۔ ۱۰۔ سیّد قائم الدین، کھام گاؤں ۱۱۔ صغرا بیگم، حیدر آباد۔ ۱۲۔ سعید اختر، کلکتہ ۱۹۔ ۱۳۔ عبدالغنی ابوبکر بمبئی ۸۔ ۱۴۔ عابدہ بیگم، حیدر آباد۔ ۱۵۔ ایس، ایم شاہد، پاکور۔ ۱۶۔ ایس جان محمد، کلکتہ۔ ۱۷۔ صالح بھائی دھار۔ ۱۸۔ نذیر احمد حسن میاں قادری، مہسلہ، قلابہ۔ ۱۹۔ سیّدی سعید مہسلہ۔ ۲۰۔ اسرار احمد انصاری کانپور۔ ۲۱۔ شفیق حسین مودک کوڈوائی۔ ۲۲۔ جہاں آرا بیگم گردیہہ۔ ۲۳۔ جمال غنو بھائی نوساری۔ ۲۴۔ سیّد خلیق الرحمٰن، بلرام پور۔ ۲۵۔ محمد شریف عثمانی۔ جودھپور۔

معمّا نمبر ۱۴ کا نتیجہ

(۱) جہاں (۲) لانے (۳) حرام (۴) سپاہی (۵) جیل (۶) دی

صحیح حل ۸ نکلے۔ فی کس -/۱۲/۳

(۱) فیروز حسین، رائے پور (۲) پیارے میاں، میرٹھ (۳) قمر جہاں، گریڈیہہ (۴) ایم زیڈ انصاری، کلکتہ (۵) حضرت میاں، ہُبلی (۶) شوکت حسین، جامعہ نگر، دہلی (۷) عبد الکریم، مالیگاؤں (۸) نظم الدین، کلکتہ

ایک غلطی والے ۳۶ حل نکلے۔ فی کس -/۸/۹

(۱) جاوید اکرام، برہان پور (۲) ذکی احمد، پٹنہ (۳) خالد رشید، سیتا پور (۴) ایف، ایم مجاور، انکولا (۵) ادریس بانو زیدی، لکھنؤ (۶) پروین بانو زیدی، لکھنؤ (۷) غلام رؤف، رائے پور (۸) عبد الکریم، کھڑک پور (۹) محمد عبد الستار، نظام آباد (۱۰) محمد اسرائیل، کلکتہ (۱۱) قاضی عبد الحمید، مہسلا (۱۲) نور محمد، کلکتہ (۱۳) سعید اختر، کلکتہ (۱۴) محمد علیم، گریڈیہہ (۱۵) نثار احمد، مالیگاؤں۔ (۱۶) شبیر احمد، مالیگاؤں (۱۷) ایس، اے، غنی، کلکتہ (۱۸) ماموِنہ بیگم، جودھپور (۱۹) محمد شریف احمد عثمانی، جودھپور (۲۰) رحمت اللہ، رائے پور (۲۱) عبد الاحد خاں، رائے پور (۲۲) مسرت حسین، اٹاوہ (۲۳) فاروق اعظم، مہسلا (۲۴) عبد الرحیم، کلکتہ (۲۵) عبد الشکور، کلکتہ (۲۶) محمد شاہجہاں، کلکتہ (۲۷) محمد شرافت حسین، کلکتہ (۲۸) پروین جمال، علی گڑھ (۲۹) امیر احمد صدیق، میرٹھ (۳۰) عصمت اللہ احمد، علی گڑھ (۳۱) عبد اللطیف، سورت (۳۲) کانڈ گنڈی، بیجاپور (۳۳) بدیع انصاری، جامعہ نگر، دہلی (۳۴) رشیدہ رافع، آرہ (۳۵) وزیر حسین، ہبلی (۳۶) محمد الیاس، کھیتا سرائے۔

رضیہ اختر عمر ۷ سال
پاکستان

ھودا

Regd. No. D. 96

APRIL 1955

PAYAM TALEEM

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

بودھ گیا کا مندر

اندر کے صفحات میں اسرار ندوی صاحب کا مضمون پڑھئے

نالندہ میں ایک اسٹوپ کے کھنڈر

فہرست

اس کے علاوہ بچوں سے باتیں، لطیفے، کارٹون، اشتہارات وغیرہ

مئی ۵۵ء

صدر دفتر فون نمبر ———— ۴۲۱۹۰

برانچ آفس فون نمبر ———— ۲۴۳۶۸

پیام تعلیم

ادارہ

حامد علی خاں بی۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم۔ اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ ———— چار روپے

فی پرچہ ———— ۶ / آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

بچوں سے باتیں

یہ زمانہ عام طور پر ہمارے یہاں بچوں کے امتحانات کا ہوتا ہے۔ جامعہ میں بھی امتحانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ لیکن پڑھائی کے ساتھ کھیل کود بھی تو ضروری ہے۔ اس لئے مدرسہ ابتدائی میں آج کل بچوں کے کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ بچوں کے سالانہ اسپورٹ شروع ہوگئے ہیں۔ وہ اپنی پڑھائی اور کھیلوں میں لگے ہوئے ہیں۔

اس بار آپ کو یہ پڑھ کر خوشی ہوگی کہ ہم جولائی اور اگست میں "پیام تعلیم" کا خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ جولائی میں "باغباتی نمبر" اور اگست میں "کہانی نمبر" شائع ہوگا۔ اگر آپ ان دونوں نمبروں میں اپنے لکھے ہوئے مضمون اور کہانیاں چھپوانا چاہتے ہیں تو فوراً بھیج دیجیے۔

پیام تعلیم کا یہ پرچہ اپنے مضامین اور کہانیوں کے اعتبار سے پچھلے پرچوں سے بہتر ہے۔

اس بار ایران سے ہمارے ایک دوست مجتبیٰ محمود صاحب نے ایک بڑی خوبصورت ایرانی کہانی "لکڑی کی تلوار" ہمیں بھیجی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بچے یہ کہانی بڑے شوق سے پڑھیں گے۔ پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ مجتبیٰ محمود صاحب نے پیام تعلیم کے لئے مستقل طور پر کہانیاں لکھنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔

پچھلے مہینے ہم نے احمد جمال پاشا صاحب کا ڈراما "ایک کھیل" چھاپا تھا جسے پیامیوں نے بہت پسند کیا۔ اس بار ایک اور ڈراما "روگی لومڑی" شائع ہو رہا ہے جسے بیگم قدسیہ زیدی صاحبہ نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔

بیگم سلطانہ فیضی صاحبہ آپ کو بمبئی کی ایک عجیب و غریب عمارت "جوتے کا گھر" کی سیر کرا رہی ہیں جو بمبئی کے کملا نہرو پارک میں بنا ہوا ہے۔ اس کی تصویر سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ عمارت کیسی ہے۔

اسرار محمدی صاحب آپ کو سینکڑوں برس پہلے کے صوبے' بہار میں لے گئے ہیں۔ یہ دونوں مضمون معلوماتی ہونے کے علاوہ بے حد دلچسپ بھی ہیں۔

اس کے علاوہ سراج انور صاحب' محمود پرویز صاحب' جاوید محمود صاحب اور فرحت ہاشمی صاحبہ کی کہانیاں بھی بڑی دلچسپ ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ شوق سے پڑھی جائیں گی۔

باغبانی نمبر اور کہانی نمبر میں

انعامی مقابلہ

پیام تعلیم کے باغبانی نمبر اور کہانی نمبر میں ہم بچوں کے اچھے مضمون اور کہانیوں کا انعامی مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان دونوں نمبروں میں پندرہ پندرہ روپے کے انعام تقسیم کریں گے۔ پہلا انعام سات روپیہ، دوسرا انعام پانچ روپیہ اور تیسرا انعام تین روپیہ کا ہوگا۔

دسویں درجے تک کے طالب علم اس مقابلہ میں شرکت کر سکتے ہیں۔

آؤ بچّو عید منائیں

اشک امرتسری

راگ الاپیں تال ملائیں
مل جل کر اک شور مچائیں
ساری دھرتی سر پہ اٹھائیں
کھیلیں کودیں گائیں بجائیں
آؤ بچو عید منائیں

عید ہماری ریت ہے پیارو
ریت ہماری پریت ہے پیارو
پریت کی جگ میں جیت ہے پیارو
پریت کے بندھن میں بندھ جائیں
آؤ بچو عید منائیں

عید کی خوشیاں اللہ اللہ
شاد گلی آباد محلہ
گڑیا گڈا گیند اور بلا

مل مل کھیلیں اور کھلائیں
آؤ بچو عید منائیں

ہم ہیں زمانے میں البیلے
اپنے دم سے ہیں یہ میلے
دنیا میں ہوں لاکھ جھمیلے

یاروں کی ہیں دور بلائیں
آؤ بچو عید منائیں

اشکؔ سے چل کر عید مل آئیں
اور یہ اپنا گیت سنائیں
داد نہ گر ہم اس کی پائیں

کٹی کر لیں روٹھ ہی جائیں
آؤ بچو عید منائیں

فرینک کارپنٹر —— ترجمہ۔ قدسیہ زیدی

روگی لومڑی

اُلّو درخت پر بیٹھا اُونگھ رہا ہے ——— مینڈک بوکھلایا ہوا اندر آتا ہے۔

ل۔ اُلّو! اُلّو! تم نے بطخ کو کہیں دیکھا۔ جلدی سے بتاؤ اُلّو۔

۔ (چونک کر) کون ہو جی؟ بس جگا دیا مجھے۔ بہت بدتمیز ہو تم۔ ایسا سُندر سپنا تو دیکھ رہا تھا کہ قطاروں کی قطاریں چوہیوں کی میرے سامنے ناچ رہی تھیں۔ بس میں ایک کو پکڑنے کو ہی تھا کہ آن دھمکے۔

۔ تم تو سدا ہی سوتے رہتے ہو۔

اُلّو۔ مگر سدا موٹی موٹی چوہیوں کے سپنے تو
نہیں دیکھتا۔ اُن کے خیال سے بھوک
چمک اٹھی۔

مینڈک۔ بھوک! تو کیا تم بھی بھوکے ہو؟ دُنیا
بھر کو بھوک لگ رہی ہے آج!

اُلّو۔ میں تو شاید یُوں بھوکا ہوں کہ میں نے
آج ناشتہ نہیں کیا۔

مینڈک۔ تم مینڈک تو نہیں کھاتے، نہیں
کھاتے نہ؟

اُلّو۔ اجی توبہ توبہ! مینڈک بھی کوئی کھانے
کی چیز ہے!

مینڈک۔ شکر ہے خدا کا۔ اُلّو تم نے بطخ کو کہیں
دیکھا ہے۔

اُلّو۔ تمھیں آخر بطخ کی تلاش کیوں ہے؟

مینڈک۔ مجھے بطخ کی کھوج کاہے کو ہوتی اُسے
میری کھوج ہے۔ مجھے اس نے دعوت
دی ہے۔

اُلّو۔ اچھا تو یہ بات ہے۔

مینڈک۔ آج میرا کھاجا ہوگا۔ پلاؤ کے بعد اور
فرنی سے پہلے میری باری ہے۔ بس بطخ
آج مجھے [illegible] نکال جائے گی۔ یا
شاید اپنے بدصورت بچے کی خاطر میری
ایک آدھ ٹانگ چھوڑ دے۔ مینڈک
اس کا من بھاتا کھاجا ہے۔ بات یہ
ہے کہ اس کی دادی کی گھٹی میں مینڈک
گھول کر پلائی گئی تھی۔

اُلّو۔ بڑی انوکھی گھٹی تھی۔

مینڈک۔ اگر تم بھی مینڈک ہوتے تو تمھیں یہ
بات اتنی انوکھی نہ لگتی۔ آج اُس
بدمعاش بطخ سے پیچھا چھڑاتے چھڑاتے
پلیتھن ہو گیا۔ صبح سے اب تک ایک
منٹ کو چین سے نہیں۔ پور پور دکھ
رہی ہے۔

اُلّو۔ اب تم چُپ چاپ پڑے رہنے کی
کوشش کرو۔

مینڈک۔ یہ بھی کر کے دیکھ لیا اور بڑی ہوشیاری
کے ساتھ۔ صبح سے اب تک اتنی دفعہ
دَم سادھ کر پڑا ہوں کہ جی تھک گیا
میں اپنے آپ کو پتھر کر لیتا ہوں پھر
دیکھو اُلّو ایسے۔ لیٹ کر سکڑ جاتا ہوں
گچھا مچھا ہو کر اس ڈھنگ سے۔ پتھر
بالکل پتھر۔ دیکھی تم نے میری ہوشیاری

(مینڈک زمین پر لیٹ کر سکڑ جاتا ہے
جیسے گول مول پتھر)

اُلّو ۔ نہ جانے مینڈک کا مزا کیسا ہوتا ہوگا۔
آزما کر دیکھنا چاہیے۔

مینڈک ۔ (اُچھل کر) کیا کہا تم نے۔

اُلّو ۔ ہو ہو، ہو ہو، ہو ہو۔

مینڈک ۔ یہ تم نے ہرگز نہیں کہا تھا۔ تم نے
تو مینڈک کھانے کا کچھ ذکر کیا تھا۔

اُلّو ۔ ہو ہو، ہو ہو، ہو ہو۔

مینڈک ۔ یہ آواز مت نکالو۔ یہ میرے دل
کے آر پار ہو جاتی ہے۔

اُلّو ۔ ہو ہو، ہو ہو۔

مینڈک ۔ اُلّو تمھیں آخر کیا ہو گیا؟ (پھر بطخ کو
دیکھ کر) ارے ارے بطخ آ رہی ہے۔
شکریہ اُلّو، شکریہ۔ تم بطخ کو باتوں میں
لگائے رکھو اتنے میں میں پھر پتھر
بنا جاتا ہوں۔ ارے ارے غضب میں
تو بھول ہی گیا کہ پتھر کیسے بنتے ہیں۔
(مینڈک سکڑ کر زمین پر لیٹ جاتا ہے
اور چپ چاپ پڑا رہتا ہے۔)

(بطخ مٹکتی ہوئی اندر آتی ہے جیزیں
خرید کر لائی ہے جو ٹوکری میں سے
دکھائی دے رہی ہیں)

بطخ ۔ مینڈک، مینڈک، مینڈک۔ اُلّو کہاں
ہے یہ مینڈک؟

اُلّو ۔ مجھے کیا خبر کہاں ہے۔

بطخ ۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ تمھیں کیا خبر تم
تو آنکھیں میچے پڑے ہو۔ مگر وہ مینڈک
ہے کہیں یہیں۔ مجھے معلوم ہے۔
مجھے اس کی خوشبو آ رہی ہے مینڈک بو،
مینڈک بو۔

اُلّو ۔ اگر وہیں کہیں کوئی چوہیا ہاتھ لگے تو
میری طرف بڑھا دینا۔

بطخ ۔ نیچے اُتر کر خود ہی جو ڈھونڈ لو۔
سُست کہیں کے۔ میرے پاس
فالتو وقت نہیں ہے۔ اگر وہ مینڈک
ہاتھ نہ آیا تو آج پھر چنے کی دال
کھانی پڑے گی۔ کوئی مُنہ بھی تو نہیں
[illegible] دال کو۔ مینڈک، مینڈک، مینڈک
(مینڈک سے پاؤں اُلجھتا ہے)
بھاڑ میں جائیں یہ پتھر کم بخت راستے
روکتے ہیں۔ کسی کو چاہیے کہ راستے

صاف کرو ے، بہت اونچا نیچا ہو رہا ہے
مینڈک ہو، مینڈک ہو۔ یہیں کہیں میری
ناک تلے مینڈک ہے۔ بالکل میری ناک
کے تلے۔
(وہیں مینڈک کے قریب ہی زمین سونگھتی
ہے)
(دوسری طرف سے لومڑی اندر آتی
ہے۔ لنگڑاتی ہوئی۔ غمگین صورت)
لومڑی۔ آداب عرض اُلّو۔
اُلّو۔ آج تو صبح سے میلا لگ رہا ہے پہلے بطخ
آئی اور اب یہ لومڑی۔
بطخ۔ مینڈک، مینڈک، مینڈک۔
(پھر ایک دم سے چونک کر اُلّو کی بات
پر غور کرکے)
کیا کہا تم نے لومڑی؟
(لومڑی کو پہلی بار دیکھتی ہے)
اوئی میری میّا۔
لومڑی۔ آداب عرض ہے بی بطخ۔
(بطخ بالکل سکتے میں ہے ڈر کے مارے
بالکل ہل نہیں سکتی)
[illegible] آداب عرض۔

لومڑی۔ آؤ ہم سے ہاتھ تو ملاؤ۔
بطخ۔ جی نہیں شکریہ۔ اس وقت نہیں۔ میں
زرا جلدی میں ہوں اپنا کھانا ڈھونڈنے
جا رہی ہوں۔
لومڑی۔ کیسی عجب بات ہے۔ میں بھی کھانے
ہی کی تلاش میں ہوں بی بطخ، آؤ دونوں
مل کر ڈھونڈیں۔
بطخ۔ ہوں اوں۔
لومڑی۔ رحم کرو۔ ایک غریب دکھیا اور لنگڑی
لومڑی پر رحم۔ دیکھو تو میں ہل جل بھی
نہیں سکتی۔ زرا میرا ہاتھ تھام لو بی بطخ!
بطخ۔ مجھے تو بس ایک اچھا سا مینڈک چاہئے۔
لومڑی۔ اور مجھے ایک چھوٹا سا چوزہ یا پھر نرم
سی بطخ۔
(بطخ بالکل سکتے میں آجاتی ہے اور بخار
میں دُہراتی ہے۔
بطخ۔ یا پھر چھوٹی سی بطخ۔ ہاں
پھر چونکتی ہے اور دُم دبا کر کھڑی ہو جاتی
ہے، لومڑی بڑھ کر قریب آتی ہے پھر
اُلّو کی آواز سے بطخ چونکتی ہے)
اُلّو۔ ہو ہو، ہو ہو، ہو ہو۔

بطخ۔ اوئی توبہ۔ جاؤ دُور ہو یہاں سے، بد تمیز لومڑی۔ قیں قیں قیں
(قیں قیں کرتی ہوئی بھاگ جاتی ہے)
لومڑی۔ ادھر آؤ بطخ، اِدھر آؤ، اِدھر آؤ۔
(لومڑی لپکتی ہے مگر بطخ کو پکڑ نہیں سکتی۔ بڑی غمگین سی واپس آتی ہے اور خفگی سے اُلّو سے کہتی ہے)
لومڑی۔ اگر تم انجن کی سی سیٹی نہ بجاتے تو میں نے بطخ کو پکڑ ہی لیا تھا۔ کل سے مُنہ میں ایک کھیل تک اُڑ کر نہیں گئی ہے۔ اور اوپر سے اس پاؤں نے لاچار کر رکھا ہے۔ اب تو اور بھی خراب ہو گیا پاؤں۔
(غصّے میں پاؤں زمین پر پٹکتی ہے، مینڈک سے ٹھوکر لگتی ہے اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے)
مینڈک۔ معاف کرنا! کیا تم مینڈک کھاتی ہو؟
لومڑی۔ ہرگز نہیں۔ مگر تم کہاں سے پھوٹ نکلے؟
مینڈک۔ میں یہیں پتھر بنا لیٹا تھا۔
لومڑی۔ تم کو ہرگز پتھر بن کر نہیں لیٹنا چاہئے یہ بڑی بدتمیزی کی بات ہے۔ لوگوں کو ٹھوکر لگ سکتی ہے۔ تم نے ابھی میرے پاؤں میں چوٹ لگا دی۔
اُلّو۔ تمھاری پاؤں میں کیا تکلیف ہے؟
لومڑی۔ لوہے کے تار میں پھنس گیا تھا انسانوں کو کانٹے والے تار باڑ میں نہیں لگانے چاہئیں۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔
مینڈک۔ تم نے اس پر آٹے کی پلٹس باندھی۔
لومڑی۔ میں نے پلٹس باندھی۔ السی تھوپی۔ انجیر کا شربت ملا، گیندے کا تیل لگایا اور برف کی سکائی کی۔
مینڈک۔ تم نے بھپارہ نہیں لیا ہوگا۔
لومڑی۔ اگر اب کسی نے ایک بھی دوا اور بتائی تو میں اسی کو ہڑپ کر جاؤں گی۔ چاہے وہ مینڈک ہو یا مینڈک کا بچّہ۔
مینڈک۔ میں نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا۔
اُلّو۔ میری پوچھو تو میں تو اپنے کھانے ٹھنڈے پانی میں دھوتا ہوں۔
لومڑی۔ میں اُلّو کو بھی کھاؤں گی۔
اُلّو۔ ذرا آؤ کر تو دکھا نا بی لومڑی۔
مینڈک۔ بھئی مجھے ایک نئی سوجھی ہے۔
لومڑی۔ ہی تم سے کچھ پوچھتی ہوں کہ

مینڈک۔ بھئی دوا نہیں۔ کھانے کی چیز ہے۔
لومڑی۔ ہاں تو پھر کہو۔
مینڈک۔ سنو لومڑی بیگم۔
(مینڈک لومڑی کو ایک طرف لے جاتا
ہے اور اس کے کان میں کچھ کہتا ہے)
اُلّو۔ اگر تم دونوں میں سے کسی کے ہاتھ
چوہیا لگے تو میری طرف بڑھا دینا۔
ہونہہ سنتے ہی نہیں۔ باتوں میں لگ
رہے ہیں۔
(وہ کانا پھوسی کرتے رہتے ہیں)
اُلّو۔ کانا پھوسی کرنا بدتمیزی کی بات ہے۔
لومڑی۔ (مینڈک کی پیٹھ ٹھونک کر) بھئی کیا
خوب سوجھی ہے تمھیں!
مینڈک۔ مگر یہ مت بھولنا کہ تم بے حد بیمار ہو۔
لومڑی۔ سچ مچ بہت ہی بیمار۔
مینڈک۔ (لومڑی کو کہنی سے ٹھونکا دیتے ہوئے)
کہو ہوں نہ چتر۔
لومڑی۔ (مینڈک کے گلے میں ہاتھ ڈال کر)
بہت چتر۔
بطخ۔ (اسٹیج کے باہر) مینڈک مینڈک مینڈک۔
مینڈک۔ پھر آگئی بلا۔ لومڑی مجھے چھپا لو جلدی
سے چھپا لو کہیں بطخ مجھے دیکھ نہ لے۔
(مینڈک لومڑی کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔
بطخ مٹکتی ہوئی آتی ہے۔)
بطخ۔ (اندر آتے ہوئے) مینڈک، مینڈک، مینڈک۔
(لومڑی غراتی ہے بطخ اسے دیکھ کر چیخ مارتی
ہے اور جلدی سے چلی جاتی ہے)
(مینڈک لومڑی کے پیچھے سے سر نکال کر دیکھتا
ہے اور اس کی پسلی میں ٹھونکا دے کر)
مینڈک۔ چلی گئی چلی گئی۔
لومڑی۔ یہ مت کرو۔ مجھے گدگدی ہوتی ہے۔
مینڈک۔ لومڑی کے پیچھے سے نکل کر۔ ہائے کہیں پھر
نہ آجائے کم بخت بطخ۔
اُلّو۔ اگر کچھ لوگ اتنے ہی بہادر ہوتے جتنے وہ چتر—
لومڑی۔ بکو مت اُلّو۔ خود کو جو اتنی اچھی ترکیب
نہیں سوجھتی تو — خیر چھوڑو اپنا کام شروع کریں۔
مینڈک۔ چلو میں تمھیں بھٹ تک پہنچا دوں اور یاد رکھو
کہ تم بہت بیمار ہو۔ بہت بیمار۔ ہا ہا ہا۔
لومڑی۔ (مینڈک کے ساتھ) بہت بیمار ہو۔ بہت
بیمار۔ ہا ہا ہا۔
(دونوں ہنستے ہوئے بھٹ میں چلے جاتے ہیں)
(باقی آئندہ)

ادارہ

دنیا کی ایک بڑی لائبریری

آپ نے لندن کی مشہور لائبریری کا نام ضرور سنا ہوگا۔ "برٹش میوزیم" ـــــ یہ دنیا کی دو تین بڑی لائبریریوں میں سے ہے اور نادر کتابوں کے ذخیرے کے اعتبار سے تو دنیا کی سب سے اہم لائبریری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر بڑے مفکروں اور مصنفوں نے اپنی کتابیں لکھتے وقت اپنا کچھ وقت یہاں بھی صرف کیا ہے۔

جہاں تک صرف کتابوں کا تعلق ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰ لاکھ کتابیں ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں اس لائبریری کی فہرست کے ترتیب دینے کا کام شروع ہوا۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ کام ۴۰ سال میں ختم ہو جائے گا لیکن پچھلے سال جب اس کام کی جانچ کی گئی تو معلوم ہوا کہ ابھی فہرست کی ترتیب کے سلسلے ۶۰ سال اور لگیں گے، تب جاکر کہیں یہ ختم ہوگا جس کے معنی یہ ہوئے کہ ۲۰۳۶ء میں یہ کام پورا ہوگا۔ اور یہ فہرست دو سو جلدوں میں تیار ہوگی۔ اس لیے کہ برٹش میوزیم میں کتابیں بھی تو کتنی ہیں۔ کہتے ہیں کہ میوزیم کی کتابوں کی الماری کو ایک قطار میں رکھا جائے، تو یہ الماریاں ساٹھ میل تک چلی جائیں گی۔

اسّی سال کے بعد اتنی الماریاں اور بڑھ جائیں گی کہ جن کو ۲۰ میل لمبی قطار میں رکھا جا سکے۔ اس طرح ۸۰ سال کے بعد اس کی کل قطار اسّی میل لمبی ہو جائے گی۔

۱۸۴۲ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے جو کتاب بھی برطانیہ میں کہیں بھی چھپے اس کی ایک جلد برٹش میوزیم" میں بھیجنی لازمی قرار دی گئی۔ آج تک اس قانون پر اُسی پابندی سے عمل ہو رہا ہے۔

اگر لائبریری کی ساری کتابوں اور اخباروں کا وزن کیا جائے، تو یہ کل ملا کر ۵۶ ہزار من ہوگا۔ اگر بالفرض یہ طے کیا جائے کہ لائبریری کو کسی دوسری جگہ منتقل کر لیا جائے، تو اس کام کے لئے ۲۰۰ لاریاں کی ضرورت ہوگی جو چھ مہینے تک اپنا کام کریں گی۔

برٹش میوزیم کے دارالمطالعے میں ساٹھ ہزار کتابیں رکھی ہیں۔ جہاں بیٹھ کر لوگ مطالعہ کرتے ہیں۔ اور بڑی بڑی کتابیں لکھنے کے لئے مواد اکٹھا کرتے ہیں۔ اس دارالمطالعے میں دُنیا کے بڑے بڑے آدمی اپنی کتابوں کے سلسلے میں بیٹھ کر کام کر چکے ہیں۔ کارل مارکس، گاندھی جی، لینن، مشہور ڈراما نگار جارج برنارڈ شا، مُمتاز سائنس داں آئن اسٹائن، رابندر ناتھ ٹیگور، علامہ اقبال، پنڈت جواہر لال نہرو، اور نہ جانے کتنے بڑے بڑے لوگوں نے اس دارالمطالعے کی چھت کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں مُطالعہ کیا ہے۔ سامنے دارالمطالعے کی دیوار پر لکھا ہے "آپ کے ہاتھ میں جو چیز ہے، اس کا خیال رکھئے گا۔ یہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اگر دُنیا سے کاغذ کا خاتمہ ہو جائے، تو تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھر جائے۔ کاغذ، علم، اور جہالت، حکومت اور افراتفری، غلامی اور آزادی کے درمیان پُل کا کام کرتا ہے۔ اس کے بغیر لوگوں کے دلوں کی اُمنگ ختم ہو جائے گی۔"

دلیل الرحمٰن شیب پوری

اخروٹ کے بدلے پیاز

کہتے ہیں کہ ایک بار اکبر بادشاہ کے زمانے میں کچھ قبائلیوں نے سوچا کہ ہم بھی بادشاہ کی خدمت میں اپنا تحفہ پیش کریں۔ یہ قبائلی پہاڑوں کے دامن میں رہتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ ہمارے یہاں اخروٹ کی پیداوار ہوتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ ہم اخروٹ ہی لے جائیں۔ چنانچہ دس بارہ آدمیوں کی ایک جماعت اخروٹ لے کر دارالخلافہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں انھیں ایک گاؤں ملا۔ یہاں اسی زمانے میں پیاز کی فصل کٹی تھی۔ ہر طرف پیاز کے ڈھیر تھے۔ انھوں نے پیاز اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اس لیے سوچا کہ یہ تحفہ اخروٹ سے بھی اچھا رہے گا۔ چنانچہ انھوں نے اخروٹ سے پیاز کو بدل لیا اور پیاز کا گٹھر لے کر آگے روانہ ہو گئے۔

اس طرح چند روز کے بعد وہ دربار میں پہنچے اور اپنا تحفہ بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ بادشاہ اس تحفے کو دیکھ کر ناراض ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ ایک ایک پیاز ان سب کے سر پر توڑی جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ ملازموں نے فوراً اس کی تعمیل کی۔ لیکن وہ پہاڑی اس سزا سے بہت خوش تھے۔ ان کو ذرا بھی تکلیف نہ محسوس ہوئی اور وہ بولے "شکر ہے کہ ہم نے اخروٹ سے پیاز بدل لیے تھے ورنہ تو آج ہمارے سر پھوٹ گئے ہوتے۔"

جب شہنشاہ اکبر کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت ہنسے اور انھیں انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔

بیگم سلطانہ فیضی

جُوتے کا گھر

انگریزی میں ایک کہاوت ہے:۔

"ایک بُڑھی عورت تھی جو جُوتے کے اندر
رہتی تھی۔ جس کے بے حساب بچے تھے۔
وہ اُن کو مار پیٹ کے روز سُلا دیا کرتی تھی۔"

بس اُسی بُڑھی عورت کا جُوتا آپ کو کملا نہرُو پارک میں اینٹ اور چُونے کا بنا ہوا نظر آئے گا۔ یہ پارک پنڈت جواہر لال نہرُو کی بی بی شریمتی کملا نہرُو کے نام سے بمبئی میں بنایا گیا ہے۔ چوپاٹی کے ساحل سے گزرنے کے بعد اُس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ جایئے جس کو ملبار ہل کہتے ہیں۔ وہاں فیروز شاہ مہتا باغ کے سامنے کملا نہرُو پارک ہے۔

دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر ایک گلابی جُوتا نظر آئے گا۔ وہ اتنا بڑا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی دیو کا جُوتا ہو۔ یہ ایک موٹا اور اونچا بوٹ ہے جس کے بیچ میں فیتے پڑے ہوئے ہیں۔ اس میں دو شرما کھڑکیاں بھی

ہیں۔ ایک مُنے سے دروازے سے آپ جُوتے کے اندر پہنچ جاتے ہیں، جہاں ایک سیڑھی بنی ہے۔ اس سے اوپر چڑھ جائیے اور سُرخ کھڑکی سے باغ کا نظارہ کیجئے۔ دور پہاڑ کے نیچے چھ پانی کا سمندر ایسا دکھائی دے گا۔ جیسے بڑے تھال میں کھیر بھری ہو۔

ہر سال ۲۶ر جنوری کو یوم آزادی کی خوشی میں اس جُوتے پر خوب روشنی کی جاتی ہے۔ جُوتے کے سامنے ایک بناوٹی غار ہے۔ آپ ایک طرف سے اس غار کے اندر چلے جائیں تو دیکھیں گے کہ شیشے کے ڈبوں میں مچھلیاں بند ہیں، جو ہر دم پانی میں چکّر لگاتی رہتی ہیں ———— چھوٹی چھوٹی گلابی اور چمک دار، سُنہری مچھلیاں۔ اب آپ دوسری طرف سے باہر نکل آئیں تو سامنے ایک لوہے کا بڑا سا پنجرا ملے گا۔ اس میں رنگ برنگے توتے اور پرندے بند ہیں۔ بچّے ان کو دانا ڈالتے ہیں اور وہ خوش ہو کر کھاتے ہیں۔

اب زرا حوض کے کنارے پھولوں کو دیکھئے۔ باغ میں توڑیئے۔ ہری ہری گھاس پر لوٹیے اور کھیلئے۔ لیکن گھر جانے سے پہلے پُل پر چڑھنا نہ بھُول جائیے گا۔ سُرخ سُرخ روش پر گھومتے ہوئے، آپ زرا آگے بڑھیں گے تو ایک اچھا سا پُل ملے گا۔ بس اسی پر چڑھیے، اُتریئے۔ تھک جائیں تو بڑے بڑے درختوں کے سائے تلے لیٹ کر آرام کیجئے۔

بلونت کمار سنگھ

ہمّت

مصیبت سے تم کو چھڑائے گی ہمّت   مسرت کے جلوے دکھائے گی ہمّت
زمانے میں شہرت دلائے گی ہمّت   جواں مرد تم کو بنائے گی ہمّت
کیے جاؤ ہمّت کیے جاؤ ہمّت

اگر کام کرنے سے گھبراؤ گے تم   تو کاہل زمانے میں کہلاؤ گے تم
مصیبت میں آفت میں گھر جاؤ گے تم   گزر جائے گا وقت پچھتاؤ گے تم
کیے جاؤ ہمّت کیے جاؤ ہمّت

اگر بوجھ بھاری اُٹھانا ہے تم کو   اگر دُور منزل پہ جانا ہے تم کو
اگر کام بگڑا بنانا ہے تم کو   اگر رَن میں جوہر دکھانا ہے تم کو
کیے جاؤ ہمّت کیے جاؤ ہمّت

ہوا کیا اگر سر پہ آفت کھڑی ہے   ہوا کیا اگر رنج و غم کی گھڑی ہے
ہوا کیا جو مشکل کوئی آ پڑی ہے   ہوا کیا جو منزل تمھاری کڑی ہے
کیے جاؤ ہمّت کیے جاؤ ہمّت

رحیم۔ جمیل صاحب کہاں گئے ہیں۔

کریم۔ یہاں ہی سیڑھی پر سے اُتر رہے تھے۔ اسپتال گئے ہیں۔

رحیم۔ سیڑھی پر سے اُتر رہے تھے تو اسپتال کیوں گئے۔

کریم۔ دراصل جب اُترے تو معلوم ہوا کہ سیڑھی [illegible] پہلے ہی کوئی اُٹھائے گیا۔

ایک صاحب اپنے مرحوم دوست کی موت کے بعد ماتم پرسی کے لئے گئے۔ اور اُن کے لڑکے سے بولے "کیوں بھئی تمہارے والد صاحب کیا بیمار تھے"

بیماری کیا تھی، بڑھاپا خود سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔" اُن کے لڑکے نے جواب دیا۔

"ہاں بھئی یہ بہت خطرناک مرض ہے۔ ہمارے محلّے میں بھی دو تین بچے" اسی بیماری سے مر گئے۔

دلیل الرحمٰن خبیب پوری، کلکتہ

ایک آدمی۔ تمہاری اوقات کیا ہے۔

دوسرا آدمی۔ میں صبح چھ بجے سے نو بجے تک دفتر اور شام کو سات بجے سے نو بجے تک گھر پر ملتا ہوں۔

ماسٹر صاحب۔ (ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرکے) ارے آفتاب کہاں ہے

ایک لڑکا۔ جی! آسمان پر!!

ماسٹر صاحب۔ یہ گیند کس کی ہے؟

لڑکا۔ جی! ربر کی اور کس کی؟

راجا نواب۔ لکھنؤ

پہلوان۔ میں کسی سے شکست نہیں کھا سکتا ہوں مگر ایک شرط ہے۔

ایک آدمی۔ وہ شرط کیا ہے۔

پہلوان۔ کوئی مجھ سے مقابلہ نہ کرے۔

ایک گنجا۔ میاں حجام! میں اپنے سر کی بنوائی آدھی دوں گا۔ کیوں کہ میرے سر پہ بال کم ہیں۔

حجام۔ حضور سے تو دگنی بنوائی لوں گا۔ کیونکہ بال ڈھونڈ ڈھونڈ کر کاٹنے پڑ رہے ہیں۔

ایم۔ اے۔ [illegible]

[illegible]۔ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ اگر موت آجائے تو ساری مصیبتوں سے چھٹکارا مل جائے۔

اجنبی۔ تم نے مجھے کیوں یاد کیا؟

لکڑہارا۔ تم کون ہو؟

اجنبی۔ میں وہی موت کا فرشتہ ہوں جسے تم نے یاد کیا ہے۔

لکڑہارا۔ کچھ نہیں، بس یہ لکڑی کا گٹھا اٹھانے کے لئے یاد کر رہا تھا۔ ذرا اسے اٹھا دو۔

اسد اللہ بیگ۔ ہنمنہ پور

ایک لڑکا۔ (ایک لیڈر کو دیکھ کر اپنے ساتھی سے) دیکھو یہ ملک کا سب سے بڑا آدمی ہے۔

دوسرا۔ یا اللہ۔ یہ تو ہماری ہی طرح ہے۔

سید حیدر علی جذبی پھپھندیہ

ایک آدمی۔ (دوسرے سے) آج کیا تاریخ ہے

دوسرا۔ آپ کے پاس تو اخبار ہے۔ اس میں دیکھ لیجئے۔

پہلا۔ لیکن یہ اخبار تو کل کا ہے۔

محمد [illegible] خاں۔ اجمیر

ریلوں کا راستہ معلوم کیجیے

جب پہلے پہل یورپی اقوام چین میں تجارت کی غرض سے آئیں تو انھوں نے ریلیں چلانے کا ارادہ کیا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اپنا اسٹیشن کہاں بنائیں۔ خاص طور پر جب کہ یورپ کے کئی دیس ایک ساتھ اس کوشش میں لگے رہے کہ انھیں اجازت ملے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار یورپ کے ۵ ملک چین کے ایک شہر میں اپنا اپنا اسٹیشن بنانا چاہتے تھے چینی حکومت بہت پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر ایک شہنشاہ کے وزیروں نے یہ تجویز پیش کی کہ سب کو اسٹیشن بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن سوال ذرا مشکل تھا۔ کیونکہ مسئلہ یہ تھا کہ ہر ایک کی لائن علیحدہ علیحدہ ہو اور وہ کسی دوسرے کی لائن کو پار نہ کرے اور یہی نہیں بلکہ اس کے اوپر کوئی پل بھی نہ بنایا جائے۔ اب تو سب ناامید ہو گئے۔ آخر سب لوگ اس کی فکر میں لگ گئے اور سوچتے سوچتے ان کی سمجھ میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ ا۔ ب۔ ج۔ د۔ ر۔ ان مقامات کو ظاہر کرتے ہیں جہاں اسٹیشن بنے اور ریلیں اسی طرح ا، ب، ج، د، ر کو ظاہر کرتی ہیں جہاں سے وہ شہر پناہ کے دروازہ میں سے داخل ہوں گی۔

ان لوگوں نے ایسا طریقہ معلوم کیا کہ ریلیں اپنے اپنے اسٹیشنوں پر پہنچ جاتی تھیں

اس کا حل صفحہ نمبر ۴۵ پر ملاحظہ فرمائیے

مجتبیٰ محمود، تہران

ایک قدیم ایرانی کہانی!

لکڑی کی تلوار

یہ کہانی شاہ عباس کے زمانے کی ہے جو ہندوستان کے مشہور بادشاہ اکبر کے زمانے میں ایران میں حکومت کرتے تھے۔ ایک رات شاہ عباس ایک درویش کا روپ دھارے ایک ہاتھ میں کشکول اور دوسرے میں تبرزین (کلہاڑی کی وضع کا ایک ہتھیار) تھامے اصفہان کے گلی کوچوں میں گردش کر رہے تھے تاکہ دیکھیں کہ شہر کے لوگوں کا کیا حال ہے۔

انھوں نے بہت سی گلیوں کا چکر لگایا اور محلے محلے گھوم آئے دیکھا کہ سب لوگ خوش وخرم ہیں، کوئی بھوکا نہیں، کوئی رنجیدہ اور غمگین نہیں ہے۔ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور واپس محل کی طرف جانے لگے۔ راستے میں ان کی نظر ایک پرانے گھر کے دروازے پر پڑی جس کے سوراخوں میں سے دیے کی مدھم روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ گھر کے اندر سے گانے بجانے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ شاہ عباس کو بڑا تعجب ہوا کہ ایسے پرانے اور بوسیدہ مکان میں ناچ اور گانا؟ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

گھر والے نے کہا "کون ہے؟"

شاہ عباس بولے "درویش۔"

گھر والا بولا " آئیے درویش بابا تشریف لائیے ___ آپ کے قدم سر آنکھوں پر ___ یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لائے ہیں!"

شاہ عباس مکان کے اندر داخل ہوئے۔ اندر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ ایک چھوٹا سا دیا طاقچے میں ٹمٹما رہا ہے گویا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو۔ ایک کونے میں ایک عورت بیٹھی کچھ گنگنا رہی ہے اور اس کے آگے مٹی کے برتن میں کشمش اور چنے رکھے ہیں۔

گھر والے نے کہا۔ "درویش بابا۔ آپ بھی ہماری خوشی میں خوشی منائیے ___ ہمارا گانا سنیے اور کشمش وغیرہ نوش فرمائیے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک پرانا زنگ آلود تھال اٹھا لیا اور اسے بجاتے ہوئے وہ اور اس کی بیوی دونوں گانے لگے ___ اور گاتے گاتے خوشی سے مست ہو کر جھومنے لگے۔

شاہ عباس نے کہا۔ "بھائی! تم مجھے اپنا حال سناؤ ___ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

گھر والے نے کہا "درویش بابا ___ میں موچی ہوں ___ ہر روز سویرے قریب کی ایک جوتوں کی دوکان میں جاتا ہوں اور لوگوں کے جوتوں کو سیتا اور درست کرتا ہوں۔ دوکان کا مالک جو دے دیتا ہے ہنسی خوشی لے لیتا ہوں، اور کہتا ہوں۔" خدا برکت دے" مغرب کے وقت وہاں [illegible] پنیر، کشمش اور چنے لے کر گھر لوٹتا ہوں ___ کھانے کے بعد ہم دونوں میاں بیوی گا بجا کر دن کی تھکن اتار لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہم فکر یا رنج و غم کو اپنے پاس پھٹکنے ہی نہیں دیتے۔ جیسے بھی ہو ہنس بول کر گزار دیتے ہیں۔ میں کئی سال سے موچی کا کام کر رہا ہوں۔ ہر روز جتنا کماتا ہوں، سب خرچ کر دیتا ہوں۔ پیسے بچا کر رکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ہماری خوشی اور ہمارے گانے بجانے میں کوئی فرق نہیں آتا!"

درویش نے کہا۔" اچھا! فرض کرو کہ اگر کل شاہ عباس کفاشی (جوتے بنانے) کے [illegible] کو بالکل بند کر دے تو تم کیا کرو گے ___ کس طرح گانے بجانے کی یہ محفل جماؤ گے؟"

وہ بولا " اول تو شاہ عباس ایسا نہیں کریں گے اور اگر کیا بھی تو انشاء اللہ [illegible]

ہم پہلی ہنسی خوشی میں کوئی فرق نہیں آنے دیں گے۔"

شاہ عباس نے کشکول میں سے تھوڑا سا پلاؤ نکال کر کھایا ــــ کچھ ان کی کشمش اور چنے بھی کھائے اور انھیں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

دوسرے دن انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کفاشی کا کام ممنوع قرار دے دیا اور اس دوکان کو تو اسی روز بند کروا دیا جس میں وہ موچی کام کرتا تھا۔ اب موچی بیکار ہوگیا اور دل میں کہنے لگا۔

"اے درویش! تیری کالی زبان پر لعنت ــــ وہی ہوا جو تو نے کہا ــــ شاہ عباس نے مجھے اپنے پندرہ سالہ روزگار سے محروم کر دیا۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ اگر آدمی میں ہمت ہو تو وہ کبھی بیکار نہیں رہتا۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیے"

یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً کفاشی کے اوزار بیچ ڈالے۔ ان پیسوں سے ایک مشک خریدی اور بہشتی کا کام کرنے لگا۔ قہوہ خانے، روٹی کی دوکان اور بعض دوسری دوکانوں میں پانی بھرنے لگا۔ شام تک اسے اتنے پیسے مل گئے جو اس کی پہلی آمدنی کی نسبت دو تین گنا زیادہ تھے۔

رات کو اس نے پہلے سے کہیں زیادہ شان سے گانے بجانے کی محفل آراستہ کی۔ اس رات بھی شاہ عباس نے سوچا کہ چلو شہر چلتے ہیں۔ دیکھیں کیا خبر ہے؟ اور ساتھ ہی ایک چکر کل والے دوست کے گھر کا بھی لگا آئیں۔ غرض انھوں نے درویشی کا لباس پہنا اور شہر میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ گھومتے گھماتے وہ اس گلی میں نکل آئے جس میں موچی کا مکان تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دس پندرہ سال بعد آج تو یقیناً موچی کا گھر سنسان پڑا ہوگا۔ جب کھانے کو روٹی نہ ملے تو گانا بجانا کیسا؟ لیکن جب وہ موچی کے مکان کے قریب پہنچے تو اس مکان سے گانے بجانے کی بڑی زوردار آواز آ رہی تھی۔

انھوں نے آواز دی ــــ "بھائی! مہمان قبول کروگے ــــ؟"

موچی نے کہا۔ "بسم اللہ ــــ تشریف لائیے ــــ آپ کون ہیں ــــ؟"

شاہ عباس نے کہا "میں ہوں درویش"

وہ بولا "اے درویش بابا ــــ عجب کالی زبان ہے تمھاری! جو تم نے کہا تھا وہی ہوا۔ کہ میرے ہی سے دکان کھولی ہی تھی کہ شاہ عباس

گئے آدمی پہنچ گئے اور کہا "شاہ عباس نے حکم
دیا ہے کہ کفاشی کا کام بند کر دیا جائے۔"

درویش نے پوچھا "اچھا! تو آج بیکار
رہنے کے باوجود تم اسی طرح گا بجا رہے ہو؟
پھر تم نے کیا کیا ـــ پیسے کہاں سے لائے؟"

اس نے کہا "درویش بابا! ہم مزدور لوگ
ہیں۔ ہم کبھی بیکار نہیں رہتے۔ میں نے فوراً کفاشی
کے اوزار بیچ کر ایک مشک خریدی اور پانی بھرنے
لگا جس سے پہلے سے کہیں زیادہ پیسے ملے۔ یہی
وجہ ہے کہ اب میں نے ایک ڈھول بھی خرید لیا ہے
اور آج ہماری محفل پہلے سے زیادہ شاندار ہے۔
کشمش اور چنوں کی جگہ گز (ایک ایرانی مٹھائی)
اور حلوے نے لے لی ہے۔ میرا یہ نیا کام پہلے
سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ افسوس کہ مجھے دیر میں
معلوم ہوا ورنہ میں شروع ہی سے یہی پانی بھرنے
کا کام کرتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب میں یہ کام
کبھی نہ چھوڑوں گا اور میرا کاروبار دنوں دن
اچھا ہوتا جائے گا۔"

درویش بولا "اچھا بھائی! فرض کرو کل
اگر شاہ عباس کو یہ شوق چرّائے کہ وہ اس کام
کو بھی بند کر دے۔ تو اس وقت تم کیا
کروگے؟"

وہ بولا "درویش بابا ـــ تمہیں اپنے بڑھاپے
کی قسم ایسی منحوس بات زبان سے مت نکالو۔
اوّل شاہ عباس کو بھلا سقائی سے کیا دشمنی ہو سکتی
ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو میں پتھر میں سے
بھی پیسے نکال لوں گا اور اپنی زندگی ہمیشہ ہنسی
خوشی گذاروں گا۔ لیکن درویش بابا تمہیں خدا
کی قسم ایسی کالی زبان مت نکالو ـــ اور اپنے
الفاظ واپس لے لو۔"

درویش بولا "اے بھائی میں نے تو ایک
مثال دی تھی ـــ اس کی بھلا کیا اہمیت؟"

موچی بولا "درویش بابا! میرا تو تمھاری مثالوں
سے بھی جی گھبراتا ہے۔"

شاہِ عباس دل میں بہت خوش ہوئے کہ خدا
کا شکر ہے میرے ملک کے لوگ ہر حالت میں
خوش رہنے کے عادی ہیں اور کسی صورت میں اپنی
خوشی اور تفریح کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں
ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ موچی کا امتحان لینے کے
لئے یہ کام بھی بند کر دینا چاہتے تھے۔ درویش
نے کشکول میں سے پلاؤ نکال کر کھایا ـــ تھوڑا
سا موچی کا حلوہ بھی چکھا اور رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن شاہ عبّاس نے پہلا کام یہ کیا کہ سقّائی کا کام بھی بند کروا دیا۔ بے چارہ نیا نیا سقّہ جیسے ہی میدانِ شاہ میں آیا دیکھا کہ شاہ عبّاس کے آدمی سقّوں کو پکڑ رہے ہیں اور سارے شہر میں ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ ہر طرف اعلان کیا جا رہا تھا "حکم ـــ شاہ عبّاس کا حکم ـــ آج سے اصفہان میں سقّائی ممنوع ہے۔"

موچی بولا۔ "اے کالی زبان والے درویش! ـــ تو نے میری روزی کو مٹّی میں ملا دیا!" ـــ لیکن پھر اس نے سوچا کہ مجھے ہمّت نہ ہارنی چاہیے، بلکہ کسی اور کام کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے کہیں سے ایک ہنٹر ڈھونڈ نکالا۔ اپنے پرانے جبّے کو سی سلا کے پہنا، ترچھی ٹوپی لگائی، مونچھوں کو چمکایا اور گلی کوچوں میں گھومنے لگا۔ اس نے سوچا بہتر یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی گلی کوچوں میں کوڑا کرکٹ پھینکے تو شاہ عبّاس کے فراش کے نام سے اس پہ جرمانہ کردوں ـــ اس طرح میں ایک اچھا کام بھی انجام دوں گا اور کچھ پیسے بھی مل جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ اِدھر اُدھر گھومنے لگا ـــ جہاں کسی کو گلی کوچے میں کوڑا پھینکتا ہوا دیکھتا اسے جا پکڑتا اور کہتا تم نے کوڑا یہاں کیوں پھینکا؟ چلو شاہ عبّاس کے پاس!

لوگ اس کے لباس اور وضع قطع سے ڈر جاتے اور دو تین آنے اس کے ہاتھ میں رکھ کر اس کی منّت سماجت کرنے لگتے کہ وہ انھیں معاف کردے۔

لوگوں کے سامنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر بلند آواز میں شاہ عبّاس کو دُعائیں دیتا اور کہتا کہ سچ مچ بادشاہ ہو تو ایسا ہو ـــ شاہ عبّاس کو اپنی رعایا کا کتنا خیال ہے کہ اُنھوں نے گلی کوچوں میں کوڑا پھینکنا جُرم قرار دے دیا ہے تاکہ اس غلاظت سے لوگوں کی صحت پر بُرا اثر نہ پڑے۔

اس طرح موچی نے شام تک دو تین روپیے پیدا کرلیے اور رات کو کھانے کے لیے پلاؤ، سالن، کباب، حلوہ اور بہت سی دوسری چیزیں خرید لایا۔

رات کو شاہ عبّاس پھر درویش کا بھیس دھارے شہر میں گھومنے نکلے۔ سب سے آخر

جب وہ موچی کی گلی کی طرف آئے اور یہ دیکھ کر
حیران رہ گئے کہ گلی کے نکڑ ہی سے مُرغن کھانوں
کی خوشبو اور گانے بجانے کی آواز آرہی تھی!

شاہ عبّاس اسی طرح اجازت لے کر پھر
داخل ہوئے اور موچی نے درویش کو دیکھ کر
کہا۔ "درویش بابا! تمھاری کالی زبان کی برکت
سے تم نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ جب میں وہاں
پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں۔ سقاؤں کی بھگدڑ مچی
ہوئی ہے اور چاروں طرف ڈھنڈورا پیٹا جارہا
ہے ــــ فرمان ــــ فرمان شاہ عبّاس کا ــــ
آج سے شہر اصفہان میں سقائی ممنوع ہے۔
تھوڑی سوچ بچار کے بعد میں نے شاہ عبّاس
کے فرّاش کا روپ دھارا اور گلی کوچوں میں
کوڑا پھینکنے والوں کو پکڑتا اور ان سے جرمانے
وصول کرتا رہا۔ آج میں کل سے زیادہ خوش
ہوں کیونکہ آج مجھے بہت زیادہ پیسے ملے اور
میں نے سب پیسے آج ہی خرچ کر دیئے۔

درویش نے کہا "اچھا بھائی! فرض کرو
کل اگر تم نے کسی آدمی کو پکڑا اور وہ شاہ عبّاس
کے پاس چلنے کو تیار ہو گیا تو اُس وقت تم کیا
کروگے؟"

وہ بولا ــــ "یہ تو غیر ممکن ہے۔"
اس کے بعد سب نے مل جل کر کھانا کھایا
اور شاہ عبّاس اپنے محل لوٹ آئے۔ صبح انھوں
نے اپنے دو ہٹے کٹے فرّاشوں کو سادہ لباس
پہنوا کر حکم دیا کہ جاؤ اور فلاں شخص کے سامنے
کوڑا پھینکو ــــ اگر وہ کہے کہ شاہ عبّاس کے
پاس چلو تو کہو "بہت خوب!"

جب شاہی فرّاشوں نے ایک گلی میں
کوڑا پھینکا تو موچی نے ڈانٹ کر کہا ــــ "تم
لوگوں نے یہاں کوڑا کیوں پھینکا ــــ چلو
شاہ عبّاس کے پاس۔" فرّاشوں نے کہا
"چلو ــــ!"

وہ فرّاشوں کو لئے محل کی طرف چلنے لگا۔
راستے میں وہ فرّاشوں کو نرمی سے سمجھانے لگا
لیکن اِن پر کوئی اثر نہ ہوا اور اُنھوں نے
پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ جب وہ شاہی محل
کے بالکل قریب پہنچ گئے اور موچی نے دیکھا
کہ وہ بڑے مزے سے اس کے ساتھ چلے
آرہے ہیں تو اسے خطرے کا احساس ہوا اور
وہ بولا "خیر ــــ اس دفعہ میں تم لوگوں کو
معاف کرتا ہوں ــــ لیکن آئندہ بھول کر

بھی گلیوں میں کوڑا نہ پھینکتا۔"
وہ بولے ـــ"آئندہ بھی ضرور گلیوں میں کوڑا پھینکیں گے۔"
اس نے کہا: "اچھا! اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"
وہ بولے: "ہم نہیں جاتے۔"
موچی نے چاہا کہ خود چلا جائے، لیکن فراشوں نے اسے پکڑ لیا اور زبردستی شاہ عباس کے پاس لے چلے۔ موچی ہانپتا کانپتا اور ڈرتا دربار میں حاضر ہوا۔
شاہ عباس نے پوچھا ـــ
"بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟"
وہ کہنا چاہتا تھا "قربان! قلی بیگ!" (ایران میں "قربان" احتراماً استعمال ہوتا ہے جس طرح کسی بادشاہ یا بڑے حاکم کو ہندستان میں حضور یا سرکار کہتے ہیں) لیکن مارے ہیبت کے، بجائے "قربان! قلی بیگ" کے اس کی زبان سے نکل گیا ـــ "یاردان! قلی بیگ" (جس کے معنی ہوتے ہیں دوست کو پہچاننے والا قلی بیگ۔ گو کہ قلی بیگ نے بادشاہ کو پہچانا نہیں تھا لیکن بالکل اتفاقیہ طور پر اس کی زبان سے "قربان" کی بجائے "یاردان" نکل گیا۔)
شاہ عباس یہ سن کر ہنس پڑے اور بولے "قلی بیگ! تمھیں چونکہ فراشی بے حد پسند ہے اس لئے آج سے میں تمھیں اپنے کمرے کا فراش مقرر کرتا ہوں۔ رات تک اپنی جگہ سے مت ہلو۔"
ان دنوں کے مراسم کے مطابق ایک خوبصورت تلوار اسے دی گئی جسے اس نے اپنی کمر سے باندھ لیا اور کمرے کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ شاہ عباس نے مغرب تک اس پر نگرانی رکھی تاکہ وہ پیسے کمانے کے لیے کہیں نہ جا سکے۔ جب سورج مغرب کی پہاڑیوں میں ڈوب گیا تو شاہ عباس نے موچی سے کہا ـــ "اب تم جا سکتے ہو۔ کل صبح پھر اپنے کام پر آجانا ـــ مہینے کے ختم ہونے پر تمھیں تنخواہ مل جائے گی۔"
موچی گھر کی طرف چل پڑا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ اب تو آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ باقی نہ رہا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے ایک ترکیب سوجھی اور اس نے اپنی تلوار کا پھل دس روپئے میں فروخت کر دیا۔ وہاں سے وہ سیدھا ایک بڑھئی کی دوکان پر

پہنچا۔ ایک لکڑی کی تلوار بنوا کر اسے دستے میں
لگوا کر میان میں رکھ لی اور بازار سے کھانے پینے
کی بہت ساری اچھی اچھی چیزوں کے علاوہ ایک
بڑا سا خوبصورت چراغ خریدتا ہوا گھر روانہ
ہوا۔

ادھر شاہ عباس کو یقین تھا کہ آج تو
ضرور موچی کا گھر ویران پڑا ہوگا ـــــ لیکن
جب وہ اس کی گلی میں پہنچے تو دیکھا کہ سارا
محلہ راگ و رنگ کی آوازوں سے گونج رہا
ہے۔ انھوں نے دل میں سوچا: "آج تو اس
کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔" جب موچی
کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ بولا ـــــ
"درویش بابا! آج بھی تم نے جو کہا تھا وہی
ہوا۔" موچی نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ درویش
نے پوچھا: "فرض کرو کل اگر شاہ عباس کہے
کہ اپنی تلوار نکالو اور فلاں چور کی گردن اڑا دو
تو اس وقت تم کیا کروگے؟"

موچی نے کہا: "پھر تم نے فضول بکواس
شروع کی۔ شاہ عباس اتنا سخت دل آدمی
نہیں ہے۔"

سویرے موچی اپنے کام پر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد شاہ عباس نے حکم دیا کہ چور کو
حاضر کیا جائے۔ چور دربار میں حاضر کیا گیا۔
شاہ عباس نے کہا ـــ "قلی بیگ ـــ اس
چور کی گردن اڑا دو ـــ!" قلی بیگ کے
چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن اس نے
ہمت سے کام لیا اور کہا ـــ "حضور کے
قربان! اس بے گناہ کو نہ ماریئے۔"

شاہ عباس بولے: "نہیں یہ گناہ گار
ہے ـــ اس کی گردن اڑا دو۔"

قلی بیگ نے بڑے اطمینان سے عرض
کیا: "حضور! میں ایک ایماندار آدمی ہوں اس
لئے ایک بے گناہ آدمی کے خون میں اپنے
ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔"

شاہ عباس نے کہا: "بکواس کرنے کی
ضرورت نہیں ـــ میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

قلی بیگ نے مختلف بہانوں سے ٹالنے
کی کوشش کی لیکن فرمان شاہی کے آگے کچھ
نہ چلی۔ یکایک قلی بیگ کے اداس چہرے پر
مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی ـــ اور اس نے
آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "خدایا غیب
کا علم صرف تجھ ہی کو ہے۔ مجھے یہ آدمی بے قصور

(بقیہ دیکھئے صفحہ ...)

فضل الحق شمشیر

رحمدل پری

ایک دن پرستان کی ملکہ نے اعلان کر دیا کہ پریوں کا تاج اُس پری کو ملے گا جو سب سے زیادہ رحم دل ثابت ہوگی، پرستان کی ساری پریوں نے اپنے کو رحم دل اور نیک بنانا شروع کر دیا، پریاں جو اپنے ظلم وستم کی وجہ سارے پرستان میں مشہور تھیں، وہ رحم اور نیکی کی دیویاں معلوم ہو رہی تھیں، غرض پرستان کی ساری پریاں ملکہ بننے کی فکر میں تھیں لیکن پریوں کی ملکہ بہت ہوشیار تھی، وہ بڑے غور سے ہر ایک کو دیکھ رہی تھی لیکن اُسے اب تک کوئی نیک اور رحم دل پری نظر نہ آئی۔

ایک دن صبح کے وقت پرستان کی ساری پریاں اپنے سُنہرے پروں کو پھیلا کر ناچ رہی تھیں، ملکہ بھی اُن کا ناچ دیکھ رہی تھی، سنگ مرمر کے بنے ہوئے حوض میں سُنہری اور رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی تھیں، سورج کی سُنہری کرنیں پریوں کی ملکہ کے محل میں آ رہی تھیں۔ اچانک پریوں کی ملکہ کی نظر سامنے حوض پر پڑی جس میں

ایک ننھا اور معصوم بچہ ڈوب رہا تھا
ملکہ کا دل بہت ہی نرم و نازک تھا، اُس نے
پریوں سے اس بچے کو بچانے کے لئے کہا۔
لیکن کسی پری کی ہمت نہ پڑی، صرف لال
پری اپنے لال پروں کو پھیلا کر پانی کی طرف
بڑھی، بچہ ڈوبنے کو تھا کہ لال پری نے
اُس کو اپنے ملائم پروں میں لے لیا اور
پرستان کی طرف چلی، ساری پریاں لال
پری کی اس حرکت کو حماقت سمجھ رہی تھیں
اور ان کا خیال تھا کہ اب لال پری ہرگز
نہ بچے گی۔ لیکن پرستان کی ملکہ خوشی کے مارے
پھولی نہیں سماتی تھی۔ لال پری اُس بچے کو
لے کر پرستان پہنچ گئی۔ پریوں کی ملکہ نے
خوشی سے لال پری کو گود میں لے لیا، پریوں
کی ملکہ نے پرستان کی ساری پریوں کو محل میں
بلایا، ساری پریاں سنہرے پروں کو پھیلاتی ہوئی
آگئیں، پریوں کی ملکہ نے لال پری کو " اپنا
تاج پہنادیا، سارے پرستان میں خوشی منائی
گئی اور ایک بڑا شاندار جشن منایا گیا۔ پرستان
میں خوشی کے نغمے بکھر گئے۔

سپیرے کی بین

(۱)

(۲)

کھیلوں کی بستی

جاوید محمود
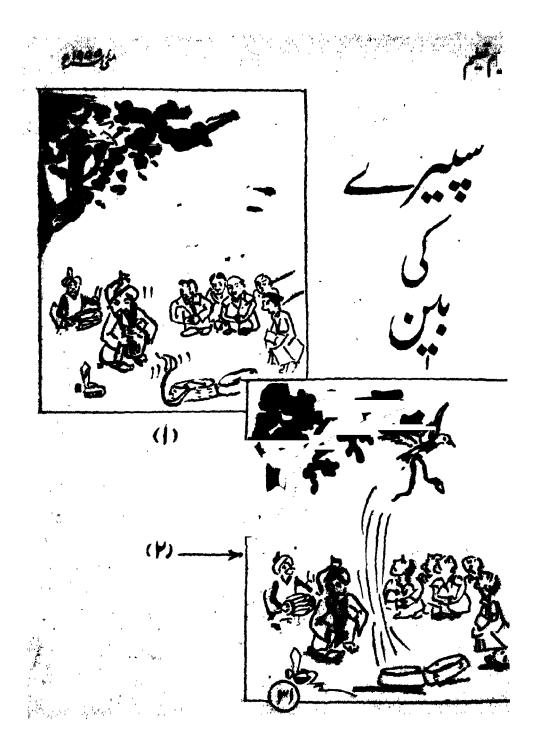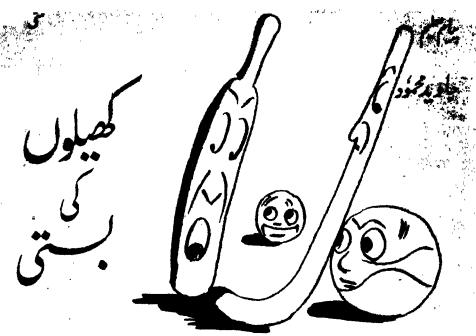
شام ہوچکی تھی۔ کمال کرکٹ کے میچ سے ہار کر واپس آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناکامی کا غصّہ تھا۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ ڈان بریڈمین سے بھی اچھی بیٹنگ کرسکے۔ اسے لینڈ وال سے بھی زیادہ تیز گیند پھینک سکے۔ اور صرف کرکٹ ہی میں نہیں بلکہ ہاکی کا بھی اچھا کھلاڑی ہوجائے اور وہ دھیان چند کی طرح ہاکی کا جادوگر کہلائے۔ لیکن پھر بھی وہ ناکام رہتا ہے۔ کرکٹ کے میدان میں وہ دعویٰ تو سَو رن بنانے کا کرتا ہے۔ مگر جب پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہوکر آتا ہے تو ساری ذمّہ داری امپائر پر ڈال دیتا ہے۔ مگر سچ تو ہے "ناچ نہ آئے، آنگن ٹیڑھا" یہ تو تھی کرکٹ کی بات اب ہاکی کو لیجئے۔ ہاکی کے میچ میں جب وہ ہارنے لگتا ہے تو اپنا غصّہ ساتھ کھیلنے والوں پر اُتارتا ہے یعنی ہاکی، گیند کی بجائے ٹانگوں پر لگتی ہے اور آپ ہی بتایئے۔ اگر کھلاڑی گیند کی بجائے ٹانگوں سے کھیلنے لگے تو گول کیسے ہو؟

آج کے میچ سے اس لئے اور بھی شرمندگی ہے کہ اس کا غصّہ اپنے ہی بیٹ پر اُترا اور اس نے بیٹ کو زمین پر پٹکنا شروع کردیا لیکن ارے یہ کیا؟ زمین پر ایک

بہت بڑا گڑھا سا ہوگیا اور زمین کے اندر جانے کا راستہ بن گیا۔

"کیا آپ کھیلوں کی بستی دیکھیں گے؟"

ایک آواز اس کے کان میں آئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟

"آپ ہر بار کیوں کھیل میں ہار جاتے ہیں؟ کھیلوں کی بستی میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" آواز پھر آئی۔

کمال نے گھبرا کر کہا "آپ ہیں کون صاحب۔ نام تو بتائیے؟"

"جی میں آپ کا کرکٹ کا بیٹ بات کر رہا ہوں۔ آئیے میں آپ کو کھیلوں کی بستی میں لے چلوں۔"

اس دعوت کو پا کر کمال بے حد خوش ہوا اور جانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔

"ہاں ہاں چلو، نیکی اور پوچھ پوچھ۔" اس نے جواب دیا۔ وہ دونوں اس گڑھے میں داخل ہوگئے لیکن ان کے اندر جاتے ہی وہ گڑھا بند ہوگیا۔ وہ دونوں نیچے اترتے گئے۔ راستے میں ایک پنگ پونگ کی میز لگی ہوئی تھی۔ کرکٹ کا بیٹ آپ ہی آپ چل رہا تھا اور اس میں لگا ہوا ہینڈل ہاتھوں کا کام دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد چلتے چلتے وہ تھک گیا۔

لیکن کھیلوں کی بستی فوراً ہی آگئی۔ اس نے دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑی خوبصورت بستی تھی۔ دروازے پر بے شمار ہاکیاں، بلّے، گیندیں ان کا استقبال کر رہی تھیں۔ بیٹ نے باری باری ان کا کمال سے تعارف کرایا۔ یہ ہیں مسٹر بیچ اور وہ مسٹر ہاکی ہیں اور ان کے دوست۔ ہاکیاں خود بخود اوپر اٹھ گئیں۔ کمال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس سے لڑیں گی لیکن وہ سب اس کو سلام کر رہی تھیں۔ جب آداب کی آواز اس کے کان میں آئی تو اس کا ڈر دور ہوگیا۔ وہ خوشی سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اور ہر ایک کھلاڑی بچے کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ کھیلوں کی بستی دیکھے۔

یکایک ایک عجیب سی ہلچل ہوئی کہ

طرف بڑھی۔ سارے بیٹ اور ہاکیاں ادب
سے کھڑے ہو گئے۔ کرکٹ کے بیٹ نے
بتایا کہ یہ ہمارے سب سے بڑے آقا
جناب اولمپک ہیں۔ اولمپک صاحب
اس کے سامنے کھڑے تھے۔ عجیب سی شکل،
سر کی جگہ فٹ بال تھی، آنکھوں کی بجائے
پنگ پونگ کی سفید سفید گیندیں تھیں۔
دو ہاکیاں پاؤں کا کام دے رہی تھیں۔
ہاتھوں کا کام کرکٹ کے دو بیٹ دے
رہے تھے۔ اور ان میں لگے ہوئے ٹینس
کے ریکٹ انگلیوں کا کام دے رہے تھے۔
خدا جانے یہ سب چیزیں کس طرح لگی تھیں۔
جلد ہی وہ کمال کے گہرے دوست بن گئے۔
اور انھوں نے کھیلوں کی بستی دکھائی۔ بستی
کی ہر چیز کھیلوں کے سامان کی طرح تھی۔
انھوں نے پالتو جانور دیکھے تھے، لیکن کوئی
فٹ بال کی طرح تھا کوئی ہاکی کی طرح۔ پھر
بستی کے مکانات دیکھے۔ تمام گھروں کی
شکلیں بھی ایسی ہی تھیں۔ وہ ایک بڑے
گھر میں داخل ہوئے۔ جس کی شکل کرکٹ
کے بیٹ کی طرح تھی لیکن تھا وہ سیمنٹ کا
اسی طرح ہاکی ہاؤس۔ کرکٹ ہاؤس۔ طرح
طرح کے عجیب گھر تھے۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ چاروں طرف
قمقمے جل رہے تھے۔ اولمپک صاحب نے کہا
کہ ہم آپ کو ہوائی جہاز میں سیر کرائیں گے۔
کمال نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا فٹ بال
ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو ہوائی جہاز
ہے۔ وہ فٹ بال نما ہوائی جہاز میں داخل
ہوئے اور آرام سے بیٹھ گئے کہ یکایک کسی
نے فٹ بال کو زور سے لات ماری۔ مسٹر اولمپک
نے کچھ بٹن دبائے اور وہ ہوا میں اُڑنے
لگا۔ وہ بہت خوش تھا اور غور سے ایک
اِک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کھیلوں کا
آسمان دیکھا تو جگمگاتے ستاروں میں کچھ
جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں۔ اُس کے منہ
سے بے ساختہ نکل گیا۔ اولمپک صاحب ان
تاروں میں تو وینو منکڈ، وجے ہزارے،
ڈان بریڈ مین، ریلین وال اور دیکھیے
محمد حنیف وغیرہ نظر آ رہے ہیں؟

مسٹر اولمپک نے کہا ہاں! یہ کھیلوں
کا آسمان ہے۔ اس پر چمکتے ہوئے وہ لوگ

ہیں جو دنیا میں اولمپک کھیلوں میں آگے آگے ہیں۔ وہ دیکھو عذر دھیان چند نظر آ رہے ہیں۔ اور اس تارے میں امتیاز ہیں۔

کمال کی کتنی خواہش تھی کہ وہ بھی بڑا کھلاڑی بن سکے اور اس نے اولمپک صاحب سے کہہ دیا کہ میں کھیلوں کے آسمان پر تارا بن کر جگمگانا چاہتا ہوں۔

میرے اچھے دوست میں ہر کھلاڑی بچے کے بارے میں جانتا ہوں۔ تم بے ایمانی سے کھیلتے ہو۔ اس لئے ہمیشہ ناکام رہتے ہو۔ "کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو" تم نے ہندوستان کے وزیر اعظم کا یہ جملہ سنا ہوگا۔ ہار کر بھی مسکراؤ۔ ضرور اچھے کھلاڑی بن جاؤ گے۔ یکایک فٹ بال ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔

اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ کیسا خواب تھا۔ لیکن اس خواب نے کمال کو ایک راستہ دکھایا تھا۔ کتنے مزے کا تھا۔ کھیلوں کی بستی کتنی عجیب تھی۔ اور پھر اسے اولمپک صاحب کے الفاظ یاد آ گئے۔ اس نے پاس رکھے ہوئے کرکٹ کے بیٹ کو آنکھوں سے لگا کر کہا: "اس خواب نے مجھے راستہ دکھادیا ہے۔ میں اب کبھی بے ایمانی سے نہیں کھیلوں گا۔ کیونکہ مجھے کھیلوں کے آسمان پر تارا بن کر جگمگانا ہے!!"

"لکڑی کی تلوار" کا بقیہ

معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ گناہ گار ہے تو کوئی بات نہیں۔ اپنے کئے کی سزا بھگتے گا اور مر جائے گا لیکن اگر یہ بے قصور ہے تو خدایا! اپنی قدرت سے اس تلوار کو لکڑی کا بنا دے!"

اس نے میان سے تلوار کھینچی لیکن لکڑی کی تلوار دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ قلی بیگ خوشی سے مسکراتا ہوا بولا "بادشاہ سلامت! ملاحظہ فرمائیے میرا خیال درست ہے۔ یہ آدمی بے گناہ ہے۔"

شاہ عباس کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ انھوں نے قلی بیگ سے اپنا تعارف کرایا۔ انعام و اکرام سے اس کی گود بھر دی اور گھر روانہ کیا۔

بہار کے چند تاریخی مقامات

اسرار احمد ندوی

ریاست بہار میں ہندستان کی اَن گنت تاریخی یادگاریں ہیں۔ اس کی پُرانی تاریخ ایک ہزار سال قبل مسیح سے ملتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ اس ریاست میں ہمیں تین ہزار سال کی تاریخ ملتی ہے۔ جب انگلینڈ والے محض کھلنڈرے تھے۔ پڑھنے لکھنے اور ادب تہذیب میں روم اسپین کے محتاج تھے۔ اس وقت بہار میں نالندہ میں ایک بہت بڑی یونیورسٹی تھی، جہاں ہندستان اور باہر کے تقریباً دس ہزار لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ چینی سیاح ہیوئن سانگ اور فاہیان جب آئے تھے تو انھوں نے اس یونیورسٹی کو دیکھا اور اس کا ذکر اپنے روزنامچے میں کیا تھا۔

بہار کا پُرانا نام مگدھ دیش تھا اور اس کے دارالسلطنت کو پاٹلی پتر کہتے تھے، جس کو اب عظیم آباد یا پٹنہ کہتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بودھ مذہب کی ابتدا اور عروج کا مرکز بہار ہی تھا۔ یہاں مہاتما بودھ کی تعلیمات کے لئے بڑے بڑے مٹھ اور خانقاہیں تھیں۔ ان مٹھوں یا مدرسوں کو وہار یعنی گہوارۂ علم کہتے تھے۔ اسی وجہ سے

ایک خاص علاقہ کو بھی وِہار کہتے تھے اس لئے
کہ وہاں پر مدرسے اور خانقاہیں بہت تھیں۔
یہ علاقہ اب بہار شریف کے نام سے مشہور
ہے۔ پھر جب تقریباً ۴۳۰ء میں نالندہ
یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کو بھی وِہار ہی کا
لقب ملا۔ پھر یہ لفظ لوگوں کو کچھ ایسا
بھایا کہ پورے علاقے کا نام بہار پڑ گیا۔ اور
آج بھی اس کا یہی نام ہے۔

آیئے اب ہم آپ کو اس صوبے کے
چند تاریخی مقامات کا مختصر حال سنائیں۔

راجگیر —— یہ جگہ بہار کی سب سے
پرانی تاریخی یادگار ہے۔ یہ پٹنہ ضلع میں ہے
راجگیر پہاڑی علاقہ ہے۔ آپ کو میلوں تک
بس پہاڑ ہی پہاڑ نظر آئیں گے یہاں ایک خاص
قسم کی گھاس ہوتی ہے۔ کافی لمبی لمبی۔ اس کی
جھاڑو بھی بنتی ہے اور اسی کی سینکوں میں
روئی لپیٹ کر عطر کی پھریری تیار کی جاتی
ہے۔ اس گھاس کو بہار میں کوس کہتے ہیں۔
یہ گھاس راجگیر میں بہت ہوتی تھی اسی لئے
اس کا پرانا نام کوساگر پورہ ہے۔ پھر جب
اس کو مگدھ کی سلطنت نے صدر مقام بنایا
تو اس کا نام راج گرہ رکھا۔ اب اسی راج گرہ
سے راج گیر بن گیا۔

راج گیر کی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوؤں
اور مسلمانوں دونوں کے لئے زیارت گاہ کی
حیثیت رکھتا ہے۔ یہی جگہ مہاتما بودھ کی تعلیمات
کی اشاعت کا مرکز تھی۔ پہاڑوں میں آپ کو
بہت سے غار اور کُنڈ یا جھیلیں نظر آئیں گی۔
ان غاروں میں بودھ مذہب کے علما اور
سادھو عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک غار ہے
جو ۵۸۵ قبل مسیح کا بنا ہوا ہے۔ اس غار
کے اندر چاروں طرف پتھر کی نہایت مضبوط
اور بہترین دیواریں ہیں۔ ان دیواروں پر
کافی نقش و نگار ہیں۔ جن کو دیکھ کر حیرت سے
منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے آخر کس طرح لوگوں
نے پتھر کو موم بنا لیا تھا۔ یہ غار چیپا پہاڑی کے
نام سے مشہور ہے۔

کنڈ میں سیتا کنڈ اور مخدوم کنڈ زیادہ مشہور
ہیں۔ عقیدت مند لوگ ثواب اور صحت کے لئے
اس میں غسل کرتے ہیں اور اس کا پانی پیتے ہیں
بھائی ثواب کا حال تو اللہ جانے صحت ضرور
اچھی ہو جاتی ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ پہاڑ

سے ان کنڈوں میں جو پانی گرتا ہے وہ غالباً اپنے ساتھ گندھک کا کچھ حصہ بھی لاتا ہے اسی لئے بھوک بہت لگتی ہے اور آدمی تندرست ہو جاتا ہے۔ ہر تیسرے سال یہاں ہندوؤں کا ایک زبردست میلا لگتا ہے۔ میلا کیا ہوتا ہے آدمیوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آتا ہے ہزاروں لاکھوں آدمی۔ جدھر نظر دوڑایئے آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے راج گیر زیارت گاہ اُس وقت بنا جب بودھ مذہب کے عروج کے کوئی چھ سو سال بعد ایک بزرگ حضرت مخدوم بہاری نے راج گیر کو اپنی عبادت کے لئے چُنا۔ آپ نے تقریباً تیس سال تک راج گیر کے جنگلوں اور کھوہوں میں عبادت کی ہے اس کے بعد آپ قصبہ بہار تشریف لے گئے۔ اسی وقت سے قصبہ بہار بہار شریف کہا جانے لگا۔ اب یہ ریاست بہار کا سب سے بڑا سب ڈویژن ہے۔ راج گیر میں پہاڑ کے اندر پتھر کا بنا ہوا حجرہ ہے، جس میں آپ عبادت کیا کرتے تھے اور گرم پانی کا چشمہ مخدوم کنڈ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت مخدوم شاہ اس میں وضو کیا کرتے تھے، دیکھنے کی چیزیں ہیں۔

راج گیر اور اس کے آس پاس میں کھنڈروں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں، ٹیلوں اور کھوہوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ کتنی ہی عالی شان عمارتیں برس ہا برس گزرنے کی وجہ سے زمین کے اندر دفن ہو گئیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کھدائی ہو رہی ہے اور کچھ عمارتیں نکلی بھی ہیں۔ ان میں نالندہ یونیورسٹی کی عمارت بھی ہے۔ ۱۲۳۵ء تک یہ یونیورسٹی ٹوٹی پھوٹی حالت میں زمین پر تھی لیکن اسی سال کشمیر کے راجا لال دت نے مگدھ دیس پر چڑھائی کی اور مگدھ کی حکومت کے ساتھ ساتھ اس یونیورسٹی کی ہستی بھی مٹا دی۔ اب اس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور بڑے بڑے کمروں کے نشانات کھدائی میں نکل رہے ہیں۔

سہسرام ——— یہ ضلع شاہ آباد کا ایک شہر ہے۔ اس کا پرانا نام ارجن پورہ ہے۔ کہتے ہیں ہندوؤں کے ہزار ہاتھ والے دیوتا ارجن کی وفات یہیں ہوئی تھی اس لئے اس کو ارجن پورہ کہتے تھے۔ یہاں ایک پہاڑی ہے

جو چندن شہید کی چوٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑی پر پتھر کا ایک ستون گڑا ہوا ہے۔ اس پر راجا اشوک کا ۲۳۱ قبل مسیح کا ایک کتبہ بھی ہے۔ اس لاٹ کے متعلق آپ کو ایک بات چپکے سے بتادوں، ہوشیار مجاور نئے لوگوں سے اس لاٹ کو چندن شہید کا چراغ دان کہہ کر ان سے پیسے لے لیتے ہیں۔ آپ اگر جائیں تو ان کی باتوں میں نہ آجایئے گا۔

شیر شاہ سوری کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہی شیر شاہ جس نے مغل بادشاہ ہمایوں سے حکومت چھینی تھی۔ اس کا اور اس کے والد حسن شاہ کا مقبرہ بھی یہیں ہے شیر شاہ کا مقبرہ ایک تالاب کے بیچ میں ہے۔ یہ اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے شیر شاہ کے مقبرے سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر اس کے لڑکے سلیم شاہ کا مقبرہ ہے۔ سلیم شاہ کی لاش گوالیار سے لاکر یہاں دفن کی گئی ہے۔ یہاں ایک عیدگاہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ اسے ۱۸۳۳ء میں مجاہد خاں نے بنوایا تھا۔ دیکھنے کی چیزوں میں ایک گرا ہوا قلعہ بھی ہے جو نورتن کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں شیر شاہ سوری رہتا تھا۔

قلعہ رُہتاس ——— (شاہ آباد) یہ قلعہ فنِ تعمیر کے اعتبار سے نادر نمونہ ہے۔ راجا ہریش چندر کے بیٹے رُہتاس کے نام سے یہ قلعہ مشہور ہے۔ اس قلعہ کے دروازے پر پتھر کے دو بڑے بڑے ہاتھی کھڑے ہیں۔ میں تو بھئی اچانک ان کو دیکھ کر ڈر گیا تھا پھاٹک کے بعد چکّر دار راستوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ اس سے گزر کر شاہی محلات اور تخت ہیں۔ قلعہ کے پاس اورنگ زیب اور شیر شاہ کی بنوائی ہوئی مسجدیں اور حبش خاں کا مقبرہ بھی دیکھنے کی چیزیں ہیں۔

پاواپوری ——— (پٹنہ) بہار شریف سے پانچ چھے میل دکھن میں ایک گاؤں ہے یہ مقام ساری دُنیا کے جینیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جین دھرم کے بانی مہاویر جی نے اسی مقام کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا مرکز بنایا تھا۔ گاندھی جی کا اصول اہنسا اس مذہب کا پہلا سبق ہے۔ جین مذہب کے

ماننے والے اس طرف بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ گجرات اور مُرشد آباد (بنگال) میں ان کی کافی تعداد پائی جاتی ہے۔ اسی لئے پاواپوری میں مُرشد آبادیوں کی بنوائی ہوئی سرائیں، خانقاہیں اور مندر ہیں۔ یہاں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے۔ اس میں دُنیا بھر کے جینی جمع ہوتے ہیں۔

پاواپوری تین حصّوں میں بٹا ہوا ہے اور ہر حصّے میں عظیم الشان مندر بنے ہوئے ہیں۔

پہلا حصّہ گاؤں مندر کہا جاتا ہے۔ یہ گاؤں کی آبادی کے اندر ہے۔ یہ مہاویر جی کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس مندر میں جین مذہب کی مقدس کتاب استادلی رکھی ہوئی ہے۔ یہ سنسکرت زبان میں ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ بھی پاس ہی رکھا ہے۔

دوسرا حصّہ وہ ہے جسے 'سامو سرن' کہتے ہیں۔ یہ گاؤں سے باہر ایک بڑے میدان میں بنا ہوا ہے۔ اس جگہ مہاویر جی وعظ کہا کرتے تھے۔ جینیوں کا عقیدہ ہے کہ مہاویر جی کے وعظ انسانوں کے علاوہ چرند، پرند بلکہ سارے حیوان سُنا اور سمجھا کرتے تھے۔ یہاں پر برابر بہترین گلاب پھولے رہتے ہیں اور آنے والوں کو یادگار کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔

تیسرا حصّہ وہ ہے جہاں مہاویر جی انتقال ہونے کے بعد جلائے گئے۔ ان کی راکھ کو ان کے ماننے والوں نے اتنا بٹورا کہ اس جگہ ایک تالاب بن گیا۔ وہ تالاب اب ایک پُر فضا جھیل بن گیا ہے۔ اس جھیل کے بیچ میں ایک مندر ہے جس کو جل مندر کہتے ہیں۔ یہ مندر سونے چاندی کے پتّروں سے پٹا پڑا ہے۔ سارے مندروں میں مہاویر جی اور ان کے ساتھیوں کے مجسّمے بنے ہوئے ہیں۔ ان مندروں کے اخراجات اور دیکھ بھال کے لئے ایک بہت بڑا وقف ہے اور ایک کمیٹی ہے جو اس کی کڑی نگرانی رکھتی ہے۔

فرحت ہاشمی — حیدرآباد

انصاف

حضرت سلیمانؑ کا انصاف ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ وہ مصر پر حکومت کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے خواب میں اُن سے کہا کہ "میں تمہارے انصاف سے بہت خوش ہوں۔ مانگو! تم جو بھی چاہتے ہو"۔ حضرت سلیمانؑ نے جواب دیا "مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اتنا دانا بنا دے کہ میرے پاس جو شخص بھی انصاف کے لئے آئے"، میں اس کا ٹھیک طور پر فیصلہ کر سکوں اور کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو عورتیں ایک چھوٹے بچے کو لے آئیں۔ ان میں سے ایک عورت نے کہا "ہم دونوں ایک ہی گھر رہتے ہیں۔ اس عورت کا بچہ مر گیا تو اس نے رات ہی میں مجھ سے آکر میرا بچہ اُٹھا لیا"۔

دوسری عورت نے کہا "نہیں یہ بچہ میرا ہے۔

بادشاہ یہ سن کر تھوڑی دیر سوچنے لگا۔ آخر اس نے سوچ کر فیصلہ کیا اور جلاد کو حکم دیا کہ اس بچے کے دو ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا ان دونوں عورتوں کو دے دو۔

پہلی عورت اس فیصلے سے خوش ہو گئی اور حضرت سلیمان کو دعا دینے لگی اور بولی۔ "ہاں یہ درست ہے۔ بچے کو آدھا آدھا بانٹ دیجیے۔"

دوسری عورت یہ فیصلہ سن کر چیخ اٹھی "للہ بچے کے ٹکڑے نہ کیجیے۔ یہ بچہ اسی عورت کو دے دیا جائے۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

اب بادشاہ سمجھ گیا کہ بچہ کس کا ہے اس نے پہلی عورت کو سزا دی اور بچے دوسری عورت کے حوالے کر دیا جو کہ اس کی حقیقی ماں تھی۔

ترجمہ

مقیم الدین۔ بیاول

ایک تعلیمی سیر

اردو بیسک بوائز اسکول بیاول (ضلع مشرقی خاندیش) کی تیسری اور ساتویں کے طلبا ایک تعلیمی سیر کے لئے ساکلی (بیاول [illegible]) کے قریب ہی ولی شاہ کے مقبرے پر گئے تھے۔ سیر بڑی ہی پر لطف رہی۔ ساتویں جماعت کے ایک طالب علم جناب مقیم الدین صاحب نے اس سیر کا بہت دلچسپ حال لکھا ہے۔ آپ بھی پڑھئے اور سیر کا لطف اٹھائیے۔ ادارہ

ہم سب لڑکے نہا دھو کر سورج نکلنے سے پہلے ہی سیر کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ناشتہ کرکے اپنا کھانا لے کر مدرسے میں جمع ہو گئے۔ جماعت کے کمرے میں گویا خوشی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ ہم سب کل ملا کر ۵۵ تھے۔ ٹھیک ہی آٹھ بجے ہم سیر کے لئے روانہ ہو گئے۔ مدرسے سے بستی کے باہر تک طلبا دو دو کی قطار میں چلنے لگے۔ بازار اور گلیوں سے چلتے ہوئے، بچوں کا ستھرا پن، چہروں پر خوشی کی لہریں اور قطار در قطار تنظیم کے ساتھ چلنے کی وجہ سے ہر شخص کی نظر ہم پر پڑ رہی تھی۔ جب ہم بستی سے باہر نکلے تو قطار میں چلنے کی بجائے گروہ میں طلبا تقسیم ہو گئے۔ ہمارے شہر بیاول سے ساکلی کا فاصلہ پانچ میل کا ہے۔ راستہ چلتے ہوئے سڑک کی دو طرفہ فصلوں کا مشاہدہ کرنے کا کتنا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ کھیتوں اور فصلوں کے بارے میں جو باتیں ہماری سمجھ میں نہ آتی تھیں وہ اپنے استادوں سے پوچھ لیتے تھے۔

تین میل کے فاصلے پر سبھونک ندی کے نئے بنے ہوئے بند کا ہم نے معائنہ کیا۔ یہ بند پہلے پانچ سالہ منصوبے کے ماتحت بنایا گیا ہے۔ ہمارے ایک استاد صاحب نے ہمیں پہلے پانچ سالہ منصوبے کا ایک مختصر سا خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس بند کے ذریعے سبھونک ندی کا پانی روک کر اطراف کے کھیتوں کو سیراب کر کے ہر سال، بارش کی فصل کے بعد ربیع کی دوسری فصل لی جایا کرے گی۔ بند کے ذریعے رکے ہوئے پانی کی نکاس کے لئے جو راستے بنائے گئے تھے ہم نے ان کو بڑی غور سے دیکھا۔ چونکہ ہمیں بیاول سے روانہ ہوئے کافی وقت گذر چکا تھا اور بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے اسی ندی پر ہم سب نے چھوڑے اور کھیلوں کا ناشتہ کیا اور پھر تازہ دم ہو گئے۔ اب ہم پھر ساکلی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سڑک سے چلتے ہوئے ہمیں اکثر بسیں نظر آئیں۔ آدھے گھنٹے میں ہم "دلی شاہ" کے مقبرے پر پہنچے۔ اس قدر بڑا اور خوبصورت مقبرہ ہمارے پاس پڑوس کے علاقہ میں شاید کہیں نہیں ہے۔

پانچ میل پیدل چلنے کی وجہ سے اکثر بچے بالکل تھک چکے تھے۔ کیونکہ تیسری جماعت کے چھوٹے بچے بھی ہمارے ساتھ تھے۔ تھوڑی دیر سستا لینے کے بعد ہم نے مقبرے کو گھوم پھر کر دیکھا۔ یہ مقبرہ مغل بادشاہوں کے زمانے کا ہے۔ یہاں اس کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار ایک مغل فوج نے دلی شاہ کی قبر کے پاس آکر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ جس کا کسی کو علم تک نہ تھا۔ اس وقت قریب میں کوئی آبادی بھی نہیں تھی اس لئے کہ ساکلی کی بستی تو بعد میں بسی۔

جب یہ فوج اپنی منزل مقصود پر پہنچی تو فوج کا سپہ سالار بیمار ہو گیا۔ رات کو سپہ سالار نے خواب میں دلی شاہ کو دیکھا اور انھوں نے کہا کہ تمہاری فوج نے ہماری قبر پر صفائی کا خیال نہیں رکھا اور گندگی پھیلائی۔ اگر تم اپنی صحت چاہتے ہو تو تم ہاتھی پر سوار ہو کر اسی راستہ واپس جاؤ جس راہ سے تمہاری فوج آئی ہے اور جہاں تمہارا ہاتھی رک جائے اور اپنا ایک پیر اٹھالے اسی کو ہماری قیام گاہ سمجھو۔ سپہ سالار کا ہاتھی اسی جگہ رُک گیا اور اس نے اپنا ایک پاؤں اوپر اٹھا لیا۔ سپہ سالار نے اسی مزار پر ایک عالی شان مقبرہ بنوایا۔ پھر وہ سپہ سالار تندرست ہو گیا۔ یہ مقبرہ مغلیہ فن تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس مقبرے کے چاروں میناروں اور درمیانی گنبد پر سونے کے کلس ہیں۔ یہاں پر ہم نے گاؤں کے لوگوں سے ایک کہانی سنی کہ ایک بار ایک چور... سونے کا کلس

جھلنے کی نیت سے آیا۔ لیکن جیسے ہی اس نے کلس کو ہاتھ لگایا اس کا ہاتھ اس سے چپک گیا اور وہ اسی وقت اندھا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے یہ قصہ محض گھڑ لیا ہو تاکہ کوئی شخص سونے کے کلس کو چرانے کی کوشش نہ کرے۔ یہاں ہر سال سردی کے موسم میں ولی شاہ کا عرس شریف ہوتا ہے۔

ہمارے پروگرام کے مطابق مقبرے کے ارد گرد کا میدان صاف کیا گیا۔ میدان کی صفائی دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے بعد اسی جگہ تمام طلباء جلسے کے لئے جمع ہو گئے۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ چند طلباء نے اخبار کی تازہ خبریں پڑھ کر سنائیں۔ پھر گانے کا پروگرام شروع ہوا۔ پھر تیسری جماعت کے کچھ بچوں نے مختلف جانوروں کی آواز کی نقلیں اتاریں۔ اس کے بعد ساتویں جماعت کے استاد صاحب نے اپنی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ تیسری جماعت کے استاد صاحب نے دو بہترین نظمیں "میاں جی اور سپاہی" "اپنے بچپن میں" پڑھ کر سنائیں۔ بڑا ہی لطف آیا۔ اس کے بعد تیسری جماعت کے طلباء میں مقررہ میدان [illegible] کا مقابلہ ہوا" اور ساتویں جماعت کے طلباء پانچ منٹ میں حافظہ کی مدد سے زیادہ سے زیادہ الفاظ لکھنا" کے مقابلے میں شریک ہوئے۔ ان مقابلوں میں اول نمبر آنے والے طلباء انعام کے حقدار ہوئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم پورے پروگرام پر عمل نہ کر سکے۔ اس کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ آرام کر کے ہم نے ساکلی گاؤں کی سیر کی۔ یہاں کا اردو مدرسہ دیکھا۔ گاؤں میں گرام پنچایت ہے۔ مڈل مدرسے کے لئے ایک سرکاری عمارت ہے۔ گاؤں کے قریب ہی ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ ٹھیک پانچ بجے ہم بھساول کے لئے واپس روانہ ہوئے اور مغرب سے پہلے ہی اپنے اپنے گھر پہنچے۔

جواب

"ریلوں کا راستہ معلوم کیجیے"

جس طرح ہمارے ہندوستان میں سلسلۂ کوہ ہمالیہ شمال میں دُور تک چلا گیا ہے۔ اسی طرح دُنیا میں نہ جانے کتنے پہاڑ کہاں کہاں اور کن کن مقامات پر ہزاروں فٹ اونچے، زمین کے سینے پر فخر سے سینہ تانے ہوئے ہیں۔ اِن پہاڑوں میں ایک مرتبہ بڑے زور کی لڑائی ہوئی اور اس لڑائی میں ایک پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑ گیا۔

یہ کہانی ہزاروں برس پہلے کی ہے جب اِن پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہر وقت ایک گہری کُہر چھائی رہتی تھی ــــ جب یہ کُہر ہلکی ہوتی تو سب پہاڑ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے، ورنہ ان میں سے کوئی دوسرے کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ اُس کے ساتھ ہی کوئی دوسرا بھی پہاڑ ہے۔

اور یہ نہ جاننا ہی اُن کے حق میں بہتر رہا ــــ لیکن جب کُہر ہٹی ــــ سُورج کی تیز اور چمکیلی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑیں اور پھر جب پہاڑوں کے مُنہ پر جمی ہوئی برف آہستہ آہستہ گھُلی تو سب پہاڑوں نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سورج کی اِن کرنوں کی ہلکی سی گرمی نے [illegible]

منہ دُھلوا دیا تھا ___ جب یہ برف پگھل کر نیچے آنے لگی تو پہاڑوں نے غسل کیا اور ایک لمبے عرصے تک سوتے رہنے کے باعث اُن کے اعضا جو مضمحل ہو گئے تھے، اُن میں پھر سے ایک نیا جوش، ایک اُمنگ اور جوانی پیدا ہو گئی ___ آنکھیں کھولتے ہی اِن پہاڑوں نے ایک دُوسرے کو دیکھا اور ہر ایک کی مزاج پُرسی کی ___ لیکن آپ جانتے ہیں کہ دُنیا میں اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی، تو اسی طرح اِن پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جس کا نام الماتی تھا اپنے غرور اور اپنی بڑائی کی وجہ سے اپنے سے چھوٹے پہاڑوں کو ناک چڑھا کر دیکھنے لگا۔ الماتی کے عین سامنے ہی ایک دُوسرا خوب صورت سا پہاڑ مُرارتا تھا ___ مُرارتا بہت ہی حلیم اور خوش مزاج پہاڑ تھا ___ ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ اور ذرا بھی مغرور نہ تھا۔

الماتی اس پہاڑ مُرارتا سے نہ جانے کیوں جلتا تھا؟ ___ اور یہ جلن تو اُس وقت اور بھی بڑھ گئی جب کہ اُس کی نظر ایک ننھی سی خوب صورت پہاڑی حوانا پر پڑی۔

حوانا بہت ہی پیاری پیاری اور حسین پہاڑی تھی۔ نیچے سے قدرتی طور پر تراشی ہوئی تھی اُس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور منہ اتنا ننھا سا ___ الماتی نے جب حوانا کو دیکھا تو فوراً سوچ لیا کہ بس ___ اگر دُنیا میں کوئی پہاڑی شادی کرنے کے لائق ہے تو وہ حوانا ہے۔ اتفاق کہیے کہ وہ نوجوان پہاڑ مُرارتا بھی یہی سوچ رہا تھا ___

اصل میں یہ بڑی مشکل بات تھی ___ پہاڑ دو اور پہاڑی ایک ___ اور دونوں شادی کے اُمید وار ___ بے چاری حوانا الگ پریشان تھی، کس سے ہاں کہے، کس سے نہیں؟ لیکن پریشانی سے تو ایسی باتیں حل نہیں ہوتیں، بے چاری نے تھک ہار کر کہہ دیا کہ بھئی تم دونوں آپس میں فیصلا کر لو۔ جو تم سوچ لوگے وہ مجھے منظور ہوگا۔

یہ سُنتے ہی الماتی نے قہر کی ایک نگاہ مُرارتا پر ڈالی ___ اور بولا ___

"بُزدل او رفقدے ___ تیرا کیا خیال ہے کیا تو واقعی حوانا سے شادی کرنا چاہتا ہے ___؟"

"ہاں۔" مُرارتا کا مختصر سا جواب تھا۔
"بے وقوف اچھی طرح سوچ لے۔
شاید تجھے میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"
الاتی دہاڑا۔
"تجھ جیسے ذلیل پہاڑ میرے دامن
میں بستے ہیں، شرافت سے بات کر۔
ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" اس مرتبہ مُرارتا کو
بھی غصہ آگیا تھا۔
"دیکھ میرے سینے میں آگ لگ
رہی ہے۔ میں اس آگ سے تجھے بھسم
کردوں گا۔" الاتی چیخا، اور اس کے چیخنے
کی وجہ سے اُس کے سر میں دراڑیں پڑگئیں۔
"ایسے پہاڑ میں نے بہت سے دیکھے
ہیں۔" مُرارتا نے کہا
"اچھا تو یوں نہ مانے گا۔
تو دیکھ۔"
یہ کہہ کر الاتی زور سے کانپا۔ دہاڑا،
اور کپکپایا، اور ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا
کہ آس پاس کے تمام پہاڑ ہلنے لگے۔
یکایک الاتی کا سر پھٹ گیا اور اُس میں
آگ کے بڑے بڑے گولے نکل نکل کر مُرارتا
پہ پڑنے لگے۔ آگ کی ان لپٹوں کے ساتھ ہی
کئی کئی من وزنی پتھر کے ٹکڑے بھی آسمان پر
اُڑنے لگے۔ دور دور تک دھواں ہی
دھواں نظر آنے لگا۔ آگ کی ان خوفناک
لپٹوں کی وجہ سے آس پاس کے کئی برفانی
پہاڑ پگھلنے لگے۔ لیکن الاتی برابر آگ اگلتا
رہا۔ ساتھ ساتھ وہ ہواتا کو بھی سینتان کر
دیکھتا جاتا، جیسے کہہ رہا ہو۔ "دیکھو ہواتا
۔ یہ سب کچھ تمھاری ہی خاطر ہو رہا ہے۔
اب تو تم نے دیکھ لیا کہ میں کتنا طاقت ور ہوں۔
دیکھو میری اِس طاقت کے آگے تمھارا مُرارتا
بے بس ہے۔ اب تو تم مجھ ہی سے شادی
کروگی نا۔؟"
ہواتا بے چاری کیا جواب دیتی۔ گھٹنوں
کے بیچ میں اپنا سر دے کر رونے لگی۔
مُرارتا کو بھی غصہ آگیا تھا۔ آخر کہاں تک
الاتی کے حملوں کو برداشت کرتا۔ اُس نے بھی
طیش کے مارے پھٹنا شروع کردیا اور الاتی سے
بھی زیادہ وزنی چٹانیں ہوا میں اچھال اچھال کر
اُس کی طرف پھینکنی شروع کردیں۔ ہواتا
دونوں کے بیچ میں تھی اور یہ چٹانیں اور آگ

اُسی غریب کے جا جاکر لگتی تھی ـــــ اُس نے بہت مِنت سماجت کی، گڑگڑائی، دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے ـــــ اُنھیں چیخ چیخ کر لڑنے سے باز رکھنا چاہا ـــــ لیکن وہ دونوں اپنی دُھن کے پکے تھے ـــــ برابر لڑتے ہی گئے۔

پتھر برستے رہے، چٹانیں ہوا میں اُڑتی رہیں۔ آگ کے گولے چلتے رہے اور لاوا بہتا رہا ـــــ لیکن اِن دونوں کی لڑائی کو بند ہونا تھا نہ ہوئی۔ دنوں سے ہفتے ہوئے، ہفتوں سے مہینے اور پھر مہینوں سے سال، لیکن یہ لڑائی ختم نہ ہوئی۔

آخر ایک دن تو اِس لڑائی کو ختم ہونا ہی تھا ـــــ گرد و غبار ہٹا، دُھوئیں کے بادل چھٹے ـــــ اور چٹانوں کا گرنا بند ہوا تو المانی نے دیکھا کہ اُس کے دُشمن مُرارتا کا نام و نشان بھی نہیں ہے، اُس کا دھڑ ٹوٹ چکا ہے اور اُس کا جسم ریزہ ریزہ ہوکر المانی کے قدموں میں پڑا ہے، نہایت فخر اور غرور کے ساتھ اُس نے جوانا کو دیکھا ـــــ لیکن آہ، یہ کیا ـــــ ؟ اُس نے دیکھا کہ اِس لڑائی جھگڑے میں بے چاری حوانا مُفت میں پِس گئی تھی ـــــ ننھی سی جان، اتنے بڑے بڑے پتھروں کی چوٹیں برداشت نہ کرسکی اور آخر کار مرگئی ـــــ المانی کو بہت رنج ہوا۔ اس کے آنسو بہنے لگے اور چیخ چیخ کر اُس نے آسمان سر پر اُٹھالیا ـــــ جس کی خاطر اتنے پاپڑ بیلے وہی نہ رہی ـــــ یہ سوچ کر اُس کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا ـــــ ساون بھادوں کی طرح اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

ہزاروں لاکھوں چشمے اور ندیاں جو آپ دیکھتے ہیں، اصل میں المانی کے آنسو ہیں جو اُس نے حوانا کے مرنے پر بہائے اور یہ بہتے ہوئے آنسوؤں کے چشمے رہتی دُنیا تک قائم رہیں گے۔

(خیال انگریزی سے)

آمارانی میسی

کہانی لکھیے

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)

(۵)
(۶)
(۷)
(۸)
(۹)
(۱۰)

میری ماں

میری ماں ہے کتنی اچھی — میری ماں ہے کتنی سچی
مجھ کو پالا گود میں لے کر — پھرتی رہتی دن بھر شب بھر
بچپن کی جب یاد ہے آتی — میرے دل کی کلی کھل جاتی
انگلی پکڑ کر پاؤں چلانا — کبھی اُٹھانا کبھی بٹھانا
گہوارے میں کبھی جھلانا — لوری دینا اور سُلانا
میری اماں میری اماں — تیری خدمت میرا ایماں

ماں کا ہر فرمان ضروری
تعمیلِ قرآن ضروری

مقبول احمد سعید ہاشمی

سید جعفر علی زیدی، پورنیہ
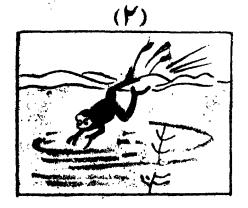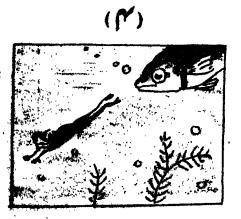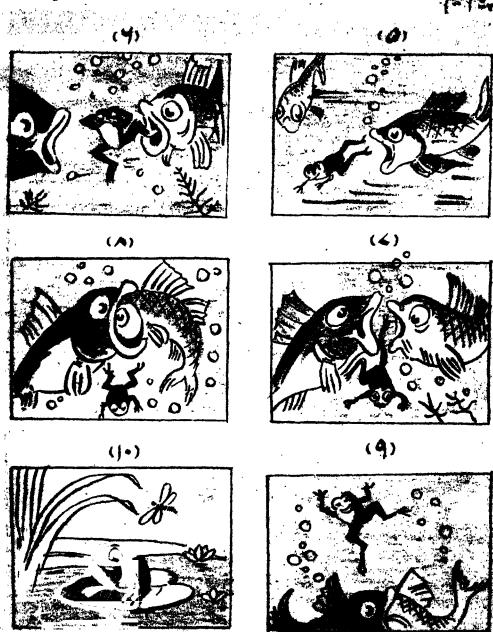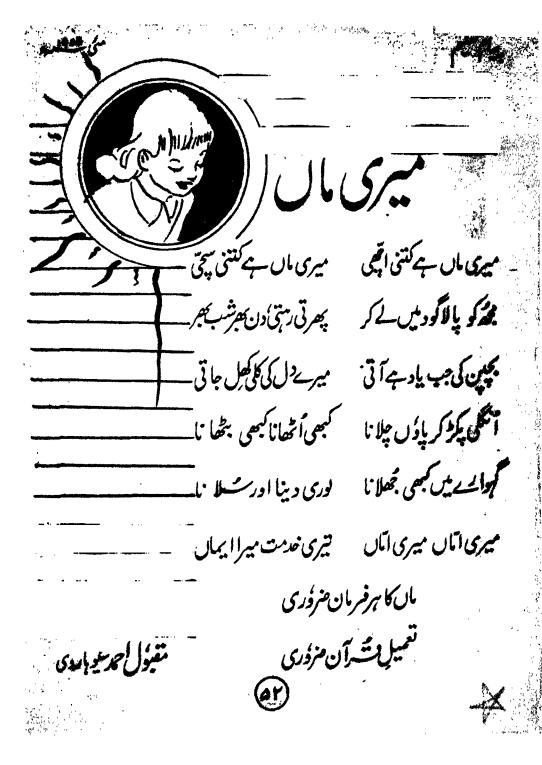
دو ٹھگ

دو ٹھگ ایک ہزار کا زیور لے کر ٹھگنے نکلے۔ اور ایک سیٹھ کے گھر جا پہنچے۔ وہ سیٹھ بہت ہی سیدھا اور نیک تھا۔ اُنھوں نے سیٹھ سے اپنی امانت رکھنے کی درخواست کی۔ لیکن شرط یہ لگا دی کہ جب ہم دونوں آدمی تمھارے پاس ایک ساتھ آئیں تو تم اس زیور کو دینا ورنہ نہیں۔ سیٹھ راضی ہو گیا۔ اور اس نے زیور رکھ لیا۔ اور انھیں ایک رسید دے دی۔ دونوں ٹھگ رسید لے کر چلے گئے۔

کچھ دنوں کے بعد پھر دونوں ٹھگ اُس سیٹھ کے پاس آئے اور اس سے کچھ باتیں کر کے چلے گئے۔ ذرا سی دیر کے بعد ایک ٹھگ سیٹھ کے پاس واپس آیا اور بولا "سیٹھ جی! ہمارا زیور دے دیجئے۔ یہ رسید دیکھ لیجئے۔ ہمیں اب زیور آپ کے پاس نہیں رکھنا ہے کیوں کہ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ سیٹھ سمجھا کہ دوسرا پاس ہی کھڑا ہے اس لئے اس نے زیور دے دیا۔ اگلے دن دوسرا ٹھگ سیٹھ کے پاس آیا اور اس نے سیٹھ سے اپنا زیور مانگا۔ سیٹھ نے بگڑ کر کہا کہ میں نے اسی وقت کل تمھارے ساتھی کو زیور دے دیا

پھر کیسا زیور مانگتے ہو۔؟ ٹھگ نے جب یہ
بات سُنی تو وہ اور بھی بگڑ گیا اور کہنے لگا
کہ تم نے اسے کیوں دیا جب کہ ہم نے یہ
شرط لگا دی تھی کہ جب تک ہم دونوں ساتھ
نہ آئیں ہرگز کسی ایک کو زیور نہ دینا۔"
اب تو سیٹھ گھبرا گیا۔ اور دونوں میں خوب تو تو
میں میں ہونے لگی اور بات بہت بڑھ گئی۔
آخر دونوں شہر کے قاضی کے پاس گئے اور
دونوں نے اپنی اپنی داستان کہہ سنائی۔
قاضی جی نے ٹھگ ہی کے حق میں فیصلہ دیا۔
اور سیٹھ سے کہا کہ جب تم نے یہ شرط مان لی
تھی اور وعدہ کیا تھا تو جب وہ اکیلا آیا تو
اسے کیوں زیور دے دیا۔؟ اس لئے تمھیں
اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ سیٹھ جی
نے ہزار منت ساجت کی مگر ان کی کچھ سنائی
نہیں ہوئی۔ اب تو سیٹھ جی اور بھی گھبرائے
اور نا اُمید ہو کر بیربل کے پاس گئے۔ بیربل
نے مقدمے کو پھر سے پیش کروایا اور عدالت
کے سامنے دونوں کا بیان پھر لیا اور ٹھگ
سے کہا کہ تم نے یہ شرط لگائی تھی کہ جب
دونوں ساتھ آئیں تب زیور دینا۔ تو پھر تم
اکیلے کیوں آ گئے؟ تم سیٹھ کو ٹھگنا چاہتے تھے
اس لئے میں قاضی سے درخواست کروں گا
کہ تمھیں شریف آدمی کو ٹھگنے کی کوشش میں
سزا ملنی چاہیے۔"

یہ دلیل سن کر قاضی جی بھی مطمئن ہو گئے
اور دونوں ٹھگ اپنا سا منہ لے کر گھر کی طرف
چل دیئے اور سیٹھ بیربل کو دعائیں دیتا ہوا
اپنے گھر چلا گیا۔

پیام تعلیم

کا

باغبانی نمبر

ہم جولائی میں پیام تعلیم کا باغبانی نمبر شائع کر رہے ہیں جس میں باغبانی سے متعلق اچھے اچھے مضامین شائع کیے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اور دوسری معلوماتی مضامین اور کہانیاں بھی ہوں گی۔

باغبانی سے متعلق اسی مہینے میں اچھے اچھے مضامین بھیجیے۔ وقت کم ہے اس لیے فوراً لکھ کر بھیجیے۔

پیام تعلیم

کا

کہانی نمبر

ہم اگست میں پیام تعلیم کا ایک کہانی نمبر شائع کر رہے ہیں جس میں بڑوں اور بچوں کی لکھی ہوئی اچھی اچھی کہانیاں شائع کی جائیں گی۔

اپنی پہلی فرصت میں کہانی لکھ کر بھیجیے۔ اس کی تیاری کا کام شروع ہو گیا ہے۔

آپ نے کہانی بھیجنے میں دیر کی تو پھر شکایت نہ کیجیے گا کہ آپ کی کہانی شائع ہونے سے رہ گئی۔

ایڈیٹر: پیام تعلیم۔ جامعہ نگر دہلی

باغبانی نمبر اور کہانی نمبر حاصل کرنے کیلئے مبلغ چار روپے بھیج کر فوراً سالانہ خریدار بن جائیے

بچّوں کی کہانیاں

سردار کا پٹہ ۳ر
چھو منتر ۳ر
گبرا فرشتہ ۳ر
آفت کا پرکالہ ۳ر
مسٹر بھوت ۳ر
ماں کا ظلم ۳ر
جن پکڑا گیا ۳ر
شاہ صاحب کی بددعا ۳ر
ظالم بادشاہ ۳ر
ہیبت خاں ۳ر
اکبر بیربل کے لطیفے ۶ر
دو بھائی ۵ر
ہوائی گھوڑا ۵ر
وفاداری کا امتحان ۵ر
تین ٹھگ ۵ر
لاڈلی بیٹی ۵ر
ایمان داری کا پھل ۵ر
دو بہنیں ۵ر
اُمت کی ماں ۳ر
کیسے جادو کوشش ۳ر
اور وہ شریف بن گیا ۳ر

شام نگر میں سینما آیا ۴ر
جادو کی انگوٹھی ۵ر
شیخ چلی کا مشاعرہ ۵ر
نیلم ۶ر
گھڑی ساز کی بیٹی ۴ر
سفید ہاتھی ۴ر
شاہی لباس ۴ر
شاہی موچی ۴ر
شہزادی گوہر بار ۵ر
مٹی کی شہزادی ۳ر
گرم چائے ۳ر
لال بجھکڑ (بچوں کا ناول) ۱۰ر
ننھی خرگوش ۳ر
سنہری کھال ۳ر
ماٹو موچی ۳ر
سنہری پرندہ ۳ر
آنکھ مچولی ۳ر
علم کی قیمت ۳ر

مسٹر گڑبڑ خاں ۵ر
سونے کا راجا ۵ر
رستم چور ۵ر
بچوں کی بیت بازی ۳ر — کہانی میں کہانی ۵ر
شیخ چلی نے شادی کی ۳ر — جادو کی کہانی ۵ر
شہزادی نیلوفر ۳ر — کایا پلٹ ۵ر
جادو کی چھڑی ۳ر — بڑھا جادوگر ۵ر
اندھیر نگری ۳ر — گوہر پری ۵ر

نیّر صاحب کی تصانیف

سات آٹھ برس کے بچوں کے لئے

تارا کا ڈنڈا ۳ر — بونے کا بٹوا ۳ر
انار راجا ۳ر — پری کی چھڑی ۴ر
بطخ شہزادی ۴ر — پرستان کی سیر ۳ر

آٹھ سے گیارہ برس کے بچوں کے لئے

چنن منن ۳ر — میاں مٹھو ۵ر
ٹیلو میاں ۶ر

نظمیں { بچوں کا کھلونا ۱۲ر — نئی کہانیاں ۸ر
گھی شکر ۸ر — اسلامی نظمیں ۱۰ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں — مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی

جوتے کا گھر

اندر کے صفحات میں بیگم سلطانہ فیضی کا مضمون پڑھئے

Only Title Printed at the India Printers, Delhi-6.

ایک مکھی گوشت خور پودے کے چنگل میں

اندر کے صفحات میں محسن حامد صاحب
کا مضمون پڑھیے

صراحی نما جال جن میں پھنس کر کیڑا
اپنی جان کھو بیٹھتا ہے

پیام تعلیم

باغبانی نمبر

ادارہ

حامد علی خاں ——— بی۔ اے

اطہر پرویز ——— ایم۔ اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ ——— چار روپے

فی پرچہ ——— چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی

فہرست

اگلا پرچہ کہانی نمبر ہوگا

بچّوں سے باتیں

"باغبانی نمبر" آپ کے سامنے ہے۔ اس میں آپ کو باغبانی کے بارے میں طرح طرح کے مضمون ملیں گے۔ یہ مضمون ہم نے آپ کے لئے خاص طور پر لکھوائے ہیں۔

پچھلے دنوں مدرسہ ابتدائی کے بچّوں نے 'باغبانی پروجکٹ' چلایا تھا جس میں باغبانی کے عملی کام کے ساتھ ساتھ بچّوں نے اس کے بارے میں "کتابچے" بھی تیار کئے تھے۔ ہم نے مدرسے جاکر ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھا۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچّوں نے کس طرح 'باغبانی پروجکٹ' سے فائدہ اٹھایا۔ ابتدائی مدرسے کے استاد جناب احمد علی صاحب نے ہمارے لئے ان میں سے تین مضمون چنے۔ جو ہم شائع کررہے ہیں۔

باغبانی نمبر کے مقابلے میں زیادہ بچّوں نے حصہ نہیں لیا۔ جن بچّوں نے مضمون بھیجے، انھوں نے بھی پوری محنت نہیں کی۔ بعض بچّوں نے جلدی جلدی مضمون لکھے۔ اور انھیں دوبارہ پڑھا تک نہیں۔ بعض بچّوں نے یوں ہی کٹے پھٹے مضمون بھیج دئے۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھئے کہ جب مضمون لکھیں، ایک سطر چھوڑ کر

صاف اور خوشخط لکھیں تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔

اس مقابلے میں حسب ذیل بچوں نے انعامات حاصل کئے ہیں:-

پہلا انعام۔ آم کی کہانی اسی کی زبانی۔ انجم ہاشمی۔ رامپور

دوسرا انعام۔ بیج کی کہانی۔ محمد شمیم۔ جیراجپوری

تیسرا انعام۔ سبزی کا باغ لگائیے۔ سید شبیر علی برہان پور

ہم ان بچوں کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور جناب مشتاق احمد اعظمی اور محمد صالح صاحب کے ممنون ہیں جنھوں نے مقابلے کے مضمون دیکھے اور اپنے فیصلے دئے۔ یہ تینوں مضمون ہم اس نمبر میں شائع کر رہے ہیں۔

"کیڑے مکوڑے کھانے والے پودے" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بہت دلچسپ مضمون ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ اسے بڑے شوق سے پڑھیں گے۔

اپنے گھر میں باغ لگائیے، سایہ دار درخت، پھولوں کا راجا، بھی بہت اچھے مضمون ہیں۔ اور باغبانی نمبر کے لئے خاص طور پر لکھوائے گئے ہیں۔

"باغبانی کا کلنڈر" اپنے پاس احتیاط سے رکھئے یہ آئندہ بھی آپ کے کام آئے گا۔

اس بار کہانیاں بھی تو پھلوں اور پھولوں کے بارے میں ہیں۔ سراج انور صاحب کی دلچسپ کہانی "آم کا پودا" ہمارے باغبانی نمبر میں چار چاند لگا رہی ہے۔ فریدہ ہاشمی کی کہانی "سالگرہ کا تحفہ" بھی سچ مچ باغبانی نمبر کے لئے بڑا اچھا تحفہ ہے۔ باغبانی میں صبر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کچھ دن پھول نہ آئیں تو پودے اکھاڑ نہ پھینکئے۔ اس کو غور سے دیکھئے اور سمجھئے۔ فریدہ ہاشمی کے گلاب ہی کو دیکھئے اگر وہ اس پودے کو توڑ دیتیں تو پھر کتنا پریشان ہوتیں۔

نظموں کا حصہ بھی ہمارے باغبانی نمبر کی زینت بڑھا رہا ہے۔ جناب حامد اللہ افسر اور جناب شفیع الدین نیر کی نظمیں کتنی مزیدار ہیں۔

باغبانی نمبر کے بعد اب اگلا پرچہ کہانی نمبر ہوگا۔ اس کے لئے فوراً اپنی اپنی کہانیاں بھیجئے۔ البتہ اس کا خیال رکھئے کہ کہانی مختصر ہو اور صاف لکھی ہوئی ہو۔ جو بچے بھیج چکے ہیں وہ دوبارہ نہ بھیجیں۔ اس مقابلے میں بھی پندرہ روپے کے انعام تقسیم کئے جائیں گے۔

ہمارا چمن

حامد اللہ افسر

کیسا اچھا، کیسا پیارا ہے، چمن اسکول کا
کہتے ہیں جس کو چمن، ہوتا ہے گھر وہ پھول کا
اِس چمن کو ہم نے مِل جُل کر لگایا ہے یہاں
باغ اِک چھوٹا سا ہم سب نے بنایا ہے یہاں
اس میں ہر چھوٹے بڑے بچّوں کی کیاری ہے جُدا
یعنی اِک کیاری ہماری، اِک تمہاری ہے جُدا
نام اِک بچّے کا ہر کیاری پہ ہے لکھا ہوا
اُس نے خود بویا ہے جو کچھ اس میں ہے بویا ہوا
پھول کے پودے لگائے ہیں کسی نے پاس پاس
کوئی ترکاری کے آگنے کی لئے ہے دِل میں آس
فائدہ پہنچائیں گی کِتنا ہماری کیاریاں
کھائیں گے ہم اپنی پیدا کی ہوئی ترکاریاں
دیکھ کر اپنا چمن ہوتا ہے دِل خوش کِس قدر
آج رونق پر ہے اِن پھولوں کی محفل کِس قدر
اپنے ہر پودے کی حالت پر نظر رکھتے ہیں ہم
اِس چمن کے پتّے پتّے کی خبر رکھتے ہیں ہم
خود ہی مالی اس چمن کے خود ہی رکھوالے ہیں ہم
ہیں ابھی بچّے مگر پھر بھی چمن والے ہیں ہم

حامد علی خاں

باغبانی

ٹکٹ جمع کرنا، پتیاں جمع کرنا اور سکے جمع کرنا عام مشغلے ہیں۔ لوگ اور بھی طرح طرح کی چیزیں جمع کرتے ہیں مثلاً مختلف قسم کے نب، طرح طرح کی دیا سلائیاں، دنیا کے مشہور آدمیوں کے دستخط اور تصویریں وغیرہ لیکن باغبانی جیسا مشغلہ کوئی نہیں۔ جن لوگوں کو باغبانی کا شوق ہوتا ہے، اُن کے گھر کی رونق کا کیا کہنا۔ پھر خوبی یہ کہ اور تفریحوں کے مقابلے میں خرچ بھی کچھ زیادہ نہیں۔

باغبانی شروع کرنے کے لئے سب سے اچھا موسم شروع برسات ہے۔ عام طور پر ہر گھر میں صحن یا آنگن ہوتا ہے۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر گھروں کے باہر بھی کچھ خالی زمین ہوتی ہے۔ اپنے گھر کے آنگن یا باہر کی خالی زمین کا کچھ حصہ باغبانی کے لئے چُنا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ایسے مکانوں یا عمارتوں میں رہتے ہیں۔ جہاں خالی زمین نہیں ہوتی وہ گملوں،

کُنڈلیوں اور لکڑی کے صندوقوں میں طرح طرح کے پھول، بیلیں اور ترکاریاں لگا کر اپنے چھوٹے سے گھر کو خوبصورت بنا سکتے ہیں۔

پہلی بارش ہوتے ہی اپنے چمن کے لئے زمین کا اتنا بڑا ٹکڑا چُن لینا چاہیے جس کی دیکھ بھال آپ اکیلے کر سکیں۔ چودہ، پندرہ برس کی عمر کے بچوں کے لئے چار گز لمبی اور دو گز چوڑی زمین بہت

کافی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے زمین کو ایک ڈیڑھ فٹ گہرا کھود کر کنکر پتھر نکال کر علیحدہ پھینک دینا چاہیئے۔

یہہ کام پہلے دو دن کا ہوا۔ اس کے بعد تیسرے دن پتیوں یا گوبر کی کھاد تقریباً چھ چھ انچ پوری کیاری پر پھیلا کر کھرپی سے کھدی ہوئی مٹی میں ملا دینا چاہیئے۔ اور خوب اچھی طرح پانی دے دینا چاہیئے۔ اگلے روز کیاری ہموار کرکے کیاری کے چاروں طرف کوئی چار' چار انچ اونچی مینڈ بنا دینا چاہیئے۔ اب آپ کی کیاری بیج بونے کے لئے تیار ہے۔ صفحہ ۲۸ پر باغبانی کا کیلنڈر دیکھئے اور جو چیز پسند ہو بو دیجئے۔

بیج بونے کے سلسلہ میں یہہ خیال رکھنا چاہیئے کہ پودے بہت گھنے نہ اُگیں۔ اگر غلطی سے زیادہ بیج پڑ جائے تو پودے اُگنے کے کچھ عرصے بعد گھنی جگہ کے پودے اکھاڑ دینا چاہیئے۔

باغبانی کے کام کے سلسلہ میں دو باتوں کا ہمیشہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ پہلی یہہ کہ تھوڑا تھوڑا کام روزانہ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ایک ہی دن اتنا کام کیا جائے کہ آپ تھک کر چور ہو جائیں۔ دوسرے باغبانی آرائش اور زیبائش کا کام ہے۔ ہمیشہ کیاریاں سیدھی اور سلیقے سے بنانا چاہیئے۔ لکڑی کی کھونٹیوں میں سُتلی باندھ کر پہلے سیدھا نشان دے لینا چاہیئے۔ اس کے بعد کھُدائی کرنا یا مینڈیں بنانا آسان ہو جاتا ہے اور کیاری خوبصورت بھی معلوم ہوتی ہے۔

سراج انور

آم کا پودا

انجم اور ثروت دونوں بھائی بہن تھے ۔ اُن کے گھر کے سامنے کچی زمین کا ایک ٹکڑا بے کار پڑا تھا. برسات آنے والی تھی ۔ انجم نے سوچ رکھا تھا کہ برسات بعد یہ زمین نرم ہو جائے گی تو اس میں طرح طرح کے پھل اور سبزیاں بوئیں گے ۔ دن بھر اُس کی رکھوالی کریں گے ۔ جب سبزیاں اور پھل اُگ آئیں گے تو پھر مزا آجائے گا ۔

ثروت یہ سُن کر بہت خوش ہوئی ، لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ انجم بڑا نٹ کھٹ اور ضدی ہے ۔ جتنی بھی چیزیں اُگیں گی وہ سب خود کھا جائے گا اور اُسے اتنی سی بھی کوئی چیز نہیں ملے گی ۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ انجم سے پہلے ہی طے کرے گی ۔ اور فیصلہ اس بات پر ہوگا کہ اگر وہ برابر کا کام کرے گی تو پھلوں اور سبزیوں میں بھی برابر کی حصے دار ہوگی ۔ لیکن ابھی اُس نے یہ بات انجم سے کہی نہیں تھی ۔ اُسے تو برسات کے گزر جانے کا انتظار تھا ۔

جب برسات شروع ہوئی تو ثروت برآمدے میں کھڑی یہ تماشا دیکھتی اور انجم صرف نیکر پہنے زمین کو ٹھیک کرنے میں لگا رہتا ۔ جدھر سے مٹی بہنے لگتی ، فوراً وہاں ایک ننھی سی مینڈھ بنا

دیتا تاکہ پانی نالی میں سے گزرتا رہے۔ اپنی ننھی سی کدال اور کھرپے سے وہ بار بار اس جگہ کو ٹھیک کرتا۔ مگر مٹی کی دیواریں تھوڑی ہی دیر بعد پھر گر جاتیں۔

اس نے جھلا کر سب چیزیں وہیں پھینکیں اور بھاگتا ہوا اپنے برآمدے میں آگیا۔ ثروت گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ہنس رہی تھی۔ انجم نے گھور کر اسے دیکھا مگر ثروت اسی طرح ہنستی رہی۔

"— ثرو! خدا کی قسم، باہر کیچڑ میں دھکا دے دوں گا — پھر روتی ہوئی جاؤ گی امی کے پاس — ہاں" اس نے ڈانٹا۔

"واہ — میں کیا کر رہی ہوں — تم اپنے آپ ناراض ہو جاتے ہو جی بھیا۔ میں کوئی تم پر تھوڑا ہی ہنس رہی تھی —"

"پھر کس بات پر ہنس رہی تھی —؟"

انجم کو غصہ آگیا۔

"بارش کی آواز پر —"

"بکو مت — مجھے بے وقوف بناتی ہے چل اندر چل!" اس نے ثروت کو پکڑ کر اندر دھکیلتے ہوئے کہا اور ثروت زمین پر پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی — یہ دونوں جب تک دن میں آٹھ دس مرتبہ لڑ نہ لیتے چین نہ ملتا۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جلتے بھی تھے۔ اور ایک دوسرے کے بغیر اداس بھی رہتے۔ عجیب بات تھی نا —؟۔

ان دنوں انجم کے اسکول میں اسے باغبانی سکھائی جا رہی تھی۔ نئے نئے پھولوں اور سبزیوں کے بارے میں بتایا جا رہا تھا کہ انھیں کب اور کس طرح بونا چاہیئے؟ کھادوں کی قسمیں دکھائی جا رہی تھیں اور ان کے ماسٹر صاحب بتا رہے تھے کہ کس قسم کی کھاد کیسی زمین کے لئے اچھی ہوتی ہے۔ اور جب انجم یہ سب کچھ پڑھ کر گھر آتا تو سب کی شامت آجاتی۔ کلن کو طرح طرح کے حکم دیئے جاتے —

"کلن! کہیں سے تم ایک ہل لا سکتے ہو؟"

"ہل — لیکن چھوٹے میاں ہل کا ہوگا کیا؟" کلن پوچھتا۔

"سامنے کی زمین جوتیں گے اور کیا کریں گے۔"

"چھ گز مربع زمین ہل سے جوتیں گے — کیسی باتیں کرتے ہیں چھوٹے میاں!"

"تمھیں کیا جو ہم کہتے ہیں وہ کرو — کل یہاں پر ہل آجانا چاہیئے — سمجھے!"

کلن مسکراتا ہوا چلا جاتا — کہ ہم کیا

سکتا تھا۔ کبھی انجم اُس سے پوچھتا۔

"۔کلن!۔میں نے سُنا ہے ککڑی بہت جلد بڑھتی ہے۔"

"ہاں چھوٹے میاں ۔۔ بہت جلدی۔"

"تو ہم پہلے ککڑیاں بوئیں گے۔ صبح کو اگر بوئیں تو شام تک تیار ہو جائیں گی نا ۔۔؟ انجم کی ان بے کار باتوں کو سُن کر کلن اپنے منھ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگتا ۔۔ پھر انجم نے ایک اور نئی بات سوچی۔

"کلن ۔۔میرے خیال میں ہم پہلے پھولوں کے پودے لگائیں ۔۔ اُن سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔"

"وہ کیسے میاں ۔۔؟"

"اماں تم تو بالکل بُدھو ہو۔ اِتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ دیکھو پہلے ہم پھول اُگائیں گے۔ اُن پر طرح طرح کی تتلیاں آئیں گی۔ تتلیوں کے ساتھ ہی شہد کی مکھیاں بھی آئیں گی ۔۔تتلیوں کو پکڑ کر اور پھر البموں میں چپکا کر۔ وہ سب ہمیں بیچ دیں گے۔ شہد کی مکھیوں کا پیچھا کر کے معلوم کریں گے کہ وہ اپنے چھتے کہاں بناتی ہیں۔ جب یہ معلوم ہو جائے گا تو وہ شہد نکال کر بوتلوں میں بھر لیں گے، اور پھر البموں کی طرح اُسے بھی بیچ دیں گے ۔۔کیوں کیسی رہی ۔۔؟"

"لیکن چھوٹے میاں ۔۔ شہد کے چھتے کا موسم بھی تو بنتا ہے ۔۔" کلن نے ہنس کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کیسے بنتا ہے، ویسے ہمیں اتنی لالچ بھی نہیں کرنی چاہیے ۔۔" انجم نے جواب دیا ۔۔

جب تک برسات گزر نہ گئی، شیخ چلی جیسی باتیں ہوتی رہیں۔ سب ہنستے اور ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ۔۔ برسات سے پہلے آموں کا بہت زور تھا۔ اِس سال زرا آندھیاں کم آئی تھیں، اس لئے آم بازار میں بہت سستے بک رہے تھے۔ انجم کے ابا بھی بہت سارے آم گھر میں لے آیا کرتے ۔۔ انجم تو آموں پر اپنا دم دیتا تھا، چاہے کھٹے ہی کیوں نہ ہوں، مگر آم ضرور ہوں۔

ثروت تو اس موقع کی تلاش میں تھی ہی۔ جھٹ سے جا کر اُس نے امی کے کان بھر دیئے اور امی نے انجم کی اچھی طرح خبر لی۔ انجم کا بس چلتا تو ثروت کو کچا کھا جاتا ۔۔ دوسرے ثروت اب اپنی گڑیوں اور کتابوں کو اپنی الماری

ہی میں رکھتی تھی۔ الماری کے باہر اتنا بڑا تالا لگا رہتا تھا۔ ورنہ انجم یقیناً اُس دن وہ سب گڑیاں نوچ کر پھینک دیتا اور کتابوں کے کاغذوں میں ڈورا باندھ کر پتنگ کی طرح اُنھیں اُڑاتا — لیکن اس وقت وہ بیچارا مجبور تھا۔

کافی دن گزر جانے کے بعد انجم اور ثروت میں صلح ہوگئی۔ اور دونوں پھر وہی باغبانی کی باتیں کرنے لگے۔ انجم نے ثروت کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی تھی کہ وہ بھی اب اس کام میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ میرٹھ کی سرولی مشہور ہوتی ہے، اور انجم کو صرف یہی آم پسند تھا۔ ایک مرتبہ نالی کے پاس ہی اس نے آم کی ایک خراب سی گٹھلی کو پھوٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اُسے یقین ہوگیا تھا کہ اگر سرولی آم کی گٹھلیوں کو احتیاط کے ساتھ بویا جائے تو وہ سب کی سب زمین میں سے پھوٹ آئیں گی۔

ثروت بھی راضی ہوگئی آخرکار انجم نے اس چھ گز مربع زمین میں آم بونے کا ارادہ کر لیا۔ دونوں سرولی آموں کی گٹھلیاں آہستہ آہستہ جمع کرتے رہے اور پھر ایک دن گٹھلیوں سے جب انجم کے جوتے کا خالی ڈبہ بالکل بھر گیا تو دونوں ان گٹھلیوں کو زمین میں بونے کے لئے اُس جگہ پہنچ گئے۔

پہلے انجم نے کھرپے سے زمین کو گودا — تھوڑا سا پانی دیا۔ اور پھر ایک ایک کرکے تمام گٹھلیاں وہاں بوئیں۔ کھاد حاصل کرنا زرا مشکل کام تھا وہ اس طرح آسان ہوا کہ گھر کے پچھواڑے جمّو چاچا کے بیل بندھتے تھے، اُن کا گوبر دونوں اٹھا لاتے اور ماسٹر صاحب کے بتائے ہوئے طریقے سے اُسے کھاد بنا کر زمین میں ڈالتے رہتے۔

دونوں بے حد محنت کر رہے تھے۔ اور اس محنت ہی کا اثر تھا کہ چند دنوں بعد سب کی سب گٹھلیاں پھوٹ آئیں۔ اس وقت انجم کی خوشی کوئی دیکھتا، جوں جوں پودا بڑھتا جاتا توں توں انجم کا دل بھی بڑھتا جاتا تھا، اور جب یہ پودا چھے انچ لمبا ہوگیا تو انجم نے ثروت سے کہا:-

"ثرو — تو نے دیکھا — اب چند ہی دنوں میں یہ پودا بڑھتے بڑھتے پورا درخت بن جائے گا۔ اس میں سرولی آم لگیں گے۔ اور سب کے مزے آ جائیں گے۔"

"ہاں جی بھیا —" ثروت بولی "اب ہم امّی کی خوشامد نہیں کریں گے کہ وہ ہمیں آم دیں — ہمارے پیڑوں میں آم آپ ہی

آجائیں گے تو دوسروں سے مانگنے کی ہمیں کیا ضرورت ۔۔۔؟"

"اور نہیں تو کیا ۔۔۔ یہ اچھا بھی تو نہیں لگتا کہ ہر وقت فقیر کی طرح امّی کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں ۔۔۔ تم دیکھ لینا اب امّی اور ابّا خود ہی ہم سے کہیں گے ۔۔۔

"انجم بیٹے ۔۔۔ ہمیں دس آم تو دے دو۔"

"اور پھر ہم کہیں گے، ابّا جی زیادہ آم نہیں کھانے چاہئیں، گرمی ہو جاتی ہے، چہرے پر پھنسیاں نکل آتی ہیں ۔۔۔" انجم نے منھ بنا کر کہا اور ثروت نے زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

"یہ بات سن کر ابّا پھر کتنے شرمائیں گے جگی بھیّا ۔۔۔؟"

"میں روزانہ بیس آم کھایا کروں گا ۔۔۔" انجم بولے۔

"اور میں چالیس ۔۔۔" ثروت نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"کیوں تم اتنے کیوں کھاؤ گی ۔۔۔ جب میں بیس لوں گا تو تجھے بھی بیس ہی دوں گا۔" انجم نے بنیوں جیسی بات کہی۔

"واہ ۔۔۔ اگر تم رات کو سوتے سے اٹھ اٹھ کر کھاتے رہے تو پھر میں کیا کروں گی ۔۔۔ تم تو بندروں کی طرح پیڑوں پر چڑھ جاتے ہو، میں تو نہیں چڑھ سکتی۔ مجھے یقین ہے تم ضرور چھپ چھپ کر کھاتے رہوگے اور مجھے پتہ بھی نہیں چلے گا ۔ میں تو چالیس آم ہی لیا کروں گی ۔۔۔" ثروت نے ٹھنک کر کہا۔

"مجھ پر الزام لگاتی ہے؟ ۔۔۔ انجم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔۔۔ "گدھی کہیں کی ۔۔۔ سمجھتی ہے کہ میں چور ہوں ۔۔۔ میں بھی دیکھوں گا کہ تو کس طرح چالیس آم کھائے گی!"

"میں تو ضرور اتنے ہی آم لوں گی ۔۔۔ دیکھ لینا ۔۔۔" ثروت کو بھی ضد سوار ہو گئی۔

"کہہ تو کہ نہیں لوں گی ۔۔۔" انجم نے ہاتھ مروڑا۔

لیکن ثروت برابر انکار کرتی رہی۔ انجم نے ہاتھ اتنا مروڑا کہ ثروت بے چاری دُہری ہو گئی۔ پھر ثروت نے جھک کر انجم کے ہاتھ پر کاٹ کھایا ۔۔۔ اور انجم نے "ٹکلنی کتیا" کہہ کر اب جو اس پر گھونسے برسائے ہیں، تو بس توبہ ہی بھلی ۔۔۔ "دھموں دھموں" ۔۔۔ "ہائے مری ۔۔۔ مجھے مار ڈالا" کی آوازیں سن کر [illegible] اور ابّا اندر

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

خالد صدیقی

اپنے گھر میں باغ لگائیے

باغ میں لگے ہوئے رنگ برنگے پھول کتنے بھلے لگتے ہیں۔ جب صبح کے وقت ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اِن خوبصورت پھولوں سے ٹکراتے ہیں تو ساری فضا بھینی بھینی خوشبو سے مہکنے لگتی ہے اور ننھی ننھی تتلیاں مزے میں آکر اِن پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں رس چوسنے کے لئے اِن پھولوں کی طرف لپکتی ہیں۔ اور ہم تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

آپ نے کوٹھیوں، بنگلوں اور مکانوں کے سامنے باغ بغیچے دیکھے ہوں گے۔ لیکن یہ باغ خود بخود نہیں پیدا ہوتے بلکہ یہ ہماری محنت کا پھل ہیں۔ اگر آپ بھی خوبصورت پھولوں سے اپنے گھر کا آنگن اور اپنے اسکول کو سجانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو کچھ محنت کرنی ہوگی۔ اسی کو ہم باغبانی کہتے ہیں۔

بعض بچوں کو خوبصورت پودے لگانے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے پودے لگاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ پودے مرجھا بھی جاتے ہیں۔ تب ان کو بڑا افسوس ہوتا ہے۔ جب بچے باغبانی سے زیادہ واقف نہیں ہوتے پودے اسی لئے مرجھا جاتے ہیں۔ یہ بچے نہیں جانتے کہ

کو کیسی زمین میں لگانا چاہیئے ۔ اور نہ وہ پودے کو اس کی ضرورت کے مطابق پانی دیتے ہیں ۔

پودوں کے لئے زمین کا نرم ہونا ضروری ہے کیونکہ چھوٹے چھوٹے پودے کڑی اور پتھریلی زمین سے غذا نہیں کھینچ سکتے ۔ پانی بھی بہت ضروری ہے ۔ پودے جڑوں کے ذریعے مٹی سے پانی حاصل کرتے ہیں ۔ اور اپنی بوندیوں کے ذریعے اسے پتیوں تک پہنچاتے ہیں ۔ جہاں سے یہ بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے ۔ اس طرح گرمی کے دنوں میں پودے محفوظ رہتے ہیں ۔ اس لئے پودوں کو مناسب مقدار میں پانی دینا بہت ضروری ہے ۔ زیادہ پانی بھی پودے کو نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ اس سے اس کی جڑیں سڑ جاتی ہیں ۔

پودے کے لئے سورج کی روشنی بھی اتنی ہی ضروری ہے، انسان کے جسم کی طرح پودے بھی روشنی میں پرورش پاتے ہیں ۔

باغبانی کے لئے سب سے اچھا موسم برسات کا ہے ۔ لیکن [illegible] کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے موسم میں باغبانی نہیں ہو سکتی ۔ پھولوں کی مختلف قسموں کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ باغبانی کے لئے کسی خاص موسم کی [illegible] کیونکہ کچھ پھول صرف برسات میں اپنی چھبن دکھلاتے ہیں، تو کچھ جاڑوں اور گرمیوں میں ۔ برسات کا موسم صرف سینچائی کے خیال سے اچھا ہوتا ہے کیونکہ اس موسم میں پودوں کو پانی دینے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ زمین نرم ہو جاتی ہے، اس لئے مٹی بھی آسانی سے گوڑی جا سکتی ہے ۔ برسات میں ہمیں جنگلی گھاس پھوس کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے ۔ جو پودوں کے ارد گرد اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کو جڑ سمیت اکھاڑ کر پھینک دیجئے کیونکہ زمین میں اس کی جڑ رہ جائے گی تو اس کے دوبارہ پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے ۔

باغبانی کا سلسلہ تفریح کے ساتھ ساتھ فائدے مند بھی ہے ۔ آپ اپنے گھر کے سامنے ایک خوبصورت باغ لگا سکتے ہیں ۔ جس سے آپ کو صاف ہوا ملے گی ۔ شہروں میں گنجان آبادی کی وجہ سے لوگوں کو صاف ہوا نہیں ملتی ۔ لیکن ہم اپنے گھر کے سامنے ایک باغ لگا کر صاف ہوا کا انتظام کر سکتے ہیں ۔ اور اپنے گھروں کو پھولوں سے سجا سکتے ہیں ۔ اچھے اچھے ہار بنا کر پہن سکتے ہیں ۔ آپ اپنے اس باغ میں اپنی کتابیں پڑھ سکتے ہیں ۔ باغبانی کے کام میں ہماری ورزش بھی ہو جاتی ہے ۔ اور ہم تھکے [illegible]

انجم ہاشمی رانچی

پہلا انعام

آم کی کہانی اُسی کی زبانی

فروز باغ سارے شہر میں اس لئے مشہور ہے کہ وہاں طرح طرح کے آم پیدا ہوتے ہیں ایک سے ایک عمدہ قلمی، لنگڑا، ثمر بہشت، سفیدہ اور نہ جانے کتنی قسم کے آموں کے پیڑ ہیں۔

باغ کے ایک کونے میں ایک خوبصورت قلمی آم کا پیڑ تھا۔ آم بھی عمدہ تھے۔ اور پیڑ بھی خوبصورت اس لئے مالی اس کی بہت دیکھ بھال کرتے تھے۔

فروری کے آخر میں پیڑوں میں بور آنا شروع ہو گیا۔ بھینی بھینی خوشبو سے سارا باغ مہک اُٹھا۔ مالی اپنی محنت کا اتنا اچھا پھل دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ چند ہفتوں کے بعد بوروں میں چھوٹی چھوٹی کیریاں دکھائی دینے لگیں۔ ان چھوٹی چھوٹی کیریوں میں اس کونے والے پیڑ کی ایک ٹہنی پر میں بھی اپنے بچپن کا زمانہ ہنسی خوشی گذار رہا تھا۔ میں اپنے حال میں اتنا مست تھا کہ مجھے دنیا کی کسی تکلیف یا مصیبت کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں تو بس یہی سمجھتا تھا کہ ساری دنیا میری طرح سے خوش ہے۔ یہ میں نے سُن رکھا تھا کہ آم پھلوں کا بادشاہ ہے۔ میں اپنی اس بڑائی پر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، ٹھنڈی ہوا میٹھی نیند سُلاتی اور سورج کی روشنی سے تو میری

تندرستی اور طاقت بڑھتی ۔ مالی دن میں دو بار پانی دیتا۔ اور اس طرح سے میں ساری دنیا سے بے خبر اپنے والدین اور دوستوں کے ساتھ مزے میں بڑھ رہا تھا ۔ میں جانتا نہ تھا کہ تکلیف کسے کہتے ہیں ۔
ہماری زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی ۔
میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا ۔ اس طرح ہنستے کھیلتے ہماری زندگی کے دن گزر رہے تھے ۔

میں اب بڑا ہو گیا تھا ۔ میرا ہرا رنگ اور بھرا بھرا جسم دیکھ کر میرے ساتھی مجھ سے جلا کرتے تھے ۔ اور مجھے اپنی خوبصورتی پر اتنا ناز تھا کہ مارے غرور کے کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا تھا ۔

میرے دل میں ذرا سی دیر کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ میری زندگی سدا ایسی نہ رہے گی ۔ اور مجھے ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا ۔
ایک دن کچھ لڑکے باغ میں آئے اور میرے چند ساتھیوں کو میرے پاس سے لے گئے ۔ اب میں اپنی ڈال پر اکیلا رہ گیا تھا ۔ اسی لئے میں نے ہنسنا بولنا بھی چھوڑ دیا تھا ۔ اور اس غم میں میرا رنگ پیلا پڑنے لگا ۔ مجھے اپنے ساتھیوں کے چلے جانے کا رنج تھا ۔

ایک دن مالی نے مجھے بھی ڈال سے توڑ لیا ۔ اس کا مجھے بہت رنج ہوا ۔ اب میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا ۔ میرے والدین بہن ، بھائی ، دوست اور عزیز چھوٹ گئے تھے ۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ ابھی اور بھی مصیبتوں کا سامنا کرنا ہے ۔ مالی نے پیڑ سے توڑ کر مجھے ایک بڑی ڈلیا میں دوسرے آموں کے ساتھ رکھ دیا ۔ اور ایک آدمی کے پاس گیا ۔ وہ ہمیں بازار لے گیا ۔ یہاں پر آموں کے اور بھی ٹوکرے تھے ۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی آیا اس کے ساتھ ایک بہت پیارا بچہ تھا ۔ اس آدمی نے کچھ آم خریدے ان میں میں بھی تھا ۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا ۔ اس نے ہمیں ایک نرم بستر پر لٹا دیا —— اوپر سے ایک کپڑا ڈال دیا ۔ اب مجھے کچھ سکون ملا ، میں پچھلی باتوں کو یاد کرتا اور روتا ، اسی غم میں گھلنے لگا ، میرا گوشت اور میری کھال بھی نرم پڑنے لگی ۔ کچھ دن بعد اس آدمی نے ہم سب پر ایک نظر ڈالی اور آہستہ آہستہ ہم سب پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔ جب میرے اوپر ہاتھ رکھ کر دبایا تو میں درد سے چیخ اٹھا ۔ لیکن اس آدمی نے کوئی پرواہ نہ کی ۔ اور

مجھے نکال لایا - میرے ساتھ کچھ اور آموں کو بھی نکالا اور پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی میں ڈال دیا - میرے جسم میں بے حد درد ہو رہا تھا - نہانے سے کچھ سکون ملا - تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے مجھے کاٹ ڈالا - جس وقت وہ مجھے کاٹ رہا تھا میں درد سے چیخیں مار رہا تھا - لیکن اس نے میری چیخوں پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا اور اطمینان سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے بڑے شوق سے کھایا میری کھال نوچی اور میری ہڈی کو چوسا - اس وقت تکلیف بیان سے باہر تھی - لیکن افسوس! اس آدمی کے پاس سے رحم تو چھو کر بھی نہیں گیا تھا - جب ان لوگوں نے خوب اچھی طرح سے میرا گوشت کھا لیا تب میری کھال اور ہڈیوں کو کوڑے پر پھینک دیا - جسے پھر بھنگی اٹھا کرلے گیا - بھنگی نے مجھے ایک میدان میں دور لے جا کر ڈال دیا. وہاں پر ایک بکری آئی اور اس نے میری کھال کا تو صفایا کر دیا - اب بس ہڈی باقی رہ گئی -

جب کبھی مجھے اپنی پچھلی حالت یاد آجاتی تو میرا بُرا حال ہوتا - کچھ دن بعد بارش ہوئی اور ایک چھوٹی سی شاخ میرے اوپر پھوٹ آئی. اب کئی سال گزر چکے ہیں اور میں بھی ایک بڑا درخت بن گیا ہوں - اب جب میں اپنے بچوں کو پھلتے پھولتے دیکھتا ہوں تو خوشی سے جھومنے لگتا ہوں اور دعا مانگتا ہوں کہ خدا میری نسل کو زیادہ بڑھائے -

اب میری مانگ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی بہت زیادہ ہے - اور اس ترقی پر خدا کا شکر بجا لیتا ہوں -

---

بقیہ سالگرہ کا تحفہ

کہ وہی گلاب جس میں کل تک صرف پتے ہی پتے نظر آرہے تھے آج بڑی شان سے اپنے سر پر ایک خوبصورت بڑا سا تیز سُرخ رنگ کا پھول لئے مسکرا رہا تھا -

میں نے دوڑ کر اُسے چوم لیا اور میرے منہ سے نکلا "سالگرہ کا تحفہ" - اور میں گھر میں یہ خوش خبری سُنانے پہنچی - انجم نے پوچھا "ارے کس کی سالگرہ کا تحفہ؟ کس نے دیا ہے؟"

میں خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی پھر میں نے کہا دیکھو میرے گلاب کی سالگرہ کا کیسا اچھا ہے یہ تحفہ -

محمد شمیم جیراجپوری

دوسرا انعام

بیج کی کہانی
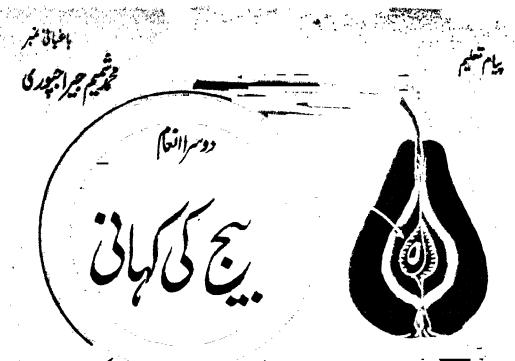
ہم کسی پیڑ کا خاندان دو طریقے سے بڑھا سکتے ہیں ۔ بیج سے یا پیڑ کے کسی حصے سے ۔ بیج سے ہم کو اپنی زندگی میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ بہت سے پیڑوں کے بیج کھائے جاتے ہیں اور بعض بیج دوا کے کام آتے ہیں ۔

ہم ان بیجوں سے اس پیڑ کا خاندان بڑھا سکتے ہیں ۔

آج آپ کو یہہ بتائیں کہ بیج میں کتنے حصے ہوتے ہیں اور اس کے اُگنے کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے ۔

آیئے سیم کے بیج کا غور سے مطالعہ کریں سیم کا بیج ایک مضبوط کالے خول کے اندر ہوتا ہے جس کو چھلکا کہتے ہیں ۔ اگر ہم دیر تک سیم کے بیج کو پانی میں رکھیں تو چھلکا نرم پڑ کر اُتر جائے گا ۔ اور ہمیں دو دالیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی نظر آئیں گی ۔ یہ دالیں پودے کے لئے بڑے کام کی ہوتی ہیں ۔ جب تک پودا زمین سے غذا حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا ' ان ہی دالوں سے غذا حاصل کرتا ہے ۔ یہ دالیں مختلف بیجوں میں مختلف ہوتی ہیں ۔ کسی میں ایک کسی میں دو ۔

آپ نے دیکھا کہ سیم کا بیج کیسا ہوتا ہے ۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ بیج کے اُگنے میں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اور اگر وہ چیزیں نہ ملیں تو بیج نہ اُگے ۔

بیج کے جمنے کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ نمی، ہوا، اور مناسب حرارت ۔

عمل ۱۔ ایک بڑے اور کھلے برتن میں آدھا پانی بھر لیجئے ۔ اس میں شیشے کی ایک چھڑ ڈالئے ۔ جس میں تین بیج بندھے ہوں ۔ ایک بیج ہوا میں رہے دوسرا آدھا پانی میں اور آدھا ہوا میں، تیسرا بالکل پانی میں ۔ اس برتن کو مناسب حرارت میں رکھ دیجئے کچھ دن بعد جب آپ اس کی جانچ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ وہی بیج جم رہا ہے جو آدھا ہوا اور آدھا پانی میں تھا ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیج کے جمنے کے لئے نمی، ہوا اور مناسب حرارت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگر اس میں سے کسی کی بھی کمی ہوئی تو بیج نہیں اُگ سکتا ۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ بیج کیسے بویا جانا چاہیئے اور پھر اُگنے کے بعد کس طرح اس کی دیکھ بھال کرنی چاہیئے ۔

بیج بوتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر بیج آدھ انچ گول ہے تو اُس کو زمین میں ڈیڑھ انچ گہرے میں بونا چاہیئے ۔

بونے کے بعد اگر اس کو پانی کی ضرورت پڑے تو کچھ پانی بھی دیجئے ۔ کچھ ہی دن میں آپ کو کیاریوں میں نئی نئی کونپلیں نظر آئیں گی ۔ وجہ یہ ہے کہ جب بیج کو ہوا، نمی اور مناسب حرارت ملتی ہے تو اس کے اندر ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور اس میں زندگی دوڑنے لگتی ہے ۔ دھیرے دھیرے وہ بڑھنے لگتا ہے ۔ اس درمیان میں وہ بیج کی دالوں سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے ۔

اس طرح بڑھتے بڑھتے وہ ایک پودا بن جاتا ہے ۔ پھر جب پھول کا زمانہ ہوتا ہے تو اس میں پھول آتے ہیں ۔ اور پھول سے پھل بنتا ہے اور پھر پھل کے اندر سے بیج بنتا ہے ۔ اور اُسی طرح اُس کی زندگی چکر لگاتی رہتی ہے ۔

تیسرا انعام

سبزی کا باغ لگائیے

سید شبیر علی برہانپور

دیکھئے ہر ایک کی پسند الگ الگ ہوتی ہے ۔ ان پھلوں ہی میں لیجئے کسی کو موسمبی پسند ہے، تو کسی کو سنگترہ پسند ہے ۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مجھے کیلے اچھے لگتے ہیں، اور دیکھئے گرمیوں کے پھلوں میں کوئی تربوز پسند کرتا ہے تو کوئی خربوزے پر جان چھڑکتا ہے ۔

جہاں تک سبزی کا تعلق ہے سبزیوں میں بھی لوگوں کی پسند الگ الگ ہوتی ہے ۔ خیر یہ سب ٹھیک ہے ۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ سب سبزیاں اُگتی کیسے ہیں ۔ اگر آپ کو سبزیاں پسند ہیں اور آپ کھانا چاہتے ہیں، تو لیجئے میں آپ کو گھر بیٹھے سبزیاں حاصل کرنے کے طریقے بتاتا ہوں، جس سے کہ آپ اپنے اپنے آنگن میں سبزی کے باغ لگا سکتے ہیں ۔ جب جی چاہے سبزیاں پکا سکتے ہیں ۔ ہاں

تو دیکھئے سبزی کا باغ لگاتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیئے ۔

زمین تین طرح کی ہوتی ہے ۔ کالی، پیلی اور ریتیلی ۔ لیکن ان تینوں قسم کی زمین سے ملی جلی ایک اور زمین ہوتی ہے جسے دومٹ کہتے ہیں ۔ اسی میں ترکاری بھلی جاتی ہے ۔ سبزی کے لئے زمین کی بڑی اہمیت ہے ۔

زمین تیار کرتے وقت اس کو اچھی طرح سے

گوڑنا چاہیئے۔ اور ساری گھاس اور پتے باہر پھینک دینے چاہئیں۔ تاکہ کیاری خوب اچھی طرح صاف ہو جائے اور پھر کوڑا کرکٹ بڑھنے میں رکاوٹ نہ بنے جب کیاری صاف ہو جائے تو اس میں کھاد ڈالنی چاہیئے۔ سبزیوں کو مرغیوں اور بکریوں وغیرہ سے بچانے کے لئے باڑھ لگا دینی چاہیئے۔ یہ باڑھ آپ کانٹوں کی بھی بنا سکتے ہیں۔ اگر باغ کے باہر ذرا اونچائی پر کنواں یا نل ہو تو وہاں سے آبپاشی کے لئے ایک بڑی سی نالی بنا لیجئے۔ اور اس بڑی نالی سے ہر کیاری کے لئے چھوٹی چھوٹی نالیاں پانی دینے کے لئے بنا سکتے ہیں۔ پھر آپ مختلف شکلوں کی کیاریاں بنا لیجئے۔ مثلاً چوکور، گول، مثلث، مستطیل جس میں بھی آپ کو سہولت ہو۔

سبزیوں کو قطاروں میں بونا چاہیئے۔ اس سے گوڑائی میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ اور ہر پودے کو دھوپ بھی اچھی طرح ملتی ہے۔

باڑھ بناتے وقت آپ چاہیں تو اس کے اندر ایک چوڑا راستہ بھی بنا لیجئے۔ اس کے کنارے آپ پھولوں اور پھلوں کے پودے بھی بو سکتے ہیں۔ جیسے لیمو، سنترہ، آڑو اور کیلے وغیرہ۔ آپ جو باڑھ بنائیں اس میں ایک چھوٹا سا راستہ بنا لیجئے، تاکہ پانی دینے میں، آنے جانے میں آسانی ہو۔ اس طرح آپ کا سبزی کا باغ تیار ہو گیا۔

اب آپ مختلف موسموں کے لحاظ سے مختلف سبزیاں بوئیے۔ اور خوب مزے میں ڈٹ کر کھائیے۔

بچّوں نے اک باغ لگایا
باغ کو اپنے خوب سجایا

کرتے کام وہ باری باری
پود لگاتے کیاری کیاری

روز خبر وہ اس کی لیتے
وقت پہ کھاد اور پانی دیتے

رنگ برنگے پھول مہکتے
آ کے پرندے اُن پہ چہکتے

پھل بھی میٹھے میٹھے آتے
پھل بھی وہ جو سب کو بھاتے

جو بھی بچہ محنت کرتا
وقت مزے سے اُس کا گزرتا

ترکاری بھی اس میں لگائی سویا ، پالک ، چولائی
ترکاری تیار ہوئی جب شاد یہ سارے یار ہوئے تب
ترکاری چھبے میں لگا کر چھبیا یہ بازار میں لا کر
بچے یہ آواز لگاتے سن کر جس کو گاہک آتے

آؤ بھائی ، آؤ بھائی
ترکاری لے جاؤ بھائی

تازہ کھیت سے آئی ہے یہ سب کو دل سے بھائی ہے یہ
سستی ہے یہ اچھی ہے یہ بات ہماری سچی ہے یہ
ہر اک سبزی ہری ہری ہے مولی ہے یا سبز پری ہے
گاجر کا اترانا دیکھو اودا پیلا بانا دیکھو
شلجم اور ٹماٹر کھاؤ میتھی سیم مٹر لے جاؤ
گھیا ، توری ، بھنڈی اور گوبھی کھیرا ، ککڑی ، آلو ، اروی
پیاز بھی ہے اور دھنیا بھی ہے ادرک اور پودینا بھی ہے

آؤ بھائی . آؤ بھائی
ترکاری لے جاؤ بھائی

ترکاری گر کھاؤ گے تم تن میں خون بڑھاؤ گے تم
جسم میں طاقت آ جائے گی صحت بھی منہ دکھلائے گی
پھرتی سے ہر کام کرو گے جگ میں روشن نام کرو گے

آؤ آؤ آؤ بھائی
ترکاری لے جاؤ بھائی

تم بھی ایسا باغ لگانا کام یہ نیئر کر دکھلاتا

کیڑے مکوڑے کھانے والے پودے

محسن حامد بی ایس سی علیگ

"جی کیا کہا! پودے اور کیڑے مکوڑے کھائیں!"

شاید آپ تعجب میں پڑ گئے ہوں گے۔ لیکن یہ سچ ہے۔ آیئے آج ہم آپ کو ایسے ہی پودوں کے متعلق کچھ بتائیں۔ لیکن ہاں، ان کا حال پڑھنے سے پہلے تھوڑا سا حال پودوں کے غذا حاصل کرنے کا بھی پڑھ لیجیے، تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ پودے کیڑے مکوڑے کھانے پر کیوں مجبور ہو جاتے ہیں ——— یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تمام پودوں کی پرورش کے لئے، پانی، کاربن ڈائی آکسائڈ، نائٹروجن اور روشنی بہت ضروری چیزیں ہیں۔ پانی اور روشنی کو تو ہم سب خوب جانتے ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ اور نائٹروجن دو گیسوں کا نام ہے جو ہوا میں ہوتی ہیں۔ یہ گیسیں پودے کی پرورش کے لئے ضروری ہیں۔ پانی، روشنی اور ان گیسوں کی مدد سے پودا اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ ان میں سے کسی چیز کی بھی کمی ہو تو پودے اچھی طرح نہیں بڑھ سکتے۔ اسی لئے قدرت نے پودوں کو یہ صلاحیت دے دی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی غذا حاصل کر سکیں۔ مثال کے

طور پر ان پودوں کو ہی لے لیجئے جو ریگستانوں میں
اُگتے ہیں۔ وہاں پودوں کی لمبی لمبی جڑیں زمین
میں بہت نیچے تک چلی جاتی ہیں تاکہ وہ پانی
حاصل کرسکیں۔ پانی میں اُگنے والے پودوں کی
جڑیں بہت چھوٹی یا بالکل نہیں ہوتیں کیونکہ
ان کو تو ویسے ہی پانی کافی مل جاتا ہے۔ پانی
کی طرح پودوں کو بڑھنے کے لئے نائٹروجن کی بھی
ضرورت ہوتی ہے۔ یہ گیس یوں تو ہوا میں بھی
موجود ہے لیکن پودوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے
کہ وہ اس گیس کو ہوا سے حاصل کرکے اپنے مصرف
میں لاسکیں۔ عام طور سے پودے نائٹروجن
زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ نائٹریٹ یا کھاد کا
نام تو آپ نے ضرور سُنا ہوگا۔ بس یہی کھاد
اِن کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ پودے اپنی
جڑوں کی مدد سے نائٹروجن کو حاصل کرتے ہیں
جو زمین میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن چند جگہوں کی
زمین میں نائٹریٹ کی مقدار پودوں کے بڑھنے
کے لئے کم ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر بیچارے
پودوں کو عجیب عجیب حرکتیں کرنی پڑتی ہیں۔
تاکہ وہ زندہ رہ سکیں۔ اور وہ اس بات پر
مجبور ہو جاتے ہیں کہ نائٹروجن کو کیڑے مکوڑوں
کے جسم سے حاصل کیا جائے۔ انگریزی میں ان
پودوں کو کارنی ورس۔ CARNIVOROUS
PLANT کہتے ہیں۔

اِس قسم کے پودے عام طور سے دلدلوں
میں پائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان جگہوں پر
نائٹروجن کی مقدار کم ہوتی ہے۔

کیڑے مکوڑے پکڑنے کے لئے ان پودوں
کو نئے نئے قسم کے ہتھیار بنانا پڑتے ہیں۔
نیچے کے مضمون میں ہم انہی کا حال لکھتے ہیں۔

پی چر پلانٹ PITCHER PLANT

اس قسم کے پودے امریکہ، ایشیا اور
بورنیو میں پائے جاتے ہیں۔ ان پودوں کی
پتیوں سے ایک صُراحی نما چیز پیدا ہوتی ہے
اس صُراحی کے اوپر ایک ڈھکن ہوتا ہے۔
عام طور سے صُراحی کا ڈھکن اور صُراحی کا منہ
بڑا خوبصورت اور کیڑوں کے دل کو لُبھانے
والا ہوتا ہے۔ میاں کیڑے پودے کی اس
چالاکی کو تو سمجھتے نہیں اور طرح طرح کے رنگ
کو دیکھ کر اس پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن
اِدھر وہ صُراحی کے منہ پر آکر بیٹھے اور اُدھر
فوراً انھوں نے صُراحی کے اندر سرکنا شروع

ردیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ صُراحی کا مُنہ رنگین ہونے کے ساتھ ساتھ چکنا بھی کافی ہوتا ہے اسی لئے جب کیڑے صاحب گنگناتے ہوئے اس پر آکر بیٹھتے ہیں تو پھسلتے ہوئے صُراحی کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور بس بیچارے ہوگئے گرفتار۔ اب لاکھ ہاتھ پاؤں ماریں مگر بے کار۔ کیونکہ صُراحی کے مُنہ کے نیچے بہت سے بال اُگے ہوتے ہیں جو ان کو اوپر چڑھنے نہیں دیتے۔ صُراحی کے پیندے میں ایک خاص قسم کا لُعاب ہوتا ہے اور کیڑے صاحب آہستہ آہستہ اسی میں گھل جاتے ہیں۔ اور بچارے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

VENUS FLY TRAP

چوہوں کو پنجرے میں پکڑتے ہوئے تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ لیکن یہ شاید کبھی سُنا بھی نہ ہو کہ ٹھیک اسی طرح پودے بھی کیڑوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ ان پودوں کو انگریزی میں VENUS FLY TRAP کہتے ہیں۔

پِچر پلانٹس کی طرح یہاں بھی پتیوں کی نوک پر ایک انوکھی چیز ہوتی ہے جو چوہے دان سے مشابہ ہوتی ہے۔ ہر چوہے دان نما پھندے میں دو حصے ہوتے ہیں۔ ہر پھندے کے سرے پر بہت سے بال اُگے ہوتے ہیں۔ اور اس کے بیچوں بیچ ایک لال رنگ کا لُعاب ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے چوہے دان میں کوئی ڈبل روٹی کا ٹکڑا رکھ دے۔ شروع میں یہ کیڑے پکڑنے کا پنجرہ کھُلا ہوا ہوتا ہے۔ جوں ہی کیڑا اس پر آکر بیٹھتا ہے اِن دونوں حصّوں کے مُنہ بند ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نادان کیڑا بھی اِس کے اندر بند ہو جاتا ہے ۔۔۔ اب میاں پودے ایک تیزاب کی مدد سے کیڑے کو ہضم کرنا شروع کرتے ہیں اور اس طرح وہ نائٹروجن جو اُن کو زمین سے نہیں ملی تھی اس طرح غریب کیڑے کو کھاکر حاصل کرتے ہیں۔ عام طور سے ایک کیڑا ایک پودے کے لئے کئی دن کو کافی ہوتا ہے۔ جب وہ کیڑے کے جسم سے اچھی طرح غذا حاصل کر لیتے ہیں تو پنجرہ پھر کھل جاتا ہے اور کیڑے کے بچے کُچھے حصے کو باہر پھینک دیتا ہے۔

" SUN DEW

بھئی یہ پودا تو انسان کے بھی بڑے کام

کی چیز ہے ۔ ہر پودا سینکڑوں اور ہزاروں مکھیوں کو بیک وقت پکڑ سکتا ہے ۔اس لئے بنگال میں تو کسان اس کو اپنے گھروں میں اُگاتے ہیں کہ ذرا مکھیوں اور کیڑوں سے نجات مل جائے ۔ اس کی پتیاں خوب بڑی بڑی اور پھیلی ہوئی ہوتی ہیں ۔ ہر پتی کے اوپر تقریباً دو سو بال ہوتے ہیں اور ہر بال کی نوک پر شبنم کے قطرے کی طرح ایک قطرہ کسی میٹھی چیز کا ہوتا ہے ۔ یہ قطرہ بال کی نوک پر بالکل اسی طرح معلوم ہوتا ہے جیسے پتی پر شبنم ۔اسی لئے اس کو SUN DEW کہتے ہیں ۔ جونہی کوئی مکھی یا کیڑا لالچ میں پتی پر آکر بیٹھتا ہے اِن بالوں میں جکڑ جاتا ہے ۔ اب وہ لاکھ کوشش کرے کہ اس کے چنگل سے نکل جاؤں مگر کامیابی نہیں ہوتی ۔ یہی نہیں بلکہ پودا اس کو اپنی گرفت میں پوری طرح لانے کے لئے اپنی پتی کو بند کر لیتا ۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہم اپنی مٹھی بند کر لیں ۔ اور اس کے بعد اسکا عرق پیتا ہے ۔جب عرق ختم ہو جاتا ہے تو کیڑے کو پھینک دیا جاتا ہے ۔ اور پودا پھر کسی بے وقوف کیڑے کا انتظار کرتا ہے ۔

باغبانی پروجکٹ

احمد علی ۔ استاد مدرسہ ابتدائی

پچھلے سال مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے "باغبانی پروجکٹ" چلایا تاکہ وہ اس دلچسپ کام کے ذریعے اردو حساب اور عام سائنس کی پڑھائی اور زیادہ دلچسپ طریقے سے کرسکیں۔ حساب میں انھوں نے رقبہ، جسامت اور اکائی کا طریقہ سیکھا اور اس کی مشق کی۔ مثلاً عبدالرحمٰن کی کیاری ۱۲ فٹ لمبی اور ۱۲ فٹ چوڑی ہے۔ اس کا رقبہ کیا ہوا؟ یا جسامت میں باغبانی کا حوض ۱۰ فٹ لمبا ۸ فٹ چوڑا اور ۶ فٹ گہرا ہے۔ بتایئے اس میں کتنے مکعب فٹ پانی آتا ہے؟ اکائی میں ۱۰ سیر شلجم کی قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ہے تو شلجم کتنے روپیہ میں بکا؟

عام سائنس کی معلومات بھی باغبانی کے ذریعے بڑھتی ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ پودے اپنی نسل کس طرح بڑھاتے ہیں۔ اس عنوان پر نسیم اختر نے سب سے اچھا مضمون لکھا۔ یہ آپ بھی پڑھیے:۔

پودوں کی نسل

پودوں کی نسل ہمارے آپ کے بونے سے تو بڑھتی ہی ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو پودے ہمیشہ ہمارے محتاج نہیں رہتے۔ وہ ہماری مدد کے بغیر

بھی اُگتے ہیں۔ اس کام میں ہوا، پانی اور پرندے
ان کی مدد کرتے ہیں۔ آپ کہیں گے وہ کیسے؟

آپ جانتے ہیں کہ جب ہوا چلتی ہے تو وہ
کبھی کبھی بڑے بڑے پیڑ پودوں کو بھی اُکھاڑ کر
پھینک دیتی ہے۔ پھر سوچئے کہ یہ ننھے منّے بیج
کس گنتی میں ہیں۔ یہ تو ہوا کے ایک ہی جھونکے میں
کہیں سے کہیں پہنچتے ہیں۔۔۔
مثلاً آکے کا بیج، اس میں
ایک بڑھیا ہوتی ہے۔
وہی بڑھیا جسے آپ ہوا
میں اُڑا کر کہتے ہیں۔
"بڑھیاری بڑھیا! ہماری
باجی سے جاکر سلام کہنا
اور باجی کے منّے کو پیار
کر دینا" جی ہاں اس بڑھیا
کے سفید سفید روئیں کے
اندر ایک بیج ہوتا ہے۔
آپ نے دیکھا ہے، یہہ بڑھیا کتنی ہلکی ہوتی ہے؟
بس اپنے روئیں کی مدد سے ہوا میں اِدھر سے اُدھر
اُڑتی پھرتی ہے، اور جب اس کے روئیں جھڑ جاتے
ہیں تو بس بیج میاں ننگے بوچے رہ جاتے ہیں۔

اور کہیں بھی گر جاتے ہیں۔ اب اگر اس زمین
میں تری ہوئی تو کیا کہنا، ان کی قسمت پلٹ گئی
اور یہہ اُگ کر دھیرے دھیرے پودے بن
گئے۔

آپ کہیں گے کہ ہوا کے ذریعے پودے کا
اُگنا تو ہم مان گئے۔ لیکن پانی کے ذریعے کیسے
اُگے گا۔ یہ لیجئے سنیے
پانی کے ذریعے اس
طرح اُگے گا کہ کوئی
پہاڑی پیڑ کا بیج بہتا
بہتا کسی میدان میں
آگیا، کھلی ہوا اور
دھوپ پا کر بس اُگ
ہی تو آیا۔ اور چند
روز بعد پودا بن کر
لہلہانے لگا۔

اب سب سے
ٹیڑھا سوال پرندوں کا ہے کہ یہ کس طرح
بیج بوتے ہیں۔ بھئی آپ مانیں یا نہ مانیں،
لیکن یہ بات سچ ہے پرندے کبھی کبھی باغبانی
کا کام کرتے ہیں۔ ہم میں اور ان میں فرق یہ ہے

کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم بیج بو رہے ہیں اور پرندے بلا سمجھے بوجھے بیج بوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بہت سے پرندے بیج کھا لیتے ہیں۔ یہ بیج جب ہضم نہیں ہوتا تو اُن کے بیٹ کرنے پر ویسے کا ویسا ہی نکل آتا ہے۔ بس زمین میں پڑنے کے بعد جہاں پانی ملا، اُگ آیا اور کچھ دنوں بعد پودا بن گیا چڑیا کو پتہ بھی نہیں چلا۔

دیکھا آپ نے کس طرح ہوا، پانی اور چڑیوں کے ذریعے کبھی کبھی پودے اُگ آتے ہیں اور ہمیں آپ کو ہاتھ بھی نہیں لگانا پڑتا۔" نسیم اختر

یہ تو تھا پودوں کی نسل کے بارے میں، اب پانی کا حال سنیئے۔ جیسے ہمارے لئے پانی ضروری ہے اُسی طرح پودوں کے لئے بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس بارے میں فہیم الدین مدنی کا مضمون پڑھیئے۔

پانی کتنا ضروری ہے

پودے کے لئے زمین اور کھاد کی طرح پانی بھی ضروری ہے۔ ہمیں اور آپ کو اگر پانی نہ ملے تو کس طرح زندہ رہیں۔ پودے بھی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ پودوں کو کھاد دیں اور پانی نہ ملے تو پودا نہیں بڑھے گا۔ پودے کی غذا پانی میں موجود رہتی ہے۔ پودے کی جڑیں اس غذا کو ہر وقت اپنے اندر کھینچتی رہتی ہیں۔

پودے کو پانی دینے کے بہت سے طریقے ہیں۔ بارش کا پانی تو پودوں کے لئے امرت کا کام کرتا ہے۔ جہاں مینھ برسا پودے لہلہانے لگے باغ میں ہر طرف ہریالی پھیل گئی۔ پودے دھل کر ہوا میں جھومنے لگے۔ اب وہ آپ کے محتاج نہیں رہے۔ قدرت نے اُن کی جڑوں میں تری پہنچانے کا انتظام کر دیا۔

لیکن برسات ختم ہوئی اور اُنھیں پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کاشتکار اس لئے اپنے کھیتوں کے پاس کنوئیں کھود لیتے ہیں اور رہٹ چلا کر پانی دیتے ہیں تاکہ اُنھیں پانی کے لئے کہیں دُور نہ جانا پڑے۔ وہ اپنی کیاریوں میں جی بھر کر پانی دے سکیں۔ نہروں سے بھی آب پاشی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ہمارے دیس میں اسی لئے اور زیادہ نہریں بنائی جا رہی ہیں تاکہ جہاں پانی کی دقت ہو، وہاں نہروں کے ذریعے پانی پہنچایا جا سکے۔

آپ نے دیکھا کہ پودوں میں پانی دینے کے لئے آدمی کتنے جتن کرتا ہے۔ اور تب کہیں ہمارے باغ اور ہماری کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ اور ہم آپ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں؟

"نعیم الدین متی"

باغبانی پروجکٹ کے لئے طلبا نے کئی نرسریاں دیکھیں اور واپس آکر اُن کا دلچسپ حال لکھا۔ سید وقار علی کا لکھا ہوا حال پڑھیئے۔

نظام الدین نرسری

ہم لاری میں بیٹھ کر نظام الدین نرسری گئے یہ ہمایوں کے مقبرے کے بالکل قریب ہے۔ نرسری دیکھنے کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ پھولوں میں کون سی کھاد پڑتی ہے۔ اور کس طرح پودوں کی پرورش ہوتی ہے۔

ماسٹر صاحب نے سب سے پہلے وہاں کے منیجر صاحب سے بات چیت کی۔ ہم نے ایک بار انھیں ایک خط بھی لکھا تھا۔ جس کا اُنہوں نے بڑے مزے کا جواب دیا تھا۔ منیجر صاحب ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے نرسری دکھانے کے لئے اپنا ایک آدمی ہمارے ساتھ کر دیا۔ سب سے پہلے یہ آدمی ہمیں وہاں لے گیا، جہاں گرمی کے پھولوں کی پَود لگی ہوئی تھی۔ پھر ہم نے ایک نالی دیکھی۔ اس میں گھاس پڑی ہوئی تھی۔ اُس آدمی سے ہم نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہاں سردی کی پَود لگی ہوئی ہے۔ اگر یہ گھاس اس میں نہ ڈالی جائے تو چڑیاں سارے بیج نکال کر کھا جائیں۔ اس طرح گھاس سے اُن کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ذرا آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مختلف کیاریوں میں طرح طرح کے پھول لگے ہوئے تھے، جو ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

اس کے بعد ہم نے چھوٹی چھوٹی کیاریاں دیکھیں ان کیاریوں کے اوپر تین تار لگے ہوئے تھے۔ یہ تار اس کام میں لائے جاتے ہیں کہ جب دھوپ بہت تیز ہو تو ان پر چٹائیاں ڈال دیں اور رات کو شبنم پڑنے کے لئے ہٹا لیں کیونکہ اُن کے لئے شبنم بہت مفید ہوتی ہے۔ ان پودوں میں پتوں کی کھاد ڈالی گئی تھی۔ پھولوں کے لئے مالی مقرر ہیں جو دن میں چار مرتبہ اپنے وقت سے پانی ڈالتے ہیں اور برابر اُن کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہم لوگ ستمبر کے مہینے میں گئے تھے۔ اس لئے نرسری میں کچھ رونق نہیں تھی۔ نرسری کے مالی

گرمی اور برسات کے پودوں کے بیج حاصل کر رہے تھے۔

اس کے بعد ہم نے چند مالیوں کو داب لگاتے دیکھا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ٹہنی کو گانٹھ کے پاس سے زرا سا کاٹ دیتے ہیں، پھر اس میں ایک چھوٹا سا تنکا رکھ کر ٹہنی کو گملے میں گاڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں سے پہلے کاٹا تھا، وہاں پر تھوڑا سا ریت ڈالنے سے اس کو اچھی طرح حرارت ملتی ہے۔ پھر اس ریت پر مٹی ڈال کر انیٹیں رکھ دیتے ہیں۔ اس پر گملا رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کو چھ مہینے تک پانی دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح داب تیار ہو جاتی ہے۔

پھر ہم ایک اور سائے دار جگہ گئے۔ یہاں بہت ٹھنڈ تھی۔ اس کے نیچے بے شمار گملے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں مختلف پھول لگے تھے۔

جب ہم سب کچھ دیکھ چکے تو منیجر صاحب کے کمرے میں گئے۔ یہاں منیجر صاحب ملے۔ ہمارے ایک ساتھی نے سوال کیا "آپ اپنے پھولوں میں کون سی کھاد ڈالتے ہیں" تو وہ بولے کہ "پتوں کی کھاد" — پھر کسی نے پوچھا کہ "آپ کے یہاں کون کون سا کام ہوتا ہے"؟ انہوں نے جواب دیا "یہاں ڈھائی سو مالی ہیں، ان میں سے کچھ تو کوٹھیوں میں پود لگاتے ہیں، کچھ ہار بناتے ہیں جو شادی شادیوں وغیرہ میں جاتے ہیں۔ سبزیوں کے بیج فروخت کرتے ہیں۔ پھلوں کے پودے بیچتے ہیں۔ داب لگاتے اور درخت فروخت کرتے ہیں۔"

ایک لڑکے نے پوچھا "کیا اس نرسری سے سرکار کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے"؟ انھوں نے کہا کہ "ہاں ہو تو جاتی ہے"۔

ایک اور لڑکے نے پوچھا کہ "کل کتنی نرسریاں ہیں؟" انھوں نے کہا "سرکاری نرسری تو یہی ہے اور ویسے لوگوں کی ذاتی نرسریاں بہت سی ہیں۔" اور یہہ سُن کر تو ہم حیرت میں پڑ گئے کہ اس نرسری سے سرکار کو ۵۰ ہزار روپے سالانہ منافع ہوتا ہے۔

پھر ہم نے منیجر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اوران سے بیج لے کر لاری میں بیٹھے اور جامعہ واپس آگئے۔

فریدہ ہاشمی

سالگرہ کا تحفہ

مجھے ہمیشہ سے پھولوں اور کیاریوں سے شوق رہا ہے۔ اسی لئے اکثر میں اپنے گھر میں موسمی پھولوں کی کیاریاں بناتی رہتی ہوں۔ آج کل بھی کئی قسم کے پھول ہمارے یہاں لگے ہوئے ہیں کئی پودے ایسے بھی ہیں جن میں اکثر پھول آتے رہتے ہیں۔ ایک گلاب کا پودا تو ایسا ہے جس کو لگے سال بھر ہو گیا۔ مگر اس میں پھول نہیں آتے۔ ایک دن میں نے سوچا کہ یہ خراب پودا ہے۔ اب اسے اُکھیڑ کر ہی پھینک دینا چاہیے۔ کیا فائدہ پھول تو آتے نہیں ہیں۔

شام کا وقت تھا۔ اپنے کام کاج سے فرصت پا کر اپنے چمن میں بیٹھ گئی، اور پودوں کو دیکھنے لگی۔ میری نظر اُس گلاب کے پودے پر پڑی۔ جس پر کبھی ایک بھی پھول نہ کھلا تھا۔

ابھی مجھے یہاں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باجوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی بارات گزر رہی ہے مگر دیکھتی کیا ہوں کہ سامنے سے چھوٹے چھوٹے بونوں کی ایک بھیڑ سی چلی جا رہی ہے۔ ان کے قد ایک فٹ سے کسی طرح زیادہ نہ تھے۔ سب کے سب رنگ برنگے کپڑے پہنے خوش و خرم چلے آ رہے تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے آگے قدم بڑھایا۔

کہ کہیں کوئی کچل نہ جائے۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی کو اپنے پاس بُلایا۔ اس کے سر پر چنبیلی کے پھولوں کا تاج تھا اور وہ سفید بُراق سے کپڑے پہنے تھی۔ پہلے تو وہ کچھ شرمائی۔ لیکن پھر آگئی میں نے پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام چنبیلی ہے۔" اُس نے کہا۔ "دیکھئے نا میرے سر پر چنبیلی کا تاج ہے۔ آپ سب کو ان کا نام پوچھے بغیر ہی جان سکتی ہیں کیونکہ ہر ایک کے سر پر اُسی پھول کا تاج ہے۔"

"تو تم سب پھول ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں! آج شاہ گلاب کی سالگرہ ہے نا، ہم لوگ اُسی میں حصہ لینے آئے ہیں۔ اور اُن کے لئے بہت سے تحفے بھی لائے ہیں۔"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولی "کیا یہ چمن آپ کا ہی ہے؟"

"جی ہاں، یہ میرا ہی چمن ہے" میں نے ہنس کر کہا۔ "آج میں بھی تمہاری یہ تقریب دیکھتی ہوں۔"

اس کے بعد ہی چنبیلی بھیڑ ہی میں مل گئیں اور میں وہیں ایک اونچی سی جگہ پر بیٹھ کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اب جو میں نے دیکھا تو اُن میں سے ہر ایک کے سر پر کسی نہ کسی پھول کا تاج تھا۔ کسی کے سر پر گلاب کا تاج تھا۔ تو کسی پر چنبیلی، جوہی، بیلا، موتیا کے پھولوں کے تاج تھے۔ ایک انوکھی سی بہار تھی جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ تنے مُنے سے آدمی اور پھر سب کے سر پر تاج رنگ برنگے۔ کوئی اودا، کوئی گلابی، کوئی سُرخ، کوئی نارنجی، کوئی پیلا غرض ہر رنگ کے تاج تھے جو ہر ایک کے سر پر بہار دے رہے تھے۔ سب لوگ خوش و خرم نظر آرہے تھے اور ٹہل ٹہل کر ایک دوسرے کے ساتھ چمن میں چکر لگا رہے تھے۔ کبھی کوئی میرے پاس سے بھی گزرتا مگر زیادہ قریب نہ آتا۔ شاید اپنے مقابلے میں میرے قد کی اونچائی دیکھ کر ڈرتے تھے۔ کیونکہ میں تو اُن کے سامنے دیو معلوم ہو رہی تھی۔

سامنے سے ایک ٹولی اور آتی دکھائی دی۔ اُن سب کے سر پر بڑے بڑے سفید اور کاسنی پھولوں کا تاج تھا۔ قریب آنے پر میں نے دیکھا کہ یہ گل داؤدی تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ بھی اور سب ہی

کھل گئی۔

ایک اور انوکھی بات یہہ تھی کہ چمن کے اندر جتنے بھی پھولوں کے پودے تھے اُن سب پھولوں کے نیچے بھی ایک ایک ننھا منا آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

میری نظر اُس گلاب پر پڑی جس کی سالگرہ منائی جانے والی تھی۔ بہت نظر دوڑانے پر میں نے دیکھا کہ وہی گلاب جس کو میں آج اکھیڑنے والی تھی۔ اُسی کی سالگرہ منائی جا رہی ہے ایک چھوٹا سا آدمی اس پودے پر بیٹھا تھا جس کے سر پر صرف گلاب کے پھولوں کا تاج نہ تھا بلکہ ہر قسم کے پھولوں کا تاج تھا یہہ بھلا لگ رہا تھا۔

جیسے ہی لوگ آنا شروع ہوئے، وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور پھر دوسرے گلابوں نے اُسے پکڑ کر نیچے اُتارا اور ایک تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ہر پھول نے اُسے گلے لگایا، اور مبارکباد دی۔

تھوڑی دیر میں چائے آئی۔ ننھی ننھی پیالیاں چھوٹی چھوٹی پلیٹیں اور سفید کپڑوں میں ملبوس ننھی ننھی خادمائیں جن کے سروں پر رنگین دوپٹے تھے۔ یہہ سب ایک لمبی سی میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے اور مزے میں چائے پینے لگے۔

چائے پینے کے بعد ایک گلاب نے اُٹھ کر ایک بار پھر اس کو مبارکباد دی اور اس کے بعد ایک بڑا سا پیکیٹ گلاب کو پیش کیا، یہ ہمارے یہاں کے پانی پینے کے چھ کٹورے کے برابر تھا۔ اس نے جیسے ہی یہ پیکیٹ گلاب کو دیا سارے پھولوں نے "گلاب زندہ باد" "شہنشاہ گلاب کو سالگرہ مبارک" کے نعرے لگائے۔ جب شور کم ہوا تو اسی گلاب نے کہا کہ یہ ہم سب کی طرف سے آپ کا تحفہ ہے اور یہ تاج آپ کل صبح پہنیئے گا۔"

گلاب نے مسکرا کر یہہ تحفہ قبول کیا اور اُن سب کا شکریہ ادا کیا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ مجمع کم ہوا اور سب اپنے اپنے گھر چل دیئے۔ جاتے وقت پھر وہی بینڈ بجا جو آنے وقت بجا تھا۔

بینڈ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی دن نکل آیا تھا اور انجم ہاشمی مجھے اُٹھانے کے لئے ریڈیو خوب زور سے بجا رہی تھی۔

میں نے جلدی جلدی غسل کر کے ناشتہ کیا اور دوڑی دوڑی پہنچی چمن میں، کیا دیکھتی ہوں

بقیہ صفحہ ۱۴۴ پر

پھل دار اور سایہ دار پیڑ لگائیے

ابصار عبدالعلی

دیکھئے جناب! ــــ آپ ہی نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میرے گھر کے سامنے کافی زمین خالی پڑی ہے۔ لیجئے ہم اُسے کارآمد بنائے دیتے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ ایسے درخت لگانا چاہتے ہیں جو سائے دار بھی ہوں اور آپ کو پھل بھی دیں۔

آپ امرود، بیر، بیل اور آم وغیرہ میں سے اپنی پسند کے مطابق پیڑ لگائیے۔ یہ درخت ذرا سی توجہ سے ہی پھلنے پھولنے لگتے ہیں اور پھر کافی عرصے تک پھل دیتے رہتے ہیں، ان میں سے بیر اور امرود کے درخت تو آپ اپنے گھر کے آنگن میں بھی لگا سکتے ہیں۔ اور اگر آپ کے پاس اس کے علاوہ کہیں اور کچھ زمین ہے تو اپنے ابا جان سے کہہ کر ان درختوں کا باغ بھی لگوا دیجئے۔ برسات کے زمانے میں ان درختوں کی موٹی موٹی شاخوں پر جھولا جھولئے، رنگ برنگی چڑیوں کے گیت سنئے۔ اور چاہیں تو گھر بیٹھے ان پیڑوں کے سائے میں پکنک بھی منا سکتے ہیں۔

آیئے آپ کو ان درختوں کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔

امرود

امرود سستا اور بہت زیادہ پیدا ہونے والا پھل ہے۔ الہ آباد کے امرود کی شہرت تو آپ نے سنی ہوگی۔ امرود جتنا مزیدار ہوتا ہے اتنا ہی فائدے مند بھی ہوتا ہے۔ اسے گھر اور باغ دونوں جگہ لگا سکتے ہیں۔ یہ سال میں دو بار پھلتا ہے

ایک تو فروری میں پھول آکر جولائی سے اکتوبر تک اور دوسرا جون میں پھول آکر نومبر سے فروری تک ۔ اس کا درخت لگنے سے پانچ سال بعد ہی پھل دینے لگتا ہے' اور پھر ۴۰ سال تک برابر پھلتا رہتا ہے ۔

امرود لگانے کے لئے برسات سے پہلے ہی تین فٹ کا گڈھا کھود دیئے' اس میں گوبر کی کھاد اچھی قسم کی مٹی میں ملا کر بھر دیجئے' پھر جولائی میں اس میں پودا یا بیج بونا چاہیئے ۔ گھر کے آنگن میں ایک دو درخت لگانے میں کوئی بات نہیں لیکن باغ میں لگاتے وقت یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ ایک ایکڑ کے رقبے میں ستر۷۰ سے زیادہ درخت نہ لگیں ۔ ورنہ قریب قریب ہونے کی وجہ سے ہر ایک پیڑ کو غذا نہ مل سکے گی ۔ اور سب پیڑ کمزور ہو جائیں گے ۔

بیر یہ بہت معمولی لیکن مزیدار پھل ہے' اس کا درخت کسی خاص توجہ اور کھاد یا پانی دیئے بغیر ہی اگ آتا ہے اور لگنے سے پانچ سال' ورنہ سات سال بعد سے تو ضرور پھل دینا شروع کر دیتا ہے اور لگاتار پچاس سال تک پھلتا رہتا ہے ۔ اس میں ستمبر میں پھول آتے ہیں اور جنوری فروری تک پھل کھانے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔

اسے بھی بالکل امرود کی طرح شروع برسات میں گڈھا کھود کر بویا جاتا ہے ۔ لیکن ایک ایکڑ میں بیر کے اڑتالیس درخت کے حساب سے لگتے جاتے ہیں۔

بیل یہ بے حد ٹھنڈا اور مفید پھل ہے اس کے استعمال سے بہت سے فائدے ہیں مثلاً کچے بیل کو بھون کر کھانے سے پیٹ کی تمام بیماریاں دور ہو جاتی ہیں ۔ پکے ہوئے بیل کا شربت اور مربا وغیرہ بھی بنایا جاتا ہے' شربت گرمی اور لو وغیرہ سے بچاتا ہے اور مربا پیچش کے لئے مفید ہے' پکے بیل کا گودا سکھا کر رکھ لیتے ہیں اور جب اس کی فصل نہیں ہوتی تو بڑے مزے سے کھاتے ہیں' اس کے چھلکے سے زرد رنگ نکالا جاتا ہے ۔

اس میں آخر فروری سے اپریل تک پھل پکتے ہیں' اس کا درخت سایہ دار ہوتا ہے اور بالکل بیر کی طرح لگایا جاتا ہے ۔

آم آم کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں' ان میں ملیح آباد کا سفیدہ' دسہری ثمر بہشت اور بمبئی کا سرولی' بنارس کا لنگڑا وغیرہ بہت مشہور ہیں لیکن یہ قلمی آم ذرا مہنگے ہوتے ہیں' سب سے سستا تو دیسی آم ہوتا ہے جسے چوس کر کھاتے ہیں ۔ آم پھلوں میں سب سے زیادہ مزیدار پھل ہے اسی لئے پھلوں کا بادشاہ کہلاتا ہے ۔ اگر کھانے

کے بعد اُسے کھایا جائے تو ہاضمہ ٹھیک رہتا ہے، یہ
صرف ہندستان میں پیدا ہوتا ہے اس لئے غیر ملکوں
میں اس کی بڑی مانگ ہے۔

ہماری زبان کے مشہور شاعر مرزا غالب کا کہنا
تھا کہ "آم میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں"

کچے آم سے کئی طرح کے مربّے چٹنی اور اچار
وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ کچے آم کو بھون کر اس کا
پنا بنا کر پیتے ہیں تو لُو اور گرمی کا اثر ختم ہو جاتا
ہے۔ کچے آم سے کھٹائی بھی بنتی ہے۔ جسے ہم
آپ روزانہ دال میں ڈالتے ہیں اور اس کی چٹنی
بناتے ہیں۔

اس کے لگانے کا طریقہ بھی وہی ہے جو بیر
اور بیل کا ہے لیکن اس میں ایک بات قابلِ غور ہے
وہ یہ کہ گڈھا کھودنے پر اندر سے نکلی ہوئی مٹی
بالکل الگ کر دینی چاہیئے۔ گوبر کی کھاد کے ساتھ
دوسری اچھی مٹی بھر دینی چاہیئے۔ اس کا پودا بارش
ہو جانے پر جولائی میں لگائیے۔ عام طور سے اس کا
درخت لگنے سے دس بارہ سال بعد پھل دینے لگتا ہے
اس کے درخت ایک ایکڑ میں ستّرہ سے
زیادہ نہ ہوں، آم کا پیڑ بڑا سایہ دار ہوتا ہے۔

اظہارالحق۔ استاد باغبانی
مدرسہ ثانوی جامعہ

جنوری

ترکاری :۔ اس زمانے میں بھنڈی، کریلا، لوکی کدو، توری، ککڑی، کھیرا، بینگن، پیاز، مولی، پالک وسلاد بویا جاتا ہے۔ اور ریات گوبھی گانٹھ گوبھی کے پودوں کو کھیت میں خالی جگہوں پر لگاتے ہیں۔ سلاد اور رائی کے کچھ اچھے پودے بیج کے لیے چھانٹتے ہیں۔

پھلواری :۔ اس زمانے میں گلاب میں تازہ گوبر کھاد کے طور پر دیتے ہیں۔ گل داؤدی کے پودے لگانے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اس کے پودوں کو گملوں سے نکال کر ٹکڑے کرنے کے بعد کیاری میں لگائیے۔ گڑھل، رکمنی اور چمیلی وغیرہ کی چھنٹائی کرنی چاہیئے۔ موسمی پھولوں کو پانی دیجئے۔ چشمے باندھیئے۔ گرمی کے پھولوں کا بیج نرسری اور کیاریوں میں بوئیے۔

فروری

ترکاری :۔ جنوری والی ترکاریوں کو پھر سے بوئیے۔ آبپاشی وقتِ ضرورت پر کیجئے۔ سلاد بھی بویا جاتا ہے۔ بیج والے مٹر میں پانی بہت کم دینا چاہیئے۔

پھل :- لوکاٹ، آڑو، آلوچا، لیچی، آم کو پھل لگنے کے بعد آبپاشی کر دینی چاہیئے۔ انناس پر مٹی چڑھائیے۔ اور آبپاشی کیجئے۔ تربوز اسی زمانے میں بویا جاتا ہے۔

پھلواری : کیاریوں میں پٹونیا، فلوکس کے پودے لگائیے۔ ولائتی گلاب کی نومبر میں لگائی ہوئی قلموں کے پودے کو اٹھا کر دوسری جگہ پر لگا دیجئے۔ اور پانی دیجئے۔ گلاب میں داب لگائیے

مارچ

ترکاری :- پیاز کی گانٹھوں کو حفاظت سے رکھئے۔ جنوری والی ترکاریوں کو تیسری بار بویا جاتا ہے۔

پھل :- لیچی کو جڑوں سے بچائیے۔ آم، آڑو اور آلوچے کی آب پاشی کیجئے۔ بیل کی ایک سال کی سب شاخیں کاٹ دینی چاہئیں۔ خربوزہ بویا جاتا ہے۔ کیلے کی پتیاں نکال کر اور کھاد دے کر پانی دیجئے۔

پھلواری :- ڈہلیا کی جڑوں کی گانٹھوں کو مٹی میں گھڑے کے اندر رکھنا چاہیئے۔ بیلی اور گانٹھ والے پودوں کے گملوں کو اکتوبر تک سایہ دار جگہ میں رکھنا چاہیئے۔ جو پودے جاڑوں میں پھول چکے ہیں، ان کی چھنٹائی کر کے قلم لگائیے۔ سردیوں کے موسمی پھولوں کے بیج اکٹھے کیجئے۔

اپریل

ترکاری :- رتالو کی گانٹھیں لگائیے اور اس کے چڑھنے کا انتظام کیجئے۔ ککڑی، کھیرا اور ساگ چوتھی مرتبہ بونا چاہیئے۔

پھل :- خربوزے کو لگاتار پانی دیجئے۔

پھلواری :- گانٹھ دار پودوں کے گملوں کو سایہ دار جگہوں میں رکھنا چاہیئے۔ پھولوں کی خالی کیاریوں کی گہری گوڑائی کرنی چاہیئے۔

مئی

ترکاری :- سلاد کا دیسی بیج سایہ دار جگہ میں بو سکتے ہیں۔ سیم، تُرئی، مولی اور کاشی پھل (کمہڑا) مکا، بھنڈی، مرچ، بینگن وغیرہ کا بیج بو سکتے ہیں
ادرک، اراروٹ، اروی، شکر قند وغیرہ بوئیے۔

پھل :- انناس کی لگاتار سینچائی کرنی چاہیئے پھلوں کے پودوں کی قلم باندھنا چاہیئے۔ اور داب لگانے کا یہی وقت ہے۔

پھلواری:۔ پودوں، جھاڑیوں اور گملوں کو پانی دینا چاہیئے۔ جاڑے کے پھولوں کا بیج اکٹھا کرنا چاہیئے۔ اور کیاریوں کو گہرا گوڑ کر چھوڑ دینا چاہیئے۔ برسات میں گملے بھرنے کے لئے پتی کی کھاد تیار کرنی ضروری ہے۔ برساتی پھولوں کا بیج منگانا۔ پانی کے نکاس کا انتظام کرنا۔ برسات سے پہلے ہی یہ انتظام ہونے چاہئیں۔

جون

ترکاری:۔ مکا اور برساتی ترکاریاں بونی چاہئیں بوئی ہوئی توری اور لوکی کی بیل کو چڑھانا۔ مکوئے سیم، لوبیا، اروی، پٹوا بوئیے۔ مکا میں نلائی کرنا اور مرچ، بینگن وغیرہ کے پودوں کو کھیت میں لگائیے۔

پھل:۔ پودے تیار کرنے کے لئے آم کی گٹھلیاں بونا چاہئیں۔ قلمیں باندھنا چاہئیں۔ تھالوں کی نکائی اور باغ کی گوڑائی کرنی چاہیئے۔

پھلواری:۔ اب گل داؤدی کے چھوٹے پودوں کو اٹھا کر گملوں میں لگا دیجئے۔ دیسی پودوں اور جھاڑیوں کی قلمیں اور بیج لگانا اور پانی کے نکاس کا ٹھیک انتظام کرنا چاہیئے۔ گلاب کی معمولی چھنٹائی کیجئے۔ برساتی پھولوں کے بیج بونا چاہئیں۔ دیسی گلاب کی لگی ہوئی قلموں کو اٹھا کر کیاریوں میں جاڑے میں چشمہ لگانے کے لئے لگانا چاہیئے۔

جولائی

ترکاری:۔ اب آپ بینگن، بھنڈی، پرول، توری کدو، سیم وغیرہ بو سکتے ہیں۔ ہلدی، ادرک اور اراروٹ پر مٹی چڑھانا چاہیئے۔ سیم۔ چچینڈا وغیرہ کی بیلوں کو اوپر چڑھانا چاہیئے۔ اس زمانے میں بیلیں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ دیسی سلاد بونا چاہیئے۔

پھل:۔ آڑو، آلوچا، لیموا اور سنترہ وغیرہ کا چشمہ کرنا چاہیئے۔ مکوئی بونی چاہیئے۔

پھلواری:۔ برسات کے موسمی پھول بوئیے۔ ڈلیا کی رکھی ہوئی گانٹھیں جو اُگنے لگی ہیں گملوں میں لگا دیجئے۔ گڑہل، گلاب وغیرہ کی قلمیں لگائیے۔ جھاڑیوں کو صاف کیجئے۔ کھاد دیجئے۔ اور چھنٹائی کیجئے۔

اگست

ترکاری:۔ یہ برساتی ٹماٹر، دیسی گوبھی کا بیج

بونے کا زمانہ ہے۔ ولایتی گوبھی کا بیج اس مہینہ
کے آخر میں بویا جاتا ہے۔ سلاد، بینگن اور مولی
بونی چاہیئے۔

پھل:- آڑو، آلوچا، لیمو و سنترے میں چشمہ
باندھنا اور لیمو وغیرہ کی قلم باندھنا چاہیئے۔ امرود
شریفہ و انار کے پھلوں کی حفاظت کیجئے۔ اناناس
کی بڑی پتیوں کو لگائیے۔ داب اور بندھی ہوئی
قلموں کو آہستہ آہستہ کاٹنا چاہیئے۔

پھلواری:- گلابوں میں چشمہ باندھیئے۔ اور بہت
سے پودوں کی قلمیں بالو میں لگا کر پودے تیار کیجئے۔
گل داؤدی میں لکڑی لگانے اور پانی دینے کا
یہی زمانہ ہے۔

ستمبر

ترکاری:- سلاد، شلجم، بینگن، مولی، چقندر
گاجر، ٹماٹر اور ولایتی مٹر بونا۔ گوبھیوں کے
بیج نرسری میں بونے چاہیئں۔

پھل:- اب آڑو کی گٹھلیاں بو کر پودے تیار
کرنے کا وقت آگیا۔ ناریل کی نیچے کی پتیاں توڑ دیجئے۔

پھلواری:- پھولوں کی کیاریوں کو گوڑیئے اور
صاف کیجئے۔ گل داؤدی میں بغل کی کلیوں کو نوچ
دیجئے۔ اور رقیق کھاد دیجئے۔ گل تسبیح کی پتیاں
لگائیے۔ برساتی پھولوں کا بیج اکٹھا کیجئے۔

اکتوبر

ترکاری:- برسات ختم ہوتے ہی شلجم، گاجر، مٹر
سیم، فرنچ بین، سلاد، ٹماٹر، پالک، کاسنی،
مولی، چقندر، پیاز بونی چاہیئے۔ گوبھی کے
پودے کھیت میں لگانے چاہیئں۔ آلو اور بینگن
کا بیج بونا چاہیئے۔

پھل:- پپڑا کا بیج اکٹھا کیجئے۔ بادام، امرود
شریفہ، کھرنی، لیچی، آڑو، آلوچا، چکوترہ وغیرہ
کے بیج بوئیے۔ جو قلمیں باندھی ہیں ان کی حفاظت
کیجئے۔

پھلواری:- جاڑے کے موسمی پھولوں کا بیج
کیاری یا نرسری میں بونا چاہیئں۔ نرگس کی گانٹھوں
کو نکال کر گملوں میں لگائیے۔ ولائتی گلاب کی
جڑ اور تنے کی چھنٹائی کیجئے۔ سڑکوں و راستوں
کی مرمت و صفائی کیجئے۔ گل داؤدی میں کیمیائی
کھاد دینی چاہیئے۔ کیڑے مارنا۔ پھول مٹر بوئیے۔
برساتی پھولوں کے بیج اکٹھا کیجئے۔ اور چشمہ اور
قلم باندھیئے۔

نومبر

ترکاری:- سردیوں کی ترکاریوں کی دوسری بوائی کیجیے اور بوئی ہوئی کی نکائی و فاصلہ غور سے دیکھ کر ٹھیک کیجیے۔ مٹر و ٹماٹر میں لکڑی لگانا چاہیے۔ آلو پر مٹی چڑھائیے۔ پیاز کی گانٹھوں کو بیج تیار کرنے کے لئے بونا چاہیے۔ پودینہ کو نئی کیاری میں کھاد دے کر لگانا چاہیے۔ گوبھی پر مٹی چڑھانا چاہیے۔

پھل:- لوکاٹ و بیر وغیرہ کو کھاد دینا اور سینچائی کرنا۔

پھلواری:- ولائتی گلاب کی قلمیں لگائیے۔ سینچائی اور گوڑائی کیجیے۔ گل داؤدی نرگس وغیرہ میں رقیق کھاد دیجیے۔ سردیوں کے پھول لگائیے اور ان کی نکائی اور آبپاشی کیجیے۔

دسمبر

ترکاری:- مولی، رائی، سلاد، مٹر وغیرہ کی تیسری بوائی کرنا چاہیے۔ گوبھیوں کو ایک بار پھر کھیت میں لگانا چاہیے۔ اس زمانے میں مولی وغیرہ کو لگاتار پانی دینا چاہیے۔ بینگن و پیاز کو کھیت میں لگانا چاہیے۔

پھل:- پھلوں کے پودوں کو کھاد دے کر سینچائی کرنی چاہیے — **پھلواری:-** جلد اُگنے والے پھولوں کو دوسری بار بوئیے۔ اور گملوں میں بوئے ہوئے پودوں کو سردی سے بچانا چاہیے۔ ڈہلیا میں لکڑی لگائیے۔ اس زمانے میں گلاب میں رقیق کھاد دینا چاہیے۔

بقیہ آم کا پودا

سے نکل آئے — دوڑ کر اُنھوں نے دونوں کا بیچ بچاؤ کیا۔ اور جب اُنھیں بات معلوم ہوئی تو ابا ہنسنے لگے۔

ثروت کا رونا بند ہو گیا تو ابا نے انجم کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا —

"بھئی تم دونوں آخر آموں پر کیوں لڑ پڑے — تم دونوں اتنے بڑے ہو گئے ہو، لیکن نوک جھونک کی عادت نہیں گئی — اور تمھیں شرم نہیں آتی۔ چھوٹی بہن کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوئے — ارے بے وقوف اوّل تو یہ پودے بڑھتے نہیں، اور فرض کرو کہ بڑھ بھی جاتے تو جانتے ہو اس میں پھل کب آتا —؟"

"کب آتا —؟" انجم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"برسوں بعد"

ابا کے یہ کہتے ہی انجم حیرت سے ثروت کو دیکھنے لگا۔

میرا باغ

سب سے اچھا میرا باغ
کیسا سُندر میرا باغ

ہر سُو ہے ہریالی چھائی
یہ ہریالی من کو بھائی

ڈالی ڈالی پھُول کھلے ہیں
لال ہرے نیلے پیلے ہیں

ہم سب روز وہاں ہیں جاتے
پھولوں کو پانی دے آتے

وجے موہن صابر

محمد صالح بی۔ ایس سی

پھولوں کا راجا

ادھر کچھ دنوں سے میاں پرویز ہیں اور باغبانی۔ رات کو خواب بھی دیکھتے ہیں تو باغبانی کے۔ رات دن یہی ان کی بس رٹ ہے اور یہی اُن کا وظیفہ وہ پڑھتے بھی ایسے اسکول میں ہیں جہاں بچوں کے ہاتھ سے کام کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ بچے خود ہی اپنی کیاری تیار کرتے ہیں اور خود ہی پھولوں کے پودے اور ترکاریاں لگاتے ہیں۔ پرویز کے گھر کا صحن بھی خوب ہے۔

اسکول میں انہوں نے دیکھا تو' خود اپنے گھر پر بھی انھیں باغبانی کا شوق پیدا ہوا۔ بس پھر کیا تھا لگے اپنی امی جان سے ضد کرنے کہ ہم تو اپنے گھر میں باغبانی کریں گے۔ اُن کی امی جان اپنے بچوں کی ہر اچھی خواہش کا بڑا خیال رکھتی ہیں۔ انھوں نے چھوٹے میاں کو ایک طرف تھوڑی سی زمین میں کیاری بنا لینے کی اجازت دے دی۔

شوق تو تھا ہی۔ اُنھوں نے جھٹ پٹ گڑائی شروع کر دی۔ اور کھاد ڈال ڈول کیاری تیار کر لی۔ مگر ترکاری بونے سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ اُنھوں نے سوچا کہ پھول لگاتے جائیں۔ مگر ایسے کونسے پھول ہوں کہ خوبصورت بھی ہوں اور سال بھر آتے بھی رہیں۔ اور کیاری کبھی سونی سونی نہ دکھائی دے۔

آخر اُن کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ گلاب کے پھول لگائیں۔ اوّل تو اِس لئے کہ یہ پھول ہوتا بھی خوبصورت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کھِلتا بھی قریب قریب سارے ہی سال ہے۔

پرویز میاں کو اس سلسلے میں زیادہ معلومات نہ تھی۔ وہ کہیں سے گلاب کی ایک ٹہنی لے آئے یہ ٹہنی انھوں نے اپنی کیاری میں دبا دی۔ جب کچھ دن گزر گئے وہ سوکھ گئی۔ انھیں بہت افسوس ہوا۔

اُن کے بڑے بھائی کو اس قسم کے کاموں سے بڑی واقفیت تھی۔ وہ بڑے غور سے پرویز میاں کی باغبانی کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے جو دیکھا کہ گلاب کی ٹہنی سوکھ جانے سے وہ افسردہ ہیں تو پرویز میاں کو اپنے پاس بُلایا اور کہا۔

بھائی جان: "کہو بھئی پرویز! تمہاری باغبانی کا کیا حال ہے؟"

پرویز: "بھائی جان! میں نے گلاب کی ایک ٹہنی لگائی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ تو سوکھ گئی۔ جمی ہی نہیں۔"

بھائی جان: "اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اُس کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھا گچھا بھی تھا؟"

پرویز: "جی نہیں! پوچھا تو میں نے کسی سے نہیں تھا۔ مگر بھائی جان! آخر ٹہنی ہی تو لگائی جاتی ہے گلاب کی؟"

بھائی جان: "ہاں بھئی! ٹہنی بھی لگائی جاتی ہے مگر طریقے سے۔ یہ نہیں کہ بس کہیں سے ایک ٹہنی توڑ کر لے آئے اور مٹی میں دبا کر یہ سمجھ بیٹھے کہ گلاب کا پودا ہو گیا۔"

پرویز: "تو پھر بھائی جان! آپ ہی بتائیے کہ ہم گلاب کیسے لگائیں؟ ہمیں تو گلاب ہی کے پھول سب سے زیادہ پسند ہیں۔"

بھائی جان: "گلاب کا پھول سچ مچ بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کا پیارا پیارا رنگ اس کی بھینی بھینی خوشبو، اس کی نرم نرم پتیاں اور اس کا دل لبھانے والا روپ۔ بس کیا کہنا۔ اِسی لئے تو اُسے پھولوں کا راجا کہتے ہیں۔"

پرویز: "لیکن اس کے لگانے کا کیا طریقہ ہے؟"

بھائی جان: "اچھا لو۔ اِسے لگانے کا طریقہ بھی سنو۔ کہتے یہ ہیں کہ پہلے تو جیسے تم نے کیاری کھودی ہے۔ ویسی ہی کیاری کھود کر تیار کر لیتے ہیں۔ البتہ تین فٹ گ[illegible]

پھر اُس میں تھوڑی،

مگر یاد رکھیے کہ گلاب کے لئے زیادہ کھاد کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

پرویز :۔ "اچھا ۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہ تھا ۔

بھائی جان :۔ اسی لئے ذرا دھیان سے سُنو ۔ اب یا تو گلاب کے چھوٹے چھوٹے پودے لا کر مٹی میں اچھی طرح اُن کی جڑیں دبا دو ۔ یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم اُس کی قلم لگاؤ ۔ آج کل زیادہ تر یہ دوسرا طریقہ ہی کام میں لایا جاتا ہے ۔

پرویز :۔ "قلم کیسے لگاتے ہیں ؟"

بھائی جان :۔ قلم لگانے میں دو تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔ ایک تو یہ کہ قلم لگانے کے لئے جو ٹہنی ہو ۔ وہ مضبوط ہو اور اُس میں گانٹھیں پاس پاس ہوں ۔ شاخ میں کچھ پتے ہوں تو وہ بھی توڑ دو ۔ دوسرے یہ کہ کوئی نَو، دس انچ لمبی شاخ لو ۔ اور اُس کو زمین میں تقریباً آدھ انچ دبا دو ۔ تیسرے یہ کہ قلم کچھ فاصلے سے لگانا چاہیئے ۔ اب روز اُسے پانی دو ۔ اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو ۔ تم دیکھو گے کہ چند روز میں اس میں نئے کلّے پھوٹنے اور نئی پتیاں اُنکھے چھنگ کا ہر اپن کھلا نکلیں گے ۔ اس بات پر ۔ اُنھوں نے پرویز میاں کو ایسی جگہ لگاؤ کہ زمین میں کیاری بنا لینے کی اجازت جہاں دھوپ خوب آتی ہو ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پانی نہ ٹھہرتا ہو ۔ کیونکہ زیادہ پانی سے گلاب کے پودے کو بہت نقصان پہنچتا ہے ۔"

پرویز میاں :۔ "بھائی جان ! پودے لگانے کا طریقہ تو میں سمجھ گیا ۔ مگر یہ اور بتا دیجئے کہ گلاب اور کس کس کام آتا ہے ؟ امّی جان کہہ رہی تھیں کہ اس کی پتیوں سے کچھ اور بھی کام لئے جاتے ہیں ۔

بھائی جان :۔ ہاں بھئی ! "یہ پھولوں کا بادشاہ" نہ صرف رنگ روپ اور خوشبو میں سب سے بڑھ کر ہے ۔ طرح طرح سے کام آتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ قبض، کھانسی اور کئی بیماریوں میں حکیم لوگ اِسے دواؤں کے ساتھ استعمال کراتے ہیں ۔ دوسرے گلاب کا عرق دودھ پیتے بچّوں کے معدے اور آنتوں کے لئے فائدے مند ہوتا ہے ۔ اس کا گلقند بنتا ہے ۔ جو پیٹ کے درد کے لئے مفید ہے ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا عطر بھی تیار ہوتا ہے ۔"

پرویز میاں یہ باتیں سُن کر بہت خوش ہوئے اُنھوں نے اپنی کیاری میں گلاب لگائے ۔ پھر تو ایسے ایسے بڑے بڑے خوش رنگ پھول آئے کہ جو دیکھتا پرویز میاں کی پیٹھ ٹھونکتا ۔

فرینک کارپنٹر

ترجمہ: قدسیہ زیدی

آخری قسط

روگی لومڑی

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں

اُلّو میاں پیڑ پر بیٹھے اونگھ رہے تھے کہ ایک مینڈک صاحب بطخ سے ڈرے سہمے اندر آئے۔ مینڈک جہاں بطخ کو دیکھتے اس سے بچنے کے لئے پتھر کے بن جاتے۔ دوسری طرف لومڑی بیگم آئیں جو بطخ کو اپنی غذا بنانا چاہتی تھیں۔ ان کا پاؤں مینڈک صاحب سے ٹکرایا۔ مینڈک صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ جب یہ سُنا کہ لومڑی مینڈک نہیں کھاتی تو خوش ہو کر بھوکی لومڑی کو ایک ترکیب بتائی جس سے بیٹھے بٹھائے لومڑی کو غذا مل جائے
اب وہ لومڑی بیگم کو سہارا دے کر بھٹ میں لے جاتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں مُرغا آتا ہے۔ مینڈک اُسے لومڑی کی بیماری کا حال سُناتے ہیں۔ مُرغا مزاج پُرسی کے لئے جاتا ہے اور لومڑی اسے ہڑپ کر جاتی ہے پھر خرگوش میاں آتے ہیں۔ مینڈک اسے بھی لومڑی کی بیماری کا حال سُناتے ہیں وہ بھی بھٹ کے اندر جانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن مینڈک کو اس پر رحم آجاتا ہے اور وہ اُسے جانے سے منع کرتے ہیں مگر وہ کسی طرح نہیں مانتا ——

مینڈک:۔ (روتے ہوئے) خرگوش خدا کے واسطے لومڑی کو دیکھنے مت جاؤ۔

خرگوش:۔ میرے اچھے مینڈک! تم تو پریشان ہو گئے۔

مینڈک :۔ ہاں بہت پریشان ۔
خرگوش :۔ لو میرا رومال لے لو۔
مینڈک :۔ اے کاش تم لومڑی کو دیکھنے نہ جا رہے ہوتے ۔
خرگوش :۔ نہیں مجھے ضرور جانا چاہیے میرا فرض ہے۔ ایک رومال اور ہوتا تو بہت اچھا رہتا۔
مینڈک :۔ لو اسی کا ایک کونا تم بھی لے لو۔
(دونوں ایک ہی رومال سے ناک پونچھتے ہیں)
خرگوش :۔ بس اب تو خوش ہو جاؤ۔ مینڈک ابھی سب کچھ ہوا جاتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔
مینڈک :۔ ہاں بس اسی کا تو مجھے ڈر ہے ۔
خرگوش :۔ میں جب لومڑی کو اپنا ایک فیتہ دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گی۔ تم رکھو یہ رومال۔
مینڈک :۔ ہائے خرگوش ۔
خرگوش :۔ بہت دیر نہیں لگے گی۔
مینڈک :۔ ہرگز نہیں لگے گی۔ (بھیں بھیں کر کے روتا ہے) لوٹ آؤ خرگوش لوٹ آؤ۔
(خرگوش چلا جاتا ہے)
ہائے اب کیا کروں ؟ کیسے روکوں ؟ آؤ!
بھلا تم نے کیوں نہ روکا۔ تم ہی روک لیتے۔ جب تمھاری ضرورت ہوا کرے اُس وقت تو جاگتے۔ رہا کرو۔ بے چارہ خرگوش۔ بے چارہ خرگوش۔ (روتا ہے) اگر اب بھی جھٹ میں پہنچ جاؤں تو شاید اس کی ایک آدھ ٹانگ یا کم سے کم اس کا کان بچا سکوں گا۔ (بطخ اندر آتی ہے)
بطخ :۔ آہا ہا! تم یہاں ہو۔
مینڈک :۔ ہائے ہائے اب تم آگئیں۔
بطخ :۔ نہیں کوئی بات نہیں تم آؤ میری ٹوکری میں آجاؤ۔
مینڈک :۔ نہیں بطخ اس وقت نہیں۔ مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ مجھے خرگوش کی جان بچانا ہے۔ میرا مطلب ہے —
بطخ :۔ آؤ میرے ننھے مینڈک تم میری ٹوکری میں آجاؤ۔ میں بہت دیر سے تمھاری راہ تک رہی ہوں۔
مینڈک :۔ بطخ رانی مجھے آج چھوڑ دو۔ بس آخری دفعہ۔
بطخ :۔ خوب تمام دن تمھارا پیچھا کرنے کے بعد۔ جی نہیں ایسا نہیں ہوگا۔
مینڈک :۔ بی بطخ لومڑی بہت پیاری ہے۔

بطخ :۔ (حیرت سے) مجھے اس سے کیا مطلب۔
مینڈک:۔ میرے خیال میں لومڑی مر رہی ہے۔
بطخ :۔ جتنی جلدی مرے اتنا ہی اچھا ہے۔
مینڈک :۔ کیا تم جاکر دو حرف ہمدردی کے لومڑی سے نہیں کہہ سکتیں۔
بطخ :۔ کون میں ؟
مینڈک:۔ دُکھیا بالکل لاچار ہے، ہل جُل بھی نہیں سکتی۔ چلو میں تمھارے ساتھ چلوں۔ بس پھر میں تمھارے بس میں۔ جو تم چاہو کرو۔ میں بھاگ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ چلو جلدی سے چلو۔ شاید ہم وقت پر پہنچ جائیں۔ شاید وہ تمھیں خرگوش سے بھی زیادہ پسند کرے۔ میرا مطلب ہے ـــــ کہ
بطخ :۔ کیا مطلب ہے تمھارا؟
مینڈک:۔ سب باری باری اُسے دیکھنے جارہے ہیں۔ بے چاری لومڑی کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ تم تو اُسے پہچان بھی نہ پاؤگی۔ ابھی مُرغا اُسے دیکھنے گیا تھا اور اس وقت خرگوش وہیں ہے۔ یہ دیکھو اس کے پیر کے نشان۔
بطخ :۔ محض بکواس ہے۔
مینڈک:۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بالکل سچ۔ یہ دیکھو۔
بطخ :۔ میں خوب جانتی ہوں تم جھوٹ بول.....
(بطخ جُھک کر پاؤں کے نشان دیکھتی ہے)
مینڈک:۔ دیکھو یہ رہے۔
بطخ :۔ ہاں ہیں تو نشان۔
(پھر دیکھتی ہے اور مینڈک کے ہلکا سا چپت لگاتی ہے)
اپنے بڑوں کو عقل سکھانے کی کوشش مت کرو۔ پاؤں کے نشان تو بے شک ہیں۔ مگر صرف بھٹ میں جانے کے نشان ہیں۔ واپس آنے کے نہیں۔ کیونکہ لومڑی نے خرگوش اور مُرغے دونوں کو ہڑپ کر لیا ہوگا۔ اور تمھارا ارادہ تھا کہ وہ مجھے بھی ہڑپ کر جائے۔ مگر اتنی بھولی نہیں کہ تمھارے جال میں آجاؤں گی۔ مکار ٹھہر تو جاؤ ابھی بناتی ہوں تمھارے کباب۔ چلو گھسو میری ٹوکری میں۔ فوراً فوراً۔ (مینڈک کا پیچھا کرتی ہے)
مینڈک :۔ (چیخ چیخ کر) بچاؤ، بچاؤ۔ لومڑی

مجھے بچاؤ۔
(خرگوش لومڑی کے بھٹ میں سے نکلتا ہے صرف ایک فیتہ لگائے ہوئے ہے)
(مینڈک اسے دیکھ کر حیرت میں ہے اور بطخ بھی اچنبھا ظاہر کرتی ہے)

خرگوش:۔ کس نے پکارا لومڑی کو

بطخ:۔ خرگوش!

مینڈک:۔ تم کو لومڑی نے ہڑپ نہیں کیا؟

خرگوش:۔ ہڑپ، کیسی باتیں کرتے ہو؟ بیچاری لومڑی کسی کو ہڑپ نہیں کر سکتی۔ غریب ہل جُل بھی نہیں سکتی۔

مینڈک:۔ کیا وہ سچ مچ بیمار ہے؟

بطخ:۔ یہ سب کیا ماجرا ہے؟

خرگوش:۔ کوئی ایسی بات نہیں، جب میں لومڑی کو دیکھنے گیا تو بے چاری چپ چاپ کونے میں پڑی تھی۔ بہت خاموش اور اُداس اور کمبل سر سے پاؤں تک اوڑھ رکھا تھا۔ جیسے بیمار اوڑھتے ہیں۔

بطخ:۔ ہاں ہاں پھر کیا ہوا؟

خرگوش:۔ میرا دل بہت کڑھا بڑی مشکل سے بے چاری مسکرائی۔ اور ہلکی سی آواز میں کہا آؤ بیٹھو۔ پھر بولی تمھارے فیتے بہت خوبصورت ہیں۔ وہ دوسرا فیتہ جو میں پہنے تھا۔ میرے پاس دو تھے نا۔ جو میں نے روغنی گڑیا کی شادی میں پہنے تھے اور تب سے میں نے اُتارے نہیں۔ میرے خیال میں اچھی چیزوں کو پہننا چاہیے۔ سینت سینت کر نہیں رکھنا چاہیے۔ بکسوں میں رکھنا بے وقوفی ہے۔

بطخ:۔ (بے صبری سے) اونہہ یہ بتاؤ پھر کیا ہوا۔

خرگوش:۔ لومڑی بولی فیتہ میرے پاؤں کی پٹی کے لئے بہت ٹھیک رہے گا۔ میں نے کہا اچھا خیال ہے۔ میں نے فیتہ اسے دیدیا مگر بے چاری سے باندھا نہیں گیا تو میں نے خود اپنے ہاتھ سے باندھ دیا۔

بطخ:۔ کیا کہا، تم نے باندھ دیا؟ لومڑی کے پاؤں پر فیتہ اپنے ہاتھ سے؟

خرگوش:۔ ہاں ہاں، میں نے باندھ دیا اپنے ہاتھ سے۔ پھر بے چاری بولی۔

بطخ:۔ (چونک کر) ارے ارے وہ مینڈک کہاں غائب ہو گیا۔ (خرگوش کی باتوں کے دوران

میں مینڈک خرگوش کے پیچھے چھپ کر پتھر کا
بن جاتا ہے۔)
خرگوش:۔ مینڈک! ہاں کیا یہاں کوئی مینڈک
بھی تھا۔
بطخ:۔ تمھارے پاس ہی تو کھڑا تھا۔ ابھی ابھی۔
(بطخ مینڈک کو ڈھونڈتی ہے پھر خرگوش
کی جیب میں دیکھتی ہے)
خرگوش:۔ میرے ایک چچا تھے جو اپنی جیب
میں سے درجنوں مینڈک نکال سکتے تھے۔
مگر وہ جادوگر تھے جادوگر۔
بطخ:۔ مینڈک! مینڈک! مینڈک۔
(اِدھر اُدھر بھاگ کر ڈھونڈتی ہے اور
مینڈک سے ٹھوکر کھا کر گر جاتی ہے)
خرگوش:۔ ارے ارے میری بطخ رانی کو کہیں
چوٹ تو نہیں آئی۔ بے چاری بطخ۔
(خرگوش اس کو سہارا دے کر اُٹھاتا ہے)
بطخ:۔ کم بخت پتھر ہی پتھر ہیں اِس سڑک پر
اِنھیں ہٹا دینا چاہیے۔
خرگوش:۔ بے شک۔ بے شک! بطخ رانی تمھاری
ٹوکری بھی تو گر گئی۔
بطخ:۔ ہائے میرا پاؤں۔ ہائے میرا پاؤں۔

خرگوش:۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔
بطخ:۔ کیا کہا تم نے؟
خرگوش:۔ میں نے کہا بڑی خوشی کی بات ہے۔
بطخ:۔ بالکل خوشی کی بات نہیں۔ اوّل تو مجھے
ابھی تک خوراک کی تلاش ہے۔ دُوسرے
ابھی ابھی میرے پاؤں میں چوٹ لگ گئی
اور تیسرے میرے میاں کا مزاج خراب
ہوگا۔ اور تم کہتے ہو کہ خوشی کی بات ہے۔
خرگوش:۔ میرا مطلب ہے۔ کیا یہ خوشی کی بات
نہیں کہ میرے پاس ایک دُوسرا فیتہ بھی
ہے۔ میں تمھارے پاؤں پر بھی پٹی باندھ
دوں گا۔ جیسے میں نے لومڑی کے
باندھی تھی۔
بطخ:۔ ہاں ضرور باندھ دو۔ میں بھی سوچ رہی
تھی۔ تو لو جلدی سے باندھ دو۔
خرگوش:۔ ابھی لو۔ دیر تھوڑے ہی لگے گی۔ لو یہ
اُتارا فیتہ اور یوں باندھا تمھارے پاؤں پر۔
بطخ:۔ نہیں بھئی اتنا کس کر نہیں۔
خرگوش:۔ اور یوں گھوم گیا ایک بار پھر ایک بار
اور۔ اب جو فیتہ بچ گیا ہے اس کے ساتھ
یوں چکر کاٹا اور۔

(جلدی جلدی بطخ کے چاروں طرف گھومتا
ہے اور بطخ کے دونوں پاؤں باندھ دیتا ہے)
بطخ :- یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ارے تم تو مجھے باندھ
رہے ہو۔ ہائے میں مری۔
خرگوش :- یہی میں نے لومڑی کے ساتھ کیا اور
یونہی وہ ہل جل نہیں سکتی۔
بطخ :- کھولو۔ مجھے جلدی۔ (خرگوش جلدی جلدی
بطخ کے پاؤں باندھ دیتا ہے)
خرگوش :- مینڈک اب تم اٹھ سکتے ہو۔
(مینڈک اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور بطخ کا
حلیہ دیکھ کر ہنستا ہے اور بطخ اپنے پاؤں
چھڑانے کی بےکار کوشش کرتی ہے)
خرگوش :- تمہارے خیال میں بطخ رانی کو لومڑی
سے ملاقات کرنی چاہئے نا؟
مینڈک :- بہت نیک خیال ہے۔
خرگوش :- چلو ہم اس کو سہارا دے کر لے چلیں۔
مینڈک :- ٹوکری بھی لے چلو شاید اس کی
ضرورت پڑے۔
بطخ :- نہیں نہیں۔ قیں قیں۔ قیں۔
(خرگوش ٹوکری بطخ کے سر پر رکھ دیتا ہے
اور دونوں اسے بھٹ میں دھکیلتے ہوئے
لے جاتے ہیں۔ بھٹ میں سے لومڑی پھدکتی
ہوئی دونوں پاؤں بندھے باہر آتی ہے)
لومڑی :- مکار مینڈک ٹھہر تو ابھی لیتی ہوں
تیری خبر۔
بطخ :- میرے پاس مت آنے دو اس مینڈک کو۔
(لومڑی غراتی ہے اور بطخ ڈر جاتی ہے)
خرگوش :- جو پہلے کھل جائے۔
مینڈک :- وہ دوسرے کو کھا جائے۔
خرگوش :- یا بھاگ لے۔
الّو :- یا مجھے ایک چوہیا دے دے۔
مینڈک :- الّو! ارے تمہیں تو ہم بھول ہی گئے تھے۔
خرگوش :- الّو تمہیں ایک موٹی سی چوہیا دیں۔
(جیب سے ایک چوہیا نکالتا ہے)
میرے چچا کا جادو ہے چچا کا۔
الّو :- لو ابھی آیا۔ (کود کر نیچے آتا ہے)
مینڈک اور خرگوش ناچتے ہیں اور چوہیا کو ایک
دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں اور الّو اسے پکڑنے
کی کوشش کرتا ہے لومڑی اور بطخ بھی بندھے
ہوئے پاؤں سے اچھلتے ہوئے اندر آتے ہیں اور
ایک دوسرے پر غصے سے پھنکارتے ہیں۔
(ناچ جاری ہے کہ پردہ آتا ہے)

زعفران
کشمیر کا دل لبھانے والا پودا

م۔ اطہر پرویز

کشمیر جنت نظیر جہاں اپنی حسین وادی کے لئے مشہور ہے، وہاں زعفران نے اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ زعفران کشمیر کا دل لبھانے والا تحفہ ہے۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ اگر کوئی زعفران کا کھیت دیکھ لے تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے۔ یہ بات اگر سچ نہ بھی ہو تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کا دل اس خوبصورت پھول کو دیکھ کر خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہوگا۔ زعفران دنیا میں سب سے زیادہ کشمیر ہی میں پیدا ہوتا ہے۔

سری نگر سے دس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے — پام پور۔ زعفران اسی گاؤں اور اس کے آس پاس کے علاقے میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سری نگر جانے والے پام پور کے زعفران کے کھیت دیکھنے ضرور جاتے ہیں، اور پام پور ساری دنیا میں مشہور ہو گیا ہے۔

زعفران کی خوشبو کا کیا کہنا۔ اگر یہ چند روز کے لئے کسی کمرے میں رکھ دیا جائے تو اس کی مہک دو تین ہفتے تک بسی رہتی ہے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر کو زعفران اتنا پسند تھا کہ اس نے اپنی کتاب "تزک جہانگیری" کے ایک باب میں صرف کشمیر کی زعفران ہی کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر

سے لکھا ہے کہ "اس کی خوشبو اتنی تیز ہوتی ہے کہ اس سے ایک بار میرے سر میں درد بھی ہو گیا تھا"۔

زعفران کے کھیتوں کی بہار نومبر میں دیکھنے کے لائق ہوتی ہے جب وقت زعفران کے پھول کھلتے ہیں، کھیتوں کے آس پاس عجیب طرح کی بھینی بھینی سی مہک رہتی ہے۔ اور چاندنی رات کی تو بات ہی اور ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، اور ان پر دُھلی ہوئی سفید چاندنی تو اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے دیکھنے والے اس منظر میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ سردی کا خیال بھی باقی نہیں رہتا۔

زعفران ایک بار بویا جاتا ہے تو آٹھ نو سال تک پھولتا رہتا ہے۔ اس کے بعد زمین کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور یہ پھر دوسری جگہ بویا جاتا ہے۔ اور پہلی والی زمین ۹ سال تک خالی پڑی رہتی ہے۔ تاکہ اس میں دوبارہ قوت پیدا ہو جائے۔ لیکن اب زمین کا علم جاننے والے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کوئی ایسی ترکیب نکالیں جس سے یہ زمین اتنے دن بے کار نہ پڑی رہے۔

زعفران کے بونے کے بعد آٹھ نو سال تک برابر اس کی نرائی ہوتی ہے۔ اکتوبر کے شروع میں پھول آنے لگتے ہیں اور نومبر میں یہ پھول توڑے جانے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ یہ پھول نیلے نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اس پھول کے اندر چھ نرم پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ تین کا رنگ زرد ہوتا ہے اور تین کا سُرخ۔ اسی سرخ پنکھڑیوں میں سے "شاہ زعفران" نکلتا ہے۔ جو زعفران کی سب سے اچھی قسم ہے۔ دوسری قسم کا زعفران زرد پنکھڑیوں سے نکلتا ہے۔

زعفران بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کا استعمال بعض یونانی دواؤں میں ہوتا ہے۔ یہ قیمتی کپڑوں کے رنگنے میں بھی کام آتا ہے۔ اور لوگ کھاتے بھی ہیں، جس سے کھانے میں خوشبو آ جاتی ہے۔

کشمیریوں میں زعفران کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ پام پور میں ایک بزرگ "شوقی بابا" تھے۔ ایک بار وہ عالم بالا کی سیر کو گئے۔ اللہ میاں نے انھیں کشمیریوں کے لئے زعفران کی جڑ دی۔ جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے بوئی۔ اور اس طرح کشمیر کی زمین میں پہلی بار زعفران پیدا ہوا۔ یوں تو یہ کہانی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ زعفران کشمیریوں کے لئے اللہ میاں کا ہدیہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اچھے بچوں کیلئے اچھی کتابیں

چراغ کا سفر

آپ کے گھر میں بجلی کی روشنی ہوگی یا مٹی کے تیل کی لال ٹین اور لیمپ جلتے ہوں گے۔ اسی روشنی کی کہانی پڑھیے سید محمد نوشنی صاحب نے بڑی اچھی طرح یہ کہانی لکھی ہے۔

قیمت پیامی بچوں کیلئے دس آنے اوروں کیلئے بارہ آنے۔

انوکھا عجائب خانہ

ہر بچے کے گھر میں ایک عجائب خانہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ حسین حسان صاحب کی یہ کتاب جو بچے پڑھیں گے۔ انھیں گھر کا یہ عجائب خانہ نظر آنے لگے گا۔ قیمت پیامی بچوں کے لئے ایک روپیہ چار آنے اوروں کیلئے ایک روپیہ دس آنے۔

اور اچھی کتابیں

کتاب	قیمت
تارا کا ڈنڈا	۳/
بونے کا بٹوا	۳/
انار راجہ	۳/
چنن منن	۳/
پری کی چھڑی	۴/
میاں خوں خوں	۳/
کالا دیو	۴/
سراغرساں کتا	۳/
ملا دوپیازے کی عقل	۵/
زمرد شہزادہ	۵/
شاہی فقیر	۵/

مفت

جو بچے دو روپے کی کتابیں منگائیں گے وہ چار آنے تک کی جو کتاب چاہیں۔ مفت منگا سکتے ہیں۔ اور جو تین روپے کی کتابیں منگائیں گے وہ چھ آنے تک کی کتابیں منگا سکتے ہیں۔

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
منی کا پرستان	۵/	باپ کی ناؤ	۵/	کھلو میاں	۸/	ننھے میاں	۶/
میاں مٹھو	۵/	پرستان کی سیر	۵/	بچوں کا تحفہ حصہ اول	۱۰/	شیخ چلی نے جنت کی سیر کی	۶/
ٹلو میاں	۵/	بلبل شہزادی	۵/	بچوں کا تحفہ حصہ دوم	۱۲/	حبیب خدا	۲/۸/
گمی شکر	۸/	انوکھی چھتری	۶/	جادو کی کہانی	۹/	پیارے نبی	۱/۴/
طلسمی مینا	۵/	مزدور کا بیٹا	۷/	راکشش کا محل	۶/	فسانۂ عجائب	۱/۴/
مزدور کا انجام	۱۲/	پھر پھر	۸/	چار کہانیاں	۱/۲/	باغ و بہار	۱/۴/

یہ اور دوسری کتابیں منگانے کا پتہ } آزاد کتاب گھر (۲) کلاں محل دہلی

جشن ۲۶ء

گلاب کا پھول

سورج مکھی کا پھول

فوٹو سراج انور

July. 59.

Only Title Printed at the India Printers, Delhi-6.

پیام تعلیم

پیدائش ۸ر دسمبر ۱۸۷۸ء خواجہ حسن نظامی وفات ۳۱ر جولائی ۱۹۵۵ء

پیام تعلیم

ادارہ

حامد علی خاں ــــــــ بی اے (جامعہ)

اطہر پرویز ــــــــ ایم اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ ــــــــ چار روپے

فی پرچہ ــــــــ ۶ ر چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی

فہرست

بچّوں سے باتیں

ہم نے جولائی اور اگست میں پیام تعلیم کے دو نمبر چھاپے۔ جولائی کے پرچے میں صرف باغبانی کے بارے میں مضمون اور کہانیاں تھیں۔ گویا پورا پرچہ ایک طرح کی معلومات کا پرچہ تھا۔ جو امید سے زیادہ پسند کیا گیا۔ کیا بچے کیا بڑے سب نے ہماری ہمت بڑھائی۔ اگست کے پرچے میں ہم نے کہانیاں ہی کہانیاں چھاپیں۔ جس میں بچوں کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کی کہانیاں بھی تھیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کہانی نمبر میں صفحوں کی کمی کی وجہ سے ہماری پسند کی ہوئی کئی کہانیاں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ وہ کہانیاں اب ہم اس پرچے میں شائع کر رہے ہیں۔ اور امید ہے کہ آپ ان کہانیوں کو ضرور پسند کریں گے۔ جناب راشد حسن قادری، جناب معین الدین صاحب، جناب احسن حامد صاحب اور فریدہ ہاشمی صاحبہ کی کہانیاں، کہانی نمبر کے لئے ہی آئی تھیں۔ ہم ان کہانیوں کو بھی بڑی خوشی کے ساتھ اس پرچے میں شائع کر رہے ہیں۔

اسی پرچے میں ہم پروفیسر مبارز الدین صاحب رفعت کا ایک مضمون "انڈونیشیا کا ایک جزیرہ بالی"

کبھی کوئی غلط بات قلم سے نکل گئی تو گرفتار
کر لئے جاؤ گے مگر ان پر بھلا اس کا کیا اثر ہوتا
وہ تو اپنی دھن کے پکے تھے۔ برابر لکھتے رہے۔
دن بدن ان کی زبان منجھتی گئی۔ عبارت میں
عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ بہت کم استعمال
کرتے، زبان روزمرہ کی لکھتے۔ اس لئے پڑھنے
والوں کو ان کے مضامین میں بڑا مزا آتا۔ اور
اس طرح ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت
برابر بڑھتی گئی۔

ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ ۱۸ برس
کی عمر میں خواجہ صاحب کی شادی ہو گئی۔ اب
ان کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں تھیں۔ نیا گھر
چلانے کے لئے ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے
اور ان سب کے لئے پیسہ چاہیئے۔ خواجہ صاحب
کبھی جلد سازی کرتے، بستی نظام الدین سے
۵ میل پیدل شہر جاتے، کتب فروشوں اور دوسرے
لوگوں سے غیر مجلد کتابیں اکٹھا کر کے سر پر لاد
لاد کر گھر لاتے اور جلدیں بنا کر پھر شہر لے
جاتے۔ کبھی طوطا مینا، گل بکاؤلی، آرائش
محفل اور قصہ چہار درویش قسم کی کتابوں کی
گٹھری لاد کر شہر کے کوچے کوچے میں صدائیں
لگاتے پھرتے۔ اور کتابیں بیچ کر اپنا اور
اپنی بیوی کا پیٹ پالتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا
کہ انھیں فاقہ بھی کرنا پڑتا۔ لیکن ان تمام
مصیبتوں کے باوجود انھوں نے کسی کے
سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

روزی کمانے کے ساتھ ساتھ خواجہ
صاحب نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی برابر
جاری رکھا۔ اور انہوں نے اس میں اتنی
مہارت حاصل کی کہ ان کے مضامین ملک
کے بڑے بڑے رسالوں اور اخباروں میں
عزت کے ساتھ شائع ہوتے اور ان کا
طرز تحریر بہت پسند کیا جانے لگا۔

۱۹۰۷ء کے بعد خواجہ صاحب نے
پیری مریدی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اپنے
مریدوں میں سے ایک مرید کی مدد سے انہوں
نے "حلقہ المشائخ" کے نام سے ایک حلقہ
بنایا اور اسی حلقے کی طرف سے انھوں
نے ایک رسالہ "نظام المشائخ" جاری کیا۔
حلقے کی خبروں کے علاوہ اس رسالے میں
بڑے اچھے علمی اور ادبی مضامین شائع
ہوتے تھے۔

رسالوں اور اخباروں کے علاوہ خواجہ صاحب نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔ جن سے اب ان کی آمدنی بھی بڑھ گئی۔ اب تو کتابوں کی اشاعت اور پیری مریدی کا سلسلہ اتنا بڑھ گیا کہ خواجہ صاحب کے لئے اکیلے اتنا کام کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے ان کاموں کے لئے اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ جس سے وہ آخری وقت تک تصنیف و تالیف اور اپنے حلقے کی تبلیغ اور اشاعت کا کام لیتے رہے۔

خواجہ صاحب کی ترقی اور عروج میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اور آہستہ آہستہ بہت بڑے انشا پرداز اور صاحب طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے مریدوں کے حلقے میں بزرگی کا درجہ بھی ملا۔ سیکڑوں تعلیم یافتہ اور مالدار لوگ ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے۔ ملک کے بڑے بڑے لیڈروں اور صاحب اقتدار لوگوں سے ان کے تعلقات ہو گئے اور وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے۔

آخری عمر میں خواجہ صاحب کی تندرستی جواب دے گئی۔ وہ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ انھیں دکھائی بھی کم دیتا تھا اور آخر دو سال کی متواتر اور مسلسل بیماری کے بعد ۳۱ رجولائی ۱۹۵۵ء کو علم و ادب کا یہ درخشاں ستارہ، ملک میں سب سے زیادہ کتابوں کا مصنف، اردو کا زبردست صاحب طرز انشا پرداز، ساٹھ ستر ہزار مریدوں کا پیر اور لاکھوں ہندو مسلم سکھ اور عیسائیوں کا محبوب اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

خواجہ صاحب کی زندگی سے ہم سب کو یہ سبق ملتا ہے کہ اگر انسان کوشش کرے تو وہ اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

جواب "راستہ بتایئے"

ڈوڈو میاں نے کھبا اُٹھایا۔ اپنے گاؤں کا نام تو انھیں معلوم ہی تھا۔ کھبے پر ایک گاؤں کا نام پڑھکر اسی رُخ سے کھبا کھڑا کر دیا۔ اس طرح اُن کو نانی اماں کے گاؤں کا صحیح راستہ معلوم ہو گیا۔

احسن حامد

کلہاڑی کا دلیہ

یہ اس وقت کی بات ہے جب نہ جہاز تھے اور نہ ریل، نہ موٹر اور نہ تانگے۔ بس
ل پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک سپاہی چھٹی لے کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ شام
گئی سردی ایسی پڑ رہی تھی کہ ہاتھ پاؤں گلے جا رہے تھے اور مارے بھوک کے برا حال تھا۔
قسمت کی بات کہ تھوڑی دور پہ ایک گاؤں تھا۔ سپاہی بہت خوش ہوا کہ اب کھانے اور سر
چھپانے کا ٹھکانہ مل جائے گا۔ بس پھر کیا تھا، لپک کر سب سے پہلے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
اندر سے ایک بڑھیا نکلی، نہ منہ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت، کمر سے کمر دوہری اور عقل سے
آدھی دیوانی۔ بولے تو چھتیس مرتبہ گردن ہلے اور چلے تو بس ایسا لگے کہ اب گری اور تب گری۔
دعا سلام کے بعد سپاہی نے اُس سے اپنے رات کے رہنے کے لئے کہا۔ بڑھیا بولی
بڑی خوشی سے رہو بیٹا۔" سپاہی نے سوچا کہ اب پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ آگے آگے بڑھیا
اور پیچھے پیچھے وہ۔ اندر جا کر بڑی بی نے ایک کونے میں خشک گھاس ڈال دی اور کہا "اب سو
جاؤ بیٹا، تھکے ہارے ہو۔"

سپاہی کے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے تھے۔ بھلا بھوکے پیٹ وہ کیسے سو سکتا تھا۔ پہلے تو لحاظ مروت میں کچھ بولا نہیں، مگر جب دیکھا کہ بڑی بی اُسے سوکھا ہی ٹرخا رہی ہیں تو کہا "اچھی بڑی اماں! کچھ کھانے کو ہو تو دے دو، صبح سے بھوکا ہوں۔"

یہ سنتے ہی بڑی بی کے پیروں تلے زمین نکل گئی وہ خود کنجوس مکھی چوس، سینک سلائی سے کھانے والی، بھلا سپاہی کو کھلانے کا کلیجہ کہاں سے لاتیں۔ بولیں

"ارے بیٹا کچھ ہوتا تو میں خود پوچھتی، آئے مہمان کی قدر کرنا میں بھی جانتی ہوں، پر کیا کروں بیٹا! اپنی قسمت ہے کہ جو پرسوں سے ایک دانہ بھی اُڑ کر منہ میں گیا ہو!"

سپاہی نے سوچا کہ یہ بڑھیا بڑی سیانی معلوم ہوتی ہے ہونے کو تو سب کچھ ہوگا مگر کھلانے کی مشکل ہے۔

کمرے میں ایک طرف کلہاڑی پڑی تھی سپاہی نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا "بس ہوگیا بندوبست اب دونوں پیٹ بھر کر کھائیں گے، اور بڑی اماں کھلاؤں گا بھی ایسی نرالی چیز کہ عمر بھر چٹخارے لیتی رہو"

یہ سنتے ہی بڑی بی کے پوپلے منہ میں پانی بھر آیا اور پوچھنے لگیں "وہ کیا چیز ہے ہم بھی تو جانیں۔"

سپاہی بولا "کبھی تم نے کلہاڑی کا دلیا بھی کھایا ہے بڑی اماں!" بڑی بی کان پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولیں "کیا کہا بیٹا! کلہاڑی کا دلیا! میں نے تو ایسا دلیا نہ دیکھا اور نہ سنا کھانے کا تو ذکر ہی کیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے بڑی بی بھلا تم نے کہاں کھایا ہوگا۔ تم تو یہاں گاؤں میں پڑی رہتی ہو ذرا شہر جا کر تو دیکھو لوگ کیسے کیسے رنگ برنگے کھانے پکاتے ہیں۔"

بڑی بی نے پوچھا وہ کیسے پکتا ہے سپاہی نے بتایا کہ بڑی آسان ترکیب ہے پھر بڑھیا سے آگ جلانے اور پتیلی میں پانی بھرنے کو کہا۔ بڑی بی نے جلدی جلدی آگ سلگائی اور پانی لے آئیں۔ سپاہی نے لکڑی کا دستہ نکال کر الگ پھینک دیا اور کلہاڑی پانی میں ڈال، آگ پر چڑھا دی اور وہ چمچا چلانے لگا۔ اور بڑی بی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سپاہی

رگھو رنے لگیں۔ جب پانی ذرا گرم ہو گیا تو سپاہی بولا" اگر تھوڑا سا نمک ہوتا تو بڑی اماں دلیا پھیکا نہ رہتا" بڑی بی جھٹ پٹ گئیں اور نمک لے آئیں۔

سپاہی نے نمک ڈال کر چمچا چلانا شروع کیا، تھوڑی دیر میں وہ پھر پانی چکھ کر بولا "بڑی اماں اگر مٹھی بھر چاول مل جاتے تو دلیہ ذرا گاڑھا پکتا"

بڑی بی نے جواب دیا" ہاں بیٹا تھوڑے سے جو کے دانے پڑے تو ہیں۔ کہے تو لا دوں"

بڑی بی جھٹ پٹ اٹھیں اور دوسرے سے جو کا تھیلہ اٹھا لائیں اور سپاہی حوالے کر دیا۔ سپاہی نے جو کھولتے ہوئے میں ڈال دئے اور پھر چمچا چلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دانے نکال کر اور بولا کہ" بس اب ایک چیز کی کسر وہ ہوتی تو مزہ آ جاتا"

بڑی بی نے پوچھا "وہ کیا بیٹا" سپاہی کہا ذرا سا گھی اگر ہوتا تو کیا کہنے مگر رے پاس تو گھی ہوگا نہیں"

"بڑھیا نے سوچا کہ جہاں سیر وہاں سوا سیر، گھی کی کسر رکھ کر ہانڈی کا مزہ کیوں خراب کروں۔ جی کڑا کر کے بولیں "ہاں بیٹا ذرا سا گھی پڑا تو ہے"

بڑی بی نے اپنا گھی کا برتن بھی لا کر سپاہی کے حوالے کیا۔ سپاہی نے خوب بھر بھر چار چمچے گھی پتیلی میں ڈال دیا اور پتیلی چولھے سے اتار لی اور ہنستا ہوا بولا "چلو بڑی اماں کلہاڑی کا دلیہ پک گیا"

دو رکابیوں میں نکال دونوں کھانے بیٹھ گئے۔ بڑی بی بھی خوش تھیں کیوں کہ انھیں کلہاڑی کا دلیا کھانے کو مل گیا تھا اور سپاہی بھی مگن تھا کہ بڑھیا کو خوب پٹی پڑھائی۔

"گھی کبھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا" کہئے سچ ہے نا۔

دوکار آمد جانور

یوسف اکولوی

یاک YAK

یہ بھینس جیسا کالا اور بڑا جانور ہوتا ہے۔ جس کے سینگ گول اور مُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض یاک سفید اور کالے بھی ہوتے ہیں۔ دونوں بازوؤں پر نرم اور لچکیلے بال اور دُم پر گھوڑے کی دُم کی طرح لمبے بال ہوتے ہیں۔ جو پردے کی طرح لٹکے رہتے ہیں جو کبھی کبھی زمین سے بھی چھوتے ہیں۔ اس کے بال رسّی اور خیمہ بنانے کے کام آتے ہیں۔ اس کی آواز سُوَر کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔ یاک کی دُم بہت قیمتی ہوتی ہے اور تبت سے دوسرے ممالک کو برآمد کی جاتی ہے۔ تبّت کے علاقوں میں اور ہمالیہ کے اونچے جنگلات میں یاک باربرداری کے کام آتا ہے یہ کافی اور بھاری وزن ایک دن میں بتیس میل تک لے جاسکتا ہے۔ اس سے دودھ، مکھن گوشت اور کپڑے بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔

REINDEER

رینڈیر یورپ اور ایشیا کے شمالی حصوں میں پایا جاتا ہے۔ نر کے سینگ مادہ سے بڑے اور پھیلے ہوئے، ہوتے ہیں جو ہر سال گرتے ہیں اور پھر نئے نکل آتے ہیں یہ گورا اور بھرے جسم کے اس جانور کی جسمانی ساخت آب ہوا کے مطابق ہوتی ہے اور عموماً یہ چار فٹ اور چھ انچ لمبا ہوتا ہے۔ یہ نگاہ میں تیز اور قدم میں نہایت سبک رفتار یعنی دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے۔ وزن میں چار من کے قریب ہوتا ہے۔ یہ بے پہیوں کی گاڑی یعنی سلیج کے علاوہ سو سیر کا وزن اور بھی کھینچ سکتا ہے۔ جس طرح اونٹ ریگستان میں کار آمد ہے اسی طرح ٹھنڈے ملکوں میں رینڈیر مفید ہے۔ ان باتوں کے علاوہ دودھ، خوراک اور کھالیں بھی اس کی نہایت مفید ثابت ہوئی ہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ اپنی غذا برف میں سے سونگھ کر نکال لیتے ہیں۔ اگر اسے وہ غذا پسند ہو تو ایک اِک دن میں ۱۲، ۱۲ سیر کھا لیتا ہے۔

نیچے کی تصویر اب سے ہزاروں سال پہلے کی ہے۔ جو ہمارے آباو اجداد نے چٹانوں پر کھود کر بنائی تھیں اور مورخوں نے ان کو چٹانوں پر دیکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رینڈیر بڑا قدیم جانور ہے۔ اور ہمارے آباو اجداد اس سے خوب واقف تھے۔

معین الدین

"مینڈک کی پیٹھ پر مسا"

ایک گاؤں میں ایک لکڑ ہارا رہتا تھا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر گزر بسر کرتا۔ لکڑیاں کاٹتے کاٹتے ایک دن اس کی کلہاڑی کی دھار اتنی خراب ہو گئی کہ اس کو تیز کیے بغیر لکڑی کاٹنا مشکل ہو گیا۔ لکڑ ہارا اپنی کلہاڑی پر دھار رکھنے کے لیے ایک پتھر کی تلاش میں نکلا۔ دریا کے کنارے اُسے ایک پتھر نظر آیا۔ اور وہ وہیں بیٹھ کر کلہاڑی کو پتھر پر رگڑنے لگا۔ اتنے میں ایک جھینگے نے پانی سے اپنا سر باہر نکالا اور اس نے لکڑ ہارے کے پاؤں میں بڑے زور سے کاٹ لیا۔ لکڑ ہارے نے غصّے میں آکر ایک درخت کو کاٹ ڈالا۔

درخت بالکل بے قصور تھا۔ لیکن اس طرح کاٹے جانے پر اس کو بھی غصّہ آیا۔ اس نے اپنا ایک پھل چوزے میاں کی پیٹھ پر گرا دیا۔ چوزے میاں بہت بھنّائے اور اُنھوں نے خفا ہو کر چیونٹیوں کے ایک چھتّے کو اپنے پنجے سے کرید ڈالا۔ چیونٹیوں کو جو غصّہ آیا تو وہ ایک سانپ پر ٹوٹ پڑیں اور انھوں نے سانپ کو زخمی کر دیا۔

سانپ غصّے سے پھنکارتا ہوا ایک جنگلی سور کی طرف لپکا اور اس کے اتنے زور

سے کاٹا کہ سور چیختا ہوا جنگل کی طرف بھاگتا چلا گیا وہاں اُس نے ایک کیلے کے پیڑ کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالا۔ یہ درخت ایک ہاتھی کے اُوپر گرا۔ اس پر ہاتھی کو بہت غصہ آیا اور اس نے اپنے سونڈ سے ایک بہت بڑا درخت اُکھاڑ کر نیچے پھینک دیا۔ یہ درخت ایک بڑھیا کے چھپر پر گرا۔ چھپر تتر بتر ہوگیا۔ بڑھیا روتی دھوتی ہاتھی کے پاس آئی اور بولی۔

"میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا، جو تم نے میرا گھر اُجاڑ دیا۔" ہاتھی نے جل کر کہا۔ "میں کیا کروں سور نے کیلے کے پیڑ کو اُکھاڑ دیا" اور یہ پیڑ میرے اُوپر گرا۔ میں نے درخت گرایا۔ بات برابر ہے۔"

اب بڑھیا اور ہاتھی سور کے پاس گئے اور سور سے یہی سوال کیا۔ سور نے کہا "سانپ نے میرے کاٹا۔ میں نے کیلے کے پیڑ کو اُکھاڑا بات برابر ہے۔"

پھر بڑھیا ہاتھی اور سور، سانپ کے پاس گئے، سانپ نے کہا "چیونٹیوں نے مجھے کاٹا، میں نے سور کے کاٹا۔ بات برابر ہے"

اب بڑھیا، ہاتھی، سور، سانپ، چیونٹیوں کے پاس گئے۔

چیونٹیوں نے کہا "چوزے نے ہمارے چھتے کو کُریدا ہم نے سانپ کو کاٹا۔ بات برابر ہے۔" اب بڑھیا، ہاتھی، سور، سانپ اور چیونٹیاں چوزے کے پاس گئے۔ چوزے نے کہا "پیڑ نے اپنا پھل میرے سر پر گرایا۔ میں نے چیونٹیوں کے چھتے کو کریدا بات برابر ہے۔" اب بڑھیا، ہاتھی، سور، سانپ، چیونٹیاں اور چوزے، درخت کے پاس گئے۔ درخت نے کہا "لکڑ ہارے نے مجھے کاٹا۔ میں نے اپنا پھل چوزے پر گرایا۔ بات برابر ہے۔" اب بڑھیا، ہاتھی، سور، سانپ، چیونٹیاں، چوزے اور پیڑ، لکڑ ہارے کے پاس گئے۔ لکڑ ہارے نے کہا "جھینگے نے میرے پاؤں پر کاٹا، میں نے درخت کو کاٹا، بات برابر ہے۔" اب بڑھیا، ہاتھی، سور، سانپ، چیونٹیاں، چوزے، پیڑ اور لکڑ ہارا جھینگے کے پاس گئے۔

جھینگا کسی کی شکایت نہ کر سکا اس نے شرم سے گردن جھکا لی۔ ان سب کو بہت

غصہ آیا اور یہ طے کیا گیا کہ جھینگے کو اُبلتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ایک بڑے سے برتن میں پانی کھولنے کے لئے رکھ دیا گیا اور اس میں جھینگے کو ڈال دیا گیا اور اوپر سے برتن کو ڈھک دیا۔

برتن کو چاروں طرف سے سب گھیرے ہوئے تھے اور بار بار برتن کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھتے لیکن جھینگے کا کہیں پتہ نہ تھا وہ پانی کی تہہ میں بیٹھ گیا تھا۔ اب سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور آپس میں چاؤں چاؤں کرنے لگے۔ اتنے میں ایک مینڈک وہاں آپہنچا۔

مینڈک نے پوچھا "کیا بات ہے بھائی کیوں لڑ رہے ہو؟" سب نے مینڈک کو پوری کہانی سنائی۔ مینڈک یہ سن کر برتن کے پاس پہنچا اور بولا "اس برتن میں پانی زیادہ ہے اس لئے اچھی طرح نہیں کھولتا اس کا ڈھکن کھولو تا کہ میں تھوڑا سا پانی پی لوں" ڈھکن کھولا گیا۔ مینڈک نے منہ لگا دیا اور پانی غٹا غٹ غٹا غٹ پی گیا۔ تھوڑی دیر میں برتن تو خالی ہو گیا۔ لیکن جھینگے کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سب حیرت سے منہ کھولے مینڈک کو تک رہے تھے! مینڈک نے گھبرا کر کہا "آپ سب جانتے ہیں میرے منہ کا دہانا کتنا چوڑا ہے۔ میں پانی کے ساتھ جھینگے کو بھی پی گیا۔"

یہ سنتے ہی سب کے سب مینڈک پر پل پڑے اور اس کی پیٹھ پر اتنی چٹکیاں لیں کہ اس پر مسا بن گیا۔ اسی روز سے آج تک مینڈک کی پیٹھ پر یہ مسا موجود ہے۔ اور اسی لئے مینڈک پھدکتا رہتا ہے جیسے کوئی اس کی پیٹھ پر چٹکی لے رہا ہے۔

برسات کی ایک رات

افتخار احمد اقبال

کل رات سوتے سوتے مری آنکھ کھل گئی
بارش ہوئی تھی خوب، کہ پرنالے بہہ گئے
کچھ ڈال گر پڑے تھے وہیں ٹوٹ ٹوٹ کر
اب آسماں پہ ابر کے ٹکڑے تھے جم گئے
بجلی کی روشنی میں چمکتی تھیں تتلیاں
لے لو! ہوا نے ڈالیوں میں گدگدی سی کی
ایسا لگا کہ پھولوں نے موتی لٹا دیئے
تارے بھی بادلوں سے کبھی جھانکنے لگے
ٹھنڈی ہوا چمن میں نئے گل کھلا گئی
میں سوچنے لگا کہ یہ برسات کی بہار

دیکھا تو باغ کی تھی ہر اک چیز دھل گئی
اس سے زیادہ یہ کہ ندی نالے بہہ گئے
روتے تھے پیڑ جن کے لیے پھوٹ پھوٹ کر
پانی کے دھارے خوب پڑے اور تھم گئے
جیسے سلگ رہی ہوں ہزاروں ہی بتیاں
اور پتیوں سے بوندوں کی بوچھار سی گری
یا پتیوں نے آنکھ سے آنسو بہا دیئے
ہنس ہنس کے اپنا منہ بھی کبھی ڈھانکنے لگے
پانی پڑا بہار ہر اک شے پہ آ گئی!
کلیوں کا حسن، پھولوں کا، پتوں کا نکھار

کل اک نئی صبح کا یہ انعام لائے گا!
محنت کا سب کے واسطے پیغام لائے گا!

کارٹون

جناب عالی میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا سچ مچ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے

پروفیسر مبارز الدین رفعت

انڈونیشیا کا ایک جزیرہ ۔ بالی

انڈونیشیا کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ یہ ملک پہلے ڈچ حکومت کی غلامی میں تھا۔ ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو آزاد ہوا اور وہاں قومی حکومت کی بنیاد پڑی۔ ایشیا کا نقشہ اٹھا کر دیکھئے۔ ملایا کے نیچے آپ کو بہت سے ٹاپو نظر آئیں گے یہی انڈونیشیا ہے۔ یہ ملک جزیروں کا ملک ہے۔ بڑے چھوٹے ہزاروں جزیروں سے مل کر بنا ہے۔ ان جزیروں میں کچھ تو ایسے ہیں کہ چھوٹے نقشے میں سرے سے دکھائے ہی نہیں گئے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں کہ سوئی کے برابر نظر آتے ہیں۔ ان جزیروں کی تعداد تین ہزار سے بھی زیادہ ہے۔

بھارت اور انڈونیشیا کے جزیروں کا آپسی رشتہ بہت پرانا ہے۔ پرانے زمانے سے بھارت کے لوگ ان جزیروں میں آتے جاتے رہے ہیں۔ یہاں انھوں نے کبھی اپنا دھرم پھیلایا تھا۔ اپنی ریاستیں بنائیں اور سُندر سُندر مندر بنوائے تھے جو اب تک قائم ہیں۔ بعد میں یہاں کے لوگوں نے دوسرے مذہب قبول کر لئے۔ لیکن اب بھی 'بالی' اور اس کے آس پاس کے جزیروں میں زیادہ تر ہندو مذہب کے ماننے والے ہی بستے ہیں۔

بالی ایک چھوٹا سا خوبصورت ٹاپو ہے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ ہر طرف ہرے بھرے کھیت ہیں، اور سمندر کے کنارے اونچے اونچے ناریل کے پیڑ ہیں۔ سمندر کا نیلا پانی، اس کے کنارے ہوا سے جھومتے ہوئے ناریل کے پیڑ، جگہ جگہ پہاڑیاں اور بیچ بیچ میں ہرے بھرے کھیت، یہ سب مل کر ایک ایسا حسین منظر آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں کہ بس اسے دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہتا ہے۔

بالی جزیرے کی پچھلی تاریخ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں کچھ ہندستانی یہاں آ کر بس گئے تھے۔ بالی پہلے جاوا کی حکومت میں شامل تھا، پھر ماجا پہٹ راجاؤں نے اسے اپنایا اور جب ان کا زمانہ ختم ہو گیا اور جاوا میں اسلام پھیلا تو یہ جزیرہ پھر جاوا سے الگ ہو گیا۔ یہاں کے لوگ ہندو ہی رہے۔ اب بالی ملی جلی ہندستانی اور جاوی تہذیب کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ جیسے قدیم بھارت میں سماج کی بنیاد ذات پات پر رکھی گئی تھی

ویسے ہی بالی کے لوگوں میں براہمن، کھتری، ویش اور شودر چار ذاتیں مانی جاتی ہیں۔ بالی کے ہندو چاروں ویدوں کو مانتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے دیوتا برہما، وشنو اور شیو ہیں۔ رامائن اور مہابھارت سے تو بالی کا بچّہ بچّہ واقف ہے۔ اور بالی کے ناٹک اور بالی کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں ان ہی مقدس اور مشہور کتابوں سے متعلق ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ بہت اچھا ناچنا جانتے ہیں۔ ان کے ناچ کا دور دور تک چرچا ہے بالی کی لڑکیاں جب ناچتی ہیں تو ان کا ناچ دیکھ کر جی پھڑک اٹھتا ہے۔ بالی کے ناچ پر ہمارے یہاں کے ناچ کی گہری چھاپ ہے۔ بھارت کی طرح بالی کے دیہاتوں میں بھی لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان جھونپڑیوں کے چاروں طرف مٹّی یا اینٹ کی دیوار اٹھا دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں ایک اور چیز نظر آتی جو ہمارے یہاں نہیں ہوتی۔ ہر گھر اپنے میں باہر دیوار کے پاس چھوٹے چھوٹے مندر بنے ہوئے ہیں۔ یہ مندر اس گھرانے کے پچھلے بزرگوں کے نام پر بنائے جاتے ہیں۔ ان کے

ہر وقت چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ دیہات کا سب سے بڑا مرکز مندر ہوتا ہے۔ اس میں تین بڑے ہال ہوتے ہیں۔ یہاں صرف عبادت ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ گاؤں کا پنچایت گھر بھی ہوتا ہے۔ جہاں آپسی جھگڑوں کے فیصلے ہوتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہاں کھیل تماشے بھی کئے جاتے ہیں۔ گاؤں کی سیاست، اور سماجی باتوں پر یہیں بیٹھ کر سوچ بچار کیا جاتا ہے۔ یہیں ڈرامے بھی کھیلے جاتے ہیں اور ناچ بھی ہوتے ہیں، اور یہاں گانے کی سنگیت سبھا بھی جمائی جاتی ہے۔

بالی جزیرہ کے ساحل پر مونگا بھی ملتا ہے مونگا ایک چھوٹا سا سمندری کیڑا ہے۔ جس کا جسم شروع میں جیلی کی طرح گلگلا اور نرم ہوتا ہے۔ یہ کیڑے اپنی خوراک کی تلاش میں سمندر کی تہہ میں چھپی ہوئی چٹانوں سے چپٹ جاتے ہیں۔ جہاں ان کے جسموں پر اور ان کے جسموں کے درمیانی جگہ پر سمندری چونا بھر جاتا ہے۔ مرنے پر ان کے جسم چٹان کی طرح ہو جاتے ہیں۔ گرم سمندروں کے جزیروں کے ساحل پر مونگے سے بنی ہوئی چٹانیں اکثر نظر آتی ہیں۔

ہاں آپ پوچھیں گے یہاں کے لوگوں کی زبان کیا ہے؟ یہاں جو زبان سب سے زیادہ بولی جاتی ہے وہ ملائی زبان ہے۔ اس زبان میں ڈچ، جاوی اور سنسکرت زبانوں کے بہت سے لفظ آ گئے ہیں۔ سنسکرت زبان کے لفظ سب سے زیادہ ہیں۔

بالی کے لوگ بڑے ہنس مکھ اور ملنسار ہیں۔ یہ لوگ باتونی ہیں اور جلدی جلدی باتیں کرتے ہیں۔ مہمان کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ ہندستانیوں سے تو انھیں بڑا پریم ہے۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال سے انھیں بڑی عقیدت ہے۔ انڈونیشیا کی آزادی کے سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑی گہری دلچسپی لی تھی، انڈونیشیا کے سب ہی لوگ اور خاص طور پر بالی کے لوگ ان کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں اور اس کا بڑا احسان مانتے ہیں۔

اگر کبھی آپ کو بالی جانے کا موقع ملے تو یہ محسوس ہوگا کہ جیسے آپ کسی پرائے ملک میں نہیں بلکہ اپنے دیس ہی کے کسی حصے میں گھوم رہے ہیں۔

الیاس مجیبی

منشی جی

ہماری بستی میں ایک بزرگ تھے، سچ مچ بزرگ ہی تھے وہ، سرخ سفید نورانی چہرا مہرا، سفید بگلا سی ڈاڑھی اور اس پر سفید پگڑی۔ بیٹھا بیٹھا کر کے بات کرتے، چھوٹے بڑے پر مہربانی کی نگاہ رکھتے۔ مال و دولت میں بھی کم سے کم ہماری برادری میں تو اُن سے بڑا کوئی نہ رہا۔ خاصا بڑا زمینداری علاقہ کہ اگر اودھ میں ہوتے ضرور تعلقدار کہلاتے۔ غرض سبھی کچھ تھا، روپیہ پیسہ بھی، نام بھی اور بستی بھر میں کیا ہندو کیا مسلمان سبھی انھیں اپنا بڑا مانتے۔ لیکن انھوں نے خود کبھی اپنے کو بڑا آدمی سمجھا نہ شیخی گھمنڈ کو پاس پھٹکنے دیا۔ بہت ہی سادہ زندگی رہی ان کی۔ دینی پیشواؤں کے نام پر اُن کا نام تھا، لیکن بستی کا ہر چھوٹا بڑا اُنھیں منشی جی، منشی جی ہی کہا کرتا۔

بات یہ ہے منشی جی کی خاصی بڑی جائداد رہی جو آج تک ہے تو سہی لیکن بھارتی [illegible] سبھی زمینداریوں کو ختم کر چکا ہے، پھر بھی ان کے پوتے پڑوتے اسی کے بل بوتے پر [illegible] سے کاٹ رہے ہیں اور کچھ دوسرے شریفانہ دھندے بھی کرنے لگے ہیں۔ خیر تو منشی جی [illegible]

جائداد کی دیکھ بھال خود ہی کرتے، پائی پائی کا حساب لکھتے، کارندوں کا دیا ہوا حساب جانچتے پڑتالتے۔ اگلے وقتوں میں کیا ابھی تک بڑے دکوں کو عام طور پر منشی جی ہی کہا اور لکھا جاتا ہے۔ منشی جی نے اپنی کوٹھی میں کپڑے کا بیوپار بھی کھول رکھا تھا، بستی برادری اور گاؤں گاؤں کے لوگ ڈھیر ڈھیر کپڑا قرض لے لے جاتے، بہتیرے مار بھی کھاتے، لیکن منشی جی انھیں بھی نباہتے۔ وہ چاہتے تو ایسوں کے گھر نیلام کرا لیتے مگر ایسا کڑا دل منشی جی کہاں سے لاتے۔ کہا کرتے بھئی وہ آدمی ہمارا روپیہ دبا بیٹھا ہمارا نصیب کہاں لے جائے گا، اللہ ہمیں اس کا بدلا کہیں اور دے گا۔

منشی جی نے اپنے پوتوں پڑوں کو دیکھا، وہ نہایت با اقبال اور بہت خوش نصیب آدمی رہے۔ اُن کی زندگی ہی میں زمانہ کچھ کچھ بدلنے لگا تھا، کم سے کم روپے پیسے والوں کا رہن سہن بدل چکا تھا۔ لیکن منشی جی نے اپنی وضع نہ چھوڑی، وہی انگرکھا پاجامہ، سر پہ سفید صافہ، اور جو کبھی بھائی برادری یا بستی میں کسی تقریب سے جانا ہوتا منشی جی اوپر سے کالے رنگ کی عبا بھی پہن لیا کرتے تھے۔ یہ کالی عبا پہننی اُنھوں نے حج کرنے کے بعد شروع کی تھی۔ اور جناب جاڑوں کی رُت میں منشی جی روئی کا انگا، روئی کا پاجامہ پہنا کرتے جو اُن پر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔

بڑی ساری اپنی کوٹھی کے بہت بڑے صحن میں، اصل عمارت سے پرے ہٹ کر ٹھیک بڑے پھاٹک کے سامنے ایک پلنگڑی پر بیٹھے پائے جاتے۔ پیچھے گاؤ لگا، سامنے ایک خاصا بڑا سا صندوقچہ دھرا، سائل آتے، اپنی قسمت کا کچھ نہ کچھ لے ہی جاتے۔ اِدھر اُدھر مونڈھے پڑے رہتے، آنے جانے والے اُنھی پر بیٹھتے اور اسی شان سے منشی جی بستی کے بڑے بڑے لڑائی جھگڑے اور ٹنٹے چکاتے۔

خود منشی جی کی تو اولاد نہیں تھی پر اپنے چھوٹے بھائی کی اولاد پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ اُن کی مرضی، اُن کے مزاج کے خلاف ہی سہی، یہ اولاد کی خاطر، خوشی پوری کرنے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے ایک بار پوتوں نے سازش کی آپس میں کہ موٹر لی جائے۔ لیکن موٹر لی جائے تو کیونکر لی جائے، اس کے لئے تو

خاصی بڑی رقم چاہیئے۔ بڑے پوتے صاحب کا دماغ خاصا چلتا ہے، انھوں نے چھوٹے بھائی کو پٹایا کہ بھئی تمھیں ابّا زیادہ چاہتے ہیں، تم کہو ابّا سے، وہ تمھاری بات نہ ٹالیں گے۔ خیر تو صاحب چھوٹے میاں اپنے ابّا (منشی جی) کے سر ہی تو ہو گئے اور منشی جی ہنستے، قہقہے لگاتے اور بہلاتے سمجھاتے رہے کہ موٹر تو بڑے لوگ رکھتے ہیں اور ہم ٹھہرے غریب آدمی، بھلا ہمارا کام ہے موٹر کا رکھنا؟ یہ نادانی کی بات ہے، یہ خیال دل سے نکال ڈالو۔ مگر چھوٹے صاحب پیچھے ہی تو پڑ گئے، رونے لگے تو بچارے منشی جی نے ہتھیار ڈال دیے کہ وہ بچوں کا دل میلا کرنا کسی حال میں گوارا نہ کر پاتے رہے۔

تو صاحب تو منشی جی اُٹھے پلنگڑی پر سے، جھومتے جھامتے کوٹھی کی طرف چلے۔ تجوری کھول روپیہ نکال پوتے کے حوالے کیا۔ کیا پوچھئے پوتوں کی خوشی کا حال، پھولے نہ سماتے، دوسرے ہی دن دونوں بھائیوں نے دلّی کا ٹکٹ لیا اور وہاں سے خاصی بڑی سی کار لے ہوا سے باتیں کرتے گھر واپس آ گئے۔ بستی بھر میں دھوم مچ گئی کہ منشی جی کے موٹر گاڑی آئی! دُور دُور سے لوگ آتے، دیکھتے، منشی جی سے تعریف کرتے اور منشی جی ہنس کر ٹال دیتے، زیادہ کچھ دلچسپی نہ لیتے۔ اُن کو خوشی تھی نہ اُن پر کوئی خاص اثر تھا، ہاں اپنے بچوں کی خوشی سے خوش تھے اور بس۔

منشی جی بوڑھے ہو گئے تھے، پھر بھی مہینے دو مہینے پیچھے اپنی ننھیال کا پھیرا ضرور کر لیتے تھے۔ ننھیال ہوگی کوئی تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر۔ ایک دن پوتوں نے سوچا کہ بھئی موٹر تو آ لی پر ابّا نے ابھی تک موٹر میں سواری نہیں کی یہ تو کچھ ٹھیک بات نہ رہی۔ چھوٹے صاحب نے ایک دن منشی جی سے درخواست کی تو انھوں نے کہا "نہیں بھئی، یہ فرنگی کے بنائے ہوئے شیطانی چرخے ہیں اور اور اس گئے گزرے وقت میں کیا بیٹھیں۔ چھوٹے صاحب پھر پیچھے پڑے اور ایک چلتا ہوا سا فقرہ یہ جڑا کہ "ابّا! ننھیال بھی تو نہیں گئے ہیں آپ بہت دن سے!"

یہ جو سُنا تو منشی جی مارے خوشی کے کھِل ہی گئے، پھر اُن سے کوئی حیلہ بہانا کرتے نہ بنا، جھٹ پٹ تیار ہو گئے۔ موٹر میں جو

بیٹھے تو بہت مزا آیا اور جناب وہ جو فر فر کرتی چلی
ہے تو باتیں کرتے کرتے چند ہی منٹ میں پہنچ گئے۔
اسی سے منشی جی اور بھی اچنبھے میں پڑ گئے، بولے
کہ میاں وہ قصے کہانیوں میں اُڑن کھٹولے سُنا
کرتے تھے، یہ تو کچھ اُسی قسم کی سواری ہے،
واہ بھئی واہ۔ لیکن اپنے پوتوں سے کہنے لگے کہ
بیٹا! "یہ ہے بڑے لوگوں کے رکھنے کی سواری
ہمارا کام نہیں یہ مہنگی اور خرچیلی سواری کا رکھنا۔
منشی جی اپنے تئیں بڑا آدمی کبھی نہ سمجھے،
مگر سچ یہ ہے وہ تھے بڑے ہی آدمی، روپیہ پیسے
میں تو بڑے تھے ہی، عادت خصلت اور لوگوں
کے ساتھ نیک سلوک اور رکھ رکھاؤ میں خاص
کر۔ بھائی برادری والوں کے ساتھ برابری یا
محبت ہی کا برتاؤ کرتے، اپنی ریاست یا اپنے
روپے کی دھونس کبھی نہ جماتے۔ ایک بار کیا ہوا
کہ اُن کا ایک نائی تھا، رام سروپ نامی۔ وہ اُن
کے بچوں کی حجامت بنا کر سیدھا اپنے گھر کو جانے
لگا۔ بات یہ تھی کہ اُس دن اُسے دیر بھی ہو گئی
تھی اور شاید کچھ ضروری کام بھی تھا۔ پڑوس
میں جو ایک خاں صاحب رہتے تھے اُنھیں
رام سروپ کے یہ تیور برے لگے۔ اُسے بلایا۔
آپ جائیں وہ ٹھیرا بڑے گھر کا نائی، اس
نے کچھ بدتمیزی کی۔ اب کیا تھا، خاں صاحب
نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، نائی بچارے کو
پیٹ دیا۔ نائی نے جا کر منشی جی سے فریاد
کی۔ اس وقت تو منشی جی نے رام سروپ
کو بہلا بہلو دیا کہ بھئی ہم ڈانٹیں گے اُنھیں
پھر اُسے کچھ دے دلا چلتا کر دیا، بات آئی
گئی ہوئی۔ دو چار دن ہوئے کہ ایک روز
منشی جی معمول کے خلاف زنانہ ڈیوڑھی
سے باہر نکلے، اُسی کے سامنے ایک چوک
سا ہے، اور اُسی میں اُن خاں صاحب
نے ایک بڑی سی جھونپڑی ڈال بیٹھک سی
بنا رکھی ہے۔ منشی جی کی جھلک جو پائی تو
وہ خاں صاحب ذرا دبکے، لیکن منشی جی
نے بھی اُنھیں دیکھ لیا تھا، ڈانٹ کر، اور
بناتے ہوئے کچھ تیکھے تیوروں سے بولے:
"کون ہے؟"
"میں ہوں منشی جی آپ کا بھتیجا۔" خاں صاحب
نے جواب دیا۔
منشی جی قہقہہ لگا کر ہنسے، بولے "بہت
خوب، ہمارا بھتیجا کر چچا! بھتیجوں کے ہی لچھن

بھتے ہیں؟"

خاں صاحب سمجھ تو گئے کہ بات کیا ہے، منشی جی کیا کہنا چاہتے ہیں، مگر چپ ہو رہے۔ منشی جی نے پھر ڈانٹا، کیسا پٹھان ہے، حقہ نہیں رکھتا؟

خاں صاحب نے جلدی سے حقہ بھر منشی جی کے آگے لگا دیا۔ اب منشی جی حقہ پیتے جاتے، بولے کہ پرانی ڈانگ کا تمباکو معلوم ہوتا ہے پرانی ڈانگ کا۔ بھئی خوب ہے تمہارا حقہ بھی اور تمباکو تو بہت اچھا ہے۔ گلا زرا نہیں کٹتا، صاف آتا ہے اور کڑا بھی خاصا ہے۔ غرض ادھر کی بات اُدھر کی بات اور جناب اسی میں ایک بار ناٹی کی بات بھی چھڑ ہی گئی۔ اب تو منشی جی نے خاں صاحب کو بہت شرمندہ کیا کہ بہت افسوس کی بات ہے، ان غریبوں پر ہاتھ اٹھانا بھلے مانسوں کا کام نہیں، یہ تو ہمارے تمہارے دعاگو، خدمتی بندے ہیں، بے شک یہ ہمارا ہی دیا کھاتے پہنتے ہیں، پر یہ بھی تو سمجھو ہمارے بھی تو ان سے بہتیرے کام چلتے ہیں۔ دیکھو بیٹا یہاں کمّا غریبوں کو ستانا، دُکھ دینا کوئی اچھی بات نہیں، خدا کو یہ بات کبھی نہیں بھاتی اور نہ ہم کو۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

خاں صاحب آج تک یہ بات بھولے نہیں، اکثر سناتے اور پچھتاتے ہیں۔ منشی جی کی بزرگی اور ان کی بزرگانہ شان کے قائل ہیں۔

بھئی یوں تو پچاسوں باتیں ہیں منشی جی کی، اب کیا کیا سنائیں آپ کو، پر ایک بات اُن کی ایسی شئی، باوَن تولے پاؤ رتی، سچ سچ وہ بات لکھنے کی بات ہے۔ منشی جی کے زمینداری علاقے میں ایک گاؤں ہے جو رائے پتھورا کے نام پر آج تک پتھورا ہی کہلاتا ہے۔ اس کا ایک پٹواری تھا پربھولال نامی۔ بڑی ہی خوبیوں کے آدمی رہے لالہ پربھولال۔ ایک تحصیل دار دورے پر نکلے، ساتھ میں لالہ پربھولال بھی لیے ادھر اُدھر گھوم گھام کوٹھی پہنچے۔ خبر نہیں کیا بات رہی باتوں باتوں میں تحصیل دار کسی بات پر پربھولال کو گالی دے بیٹھے کہ بے ایمان ہے تو!

اوہو، پربھولال کو تو جو بھی دکھ ہوا ہو، کوئی اچنبھے کی بات نہیں، مگر یہ بات منشی جی کو

بہت بری لگی، اُن جیسے نرم دل اور بے نفس بزرگ کے جیسے آگ ہی تو لگ گئی۔ منشی جی نے پربھو لال سے جھلا کر کہا "پربھو لال اسی وقت استعفیٰ دے دو، لعنت بھیجو اس نوکری پر، اس پٹواری گری پر جس میں بھلے مانسوں کو بے ایمان بننا پڑے۔ تحصیل دار جو تھے بہت سٹ پٹائے کہ یہ مجھ سے کیا بھول ہوئی، لگے منشی جی کی خوشامد کرنے۔ لیکن منشی جی نے ایک نہ سُنی، کہنے لگے "تم کو خبر ہے یہ تم سے زیادہ ایماندار ہے، تم اسے کیا جانو، اِسے میں جانتا ہوں۔ اور تم لوگ تو جیسے ایمان دار ہو وہ بھی مجھ سے چھپا نہیں ہرگز نہیں، اب یہ پربھو لال پٹواری گری نہیں کرے گا، زندگی بھر میرے یہاں رہے گا"

تحصیل دار نے سب ہی جتن کیے، پربھو لال کو بھی منانا چاہا، منشی جی کی بھی بہتیری خوشامد کی، لیکن اُنھوں نے ایک نہ مانی اور نہ پربھو لال نے پرواہ کی اپنے وطن کا استعفیٰ دے ہی تو دیا۔ جو منظور ہو گیا۔

آخر پربھو لال جب تک منشی جی کے مختار عام اور کارندے ہو کے پوری دیانت سے کام کرتے رہے۔ منشی جی تو برسوں پیچھے جنت کو سدھار سے، لیکن پربھو لال بڑھاپے تک وفاداری کے ساتھ اس گھر کی سیوا کرتے رہے۔ ابھی دیکھتے دیکھتے، چند سال پہلے بچارے پربھو لال بھی سورگ باشی ہوئے نام چھوڑ گئے۔

سدا رہے نام سائیں کا

بقیہ "کمرے میں باغ"

وہ سانس لیتے ہیں اگر یہ مسام دھول مٹی سے اَٹ جائیں تو پودوں کو کافی ہوا نہیں ملے گی جس سے وہ سوکھ جائیں گے۔ جنگلوں میں تیز ہوا اور بارش ان کو صاف کرتی رہتی ہے لیکن یہاں آپ کو خود یہ کام کرنا پڑے گا۔ اس لئے کسی دن جب دھوپ تیز ہو ان پودوں کو ہلکے گرم پانی سے دھار دینا چاہیئے۔

روشنی بھی پودوں کے لئے ضروری ہے لیکن ایسے پودے جو کمرے کے اندر لگائے جائیں ہمیشہ تیز دھوپ سے بچائے جاتے ہیں اس لئے انہیں اٹھا کر دھوپ میں نہ رکھئے ورنہ وہ جھلس جائیں گے۔

پہلا:- آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔
دوسرا:- جی! اسی سے جو آپ کے مُنہ کے اندر ہے۔

اُستاد:- مرزا غالب کہاں دفن ہیں۔
شاگرد:- جی زمین میں۔

ٹکٹ چیکر:- ٹکٹ پلیز۔
دیہاتی:- (گھبرا کر)، لو یہ ٹکٹ مگر پولس کو کیوں
بُلا رہے ہو۔

رابعہ نواب۔ لکھنؤ

لڑکا:- میں گھر سے آرہا تھا تو دیکھا خ آپ خے
خوٹھے پر ایک خبوتر بیٹھا ہے۔
ماسٹر:- ارے بیوقوف ہر جگہ خ ہی خ بولتا
ہے کہیں تو کاف بھی بول۔
لڑکا:- بہت کوب۔

ماسٹر:- بتاؤ پانی پت کے میدان میں ابراہیم
لودی سے کون لڑا تھا۔
لڑکا:- جی میں نہیں تھا کوئی اور ہوگا۔

اوم پرکاش اگنی

دو مزیدار کہانیاں

عجیب و غریب تصویر

ہمارے یہاں تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ ایک سے ایک اچھی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں، اور لوگ انھیں بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ ان تصویروں میں وہ عجیب و غریب تصویر بھی تھی جس میں ایک آدمی کا چہرہ اس کے لمبے لمبے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا، اور پیروں میں پنکھ لگے ہوئے تھے۔

ایک آدمی نے اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھا۔ لیکن جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے پوچھا۔ "بھئی یہ کس کی تصویر ہے؟"

مصور نے کہا: "موقع کی۔"

وہ آدمی حیران ہو گیا اور بولا: "لیکن اس کا

منہ کیوں چھپا دیا گیا ہے۔

مصوّر نے کہا " اس کا منہ اس لئے ڈھک دیا ہے کیونکہ موقع جب ہمارے سامنے آتا ہے تو عام طور پر ہم اسے پہچان نہیں پاتے گویا اس کی شکل ہم سے چھپی رہتی ہے۔"

" لیکن پھر اس کے پیروں میں پنکھ کیوں لگائے ہیں ؟؟" اس آدمی نے حیرت سے پوچھا۔

مصوّر نے مسکراتے ہوئے کہا "اس لئے کہ جب ہم نہیں پہچانتے تو یہ اُڑتا ہوا چلا جاتا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

(ترجمہ) خالد صدیقی

اگر میں بڑا ہوتا

اگر میں گھر میں سب سے بڑا ہوتا تو بھائی جان اور باجی ضرور مجھ سے چھوٹے ہوتے۔ اور جس طرح بھائی جان زرا زرا سی بات پر مجھ سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ میں بھی اُن سے ناک بھوں چڑھا کر بات کرتا۔

اب رہیں باجی صاحبہ اُن سے تو بحث بھی کرتا اور نرمی سے بھی پیش آیا کرتا۔ جب وہ مجھ سے کوئی سوال پوچھتیں تو چار پانچ منٹ خاموش رہنے کے بعد ڈانٹ کر کہتا کہ تمھیں اتنا بھی نہیں آتا۔ اور پھر ایک مرتبہ جلدی سے سمجھاتا اور پھر بھی نہ سمجھتیں تو ڈانٹ کر بھگا دیتا۔ اور جب وہ رونی سی صورت بنا لیا کرتیں ان کی کمر تھپتھپاتے ہوئے ان کو سمجھا دیتا۔ جب کبھی مجھے غصہ آتا اور امّی ان کی طرفداری کرتیں تو بڑی عقل مندی سے ان کو سمجھاتا کہ آپ لاڈ کر کے اس کو خراب نہ کیجئے۔ اس طرح بچے خراب ہوتے ہیں۔

اس طرح سب بھائی بہن مجھ سے ڈرتے ہوتے۔ اور مجھے دیکھ کر سب اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ اور اگر انھیں میرے اوپر غصہ آتا تو چپ رہ جاتے۔ کسی کی کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی ہاں لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے چھوٹے بھائی بہن مجھ سے ڈرتے اور نفرت کرتے ہیں تو میں کیا کرتا —— نہیں بڑا بھائی ہو کر بڑا بھائی نہیں بننا چاہتا۔

عصمت آرا [illegible] انصاری

محسن حامد - بی - ایس ، سی

موتی

ہماری زمین کا تقریباً دو تہائی حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ پانی کا یہ حصہ پانچ بڑے سمندروں پر مشتمل ہے جن کی گہرائی کہیں کہیں چھ سات میل تک پہنچ گئی ہے اس گہرائی کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اگر دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ ہمالہ کو سمندر میں ڈال دیا جائے تو اس کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ بھی پانی میں ڈوب جائے گی۔

جس طرح خشکی پر نباتات، حیوانات اور پرندے رہتے ہیں بالکل اسی طرح سمندر کی دنیا بھی آباد ہے۔ لیکن سمندر میں بسنے والے جانور اور پودے زمین پر رہنے والے جانوروں اور پودوں سے کہیں زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ ان میں سے بعض کی شکل کچھ اتنی انوکھی ہے کہ جانوروں پر پودوں اور پودوں پر جانوروں کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ انیمون اور مونگا اسی قسم کے جانور ہیں۔ یہ دیکھنے میں بالکل پھول جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ہیں سمندر کے عجیب و غریب جانور۔

سمندر میں رہنے والے چند جاندار انسان کے لئے بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔ سیپ اور موتی پیدا کرنے والے گھونگھے کی گنتی ایسے ہی

جانوروں میں ہوتی ہے۔ موتی کے استعمال سے
کون واقف نہیں۔ اس کے بڑے بڑے قیمتی
ہار، گلوبند، بچھے، کانوں کے بندے تاج وغیرہ
بنتے ہیں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ
یہ چھوٹے چھوٹے خوب صورت موتی جو آپ
کے دل کو لبھا لیتے ہیں کیوں کر پیدا ہوتے
ہیں۔

سمندر کی عجیب و غریب آبادی میں گھونگھا
بھی ہے۔ موتی اسی گھونگھے میں پیدا ہوتا ہے
لیکن تعجب کی بات ہے کہ موتی ایسی مقامات
کے گھونگھوں میں پایا جاتا ہے جہاں گھونگھوں
کی کثرت ہو۔ کثرت کی وجہ سے گھونگھوں کو
اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے اِدھر اُدھر
حرکت کرنی پڑتی ہے۔ اس ہلنے جلنے کے
دوران میں اس کا جسم ریت پر رگڑتا ہے
اور ریت کے چھوٹے چھوٹے ذرّے
اس کے جسم میں پہنچ کر اس کو تکلیف پہنچاتے
ہیں۔ اس تکلیف سے بچنے کے لئے گھونگھا
ان ریت کے ذروں کے چاروں طرف
ایک لعاب دار مادہ لپیٹ لیتا ہے جو بعد
میں سخت ہو کر موتی کہلاتا ہے۔

سمندر سے موتی نکالنے کا کام غوط
زن کرتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں یہ
بہت خطرناک تھا۔ سمندر میں رہنے والی
بڑی بڑی مچھلیاں اور جانور کسی وقت بھی
حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب یہ کام
اس قدر خطرناک نہیں رہا ہے۔ غوط زن
کے لئے ایک خاص قسم کا لباس ایجاد
ہو گیا ہے جو اُن کی حفاظت کرتا ہے اور
اور انھیں سمندری جانوروں کے حملے سے
بچاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس لباس
کی خوبی یہ ہے کہ غوط زن کو سانس لینے
کے لئے تازہ ہوا بھی پہنچائی جا سکتی ہے
اسی لئے غوط زن سمندر میں بڑے اطمینان
سے زندہ رہ سکتے ہیں۔

انعامی مقابلے کے لئے
اپنی کہانیاں یا مضمون جلد بھیجیے

راستہ بتائیے

ڈوڈو میاں ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک دن ان کو اپنی نانی کے یہاں جانا تھا۔ لیکن نانی کا گھر دوسرے گاؤں میں تھا۔ انھوں نے سوچا کہ سائیکل پر جانا چاہیے، لیکن سائیکل پر جائیں تو کیسے انھیں گاؤں کا راستہ بھی تو نہیں معلوم تھا۔ ان کے ابّا نے کہا "بیٹا تم مزے میں چلے جاؤ۔ تم کو کوئی دقت نہ ہوگی۔ پکی سڑک پر ہو لینا۔ ہر میل پر تم کو میل کا پتھر ملے گا۔ جس پر فاصلہ لکھا ہوگا۔ جب سات میل کے سات پتھر مل جائیں تو پھر بیس، پچیس قدم پر تم کو چوراہا ملے گا۔ چوراہے پر ایک کھمبا ہے تم اس کھمبے کو دیکھ کر معلوم کر سکتے ہو کہ کون سی سڑک کس گاؤں کی طرف جائے گی۔ بس ایک سڑک تمھاری نانی کے گاؤں کی طرف بھی جاتی ہے۔ اسی راستے پر چلے جانا۔ جب تم دو میل اور چلو گے تو تمھیں ایک بڑا برگد کا پیڑ ملے گا۔ بس اس پیڑ کے دوسری طرف تمھاری نانی اماں کا گاؤں ہے۔ سامنے لال رنگ کا پکا مکان نظر آئے گا۔ بس وہی ان کا گھر ہے۔

ڈوڈو میاں سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ پہلے ایک میل کا نشان ملا، پھر دوسرے کا، پھر تیسرے کا اس کے بعد چوتھے اور پانچویں کا ـــــ ان کے ابّا نے ٹھیک راستہ بتایا تھا کیونکہ مشکل سے بیس پچیس قدم گئے ہوں گے کہ چوراہا مل گیا لیکن چوراہا دیکھ کر ان کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ چوراہے کا کھمبا آندھی سے اکھڑ کر گر گیا تھا۔ اب راستہ معلوم ہو تو کیسے۔ بیچارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے، لیکن پھر سوچا کہ عقل بڑی یا بھینس عقل کے زور سے کیا نہیں کر سکتا۔ بس پھر کیا تھا انھوں نے ذرا سی دیر میں راستہ معلوم کر لیا۔ کیسے معلوم کیا۔ دماغ پر زور ڈالیے، اور اگر نہ سمجھ میں آئے، تو پھر صفحہ ۸ پر جواب دیکھیے۔

اندھوں کا ہاتھی

عبدالواحد بیدل - پورنیہ

آپ نے سنا ہوگا کہ لوگ اکثر اپنے دوستوں، پڑوسیوں اور جاننے والوں کی برائیاں کرتے ہیں۔ یہ بڑی بری بات ہے۔ ہمیں واقعی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم لوگوں کے بارے میں اس طرح کی رائیں ظاہر کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ہر ایک کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ جس کا جس آدمی سے جیسا تجربہ ہوتا ہے اس کو ویسا ہی سمجھتا ہے۔ اگر کسی نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو آپ اس کو اچھا آدمی سمجھنے لگتے ہیں اور اگر برا تو پھر آپ کو اس کی اچھائیاں نظر نہیں آتی۔

آئیے ہم آپ کو ایک ایسی کہانی سنائیں جس کو پڑھ کر آپ اس بات کو اور اچھی طرح سمجھنے لگیں گے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار چار اندھے سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ اتفاقاً سامنے سے ایک ہاتھی آرہا تھا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ "ایک طرف ہو جاؤ، سامنے ہاتھی آرہا ہے۔" یہ سن کر وہ ایک طرف تو ہٹ گئے لیکن انھوں نے پوچھا "بھائیو ہمیں بتاؤ کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟"

اندھوں کی یہ بات مہاوت کے کان میں بھی پڑ گئی۔ اس نے ہاتھی کو روک لیا۔

اور کہا کہ تم خود چھو کر دیکھ لو۔ جب ہاتھی کھڑا ہو گیا تو اندھوں نے اُسے ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک کا ہاتھ سونڈ پر پڑا تو دوسرے کا دُم پر، تیسرے نے پیٹ ٹٹولا، چوتھے کے ہاتھ میں اس کی دم آئی۔

اب تینوں مل کر اپنے اپنے تجربے بتانے لگے۔ جس کا ہاتھ سونڈ پر پڑا تھا وہ بولا "خواہ مخواہ لوگ شور مچاتے ہیں کہ ہاتھی اتنا بڑا ہوتا ہے، اتنا اونچا ہوتا ہے۔ اس کے ایسے چوڑے چوڑے کان ہوتے ہیں۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کہ ہاتھی سانپ کی طرح ہوتا ہے اور اسی کی طرح پھنکار مارتا ہے۔ دوسرا اندھا یہ سُن کر جھلا گیا اور بولا "خواہ مخواہ کے لئے اس کو سانپ کہہ کر اہمیت جتا رہے ہو۔ میاں وہ تو سیدھا سادا رسّے کی طرح ہوتا ہے۔ مجھے تو کوئی پھنکار نہیں سنائی دی۔"

تیسرا اندھا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں نہ جانے سوتو نہیں رہے ہیں جو ہاتھی کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نے تو پیٹ چھوا تھا۔ اس نے کہا "آپ لوگ بے کار باتیں کر رہے ہیں۔ ہاتھی نہ رسّے کی طرح ہے اور نہ سانپ کی طرح۔ بھائی وہ تو پیپے کی طرح ہوتا ہے۔ پانی کے پیپے جیسا۔"

یہ بات سُن کر چوتھا اندھا اور بھی پریشان ہوا اس نے ہاتھی کا پیر چھوا تھا۔ اس نے کہا "جب تم لوگ ہاتھی کو دیکھ رہے تھے تو کیا پینک میں تھے۔ بھائی ہاتھی ہوتا ہے کھمبے کی طرح۔ اسی لئے تو لوگوں نے ہم کو ہٹنے کے لئے کہا تھا اگر کہیں ہم اس کھمبے سے ٹکرا جاتے تو ہمارا نام و نشان بھی نہ رہتا۔

اب جو چاروں میں جھگڑا شروع ہوا تو مار پیٹ کی نوبت آگئی۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ آپ نے دیکھا کہ چاروں اپنی جگہ ٹھیک کہتے تھے۔ لیکن سب کا خیال غلط نکلا۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنے اپنے تجربوں سے یہ نتیجے نکالے۔ ہاتھی کو اچھی طرح کسی نے نہ دیکھا تھا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک کسی آدمی کو اچھی طرح نہ دیکھ لیجئے اس کے بارے میں کبھی رائے قائم نہ کیجئے ورنہ آپ کا بھی وہی حال ہوگا جو اندھوں کا ہوا۔

ریحان احمد عباسی

گھر میں باغ

آپ ناگ پھنی اور تھوہڑ کے پیڑوں سے تو واقف ہوں گے وہی کانٹے دار پیڑ جسے لوگ اکثر اپنے کھیتوں یا باغ کی مینڈھ پر لگایا کرتے ہیں۔ ناگ پھنی اور تھوہڑ کے علاوہ اس کے اور بھی نام ہیں۔ اسی طرح اس کی قسمیں بھی بہت سی ہیں۔ کسی کی پتیاں خرگوش کے کان کی طرح ہیں تو کسی کا تنہ گنّے کی طرح سیدھا ہے، کہیں پتّے میں سے پتّا نکلتا چلا گیا ہے تو کسی میں بس گول گول گھنڈیاں ہی ہیں، کسی کے کانٹے لمبے ہوتے ہیں تو کسی کے چھوٹے، کسی میں ایک ہی جگہ پر کئی کئی کانٹے پھوٹتے ہیں تو کسی میں الگ الگ، کوئی گوبھی کے پھول کی طرح ہوتا ہے تو کوئی بانس کی طرح لمبا۔ اسی طرح ان کا نام بھی ان کی صورتوں کے لحاظ سے الگ الگ ہوتے ہیں۔

ناگ پھنی ریگستانی پیڑ ہے۔ یہ پیڑ بھی اونٹوں کی طرح اپنے پاس پانی کا ذخیرہ جمع کر لیا کرتے ہیں۔ ریگستانی علاقوں میں بارش کم ہوتی ہے لیکن جب ہوتی ہے تو عموماً زور دار ہوا کرتی ہے۔ ناگ پھنی کا پیڑ بارش کا پانی اپنے تنے میں جمع کر لیتا ہے۔ اس کا تنہ کافی

موٹا اور گدیلا ہوتا ہے

آپ نے سائنس کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ پیڑوں کی پتیوں سے پانی بھاپ بن کر اڑتا رہتا ہے لیکن ناگ پھنی کے پیڑ میں ایسا نہیں ہوتا اور سورج کی گرمی سے اس کا پانی بھاپ کی طرح اڑ کر ضائع نہیں ہوتا۔ ان کے تنے اور پتیوں میں ایک لیسدار مادہ ہوتا ہے، کانٹے بھی بہت ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے جانور ان پر منہ نہیں ڈالتے۔ اس لئے یہ پیڑ ریگستان جیسے خشک اور بغیر پانی کے علاقے میں پیدا ہونے اور بڑھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

خوبصورتی اور زیبائش کے لئے کمروں میں چھوٹے چھوٹے پودے رکھے جاتے ہیں۔ ناگ پھنی کا پودا بھی اپنی نوعیت اور نئے پن کی وجہ سے آپ کے کمرے کی خوبصورتی کو دو بالا کر دے گا۔ اس کا لگانا بھی مشکل نہیں۔ ہم آسانی سے کسی چھیٹے اور گہرے پیالے یا پلیٹ میں اس طرح کے پودے لگا سکتے ہیں۔ جس برتن یا گملے میں آپ اسے لگانا چاہتے ہیں پہلے اس میں مٹی اور ریت ملا کر ڈال دیجئے۔ اس کے بعد پانی ڈالئے کھاد وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیجئے پودے کے لئے زمین تو تیار ہو گئی۔ اب آپ جس طرح کی ناگ پھنی اس میں لگانا چاہیں تو اس کا ڈنٹھل یا موٹا پتا توڑ کر اس میں لگا دیجئے۔ اس طرح کہ کچھ حصہ مٹی کے اندر رہے اور کچھ اوپر۔ ہاں مٹی کے اندر وہی حصہ دبایئے گا جس طرف سے اسے توڑا تھا۔ اب آتی ہے پانی ڈالنے کی باری۔ تو جناب اس میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ یہ ریگستانی پیڑ ہے، اس لئے اس میں پانی مقدار سے زیادہ نہ ڈالئے ورنہ پودا گل جائے گا۔ پانی اس میں جب ہی ڈالئے جب مٹی بالکل سوکھ جائے یعنی روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ میں ایک بار۔ اگر آپ مٹی میں تھوڑا تارکول ملا کر ڈال لیں تو اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ پودا اچھی طرح جما رہے گا اور خراب بھی نہیں ہوگا۔

پیڑ پودوں میں بھی جان ہوتی ہے۔ ان کا بھی صاف ستھرا رہنا ضروری ہے ان میں چھوٹے چھوٹے مسام ہوتے ہیں جن سے

(باقیہ دیکھئے صفحہ ۲۷ پر)

راشد حسن قادری

مٹّی کی شہزادی

یوں تو نزہت بہت اچھی لڑکی تھی مگر شریر لڑکیوں کے ساتھ کھیل کھیل کر اُس نے کچھ بُری عادتیں سیکھ لی تھیں اور سب سے بُری عادت اُسے مٹّی کھانے کی ہوگئی تھی۔ دوپہر کو وہ چپکے سے باہر نکل جاتی اور مُنّی کے ساتھ مٹّی کھاتی۔ اسے منّی ہی نے سکھایا تھا مٹّی کھانا۔ ایک دن وہ دوپہر کو باہر کھیلنے گئی، تو اُس نے دیکھا کہ منّی پیڑ کے نیچے بیٹھی کچھ کھا رہی ہے۔ اسے دیکھ کر منّی نے جلدی سے کچھ چھپا لیا۔ نزہت نے پوچھا "کیا ہے تیری مُٹھّی میں؟" اور جب اس نے چھین کر دیکھا تو صُراحی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے تھے۔

"کیا کر رہی ہے اِن کا" اور مُنّی نے اپنا مُنھ کھول دیا۔

"ارے تو مٹّی کھا رہی ہے!" نزہت نے مُنّی کے مُنھ میں جھانک کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سچ بی بی! بڑے مزے کی لگتی ہے!" مُنّی نے ٹکڑے کو چوستے ہوئے کہا۔

اور جب مُنّی کے بہت کہنے پر نزہت نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا مُنھ میں رکھا تو اسے عجیب سا معلوم ہوا، جیسے مُنھ کا سارا تھوک سوکھ گیا ہو۔ پہلے تو اُسے بُرا معلوم ہوا مگر دو ایک ٹکڑے کھانے پر اسے مٹّی کی سوندھی

سوندھی خوشبو، پسند آنے لگی اور پھر تو وہ خواب کھانے لگی تھی۔ جب بازار سے کوری کوری صُراحیاں آتیں تو اس کا بے اختیار یہ جی چاہتا کہ سب ٹوٹ جائیں اور وہ ان کے ٹکڑے کُٹر کُٹر چبا جائے۔

.... اور اس طرح وہ دونوں روز چُھپ چُھپ کر مٹّی کھاتیں۔

آہستہ آہستہ مٹّی نے اثر دکھانا شروع کیا۔ مٹّی کوئی کھانے کی چیز تو ہے نہیں، جو ہضم ہو جائے۔ اس لئے اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اب نزہت کو بھوک بھی کم لگتی۔ آخر ایک دن بڑے بھیّا اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے، ڈاکٹر نے دیکھ کر بتایا کہ اس کا جگر اور معدہ خراب ہو گیا ہے۔ اس کا کھانا بند کر دیا گیا اور صرف دودھ دیا جانے لگا۔ لیکن دودھ سے اس کا پیٹ نہ بھرتا۔

ایک دن موقع پاکر نزہت باہر نکل گئی۔ اور اس نے مُنّی کے جمع کئے ہوئے مٹّی کے ٹکڑے کھائے۔ دو ایک ہی کھائے ہوں گے کہ اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا ــــ خوب زور کا درد ــــ اور وہ اندر آکر لیٹ گئی اور رونے لگی۔ امّی، اپیا سب پریشان تھے کہ

اس نے سوائے، دودھ کے اور کچھ کھایا نہیں پھر درد کیوں ہونے لگا۔ بڑے بھیّا کو بھیج کر ڈاکٹر کو بُلوایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی نہ سمجھ سکے کہ پیٹ میں درد کیسے ہونے لگا۔ انھوں نے کہا "اس نے ضرور کوئی اور چیز کھائی ہے۔" مگر سب حیران تھے کہ آخر کیا کھایا ہے، اس لئے کہ امّی نے اسی روز سے جب سے وہ بیمار ہوئی تھی، نعمت خانہ اور الماری میں تالا لگانا شروع کر دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھ کر چلے گئے، اور بڑے بھیّا بازار سے دوا لے آئے، "لیجیے، امّی، صبح دوپہر شام ایک ایک خوراک دی جائے گی۔ اور کھانے کو آج کچھ نہ دیجیے گا۔ دودھ کو بھی منع کر دیا ہے۔" بڑے بھیّا نے کہا۔

امّی نے اس کو دوا پلا دی اور وہ لیٹ گئی۔ درد تو برابر ہو ہی رہا تھا مگر اب کم ہو گیا تھا۔ اس کو چُپ دیکھ کر امّی اور اپیا چلی گئیں اور کام میں لگ گئیں۔ نزہت نے ادھر ادھر دیکھا اور کسی کو پاس نہ پاکر چُپکے سے اُٹھی اور زینے پر چڑھ گئی۔ وہ کبھی کبھی اوپر چھت پر بھی روشندان کے قریب بیٹھ کر مٹّی کھایا کرتی

تھی۔ آہستہ آہستہ روشندان کے پاس گئی اور ایک ٹکڑا اُٹھایا منہ میں رکھنے ہی والی تھی کہ کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سمجھی کہ امی یا اپیا ہوں گی مگر جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گئی وہاں نہ امی تھیں نہ اپیا بلکہ اپیا کے برابر دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔

"کیا کھا رہی ہو؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"یہ" اس نے مٹھی کھول کر دکھائی۔

"ارے تو تم ہی ہو وہ لڑکی" دوسری بولی "چلو اسے لے چلو"

"کہاں لے جا رہی ہو مجھے؟" اس نے پوچھا

"شہزادی صاحبہ کے حضور میں" پہلی لڑکی نے جواب دیا "ہم تو تمھاری تلاش میں بہت دنوں سے پھر رہے ہیں"

"مگر..... وہ..... وہ منّی بھی تو کھاتی ہے"

"منّی ــــ منّی کون ہے؟"

"وہ ــــ وہ وہاں رہتی ہے" اس نے چپراسی کے کوارٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں" دوسری بولی "تو چلو اُس کو بھی لے لیں"

پہلی والی بولی "تم اسے لے کر چلو میں اُسے لاتی ہوں"

دوسری نے اس کا ہاتھ پکڑا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ ہوا میں اُڑنے لگیں۔ پہلی لڑکی چپراسی کے کوارٹر کی طرف اُڑ گئی۔

وہ دونوں خوب تیز اُڑنے لگیں۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ اس کا گھر بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب وہ ایک گھنے جنگل کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اُسے سامنے ایک اونچا محل نظر آنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ محل پر پہونچ گئیں اور اس کے اندر داخل ہوئیں۔ محل کے ایک بڑے کمرے میں ایک تخت پر ایک شہزادی بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے آس پاس بہت سی خادمائیں ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ اس لڑکی نے تخت کے پاس جاکر شہزادی کو سلام کیا اور کھڑی ہو گئی۔

شہزادی نے پوچھا "اے خاکستری تو اتنے دنوں کہاں رہی اور خاکی کہاں ہے"

خاکستری نے جھک کر سلام کیا اور کہا "خاک پناہ! ہم دونوں ایک مہینے تک خاک چھانتے پھرے مگر کہیں یہ لڑکی نہ ملی آج اتفاق

سے ایک چھت پر یہ ہمیں مل گئی۔ میں اس کو لے کر حاضر ہوئی اور خاکی ایک دوسری لڑکی کو لے کر آرہی ہے اُس کا پتہ اسی نے بتایا ہے۔"

"ہوں" شہزادی نے سر ہلایا "تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ..... جی ..... جی میرا نام نزہت ہے" اس نے جواب دیا۔

"ہوں ــــ خاکسار کہاں ہے؟"

ایک خوب موٹا اور لمبا آدمی جلدی سے آگے بڑھا اور جھک کر بولا "جی حاضر ہے۔"

"خاکسار، یہی وہ لڑکی ہے جس نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے۔"

"جی خاک پناہ" خاکسار نے چند کاغذ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا بتاؤ اِس کو کہ یہاں کیوں بُلایا گیا ہے۔"

"بہت اچھا ــــ اے لڑکی سُن۔ تو نے بہت دنوں سے خاک پناہ کو ستا رکھا ہے۔ ملکۂ عالیہ ملک خاکستان کی فرماں روا ہیں۔ اس دُنیا کی ہر قسم کی زمین اور مٹی پر ان کا حکم چلتا ہے۔ جو زمین فرماں بردار ہوتی ہے۔ اس کو ملکہ صاحبہ کی طرف سے انعام ملتا۔ اس کی مٹی زرخیز ہو جاتی ہے اور وہ انسانوں کے واسطے ہزاروں من اناج اور دوسری چیزیں پیدا کرتی ہے۔ اور نافرمان زمینوں پر ملکہ حضور کا قہر ٹوٹتا ہے، وہ بنجر بنا دی جاتی ہیں۔ ان پر کوئی چیز نہیں اُگتی۔ انسان بھی ان کو ٹھکرا دیتا ہے۔ ملکہ صاحبہ کو دنیا میں مٹی کی بنی ہوئی ہر چیز کا علم رہتا ہے۔ کچھ دنوں سے انھیں ایک نئی تکلیف شروع ہوئی۔ جس کا علاج ملک خاکستان کے حکیم نہ کر سکے اور آخر ایک بڑے نجومی نے بتایا کہ انسان کی ایک لڑکی نزہت نامی مٹی کھایا کرتی ہے اور اس کے چبانے سے ملکۂ عالیہ کو یہ تکلیف ہوتی ہے۔ اسی وقت سے تجھے تلاش کرنے کے واسطے دو باندیاں بھیج دی گئیں اور آج وہ تجھے پکڑ لائیں۔ ملکہ حضور کو تعجب ہے کہ تو مٹی کیوں کھاتی ہے جبکہ کوئی جانور بھی مٹی نہیں کھاتا۔ تیرے کھانے کے واسطے مٹی اتنی عمدہ عمدہ چیزیں پیدا کرتی ہے اور تو مٹی کھاتی ہے۔ آخر تو مٹی کیوں کھاتی ہے" خاکسار نے کاغذ لپیٹتے ہوئے کہا۔

"اے لڑکی جو کچھ تجھے کہنا ہو کہہ" ملکہ

سے فرمایا۔

"جی... مجھ... مجھے... مجھے تو منّی نے مٹّی کھانا سکھایا ہے..... ملکہ صاحبہ۔۔۔۔ میں مٹّی نہیں کھاتی تھی۔ مگر اُس نے کھلائی تھی" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"منّی۔۔۔ منّی کون ہے؟" ملکہ نے حیرت سے پوچھا "خاکسار یہ کون لڑکی ہے؟"

خاکسار نے جلدی سے دوسرا کاغذ نکال کر کہا "حضور موجودہ تکلیف سے پہلے جو تکلیف کبھی کبھی ہوا کرتی تھی وہ اُسی لڑکی کے کھانے سے ہوتی تھی اس کا نام نجومی نے منّی ہی بتایا تھا"

"کہاں ہے وہ؟" ملکہ نے غصّہ سے پُوچھا۔

"حاضر ہے خاک پناہ" دروازے سے آواز آئی اور سب کی نظریں اُدھر اُٹھ گئیں۔ نزہت نے دیکھا کہ خاکی منّی کا ہاتھ پکڑے لئے آرہی ہے اس نے آکر ملکہ کو سلام کیا اور کہا "یہ حاضر ہے حضور"

"اس نے سکھایا تھا تمھیں مٹّی کھانا" ملکہ نے منّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نزہت سے پُوچھا۔

"جی جی ہاں" نزہت نے سر ہلا دیا۔

"تو اِسے مٹّی بہت پسند ہے" ملکہ نے منّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "خاکسار اس کو لے جاؤ اور اس کے ٹکڑے کرکے مٹّی میں ملا دو۔ اور تم" ملکہ نے نزہت کی طرف اشارہ کیا "تمھاری خطا کم ہے تو تم زور زور سے کہو میں اب مٹّی نہیں کھاؤں گی"

وہ جلدی جلدی کہنے لگی "میں اب مٹّی نہیں کھاؤں گی"

خاکسار منّی کو پکڑ کر کمرے کے باہر لے گیا۔

"ملکہ اس کو چھوڑ دو" نزہت نے کہا۔

"تم مت بولو بس اپنا کام کرو ورنہ...."

اور وہ پھر جلدی جلدی کہنے لگی۔

"ہائے اللہ" منّی کے زور سے چیخنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی اس کی بھی چیخ نکل گئی "امّی منّی کو بچایئے۔ میں اب مٹّی نہیں کھاؤں گی" اس کی آنکھ کھل گئی۔ نہ شہزادی نہ محل۔۔۔ امّی اور اپیا گھبرائی ہوئی اس کے پلنگ کے پاس کھڑی تھیں۔

"ہوں۔ تو تم نے مٹّی کھانی شروع کردی ہے" اپیا نے کہا۔

"کہاں ہے منّی کی بچّی بلاؤ اُس کو خبر لوں" امّی ناراض ہوتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دن کے بعد سے آج تک اس نے کبھی مٹّی نہیں کھائی۔

جوار بھاٹا

احمد حسن

کیا آپ نے کبھی سمندر دیکھا ہے؟ اگر آپ کبھی بمبئی یا مدراس یا کلکتہ گئے ہوں، تو وہاں آپ نے سمندر ضرور دیکھا ہوگا۔ دور تک پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ سمندر کے پانی میں برابر ہلچل ہوتی رہتی ہے۔ پانی کبھی بڑھتا ہے کبھی گھٹتا ہے۔ اگر آپ دن بھر سمندر کے کنارے کھڑے رہیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ چوبیس گھنٹے اکیاون منٹ میں دو بار پانی بڑھتا گھٹتا ہے۔ سمندر کے اسی بڑھتے گھٹنے کو لوگ 'جوار بھاٹا' کہتے ہیں۔

لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ سمندر میں یہ جوار بھاٹا کیوں آتا ہے؟ دراصل یہ جوار بھاٹا چاند کی کشش سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح زمین میں کشش ہوتی ہے اسی طرح چاند میں بھی ہوتی ہے۔ چاند بھی زمین کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ زمین گھومتی ہے تو بھی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جوار بھاٹے کی ذمہ داری چاند ہی کے سر ہے۔

چاند زمین کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن چونکہ ساری زمین ٹھوس ہے اس لئے اس کشش کا اثر اس کسی چیز پر نہیں پڑتا۔ البتہ پانی اس کشش کا شکار ضرور ہو جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ پھر تو

پانی کو فوارے کی طرح ابلنا چاہیئے۔ اور اوپر اٹھنا چاہیئے۔ یہ سیلاب کی شکل میں کیوں بڑھتا ہے۔
تو بھائی اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر زمین اپنی جگہ قائم رہتی تو ضرور یہی صورت رہتی کہ پانی فوارے کی طرح اوپر اُچھلتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ زمین تیزی سے گھومتی رہتی ہے۔ اس لئے سارے سمندر میں ایک طوفانی لہر سی پیدا ہو جاتی ہے
اس کام میں مہینے میں دوبار سورج بھی چاند کی مدد کرتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے جب زمین کے چاروں طرف گھومتا ہوا چاند سورج کی سیدھ میں آ جاتا ہے اس وقت سورج اور چاند دونوں کی قوت کشش مل کر کام کرتی ہے اور بڑے زور کا جوار بھاٹا آتا ہے۔ سورج کی کشش زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ سورج کا فاصلہ چاند کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔
جس طرح چاند زمین کو کھینچتا ہے اسی طرح زمین بھی چاند کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن چاند میں سمندر نہیں ہیں اسی لئے چاند میں اس کا اثر نہیں پڑتا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ پہلے وہاں سمندر تھے جو اب خشک ہو چکے ہیں اس زمانے میں ضرور ان سمندروں میں جوار بھاٹا آتا ہوگا۔ لیکن اب اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ وہاں اب تو پانی کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔
اب سائنس دانوں نے ایسی مشینیں تیار کر لی ہیں جن سے جوار بھاٹے کا وقت معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب پانی تیزی سے بڑھتا ہے تو جہاز راں اپنے بڑے جہاز بندرگاہ میں اندر تک لے جاتے ہیں اور سامان اتارنے کے لئے چھوٹی کشتیوں کو بندرگاہ سے بڑے جہازوں تک نہیں آنا پڑتا۔

بقیہ "بونے کی چھتری"

میں چلی جائے گی۔"
جان نے کہا کہ میں کل ہی جا کر چھتری کا دستہ گاڑ آؤں گا تاکہ آپ جلد از جلد اپنی پہلی صورت میں آ کر لوگوں کی مدد کر سکیں۔
اس کے بعد انھیں کچھ پتہ نہ چلا لیکن چین کے لوگ اب بھی کہتے ہیں کہ وہ بونا زندہ ہے۔ اور اسی طرح لوگوں کی مدد کرتا ہے۔

چین کی ایک قدیم کہانی

نفیس بانو

بونے کی چھتری

اب سے بہت دن پہلے چین کی راجدھانی [illegible] ایک آدمی اپنے لڑکے کے ساتھ رہتا تھا۔ چاؤ کی چھتریوں کی دوکان تھی۔ اس کے لڑکے چان کی عمر اٹھارہ اُنیس برس کی تھی۔ چان، ہونے کو تو کافی سمجھدار تھا مگر اس کا دل دُکان پر بیٹھنے میں بالکل نہ لگتا تھا۔ اُسے تو بس ایک ہی شوق تھا۔ وہ لکڑی کے طرح طرح کے جانور، پرندے اور پھول پتیاں بناتا۔ کبھی کبھی وہ اپنی مرضی سے چھتری کے لئے کوئی دستہ بھی بنا لیتا۔ اس کا بنایا ہوا دستہ خوبصورت ہونے کی وجہ سے جلدی اور زیادہ داموں میں بکتا۔ وہ جنگل سے اپنی چیزیں بنانے کے لئے لکڑی اور پھول پتیاں لاتا تاکہ وہ چھتریوں کے دستے بنا کر ان پر ویسی ہی پھول پتیاں بنائے۔

ایک دن چان لکڑی کی تلاش میں جنگل جا نکلا۔ وہاں اس کی نظر ایک بونے پر پڑی۔ چان نے زندگی میں پہلی بار بونا دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ڈر گیا مگر پھر اپنا دل مضبوط کرکے آگے بڑھا کہ اس بونے سے کیا ڈرنا۔ لیکن بونا تو خود چان کو دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پیڑ کے تنے کے سوراخ میں غائب ہوگیا۔

چان سوراخ میں بونے کو تلاش کرنے لگا۔ مگر بونا ایسا غائب ہوا کہ پتہ بھی نہ چلا۔

چان نے تھک کر بونے کا خیال اپنے دل سے نکال دیا۔ اور اُسی پیڑ میں سے ایک اچھی سی شاخ اپنی چھتری کے دستے کے لئے کاٹ لی۔

کئی دن سے چان کا باپ اُس سے ناراض تھا اور باپ کو خوش کرنے کے لئے بس یہی ترکیب تھی کہ وہ چھتری کے دستے بنا دے۔ چین میں لوگ سانپ جیسے دستے والی چھتری کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے سوچا کہ وہ بھی ایک خوبصورت سا ناگ بنائے [illegible] سوچا کیوں نہ بونے کی شکل کا دستہ بنائے۔ یہ ایک نئی چیز ہوگی۔ اُس نے لکڑی کو کاٹ کر بالکل ویسا ہی بونا بنا لیا جیسا کہ اس نے جنگل میں دیکھا تھا۔ چاؤ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے ایک اچھی سی چھتری میں وہ بونا لگا دیا۔ اب تو وہ لکڑی کا بونا چھتری کی وجہ سے اور چھتری بونے کی وجہ سے نکھر گئی۔

چاؤ نے وہ چھتری اپنے دوکان کے باہر لگے ہوئے شیشے میں بیچنے کے لئے رکھ دی۔ چان کی بنائی ہوئی چھتری بہت دن تک دُکان کے شیشے میں رکھی رہی۔ تعریف تو جو دیکھتا، کرتا مگر اتنے مہنگے داموں کی چھتری خریدنے کی کسی میں ہمّت نہ تھی۔ اتفاقاً ایک دن پیکن کا ایک امیر آدمی اُدھر سے گزر رہا تھا۔ اُس کی نظر اچانک بونے کی چھتری پر پڑی۔ اس کو یہ چھتری بہت پسند آئی اور اس نے اپنی بیٹی "وانگ" کے لئے مُنہ مانگی قیمت دے کر خرید لی۔

"وانگ" کے پاس ہونے کو تو بیسوں رنگ برنگ کی چھتریاں تھیں، مگر اسے یہ چھتری اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بہت پسند آئی۔

ایک دن شنگائی کا ایک امیر زادہ "تنگ" وہاں آیا۔ وہ وانگ سے شادی کرنا چاہتا تھا وانگ کے باپ نے اس کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ وہ اپنی لڑکی سے پوچھ کر پکّا جواب دے گا۔

ایک دن اس نے باتوں باتوں میں وانگ کے سامنے اس امیر زادے کا ذکر چھیڑ دیا۔ وانگ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دے کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ چھتری کا دستہ اس کے ہاتھ میں گھوم رہا ہے۔ مگر اس نے اس طرف زیادہ دھیان نہ دیا اور سوچنے لگی کہ

باپ کو کیا جواب دے۔ ذرا سی دیر میں پھر چھتری اس کے ہاتھ میں گھومی اور اس مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ کسی چیز نے اس کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ اب تو وہ بیچ بیچ گھبرا گئی۔ اور باپ کو بغیر جواب دیئے اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ چھتری کھونٹی میں لٹکا دی۔

وانگ کمرے میں آکر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ کہ نہ جانے چھتری کے بونے نے آج کیوں میرے ہاتھ میں کاٹ لیا۔

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم شادی کا اقرار نہ کرلو" چھتری کے بونے نے کہا۔

"ارے" وہ ایک دم چیخ اُٹھی اور کمرے سے بھاگنے ہی والی تھی کہ چھتری میں سے آواز آئی "بیٹی گھبراؤ نہیں میں تو تمھارے ساتھ اتنے دن رہا اور تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تو پھر اب مجھ سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

یہ سُن کر وانگ اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ بونا پھر بولا "وانگ! بتاؤں میں کون ہوں!"

وانگ بولی "ہاں! ضرور بتایئے۔"

اور پھر بونے نے اپنا قصہ یوں شروع کیا۔

"میں پہلے ایک بیچ بیچ کا بونا تھا، اور شہر کے باہر والے جنگل میں رہتا تھا۔ میری جان اِس لکڑی کے ٹکڑے میں تھی، جس سے چان نے اِس چھتری کا دستہ بنایا تھا۔ اس نے اس لکڑی کو کاٹ لیا تو میرے جسم سے جان نکل گئی۔ میرا جسم اب بھی اسی پیڑ کے تنے میں پڑا ہے۔ جس سے یہ لکڑی کاٹی گئی۔

آج تم جب اپنے باپ سے باتیں کررہی تھیں، تو مجھے ڈر لگا کہ کہیں تم اس آدمی سے شادی کرنے کا اقرار نہ کرلو۔ اس لئے پہلے میں گھوما اور پھر میں نے تمھاری ہتھیلی میں کاٹ لیا تاکہ تم گھبرا کر اپنے باپ کے پاس سے ہٹ آؤ۔"

"مگر آپ مجھے منگ سے شادی کرنے کے لئے منع کیوں کررہے ہیں" وانگ نے پوچھا۔

بونا بولا "میں جادو کے زور سے بتا سکتا ہوں کہ کون کیسا آدمی ہے۔ اس شہزادے سے شادی کرکے تم خوش نہ رہ سکتی تھیں بس میں تو اتنا ہی کہوں گا، آگے تمھاری مرضی۔"

بوتا یہ کہہ کر رُک گیا اور تھوڑی دیر بعد پھر بولا "میری رائے مانو تو تم چان۔ سے شادی کرلو۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔"

وانگ نے بونے سے کہا "مگر میں تو چان کو جانتی تک نہیں کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں رہتا ہے؟"

"تم کل میرے ساتھ جنگل چلنا" بونے نے جواب دیا "وہاں تمھاری ملاقات چان سے ہوجائے گی۔ مگر ہاں ایک بات یاد رکھنا اس کمرے کے باہر مجھ سے کبھی بات نہ کرنا۔ جب چان نظر آئے گا تو کسی کی طرح میں تمھاری انگلی میں آہستہ سے کاٹ دوں گا۔ اور تم سمجھ لینا کہ یہی چان ہے۔"

صبح تڑکے ہی وانگ اپنے بستر سے اٹھی اور چھتری لے کر جنگل روانہ ہوگئی جنگل پہنچی تو اس کو چان کہیں نظر نہ آیا۔ وہ چان کو تلاش کرتے کرتے اپنے گھر کا راستہ بھی بھول گئی۔

آخر تھک کر وہ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر چڑیوں کا گانا سننے لگی۔ گانا سنتے سنتے وہ وہیں درخت کے نیچے نرم نرم گھاس پر سوگئی۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد بونے نے اس کی انگلی میں کاٹ لیا۔ اور اس کی آنکھ کھُل گئی۔ سامنے دیکھا تو ایک خوبصورت لڑکا اس کا سامنے سے گزر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہی چان ہے۔

اس نے چان کو روک کر شہر کا راستہ پوچھا چان بھی شہر جارہا تھا اس نے کہا "چلو میں تمھیں پہنچادوں"۔

وانگ نے راستے بھر چان سے باتیں کیں۔ وہ چان کو خوب اچھی طرح جان گئی تھی۔ اب دونوں میں دوستی ہوگئی۔

گھر آکر وانگ نے چان کو اپنے باپ سے ملایا۔ وانگ کے باپ نے لڑکی کی مدد کرنے پر چان کا شکریہ ادا کیا، اور اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے چان کو اگلے دن نئے سال کی خوشی میں اپنے یہاں دعوت دی۔

چان کے جانے کے بعد وانگ نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ چان سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کے باپ کا دل تو نہ چاہتا تھا، کہ چان جیسے غریب آدمی سے اس کی شادی کرے مگر اپنی لڑکی کی خوشی پوری کرنے کے لئے وہ تیار

ہوگیا۔

دوسرے دن جب چان دعوت میں آیا تو وانگ کے باپ نے اس سے شادی کا ذکر کیا۔ چان کو بھی وانگ سے سچ مچ محبت ہو گئی تھی۔ مگر اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ وانگ جیسی امیر لڑکی سے اس کی شادی ہو سکتی ہے۔

اور اسی روز وانگ کے باپ نے چان کے باپ کی بھی اجازت لے لی۔ اور پھر اس طرح یہ بات پکّی ہوگئی۔ دو تین دن بعد بڑی دھوم دھام سے وانگ اور چان کی شادی ہو گئی۔

وانگ اِن دِنوں اپنی شادی کی خوشی میں بونے کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ ایک دن دونوں میاں بیوی محل میں ٹہل رہے تھے کہ وانگ کو ایک دم بونے کا خیال آیا تو اس نے چان کو سارا قصّہ سُنایا۔

چان پہلے تو یہ سمجھا کہ وانگ اس سے مذاق کر رہی ہے۔ مگر وانگ نے جب کہا کہ چلو میں تم کو اس بونے کو بات چیت کرتے دکھا دوں گی تو وہ تیّار ہوگیا۔

خیر تو دونوں اس کمرے میں گئے جہاں چھتری رکھی تھی۔ وانگ نے جیسے ہی چھتری اُٹھائی تو بونا بولا "تم دونوں کو شادی مبارک ہو اور خدا تمھیں ہنسی خوشی رکھے۔"

جب اس نے یہ آواز سُنی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

وانگ نے بونے سے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ نے میری مُلاقات چان سے کرائی۔ اگر آپ ہم کو کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے آپ کی جان دوبارہ آپ کے مُردہ جسم میں پڑ جائے تو ہمیں اور بھی خوشی ہوگی۔

بونے نے جواب دیا کہ اس میں شکریے کا کیا سوال ہے ہر آدمی کو دوسرے کو اچھا ہی مشورہ دینا چاہیے اور موقع پر کام آنا چاہئے میں نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا۔" بونا کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا کہ مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ آپ لوگ اپنی شادی کے بعد مجھے نہیں بھولیں گے۔ تو سُنیئے میری جان دوبارہ جسم میں واپس ہو سکتی ہے۔ مگر آپ کو چھتری کا دستا اسی پیڑ کے پاس گاڑنا ہوگا جہاں سے چان نے مجھے کاٹا ہے۔ یہ دستہ جب گل کر مٹی میں مل جائے گا تو میری جان بھی واپس اپنے جسم

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ کیجیے)

فریدہ ہاشمی

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے

نسیم اور افروز ایک ہی اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ نسیم کا باپ شہر میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ وہ روزانہ نئے نئے کپڑے پہن کر موٹر میں اسکول آتا۔

لیکن افروز تو یتیم تھا۔ اس کی ماں اس کے کپڑے بھی خود سیتی اور خود ہی دھو کر پہناتی افروز خود بھی ایک بنئے کی دوکان پر نوکر تھا۔ صبح کو اسکول جاتا اور شام کو بنئے کی دوکان پر کام کیا کرتا تھا۔ کتابیں بھی اس کے پاس پوری نہ تھیں وہ اپنے ساتھیوں سے مانگ کر کتابیں پڑھتا تھا مگر پھر بھی جماعت میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتا۔

نسیم ہمیشہ افروز کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ وہ اس سے بات بھی نہ کرتا اور ہمیشہ اس کا مذاق اُڑاتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کو ڈانٹ دیتا تھا۔

عید کے دن قریب آ رہے تھے نسیم نے بڑی شان سے اپنے لئے جوڑا سلوایا۔ وہ روزانہ لڑکوں میں بیٹھ کر اپنے بڑے ہونے کی ڈینگ ہانکتا۔ اپنی موٹر سے لے کر اپنے کپڑوں تک کی باتیں کرتا۔ افروز بے چارہ نیک لڑکا تھا۔ وہ کسی سے کچھ نہ کہتا اور سب کی باتیں

سنا کرتا۔ اور پڑھنے میں مگن رہتا۔ خوب جی لگا کر اسکول کا کام کرتا۔

عید کے دن سب لوگ نئے نئے کپڑے پہن کر عید گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ نسیم نے بڑی شان سے اپنی ریشمی شیروانی پہنی۔ افروز نے بھی اس روز نیا جوڑا پہنا تھا۔ جو اس نے خود پیسے جمع کر کے بنایا تھا۔ یہ کپڑے ریشمی نہ تھے مگر وہ اس میں خوش نظر آ رہا تھا۔ سب کو خوشی خوشی سلام کرتا ہوا وہ اپنے ماموں کے ساتھ عید گاہ جا رہا تھا۔ سامنے سے نسیم آتا ہوا نظر آیا۔ افروز نے اُسے سلام کیا مگر اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا اور بے چارہ افروز خاموش ہو کر چلا گیا۔

نماز ہو چکی تھی۔ مولوی صاحب خطبہ پڑھنے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "اسلام میں امیر غریب کا فرق نہیں ہے دونوں کو خدا نے اپنا بندہ بنایا ہے۔ کسی کے روپیہ سے خدا خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ نیک وہ ہے جو سب کو اپنا بھائی سمجھے کسی کا مذاق نہ اڑائے۔ ایسے ہی لوگوں کو خدا دوست رکھتا ہے۔"

نسیم مولوی صاحب کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس کے سامنے ہی افروز اپنے ماموں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ماموں نے کہا۔

"افروز پاس ہونے کی دعا مانگ لو، سب کے پاس ہونے کی" اور افروز نے دعا کے لئے اپنے ہاتھ اٹھا دئے۔ نسیم نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

"اللہ میاں! تو سب کو پاس کرنا۔ نسیم بھائی کو، مجھے، شاہد کو، شیام کو موہن کو اور........"

نسیم اپنے دل میں بڑا پشیمان ہوا۔ اس نے سوچا کہ میں اسے بُرا سمجھتا ہوں اس کا مذاق اڑاتا ہوں، پھر بھی یہ میرے پاس ہونے کی دعا مانگ رہا ہے۔ کتنا اچھا ہے یہ۔ اور میں...... میں کتنا برا ہوں۔"

اگلے روز جب اسکول کھلا تو افروز اسکول آ چکا تھا۔ نسیم کار سے اترا اور افروز کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ تک وہ کچھ سوچتا رہا اور پھر "افروز میرے بھائی"

(بقیہ دیکھیے صفحہ ۳۲ پر)

احمد جمال پاشا

کام کے وقت کام

گھر کے سب لوگ وقار کے خلاف تھے۔ لیکن مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی، اچھا خاصا خوش مزاج اور ہنس مکھ لڑکا تھا۔ باتیں بڑے مزے مزے کی کیا کرتا۔ اس کے تمام دوست اس کی عزت کیا کرتے تھے لیکن گھر پر تو اس کی عزت گھر کی مرغی دال برابر کی سی تھی۔

ایک دن میں اس سے ملنے گیا لیکن وہ گھر پر موجود نہ تھا۔ اس کی ماں جن کو میں چچی کہا کرتا تھا ملیں تو انھوں نے وقار کی شکایتیں شروع کر دیں "بھیا کیا بتاؤں تمام دن گھر سے باہر رہتا ہے رات کو بھی دیر سے آتا ہے۔ غرض انھوں نے پھر اس کی بے شمار شکایتیں کیں۔ میں چچی کو اطمینان دلا کر چلا آیا۔

میں نے رکنا مناسب نہ سمجھا۔ تین چار دن کے بعد وقار کے یہاں جانا ہوا۔ وہ اُس وقت نہا رہا تھا۔ میں اس کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ دیوار پر ٹائم ٹیبل لگا ہوا تھا۔ جس میں رات کے چار گھنٹے سونے کے تھے۔ باقی بیس گھنٹے میں پڑھائی کا پروگرام لکھا تھا۔ نیچے جگہ جگہ نوٹ لکھے ہوئے تھے جن میں وقت کی پابندی کے ساتھ ساتھ نماز، ہوا خوری اور کسرت وغیرہ کا ذکر تھا۔ قلم دان

میں قلم اور پنسلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کتابیں اور کاپیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ نہایت عمدہ کمرہ ہوادار، روشن اور صاف، پڑھائی کا ماحول دیکھ کر میں بھی خوش ہو گیا، لیکن اس کو دیکھ کر یہ انداز ضرور ہوتا تھا کہ اس پروگرام پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ آخر کوئی کس طرح اتنی دیر کام کر سکتا ہے۔ اتنے میں وقار آ گئے۔ باتیں کرتے کرتے وقار نے کہا۔

"یار گھر میں دل بالکل نہیں لگتا۔ بتاؤ کیا کروں؟"

میں نے اسے پریشان دیکھ کر کافی دیر سمجھایا بجھایا اور پھر چلا آیا۔

ایک دن بازار میں ملاقات ہو گئی وہ کافی پریشان تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ اس سے پوچھا "کیا بات ہے کیوں پریشان ہو"

اس نے کہا "یار کیا بتاؤں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، تم بھی کہتے ہوگے عجب اوٹ پٹانگ باتیں ہیں۔ مگر میں تم کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں خود ایک اچھا لڑکا بننا چاہتا ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں مجھے جھوٹ سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تم کو مگر آج بھی میں نے حساب لگایا تو کوئی بیس مرتبہ تو بولا ہی ہوگا۔ اور وہ بھی بیکار۔ مجھے ہلکی پھلکی کسرت کرنے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ میں ایک اچھا طالب علم بننا چاہتا ہوں۔ مگر ہمیشہ ادھر پڑھنے بیٹھا اور ذہن کتاب سے ہٹ کر دوسری طرف چلا گیا یا دوست آ گئے ہیں اور کسی کو منع نہیں کر سکا۔ اپنے پروگرام پر عمل نہیں کر سکتا۔

اُس کی اُداس آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا" سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ تم وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھتے۔ پھر تم نے جو پروگرام بنایا ہے وہ بھی کافی لمبا ہے۔ ایسا پروگرام بناؤ جس پر عمل کر سکو۔ اگر تم ہر کام وقت پر کرنے لگو تو مجھے یقین ہے کہ تم خوش رہنے لگو گے۔ اس کے علاوہ ایک کام یہ کرو کہ اپنی ایک ڈائری بنا لو۔ اور دن بھر میں جو کچھ کرو اسے ڈائری میں لکھ ڈالو۔ چاہے اچھا کام ہو یا بُرا۔ اس کے بعد یہ کوشش کرو کہ بُرے کام کم ہوں اور اچھے زیادہ۔ اس طرح ایک دن تم دیکھو گے کہ تم ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہو"

اتفاق کی بات کہ وقار کی سمجھ میں میری بات آگئی اور اس نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ اب وہ باقاعدہ ہر چیز ڈائری میں لکھتا۔ اور کوشش کر کے ہر کام وقت پر کرتا۔ چند روز بعد مجھے اپنی خالہ کے یہاں جانا پڑا۔ چار مہینے کے بعد عید کی چھٹی میں جب لوٹا تو وقار کے یہاں گیا۔ عید کا دن تھا۔ وقار کا کمرہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ وہ کرسی پر بیٹھا سبق یاد کر رہا تھا۔ میں نے آواز دی۔ دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ آیا چچی میری آواز سن کر آگئیں اور بولیں ـــــ

"بیٹا اندر آجاؤ۔ بہت دن بعد آئے۔ تم کو نہیں معلوم یہ وقت وقار کے پڑھنے کا ہے۔ اس وقت تو اگر اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے تب بھی وہ نہیں اٹھے گا"

"مگر چچی آج تو عید ہے"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ چھٹی کے دن بھی وہ آدھے گھنٹے ضرور کام کرتا ہے۔ بس اب نکلنے ہی والا ہے"

پھر چچی بڑی دیر تک بیٹھی وقار کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتیں رہیں۔

بچوں کی برادری جامعہ کی جانب سے
گاندھی ٹرافی کا
مضمون یا کہانی کا تحریری مقابلہ
شرطیں

۱۔ اس مقابلے کے لیے بچوں کو عمر کے لحاظ سے دو گروپ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۸ سے ۱۲ تک اور ۱۳ سے ۱۵ تک۔ اپنے نام کے ساتھ اپنی عمر ضرور لکھیے۔

۲۔ کہانی یا مضمون روشنائی سے صاف اور ایک اِک لائن چھوڑ کر لکھیے کاپی سائز کے کاغذ پر صرف ایک طرف لکھا جائے۔

۳۔ لکھنے والے کو اختیار ہوگا کہ وہ اردو میں بھیجے یا ہندی میں۔

۴۔ کہانی یا مضمون کہیں سے نقل نہ کیا گیا ہو۔ اور پہلے کہیں چھپا نہ ہو۔

۱۳۰ روپے کے انعامات

۱۔ ہر گروپ میں سب سے اچھی کہانی یا مضمون پر ۱۵، ۱۵ روپے کے انعامات دیے جائیں گے۔

۲۔ اس کے بعد دوسری اچھی کہانیوں میں سے ججوں کے فیصلے کے مطابق ہر گروپ میں سے پانچ پانچ روپے کے دس انعامات دیے جائیں گے۔

انعامات بچوں کی پسند کے مطابق۔ کھلونوں، کتابوں اور رسالوں کے سالانہ چندے کی شکل میں دیے جائیں گے۔

۵۔ پہلے گروپ کی کہانی یا مضمون زیادہ سے زیادہ ۶ صفحے کاپی سائز پر اور دوسرے گروپ کی کہانی یا مضمون زیادہ سے زیادہ ۸ صفحے کاپی سائز پر ہونا چاہیے۔

۶۔ کہانی یا مضمون کے شروع میں اس کا عنوان موٹے قلم سے اور آخر میں اپنا نام اور پورا پتہ اور عمر خوشخط اور صاف لکھیے۔ کہانی یا مضمون کی نقل اپنے پاس رکھیے۔ دفتر واپسی کی ذمہ داری نہ لے گا۔

۷۔ کہانی یا مضمون ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء تک دفتر "بچوں کی برادری جامعہ۔ جامعہ نگر دہلی" کے پتے پر بھیجیے۔

ایک بالی لڑکی

بالی عورتیں سمندر کے کنارے سے مونگے لے جارہی ہیں

ایک بالی کمہارن اپنے چاک پر برتن بنارہی ہے

اندر کے صفحات میں عراق کے بارے میں جناب نصیر الدین ہاشمی کا مضمون پڑھیے

پیام تعلیم

ادارہ

حامد علی خاں — بی اے (جامعہ)

اطہر پرویز — ایم اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ — چار روپے

فی پرچہ — ۶ (چھ) آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی

فہرست

جامعہ میں تعلیمی میلے کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی ہیں۔ اس بار ہمارا میلہ ۱۴، ۱۵، اور ۱۶ر اکتوبر کو ہوگا۔ پچھلے سال کی طرح پھر اچھے اچھے پروگرام رکھے گئے ہیں۔ بچے بڑے سب اپنے اپنے کاموں کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی کئی اچھے ڈرامے ہوں گے۔ اس بار پھر بچوں کی برادری کی طرف سے بچوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس کا حال ہم آپ کے لئے آئندہ پرچے میں شائع کریں گے تاکہ وہ پیامی بچے بھی پڑھ لیں جو اس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکیں گے۔

اس بار جامعہ میں آنے والے مہمانوں میں مصر کے نائب وزیر اعظم جناب جمال سلیم صاحب خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ آپ نے کچھ وقت جامعہ میں بھی گزارا۔ جمال سلیم صاحب نے ہندستان کے مختلف علاقوں کی سیر کی اور ہمارے ملک کے ترقی کے کاموں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

اس پرچے میں یوں تو سب ہی مضامین اور کہانیاں دلچسپ ہیں لیکن اس بار ایک خاص چیز

"عراق کے بننے والے" ہے جسے نصیرالدین صاحب ہاشمی نے ہمارے لئے لکھا ہے۔
ہاشمی صاحب عراق تشریف لے جا چکے ہیں۔ اس لئے اس مضمون کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ ہم عراقی بچوں کی تصویریں بھی شائع کر رہے ہیں۔ تصویروں کے لئے ہم عراق کے سفارت خانے کے ممنون ہیں۔
اس مضمون کے لئے ہاشمی صاحب کی صاحبزادی، فرحت ہاشمی صاحبہ خاص طور پر شکریہ کی مستحق ہیں۔ انھوں نے پیام تعلیم کے لئے ہاشمی صاحب سے یہ مضمون لکھوایا۔ فرحت صاحبہ خود بھی پیام تعلیم سے دلچسپی لیتی ہیں۔ اور عرصے سے اس کی خریدار ہیں اور انعامی مقابلوں میں بھی حصہ لے چکی ہیں۔

مضمون اور کہانیوں کے انعامی مقابلوں کا سلسلہ بے حد پسند کیا جا رہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ بچے اس میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔
اس بار بچوں کی برادری کی طرف سے اچھے اچھے مضامین اور کہانیوں کا انعامی مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر تھی لیکن بچوں کی فرمائش پر برادری نے مضمون بھیجنے کی آخری تاریخ بڑھا کر ۳۰ اکتوبر کر دی ہے۔ جن بچوں نے ابھی تک اپنے مضمون اور کہانیاں نہیں بھیجیں وہ اب اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔
ہم اپنا سالنامہ جنوری میں شائع کریں گے اس میں تمام انعامی کہانیاں اور مضامین شائع کئے جائیں گے۔

ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ پیام تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ خریدار بنائیں۔ آپ کو یہ پڑھ کر خوشی ہوگی کہ بعض بچے اس سلسلے میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ چنانچہ جناب عبدالواحد صاحب بیدل بیورنیہ نے چند مہینوں میں پیام تعلیم کے کئی خریدار بنائے۔ امید ہے کہ اور بچے بھی اس سلسلے میں دلچسپی لیں گے اور خریدار بنائیں گے۔

اپنے مضامین صاف خوشخط اور ایک ایک سطر چھوڑ کر لکھئے۔

ادارہ

حامد اللہ افسر

اسکول کی گھڑی

اسکول کی گھڑی ہے دیوار میں گڑی ہے
اس کو خبر نہیں ہے
اسکول، گھر نہیں ہے
ٹک ٹک لگا رکھی ہے
ہر وقت بولتی ہے
اسکول کی گھڑی ہے دیوار میں گڑی ہے
اتنا جسے نہ آئے
دس دیر میں بجائے
کس کام کی گھڑی وہ
کتنی ہی ہو بڑی وہ
اسکول کی گھڑی ہے دیوار میں گڑی ہے
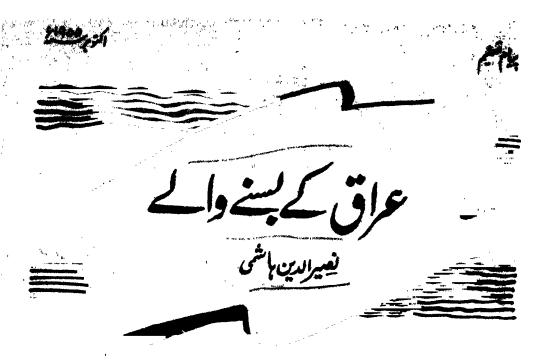
عراق، حجاز، ایران، ترکی اور شام کے ملکوں سے ملا ہوا ہے۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے پہلے عراق شام، اور حجاز، ترکی میں شامل تھے، لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد یہ تمام سلطنتیں علیحدہ علیحدہ حکومت کرنے لگیں۔ اور اب ایک کے بجائے پانچ چھ سلطنتیں بن گئیں۔ اور ان سب کی حیثیت ایک ایک ملک کی سی ہو گئی ہے۔

عراق کی حکومت انگریزوں نے حجاز کے سابق والی شریف حسین کے فرزند امیر فیصل کو سونپ دی۔ یہاں کا نظام سلطنت انگلستان سے ملتا جلتا ہے۔ انگلستان کی طرح یہاں بھی پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں، جو قانون بناتے اور حکومت کرتے ہیں۔ اس وقت امیر فیصل کے پوتے فیصل ثانی یہاں کے بادشاہ ہیں۔ یہ نوجوان ہیں۔ ابھی دو سال پہلے ان کو باختیار بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے پہلے چونکہ ان کی عمر کم تھی۔ اس لئے ان کی طرف سے ان کے ایک عزیز حکومت کا کام کاج کرتے تھے۔ شاہ فیصل ثانی نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی ہے۔

عراق ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس کے بڑے شہر بغداد، موصل، بصرہ، کربلا اور نجف اشرف ہیں۔ عراق بغداد کا دارالسلطنت ہے جو دریائے

دجلہ کے دونوں جانب آباد ہے موصل میں پٹرول کے چشمے ہیں جس سے لاکھوں گیلن پٹرول روز نکلتا ہے یہاں کا بندرگاہ بصرہ ہے۔ یہاں ہندوستان پاکستان اور یورپ کے مختلف ملکوں کے جہاز آتے ہیں' اس کے علاوہ بصرہ میں ہوائی اڈہ بھی ہے۔ مشرق اور مغرب کے ملکوں کو جانے والے جہاز یہاں اترتے ہیں۔ اس لئے بصرہ میں روزانہ بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ کربلا اور نجف یہاں کے مقدس شہر ہیں۔ یہاں ہمارے پیغمبر کے نواسے حضرت امام حسینؓ دفن ہیں' جو ایک ظالم بادشاہ یزید سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ ماہ محرم میں اب بھی ہر جگہ حضرت امام حسینؓ کا ماتم کیا جاتا ہے اور اس کا سوگ منایا جاتا ہے۔ نجف میں آپ کے باپ اور پیغمبر اسلام کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا مزار ہے۔ یہاں ہندوستان' پاکستان' افریقہ وغیرہ سے سیکڑوں آدمی ہر سال زیارت کے لئے آتے ہیں۔

بغداد بڑا پرانا شہر ہے۔ قدیم اسلامی تہذیب اور تمدن کا مرکز تھا۔ ایک زمانہ یہ تھا کہ یہاں کے مدرسے اور کتب خانوں میں یورپ اور ایشیا کے طالب علم آکر علم حاصل کرتے تھے۔

آئیے اب ہم آپ کو کچھ عراقی بچوں کا حال بتائیں۔ عراق کے متعلق اس تعارفی بیان کے بعد ہم عراقی بچوں کا حال قلمبند کرتے ہیں' عراق کے بچے ہندوستان اور یورپ کے بچوں کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ گورا ہوتا ہے یورپ کے بچوں کی طرح ان کی رنگت خوب سرخ و سپید ہوتی ہے بعض بچے گندمی رنگ کے ہوتے ہیں۔ ابھی عراق میں بچوں کی تعلیم جبری نہیں ہے۔ اس لئے بہت سارے بچے گلیوں میں گولیاں اور دوسرے کھیل کھیلتے اور موٹروں کے پیچھے دوڑتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں' سردی کے موسم میں جب کہ ہمارے بچوں کو بستر سے اٹھنا برا معلوم ہوتا ہے عراقی بچے تیار ہو کر مدرسے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی مدرسوں میں لڑکے علیحدہ مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں اور لڑکیاں علیحدہ مدرسوں میں پڑھتی ہیں۔ عام طور سے لڑکیاں نیلے رنگ کا فراک استعمال کرتی ہیں' وہاں کی عورتوں کا لباس پوری طرح مغربی ہے۔ اس لئے لڑکیاں بھی یورپ کی لڑکیوں جیسا لباس پہنا کرتی ہیں۔ ان کی مادری زبان عربی ہے اسی زبان میں وہ تعلیم پاتے ہیں۔ انگریزی زبان بھی ایک لازمی زبان

کی طرح پڑھائی جاتی ہے۔ کیونکہ طب، سائنس، زراعت، انجینئرنگ کی تعلیم انگریزی میں ہوتی ہے اس لئے بچوں کو شروع ہی سے انگریزی سکھائی جاتی ہے۔

عراق کے بچے بڑے تیز، چالاک اور مستعد ہوتے ہیں، وہ جلد جلد تعلیم میں آگے بڑھتے جاتے ہیں، وہ بزرگوں اور بڑوں کا ادب کرتے اور استاد کی عزت کرتے ہیں، اگرچہ وہاں سگریٹ نوشی عام ہے مگر بچے سگریٹ نہیں پیتے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سینما کے عادی نہیں ہیں صرف وہی کھیل دیکھا کرتے ہیں جو بچوں کے لئے مفید اور ان کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

کالج میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم ملی جلی ہوتی ہے۔ البتہ اعلیٰ لڑکیوں کو شریک کیا جاتا ہے یعنی کسی کالج میں نوسو بچوں کی گنجائش ہو تو (۶۰۰) لڑکے اور (۳۰۰) لڑکیاں جاتی ہیں، مخلوط تعلیم کے علاوہ دو کالج صرف لڑکیوں کے لئے ہیں جس میں کسی لڑکے کو شریک نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح دو کالج ایسے ہیں جن میں اب تک کوئی لڑکی شریک نہیں ہوئی ہے۔ ایک تو دینیات کالج اور دوسرا زراعت کا کالج، ممکن ہے آئندہ اس کالج میں لڑکیوں کو شریک کیا جائے۔ وہاں انجینئرنگ کالج میں بھی لڑکیاں پڑھتی ہیں اور انجینئر بنتی ہیں۔

بچوں کے کھیل کود کے لئے مخصوص مقامات ہیں جہاں بچے تعلیم کے بعد کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لئے بھی بچوں کی جماعتیں جاتی ہیں ہندوستان کی طرح وہاں بھی عیسائیوں کی طرف سے مشن اسکول موجود ہیں۔ یہاں بچوں کی تعداد کافی ہوتی ہے۔ وہاں مسلمان، عیسائی اور یہودی مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن قومی اعتبار سے لوگ اپنے آپ کو مسلمان، عیسائی، یہودی نہیں کہتے بلکہ "عراقی" کہتے ہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے نام بھی مسلمانوں کے نام جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کھانے پینے اور عام زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

وہاں کے بعض مدرسوں میں دو مرتبہ تعلیم ہوتی ہے، یعنی کچھ لڑکے صبح کو تعلیم پاتے ہیں اور کچھ لڑکے شام کو۔ اس طرح ایک ہی اسکول میں زیادہ لڑکے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح جو لڑکے ہوٹل وغیرہ میں ملازم ہوتے ہیں اور تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو بھی تعلیم کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ عراق میں تعلیم روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

مفت کی روٹی

ایک قدیم روسی کہانی

ایک کسان اپنے بیلوں کے لئے گھاس چھیل رہا تھا۔ جب دوپہر ہوئی تو وہ ایک جھاڑی کے پاس آکر بیٹھ گیا اور روٹی نکال کر کھانے لگا۔ ابھی اس نے کھانا شروع کیا تھا کہ ایک بھیڑیا آگیا۔ اور بڑی عاجزی کے ساتھ کسان سے بولا:۔

"بھیا کسان کیا کر رہے ہو"

"روٹی" کسان نے جواب دیا

"کیسی ہوتی ہے روٹی؟" بھیڑیے نے پوچھا

"بڑے مزے کی" کسان نے روٹی کا مزا لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تب تو مجھے بھی چکھاؤ" بھیڑیے نے زبان نکالتے ہوئے کہا

"ضرور چکھو" کسان نے یہ کہہ کر ایک روٹی بھیڑیے کو بھی دے دی

روٹی کھا کر تو بھیڑیے کو خوب مزا آیا۔ اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے بولا "سچ مچ بڑے مزے کی ہے تمھاری روٹی۔ ذرا مجھے بھی بتاؤ کیسے مل سکتی ہے؟"

کسان نے کہا "اچھی بات ہے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ روٹی کیسے ملتی ہے۔ بھیا پہلے تمھیں زمین جوتنی پڑے گی"

"پھر مل جائے گی مجھے روٹی" بھیڑیے نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا

کسان نے کہا "صبر کرو، بھائی صبر کرو۔ ابھی روٹی کہاں۔ جب زمین کو اچھی طرح جوت لو پھر تمھیں زمین پر پٹیلا پھیرنا پڑے گا کہ مٹی کے ڈھیلے ٹوٹ جائیں"

"اچھا تو پٹیلا پھیرنے کے بعد روٹی مل جائے گی" بھیڑیے نے خوشی سے دم ہلاتے ہوئے کہا۔

کسان اس کے پھر ٹوکنے پر چڑ گیا اور بولا "پہلے پوری بات تو کہہ لینے دو، خواہ مخواہ بیچ بیچ میں ٹوکتے ہو۔ ابھی تو تم کو اناج بونا پڑے گا"

"تب جا کر کہیں روٹی تیار ہوگی" بھیڑیے نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا

"ابھی کہاں۔ ابھی تو فصل کا انتظار کرنا پڑے گا سردی گزرنے تک۔ ہولی تک کہیں فصل پک کر تیار ہوتی ہے"

"اوہ" بھیڑیے نے ٹھنڈی سانس بھری "بڑا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے بعد تو بہت سی روٹی کھانے کو ملتی ہے"

"ابھی کہاں ـــــ ابھی سے روٹی ملے گی" کسان نے بھیڑیے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ابھی روٹی کہاں ملے گی۔ پہلے اناج کاٹنا ہوگا۔ اس کے گٹھے بنانے ہونگے پھر گٹھوں کا ڈھیر بنانا ہوگا۔ ہوا اس کا بھوسا اڑائے گی اور دھوپ اس کو سکھائے گی۔ اس کے بعد اُسے پھٹکنا پڑے گا"

"تب کہیں جا کر مجھے یہ روٹی ملے گی" بھیڑیے نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

کسان نے چڑھ کر کہا "بڑے بے صبرے ہو۔ اتنی دیر سے یہی رٹ لگائے ہو۔ ارے بھائی ابھی تو اناج کو بوروں میں بھرنا پڑے گا۔ پھر بوروں کو چکی پر لے جانا پڑے گا۔ چکی پر اناج پسے گا تو کہیں اس کا آٹا بنے گا"

"بس اب تو روٹی ملے گی۔ بڑا انتظار کرنا پڑتا ہے روٹی کے لئے"

"اماں ابھی سے روٹی ملے گی۔ ابھی تو تمھیں آٹا گوندھنا پڑے گا۔ جب آٹا خوب لیس دار ہو جائے تو پھر اسے گرم چولھے پر توا رکھ کر پکانا پڑے گا" کسان نے کہا۔

"بس پھر تیار ہو جائے گی روٹی" "ہاں اب جا کر روٹی تیار ہوئی۔ اور تم اطمینان سے روٹی کھا سکو گے" اب کسان نے اپنی بات ختم کی۔

بھیڑیا بڑی فکر میں پڑ گیا اور بیٹھا اپنے پنجے سے سر کھجانے لگا۔

"بھئی یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ ایک روٹی کے لیے اتنی محنت۔ مجھے تو کوئی آسان سی ترکیب بتاؤ۔"

کسان نے کہا "بھئی اگر تم محنت کر کے روٹی حاصل کرنا نہیں چاہتے اور مفت کی روٹی چاہتے ہو تو سنو۔ اس کا طریقہ بھی بتائے دیتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کوئی آسان سا طریقہ بتاؤ" بھیڑیے نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"سنتے تو ہو نہیں، اپنی کہے جاتے ہو"

کسان نے چڑ کر کہا "تم میدان میں چلے جاؤ وہاں ایک گھوڑا گھاس چر رہا ہے۔ اس کے"

ابھی کسان نے اپنی بات پوری نہیں کہی تھی کہ بھیڑیا بھاگتا ہوا گھوڑے کے پاس پہنچا اور بولا "گھوڑے گھوڑے میں تجھے کھانا چاہتا ہوں۔"

گھوڑا یہ سن کر بڑے مزے میں مسکرایا اور بولا "بھئی مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ضرور کھا لو۔ البتہ میرے سموں سے نال نکال دو۔ یہ لوہے کی ہیں۔ تمہارے منہ میں گڑیں گی۔"

"اچھی بات ہے" یہ کہہ کر گھوڑے نے اپنے سم بھیڑیے کی طرف کر دئے۔ اور بھیڑیے صاحب نال نکالنے کے لئے پاس کو بڑھے گھوڑے نے دو لتیاں جھاڑی ہیں تو اسے دن میں تارے نظر آ گئے۔ بھیڑیا چلاتا ہوا بھاگا

اب بھیڑیا دریا کے کنارے پہنچا جہاں مرغابیاں بیٹھی تھیں۔ بھیڑیے نے سوچا کہ میں ان مرغابیوں کو کیوں نہ کھاؤں۔ چنانچہ مرغابیوں سے بولا۔

"بی مرغابی! میں تم سب کو کھانا چاہتا ہوں"

مرغابیوں نے ہنستے ہوئے کہا "بڑی خوشی سے کھاؤ۔ ہاں مگر شرط یہ ہے کہ ہمارا ایک کام کر دو۔"

"کیا کام ہے" بھیڑیے نے پوچھا

"ہمیں ایک گانا سنا دو"

"اچھی بات ہے" یہ کہہ کر بھیڑیا ایک ٹھنٹھ پر بیٹھ گیا اور سر اوپر اٹھا کر گانے لگا۔

اب مرغابیاں موقع پا کر اڑ گئیں۔

اب تو بھیڑیا اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ میں بھی کیا بیوقوف ہوں کہ مرغابیوں کو گانے سنانے لگا۔ اب کسی سے ملوں گا تو بے وقوفی نہ کروں گا۔ بلکہ اسے فوراً

کھاؤں گا۔"

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے ایک بڑھا آدمی نظر آیا تو اس نے دوڑ کر اُس سے کہا "بڑے میاں .... بڑے میاں - میں تمھیں کھانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے" بڑے میاں نے کہا "لیکن بھائی پہلے ہم تم نسوار لے لیں۔ نسوار سے تمھیں میرے گوشت میں مزا بھی خوب آئے گا۔"

بھیڑیا نسوار لینے پر راضی ہو گیا اور بڑے میاں نے اپنی جیب سے نسوار نکالی اور ڈبیا بھیڑیے کے حوالے کر دی۔

لالچی بھیڑیے نے اتنی زور میں سونگھا کہ اس کے حلق میں نسوار چلی گئی۔ اب اسے جو چھینکیں آنے لگیں تو اتنی چھینکیں آئیں کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک گھنٹے تک چھینکتے چھینکتے اس کا برا حال ہوگیا۔ جب چھینکیں رکیں تو اس نے دیکھا کہ آدمی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

اب تو بھیڑیے کو بہت افسوس ہوا لیکن کرتا تو کیا۔ اپنی بیوقوفی پر خود ہی شرمندہ ہوا۔ اور آگے بڑھا۔ چلتے چلتے جب کافی دور نکل گیا تو اسے بھیڑوں کا ایک گلہ نظر آیا اور گلہ بان سو رہا تھا۔ بھیڑیے نے سب سے موٹی بھیڑ کو پکڑ لیا اور بولا۔

"بھیڑ، بھیڑ میں تمھیں کھانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" بھیڑ نے کہا "میری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ لیکن بھیڑیے میں چاہتی ہوں کہ جلدی مرجاؤں اور میری ہڈیوں سے تمھارے دانت نہ ٹوٹیں۔ تم ایسا کرو کہ یہاں کھڑے ہو جاؤ منھ پھاڑ کر اور میں اوپر سے کود پڑوں۔"

چنانچہ بھیڑیا منھ پھاڑ کر کھڑا ہو گیا، بھیڑ پہاڑی پر چڑھ گئی اور اُس نے دوڑ کر بھیڑیے کے سر پر وہ زور کی ٹھوکر ماری کہ بھیڑیا بے ہوش ہوگیا اور بہت دیر تک ہوش نہ آیا۔

جب بھیڑیے کو ہوش آیا تو خون میں لت پت تھا۔ گھبرا کر بولا "عجیب بات ہے۔ یہ بھیڑ بھی ہاتھ سے نکل گئی اب کیا کروں۔" اتنے میں وہ کسان بھی جس نے بھیڑیے کو روٹی کے بارے میں بتایا تھا آگیا اور بولا "کوئی بات نہیں، لیکن تم کو یہ تو معلوم ہوگیا کہ مفت کی روٹی کیسی ہوتی ہے۔"

رُوشنی کا سفر

منیر الحسن

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ستاروں کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن یہ روشنی ایسی نہیں ہے کہ ہمیشہ قائم رہیں۔ اس لئے کہ روشنی برابر کم ہوتی رہتی ہے۔ آپ نے اپنی ٹارچ میں دیکھا ہوگا کہ جب ٹارچ کا مسالہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر وہ روشنی نہیں دے سکتی۔ جب آپ اپنی ٹارچ میں مسالہ ڈلواتے ہیں تو یہ مسالہ برابر خرچ ہوتا رہتا ہے۔ یہی قاعدہ روشنی کا ہے کہ وہ برابر ختم ہوتی رہتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ستاروں کی روشنی بھی اسی طرح ختم ہوتی رہتی ہے اور اس طرح اکثر ستارے بُجھ بھی جاتے ہیں۔ بجلی کا قاعدہ کون نہیں جانتا۔ اگر روزانہ بجلی گھروں میں بجلی نہ بنے تو پھر آپ کے گھر میں بھی نہ جل سکے۔ بجلی گھر میں برابر بجلی بنتی ہے اور ہم آپ اُسے خرچ کرتے ہیں۔

چنانچہ ستاروں کی دُنیا میں اکثر ستارے اپنی روشنی ختم کر کے بجھ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مزیدار بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ رات کو آپ جس ستارے کی روشنی دیکھ رہے ہوں کہ وہ ستارہ اب تک بُجھ چکا ہو۔ آپ ہنسے تو نہیں، اس لئے کہ بظاہر تو

ہنسنے کی بات ہی ہے کہ جو ستارہ آپ کو نظر آ رہا ہے وہ بجھ چکا ہے۔ عجیب بات ہے لیکن اگر آپ ذرا سا بھی دماغ پر زور ڈالیں تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور ستاروں کا فاصلہ ہماری زمین سے اتنا زیادہ ہے کہ نہ جانے کتنے ستارے ہیں جن کی روشنی برسوں میں ہم تک پہنچتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ فرض کیجیے کہ ایک ستارے کی روشنی جو آج سے دس سال پہلے چلی تھی وہ ہم تک آج پہنچی ہے۔ اب اس درمیان میں ستارہ بجھ گیا۔ اس کی روشنی ختم ہو گئی۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس وقت وہ روشنی آپ تک پہنچے اس وقت دراصل روشنی ختم ہو چکی ہو۔

روشنی کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ کتنا ہی بڑا فاصلہ ہو طے کر سکتی ہے۔ وہ کروڑوں اور اربوں میل کا فاصلہ طے کر سکتی ہے بس اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ زیادہ فاصلہ پر جا کر اس کی چمک میں کمی ہو جائے لیکن اس کی روشنی پہنچے گی۔ یہ ضرور ہے کہ روشنی میں کمی بھی ہوتی رہتی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ روشنی سے زیادہ تیز رفتار کسی چیز کی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص گولہ داغے تو آپ کو پہلے روشنی نظر آئے گی پھر گولے کی آواز سنائی دے گی۔ آپ نے پلک جھپکائی اور روشنی نے لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ کتنی عجیب بات ہے۔

بھوتوں کا گھر

طیبہ رحمت اللہ

"بھوت، بھوت، بھوت! بس تم اسی کا وظیفہ پڑھتی رہو" نجمی بھیّا نے چڑھکر کہا۔

"لو تو کیا میں وظیفہ پڑھ رہی ہوں؟" نجمہ آپا کہنے لگیں "تم خود جا کر دیکھ آؤ، پھر اپنے آپ قائل ہو جاؤ گے"

نجمہ آپا اپنی بات منوانے پر تلی ہوئی تھیں۔ پرسوں بی جمالو نے رضیہ سے بتایا کہ اُن کے ایک رشتے دار پرنسپل لاج گئے تھے۔ جو بھوتوں کا گھر ہے۔ اور اب ان کی حالت اس قدر خراب ہے کہ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ چیختے چلاتے ہیں، یہاں تک کہ پلنگ پر دو دو فٹ اوپر اچھل جاتے ہیں۔ بی جمالو کا کہنا ہے کہ ان پر بھوت سوار ہو گیا ہے اور اب وہ .... "

"اچھا یہ سب کس نے کہا تم سے"؟ نجمی بھیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اور کون کہتا وہی رضیہ کہہ رہی تھی"

"پھر تو میں کبھی بھی یقین نہیں کر سکتا۔ بھیا نے کرسی پر پاؤں پھیلاتے ہوئے انگڑائی لے کر کہا۔

"کیوں نہیں"؟ آپا نے سوال کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ تمہاری بی رضیہ دنیا بھر کی جھوٹی ہیں۔ کبھی میں نے اس کے منہ سے سچی بات نہیں سنی"

غصے سے نجمہ آپا کا منھ لال انگارہ ہو گیا۔ "نجمی" انھوں نے چڑھ کر کہا "میں پوچھتی ہوں کہ تم نے کب

اُسے جھوٹی بات کہتے سُنا ہے۔ جو انسان خود جھوٹ
بولتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دوسرے بھی اس کی طرح جھوٹ
ہی کہتے ہیں۔ جب تمہیں اس کی بات کا یقین نہیں آتا
تو خود جاکر دیکھ آؤ۔ لیکن یوں کسی کو برا بھلا کہنا اور جھوٹی
تہمت لگانا اچھا نہیں۔" نجمہ آپا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے
باہر چلی گئیں۔

آپا کو غصہ بہت کم آتا تھا اور وہ بھی ان کی
سہیلیوں کو اگر بُرا کہا جائے تو۔ نجمی بھیا نجمہ آپا کو
ستاتے تو بہت تھے۔ مگر ان کی عزت بھی بہت کرتے
تھے ان سے بڑی جو تھیں۔

آج جو آپا یوں خفا ہو کر چلی گئیں تو بھیا
سوچنے لگے کہ محض بھوتوں کی خاطر اپنی بہن سے
جھگڑا کر لینا تو بُری بات ہے۔ مگر آخر یہ بھوت ہوتے
کیسے ہیں۔ جو ہر ایک ان سے ڈرتا ہے۔ مجھے تو بھوت
کبھی نظر نہیں آئے۔ کیوں نہ آج بھوتوں کو خود
جاکر دیکھا جائے۔ اور اس خیال کے آتے ہی وہ
ایک ٹارچ لے کر کمرے سے نکل پڑے۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ گھر کے سب لوگ
سونے چلے گئے تھے۔ نجمی بھیا شرفو کی کوٹھری
کی طرف بڑھے۔

"کون ہے؟" شرفو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

بھیا نے سب کچھ سمجھا دیا۔ شرفو گھگھیانے
لگا۔ سرکار میرے بال بچے ہیں۔ مجھ پر بھوت ووت
سوار ہو گیا تو میں بے موت مر جاؤں گا۔"

بھیا نے ڈانٹ کر کہا کہ "ڈرنے کی کوئی بات
نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ اسی کی تصدیق کے
لئے تو میں جا رہا ہوں" اب تو شرفو کی بھی ہمت بندھی
اور دونوں آہستہ آہستہ موٹر خانے کے پاس گئے۔
موٹر نکالی اور پرنسپل لاج کی طرف روانہ ہو گئے۔

"پرنسپل لاج" ایک سنسان گلی میں تھا۔
کبھی شاید بسا ہوا ہو مگر اب تو بالکل اُجڑ چکا تھا۔
کبھی کبھار کوئی شخص وہاں سر چھپانے کے لئے
آجاتا۔ مگر کوئی بھی وہاں ایک دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا

غرض بھیا آدھی رات کو پرنسپل لاج کی گیٹ
پر پہنچے۔ ہارن کی آواز سن کر ایک بوڑھا آدمی چراغ
لئے بھاگا ہوا آیا اور گیٹ کھول دیا۔ بھیا نے اسے
بتایا کہ وہ صرف رات بھر ٹھہرنے کے لئے آئے
ہیں۔ چنانچہ بوڑھا نوکر انھیں ایک کمرہ دکھا کر
ان کی ضرورت کی چیزیں دے کر چلا آیا۔

بھیا شرفو کو لئے آگے بڑھے لیکن جب اندر
قدم رکھنا چاہا تو ان کے پیر کانپ رہے تھے شرفو
بھیا کا ہاتھ پکڑے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ان کے

پیچھے ہو لیا۔ کمرے میں آنے کے بعد سیدھی طرف
انھیں ایک دروازہ ملا۔ آہستہ سے انہوں نے اس
کی زنجیر اتاری۔ تاریکی اور پھر خاموشی۔ زنجیر کا گرنا تھا
کہ یوں لگا جیسے بہت سے گھنگھرو بج رہے ہیں۔
دونوں سہم گئے۔ بھیا نے دروازہ کھولا "ارے" ان
کے منہ سے نکلا۔ دو سُرخ سرخ آنکھیں اندھیرے
میں دو جلتے ہوئے دیئوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔
شرفو نے چیخنا شروع کیا۔ مگر بھیا نے اس کا منہ
بند کردیا۔ ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شرفو کی نظریں
کہہ رہی تھیں "میں نہ کہتا تھا سرکار۔ آج تو آپ مجھے
مار ہی ڈالیں گے" اور بھیا کے کانوں میں تو جیسے
نجمہ آپا کی آواز گونج رہی تھی۔ "جب دیکھو گے تو پتہ
چلے گا" لیکن پھر انہوں نے ہمت سے کام لیا۔
"مگر وہ آنکھیں؟" شرفو بڑبڑانے لگا۔
اب وہ مڑ کر بڑے کمرے میں آنے لگے بھیا
نے پستول کی نلکی اٹھائی۔ گھر سے آتے وقت انہوں
نے اپنی شیروانی کی جیب میں احتیاطاً پستول ڈال
لیا تھا۔ لیکن ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پستول
چھوٹ کر زمین پر آ رہا۔ بھیا کا بہادر دل بھی سہم گیا۔
بڑا دل کر کے وہ یہاں تک آ تو گئے تھے لیکن یہاں سے
واپس جانا انھیں مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ وہیں گُم
سُم کھڑے تھے کہ پیچھے سے میاؤں میاؤں کی آواز
نے انھیں چونکا دیا۔ جھٹ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔
ایک کالی بلی اُن کے پیچھے بیٹھی اپنی سُرخ سرخ آنکھوں
سے انھیں گھور رہی تھی۔ بلی کو دیکھ کر اُن کی جان میں
جان آئی۔ شرفو بھی اب تن کر کھڑا ہو گیا۔

اب انھوں نے سوچا کہ جتنی جلد ہو سکے نجمہ
آپا سے ملنا چاہتے تھے۔

گھر پہنچ کر بھیا سیدھے اپنے کمرے میں گئے
شرفو کو بھی اس کے کمرے میں پہنچا دیا اور ہدایت
کردی کہ کسی سے کچھ نہ کہے۔ ناشتہ کے بعد نہایت
ڈرامائی انداز میں وہ نجمہ آپا سے کہنے لگے۔

"بھئی باجی کان پکڑتے ہیں۔ ہم قائل ہو گئے
تمہارے بھوتوں کے۔ تو اب بات کرلو۔"

نجمہ آپا گھبرا گئیں — "تو کیا واقعی تم وہاں
ہو آئے؟"

"ہاں باجی۔ واللہ اب تو کبھی ادھر کا رُخ
نہ کروں گا۔ چلو تمہاری رضیہ جیتیں اور ہم ہارے۔
خیر ہوئی جو بچ کر آ گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ شائد گھر کی
صورت نہ دیکھ سکوں گا۔"

"اوئی خدا نہ کرے۔ ایسی باتیں تو نہ کیا کرو۔"

"نجمہ آپا کو بھائی پر پیار آگیا۔

" مگر باجی۔ ذرا شرفو کے پاس چلو۔ وہ بیچارا بخار سے تپ رہا ہے۔"

" اس کو بھی لے گئے تھے؟"

بھیا نے نہایت مسکینی سے سر ہلایا۔ آپا دوڑ کر شرفو کے پاس گئیں۔

اتنے میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی کہ نجمی میاں رات بھوتوں والے گھر گئے تھے۔ پھر کیا تھا سب انھیں لپٹ گئے اور جو سوالوں کی بوچھار ہوئی تو نجمی بھیا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بعد میں انہوں نے نجمہ آپا سے کہا " باجی جیسے ہی ہم داخل ہوئے ویسے ہی سُرخ سُرخ آنکھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ آنکھیں نہیں ہیں انگارا ہیں۔ اور پھر یہ آنکھیں ہماری طرف بڑھنے لگیں"۔ اور بھیا یہ کہتے کہتے بچوں کی طرح باجی سے لپٹ گئے اور باجی نے انھیں یوں لپٹا لیا جیسے کوئی بھوت واقعی بھیا کو ان سے چھیننے لئے جا رہا ہے۔

اور شرفو نے کہا " نجمہ بی بی وہاں تو بس بلی تھی"۔ اور یہ سنتے ہی سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور نجمی بی ہارنے کے باوجود خوش تھیں +

بقیہ " زمین کی کشش "

کی دنیا میں نئی نئی تحقیقات کی ہیں۔

مرنے سے کچھ دن پہلے نیوٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ " میں ایک بچے کی طرح سمندر کے کنارے گھونگھے جمع کرتا رہا ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ یہ گھونگھے دوسروں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ لیکن ابھی میرے سامنے سچائیوں کا ایسا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے جس کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل کرنی ہیں"۔

یہ الفاظ اُس آدمی کے ہیں جس نے جدید سائنس کی بنیادیں رکھیں اور سائنسی تحقیقات کے دروازے کھول دئیے۔

گدھے کی تصویر

مجھے چونکا دیا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے آنکھیں ملیں ـــ اب جو آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں تو تصویر اپنی جگہ پر قائم ہے۔ لیکن .... لیکن مجھے یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ آج کل بھی اکثر لوگ بے زبان جانوروں پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔

زبیدہ رعنا۔ حیدرآباد دکن

تار کی کہانی

نور الہدیٰ

کہتے ہیں کہ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس خبر کو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچنے میں ہفتوں اور مہینوں لگ گئے تھے لیکن جب مہاتما گاندھی کو گوڈسے نے گولی سے مارا تو یہ خبر دنیا کے کونے کونے میں پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر پہنچ گئی۔

یہی وجہ ہے کہ آدمی برسوں سے اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ وہ ایسی ترکیب معلوم کرے جو خبریں آسانی سے کم دقتوں میں دور دور تک پہنچ سکیں۔

لیکن جب تک بجلی کی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ آدمیوں نے اس کام کے لئے روشنی اور آواز سے مدد لینی شروع کر دی تھی نپولین بلندی سے روشنی کے ذریعے ہدایت بھیجا کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ روشنی ایک بار روشن کی جائے تو یہ مطلب۔ دو بار کی جائے تو دوسرا مطلب۔ اس طرح مختلف پیغامات کے مختلف طریقے تھے، افریقہ میں ڈھول بجا کر یہ پیغام بھیجا جاتا تھا۔ لیکن ان پیغامات میں بھی وہ بات پیدا نہ ہوئی جو آدمی چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یہ پیغامات بہت دور تک نہ بھیجے جا سکتے تھے اور پھر ان کا استعمال عام لوگ کر بھی نہ سکتے تھے۔ یہ تو صرف فوجی

ضرورت کے طور پر استعمال ہوتے۔
چنانچہ جیسے ہی بجلی کی دریافت ہوئی انسان کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغام بھیجنے کے لئے استعمال کیا جائے۔
۱۷۵۳ء کی بات ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنس داں نے ایک مضمون چھپوایا۔ اس مضمون میں اس نے یہ بتلایا تھا کہ کس طرح بجلی کی مدد سے دُور دُور خبریں بھیجی جا سکتی ہیں ــــ لیکن اس وقت بجلی کے بارے میں انسان کی معلومات بہت زیادہ نہ تھیں۔ اس لئے اس کی باتوں پر کسی نے دھیان نہ دیا۔
اس کے بعد فرانسس رونالڈ نے اس کام پر دھیان دیا۔ اس نے اپنے باغ میں ۸ میل لمبا تار پھیلا دیا اور اس میں وہ بجلی کے ذریعے سے اپنی مرضی کے مطابق کھٹکے دینے میں کامیاب ہوگیا ــــ اس نے اپنے اس کام کو حکومت کے سامنے پیش کیا۔ لیکن حکومت نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لوگوں نے اُس کے اس کام کو محض کھلونا سمجھا اور ساتھ ہی اُس کا مذاق اُڑایا۔ اس لئے اس نے پھر خیال چھوڑ دیا۔
رونالڈ کے جس کام کی لوگوں نے ہنسی اُڑائی اسی کام کو ایک دن سیموئل مورسے نے سچ کر دکھایا۔ اس لئے تار سے خبر بھیجنے کا پتہ لگانے والا سیموئل مورسے مانا جاتا ہے۔
سیموئل مورسے ایک تصویر بنانے والا تھا۔ تصویر کے ذریعے روپیہ کمانے کے لئے وہ امریکہ سے یوروپ جا رہا تھا۔ اُسی جہاز سے ڈاکٹر جیکسن نام کا ایک مسافر جا رہا تھا۔ مورسے نے ڈاکٹر جیکسن سے بجلی کے بارے میں گفتگو کی اور اس کے دل میں یہ خیال فوراً پیدا ہوا کہ بجلی کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ خبریں بھیجی جا سکتی ہیں۔
مورسے وہیں اس کام میں لگ گیا ــــ اور اس کام کے لئے جو کچھ کرنا تھا اس کا خاکہ اُس نے اُسی جہاز پر تیار کر لیا۔
امریکہ واپس آکر وہ یہی کرتا رہا۔ کئی سال تک لگاتار کام کرتا رہا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے بیٹری تیار کی۔ تاروں سے بجلی کی لہر کے نکل جانے کا بھی ڈر تھا۔ اس لئے اس نے تاروں پر سوت لپیٹ کر اُسے روک رکھنے کا انتظام کیا۔

اس نے نیو یارک یونیورسٹی کے احاطے میں تار پھیلائے۔ اور اپنا کام شروع کیا۔ وہاں اُسے خاصی کامیابی ہوئی۔

اس کے لئے دو اوزار کام میں لائے جاتے ہیں۔ ایک وہ ہے جس سے خبر بھیجی جاتی ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جو خبر کو پکڑتا ہے۔ پکڑنے والے اوزار میں مقناطیس کا کانٹا لگا رہتا ہے۔ مقناطیس کے کانٹے سے ملا کر دو کانٹے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں جب مقناطیس ہل کر اُن کانٹوں پر لگتا ہے تو اس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز بجلی کے تار کے ذریعے ڈیمی تک پہنچ جاتی ہے — اور اُسی طرح کی آواز ڈیمی سے نکلنے لگتی ہے۔

تار گھر کا تار بابو جس طرح کی آواز کھٹا کھٹ اپنی ڈیمی سے نکالے گا اُسی طرح کی آواز بجلی کے تار سے بھیجنے والے اوزار تک پہنچ جائے گی۔ بھیجنے والے اوزار کے مقناطیس کی سوئی ہلنے لگے گی۔ اور اپنے بغل کے کانٹوں سے ٹکرا کر اُسی طرح کی آواز پیدا کرے گا۔ اور یہ آواز اُسی طرح تاروں کے ذریعے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے۔ اور دوسری جگہ ڈیمی سے اُسی طرح کی آواز نکلنے لگتی ہے — اس طرح سے خبر ایک جگہ سے دوسری جگہ بہت کم وقت میں پہنچ جاتی ہے۔

مورسے نے پانچ سال تک اس کی تحقیقات کی۔ پانچ سال کے بعد اس نے اپنا یہ اوزار اپنے دوستوں کو دکھایا۔ اور اس سے دس میل کے فاصلے پر پہلی بار خبر بھیجی۔

مورسے امریکہ میں یہ کام کر ہی رہا تھا کہ ادھر اُسی وقت انگلینڈ میں ولیم کوک بھی تار کی مدد سے خبر بھیجنے کی دھن میں لگا تھا۔ اُسے بھی اُسی وقت کامیابی حاصل ہوئی —

آہستہ آہستہ اس میں کافی ترقی کی گئی۔ پہلے تار کے لئے دو تاروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ بعد کی تحقیقات سے ایک ہی تار کے ذریعے ایک ہی وقت میں کئی تاروں کا بھیجنا ممکن ہو گیا۔

ہاتھ سے ڈیمی کو کھٹ کھٹانا اور کان سے سُن کر اوزاروں کو لکھنے میں وقت لگتا تھا۔ اس لئے یہ کوشش ہونے لگی کہ یہ کام بھی اوزار ہی سے لیا جائے۔ اس کام میں بھی کامیابی ہوئی۔ اب تو گھنٹے میں ۶۰۰ سے ۱۰۰۰ تک لفظ بھیجے جاتے ہیں۔

لطیفے

مالک:۔ (نوکر سے) تمھیں آٹھ آنے جرمانہ کیا جاتا ہے۔
نوکر:۔ (مالک سے) حضور! مرجائے گا۔
مالک:۔ حضور نہیں مرے گا۔
دلجیت سنگھ آزاد جمشید پور

مریض:۔ ڈاکٹر صاحب! میں نے آج اتنے کیلے کھائے ہیں کہ حلق تک بھر گیا ہے۔
ڈاکٹر:۔ تو پھر قے کردو۔ انگلی ڈال کر۔
مریض:۔ واہ اگر دو انگلیاں ڈالنے کی جگہ ہوتی تو ایک کیلا نہ منھ میں رکھ لیتا۔
عبدالسعید خاں

ایک دولتمند ہاتھی پر سوار ہو کر بازار سے گزر رہا تھا۔ ہاتھی کو دیکھ ایک افیمچی فوراً آواز دے کر بولا۔ "ارے او ہاتھی والے! ہاتھی بیچو گے۔"
افیمچی کی آواز سن کر رئیس کو بڑا غصہ آیا لیکن کچھ نہ بولا۔ اگلے دن رئیس نے اس افیمچی کو بلایا اور کہا "آج ہاتھی خریدو گے!"
افیمچی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور وہ سوداگر تو کوچ کر گیا۔ میں تو صرف دلال تھا۔"

افسر:۔ کیوں جی تم سو کیوں رہے ہو۔

کلرک :- کیا کروں کل رات بھر میرے بچے نے مجھے سونے نہیں دیا۔
افسر :- تو پھر بہتر یہ ہے کہ تم یہاں اپنے بچے کو لے کر ہی آیا کرو۔

عبدالواحد بیدل۔ پورنیہ

ماسٹر :- کوئی ایسا لفظ لکھو جو بہت لمبا ہو۔
ایک لڑکے نے لکھا "ربڑ"
ماسٹر :- یہ کیسے۔
لڑکا۔ جناب آپ اسے کھینچ کر لمبا کر سکتے ہیں۔

ایک ساتھی (دوسرے سے) تم نے کان پور کا نام کہاں سنا ہے۔
دوسرا۔ کانپور میں۔

سید حیدر علی جذبی۔ پورنیہ

شریر لڑکا :- (بال کٹواتے ہوئے حجام سے) کیوں صاحب! آپ نے کبھی گدھے کی حجامت بنائی ہے ؟
حجام :- جی نہیں، آج پہلی بار بنا رہا ہوں۔

بروں کی دوستی

احسن حامد

کسی جنگل میں ایک تھا تالاب۔ بڑا لمبا چوڑا اور گہرا۔ اس تالاب میں ہزاروں چھوٹے بڑے مینڈک رہتے
تھے۔ دن بھر کھاتا پینا اور ٹرانا ان کا کام تھا۔ نہ کسی بات کا غم اور نہ کسی چیز کی فکر۔ آزادی سے زندگی گزارتے
تھے۔ ایک دن اُن کا سردار اچانک مر گیا۔ اس کے مرنے پر انھوں نے ایک اور مینڈک کو اپنا سردار بنا لیا۔
لیکن یہ مینڈک بڑا بُرا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ اتنی اچھی بستی کا سردار اور بُرا ہو۔ آخر تنگ آکر مینڈکوں
نے ایک دن اس کو خوب اچھی طرح مارا پیٹا اور تالاب سے نکال دیا۔ وہ روتا پیٹتا سانپوں کی بستی گیا اور
وہاں ایک موٹے کالے سانپ کو سارا قصہ سنایا۔

سانپ نے دل میں سوچا کہ اگر ایک کو کھاتا ہوں تو سب مینڈک ہاتھ سے جائیں گے۔ ہاتھ بھر کا
پھن اوپر اٹھا کر گرج کر بولا "اچھا! مینڈکوں کی یہ مجال کہ اپنے سردار کو نکال دیا۔ چلو ایک ایک سے بدلہ
نہ لوں تو میرا نام شاہ ناگ نہیں۔"

مینڈک جو ابھی بھیگی بلی بنا کھڑا تھا تو خوشی سے پھول کر کُپّا ہو گیا اور بولا "ہاں سرکار! آج کل کا
زمانہ ایسا ہی ہو گیا اور اب جو آپ کی مدد ملے تو عمر بھر میرے اوپر احسان رہے۔ اور آپ کا گن گاؤں۔

سو آگے آگے شاہ ناگ اور پیچھے پیچھے مینڈک شاہ، تالاب کی طرف چلے۔ شاہ ناگ الگ خوش تھے کہ چلو مفت میں موٹے موٹے مزیدار مینڈک ملیں گے اور مینڈک شاہ بھی مگن تھے کہ کھوئی ہوئی سرداری دوبارہ ملے گی۔

جیسے ہی دونوں تالاب میں کودے سارے مینڈک مارے ڈر کر اِدھر اُدھر چھپ گئے

سانپ نے کہا "میرے سامنے تمام مینڈکوں کو بلا کر دربار میں حاضر کرو اور جو نہ آئے، مجھے بتاؤ اس سے میں سمجھ لوں گا۔"

اب کس کی مجال تھی کہ جو دربار میں آنے سے انکار کرے اور جان سے جائے۔ ڈر کے مارے سب چپ چاپ دربار کے ہال میں پہنچ لئے ایک کرسی پر مینڈک شاہ اور دوسری پر اُن کے مہمان شاہ ناگ براجمان ہوئے۔

شاہ ناگ نے اپنا پھَن نکالتے ہوئے کہا! "مینڈکو! خوب کان کھول کر اچھی طرح سُن لو۔ پہلے تم نے جو کچھ کیا وہ بہت بُرا کیا۔ مگر اب اگر کوئی سردار کا کہنا نہ مانے گا اس کے لئے مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

مینڈک یہ سُن کر سہم گئے اور ناگ شاہ نے مینڈک شاہ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے تاج رکھا اور سردار بنا دیا۔

جب دربار ختم ہوا تو سب مینڈک ٹرّاتے ٹرّاتے اپنے اپنے کام دھندوں پر چلے گئے۔

شاہ ناگ نے مینڈک شاہ سے کہا کہ مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے اور یہاں کھانے کو کہاں۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ اپنے ساتھ کھانے کی کوئی چیز نہ لایا۔ تم اگر اجازت دو ایک آدھ مینڈک کھا کر یہ بھوک مار لوں۔"

مینڈک شاہ انکار کرتے تو کیسے کرتے۔ ایک تو سانپ کا ڈر اور دوسرے اس کے احسان کی وجہ سے لحاظ اور مروّت تھی۔

اس کے مرتا نہ تو کیا کرتا۔ آہستہ سے بولا "آپ جس کو چاہیں کھائیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

سانپ نے چھ سات مینڈک پکڑے اور کھا کر آرام سے ایک کونے میں پڑ کر سو گیا۔

بستی کے سارے مینڈکوں کا آرام و چین ختم ہو گیا۔ سب کی جان کے لالے پڑ گئے۔ آج بچے تو کل کی خیریت نہیں۔ آج ایک کی باری ہے تو کل دوسرے کی۔ جو بھاگ سکتے تھے وہ گھر بار چھوڑ کر دوسرے تالابوں میں چلے گئے۔ جو بڈھے اور لاچار تھے وہ

کونے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔

اب مینڈک شاہ بہت پچھتائے کہ سانپ نے تو بڑا سخت خراج وصول کیا۔ مگر زبان ہلانے کی ہمت نہ تھی۔ کیونکہ اپنی جان بھی تو پیاری تھی۔

آخر آہستہ آہستہ سانپ چُن چُن کر سب کو کھا گیا۔ اور سارے مینڈکوں کی بستی کو ویران کر دیا۔ جب تالاب میں ایک مینڈک بھی نہ رہا تھا۔ تو ناگ شاہ مینڈک شاہ کے پاس پہنچے۔ مینڈک شاہ نے بھی نیت بھانپ لی اور سوچا کہ چند گھڑی کی زندگی ہے اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔

پھر بھی دل کڑا کر کے بولا "حضور کی عمر دراز ہو، جتنی خاطر ہم سے ہو سکی تھی، کی۔ اب مجبوراً میں معاف کیجئے اور اپنے شہر کو سدھاریے۔"

سانپ ہنسا اور بولا "اجی آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ، خاطر کا تو اصلی موقع اب آیا ہے۔" یہ کہتے ہی سانپ نے اپنا کالا پھن پھیلایا اور مینڈک شاہ کو بھی ہڑپ کر دیا۔

"کیوں بچے ہمّا تو کہا ہے کہ بیریوں کی دوستی، جی کا جنجال ہوتی ہے۔"

بقیہ بچوں کی کوشش

کچھ فاصلے پر ایک شہزادی تالاب میں نہانے آئی۔ جب شہزادی نہا رہی تھی۔ تو کبوتر موقعہ سے فائدہ اٹھا کر شہزادی کا ہار لے کر اُڑ گیا اور وہ ہار سانپ کے قریب لے جا کر رکھ دیا۔ اور اس کا ایک کونا درخت سے باہر رکھا۔

جب شہزادی نہا کر باہر نکلی۔ دیکھا کہ ہار غائب تھا۔ شہزادی نے اچھی طرح تلاش کی لیکن ہار نہ ملا۔ مجبور ہو کر شہزادی واپس چلی آئی۔

آخر کار ایک روز شہزادی کے سپاہی اسی درخت کے پاس آ پہنچے۔ ایک سپاہی نے ہار دیکھ لیا۔ اور جیسے ہی ہار لینا چاہتا تھا کہ سانپ سامنے نظر آیا۔ سپاہی نے سانپ کو مار ڈالا۔ اور ہار شہزادی کو دے دیا۔

شہزادی نے ہار دیکھا تو بہت خوش ہوئی کبوترا اور کبوتری دونوں بھی بہت خوش ہوئے پھر اب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اس کے بعد پھر اُن کے انڈوں میں بچے نکلے۔

کریم داد خاں
حیدر آباد

دنیا کے تمام ملکوں اور قوموں کے تیوہاروں کا وہاں کے لوگوں کی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے خاص طور پر پرانے تیوہار تو سچ مچ جیسے لوگوں کی زندگی کا آئینہ ہیں۔

پہلے زمانے میں آبادی کم تھی اور زمین زیادہ، جدھر نظر اٹھتی ادھر زمین ہی زمین دکھائی دیتی۔ اس لئے آدمی ہونے کا مطلب زیادہ کام کرنے والے ہاتھ تھا۔

اس زمین کو کام میں لانے کے لئے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اسی لئے پرانے زمانے میں جس کے گھر میں زیادہ بچے ہوتے وہ بہت خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے گھر میں کام کرنے والوں کی گنتی بڑھ جاتی اور گھر کے لوگ اور زیادہ خوشحال ہو جاتے۔ جب کسی گھر میں نیا بچہ جنم لیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے گلاب کی ڈالی میں ایک نیا پھول کھل گیا ہو۔

بچے کی پیدائش کے موقع پر عورتیں گیت گاتیں۔ سارا کنبہ کئی کئی دن خوشیاں مناتا۔ دعوتیں دی جاتیں۔ گھی کے چراغ جلائے جاتے۔ گھر میں رات رات بھر گانا بجانا ہوتا۔

پرانے زمانے کے لوگ ایسی ہی خوشی لہلہاتی فصل کو دیکھ کر بھی مناتے تھے۔ اس

لئے کہ جب بچے زیادہ ہوں گے تو گھر کا خرچ بھی زیادہ ہوگا۔ کیونکہ جب تک وہ بڑے نہ ہوجائیں۔ ماں باپ کو انھیں کھلانا پلانا تو پڑے گا ہی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں سائنس کی معلومات بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بارش نہ ہونا، اولے گرنا، یا فصل کو پالا مار جانا ایسی ایسی بہت سی مشکلیں تھیں، جو لوگوں کے بس کے باہر تھیں۔ اس لئے جب آدمی ان تمام مشکلوں پر قابو پالیتا اور فصل تیار ہو کر کھلیان سے گھر آتی تو لوگوں کے من خوشی سے ناچ اٹھتے اور یہ خوشی کسی تیوہار کی شکل اختیار کرلیتی۔

ہماری تہذیب دنیا کی پرانی تہذیبوں میں سے ایک ہے اس لئے اس کے تیوہار اور رسم و رواج بھی بہت پرانے ہیں۔ ہمارے زیادہ تر تیوہار فصلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور گاؤں میں آج بھی تیوہار اسی پرانے ڈھنگ سے منائے جاتے ہیں۔

ہمارے دیس میں دو فصلیں خاص طور پر ہوتی ہیں۔ ایک خریف اور دوسری ربیع کی خریف کی فصل شروع برسات میں بوئی جاتی ہے اور اگھن یعنی اکتوبر تک پک کر تیار ہوجاتی ہے۔ برسات میں کسی طرف نکل جائیے۔ زمین ہری بانات کی خوبصورت پوشاک پہنے مستی سے ہنستی نظر آئے گی۔ جدھر نگاہ اٹھے گی ادھر بھی دھان اور جوار مکئی کے ہرے بھرے کھیت لہلہاتے نظر آئیں گے۔ رفتہ رفتہ یہ فصل پینگیں لیتی ہوئی بڑھتی ہے اور کسان کے دل میں نئی نئی امنگیں گنگا جمنا کی طرح ہلوریں لیتی ہے۔ فصل تیار ہوگی۔ گھر کے سارے دکھ دلدر دور ہوجائیں گے۔ لڑکی کا گونا یا رخصتی ہوگی۔ نئی چوپال بنے گی۔ ایسے نہ جانے کتنے خوبصورت خوبصورت سپنے کسانوں کی آنکھوں میں بستے رہتے ہیں۔

اکتوبر کے مہینہ میں خریف کی فصل تیار ہوتی ہے۔ دھان کے کھیت سنہری بالوں کی کلغی باندھے شاہی شان سے مسکراتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی کسان کے دل کی کلی بھی کھل جاتی ہے، وہ دسہرے کی تیاریاں کرنے لگتا ہے۔

فصل کاٹ کر گھر لے آنا پہلے زمانہ میں کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہر منزل پر قدرت سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ قدرت کے بھید نہ جاننے کی وجہ سے انسان نے طرح کے الگ الگ دیوی

دیوتا مانے تھے اور وہ لوگ ان کی پوجا پاٹ کرتے
تھے۔ اس لئے کہ اُن کا خیال تھا کہ یہ دیوی دیوتا
انھیں اور ان کی فصلوں کو دشمنوں سے بچاتی
ہیں اور انھیں برکت دیتی ہیں اور ان کا خیال
تھا انھیں برکت دینے والے دیوی دیوتاؤں
میں ایک درگا دیوی بھی تھیں جو مصیبت کے
وقت ان کی مدد کرتی تھیں۔ اسی لئے اس
زمانے میں فصل کٹنے پر ان کی پوجا ہوتی تھی۔
کنوار میں چاندنی راتوں کے زمانے میں ہر گھر
میں دُرگا کی پوجا شروع ہو جاتی ہے۔ نو دن
تک دُرگا دیوی کی پوجا کے بعد دسویں دن
دسہرا آتا ہے۔ گویا یہ اس ہنسی خوشی کا سب
سے خاص دن ہے۔

ہمارے ملک میں دسہرے کا تیوہار
سبھی جگہ پورے جوش و خروش سے منایا جاتا
ہے۔ مگر بنگال میں اس کو خاص طور پر اہمیت
حاصل ہے۔ وہاں اس کو دُرگا پوجا ہی کہتے
ہیں۔ ہر گاؤں اور شہر کے ہر محلہ میں ایک
خاص جگہ اکٹھا ہو کر لوگ پوجا کرتے ہیں۔ ایک
منڈپ بناتے ہیں جس میں بڑے بڑے فنکاروں
کی بنائی ہوئی مٹی کی مورتیں اور دُرگا دیوی کی
مورت رکھی جاتی ہے اس کے ساتھ اور بھی
دوسرے دیوی دیوتاؤں کی مورتیں رہتی ہیں۔
نو دن تک خوب دھوم دھام رہتی ہے۔ لڑکیاں
اپنی سسرال سے ماں کے گھر آتی ہیں۔ دوست
اور رشتے دار ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں اور گاؤں
کے گاؤں۔ محلے کے محلے مل کر دُرگا پوجا مناتے ہیں۔

راجستھان اور دوسری ریاستوں کے دسہرے
پر کچھ راجاؤں اور مہاراجاؤں کی چھاپ پڑ گئی۔
انھوں نے اس موقع پر اپنی سواری بڑی شان و شوکت
کے ساتھ نکالنی شروع کر دی۔ اور ہاتھی پر خود
راجا صاحب سوار ہوتے اور پیچھے لاؤ لشکر
ساتھ ہوتا اور اس طرح ان کی سواری نکلتی۔
اس اعتبار سے میسور اور کچھ دوسری ریاستوں
کا دسہرا بہت شاندار ہوتا تھا۔ اور آج بھی بڑی
دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا
ہے اسی دن رام چندر جی نے لنکا پر حملہ کیا تھا

اُتری ہندوستان میں دسہرے کے دن
لوگ ایک دوسرے کے گھر ملنے جاتے ہیں اور
پان الائچی سے ایک دوسرے کی خاطر کرتے ہیں۔
خریف کی فصل کے ساتھ دسہرا آتا ہے اور اس
کے بعد تیوہاروں کا تانتا سا بندھ جاتا ہے۔

دو لاکھ ڈھول

ا۔ ع۔ انصاری اسلام پوری

کسی گاؤں کے باہر اِملی کا ایک پُرانا پیڑ تھا۔ اس درخت کے نیچے کوڑے کرکٹ کا ایک ڈھیر تھا۔ اسی ڈھیر میں کسی نے چیڑ کی لکڑی کا بنا ایک صندوق پھینک دیا تھا۔ ایک چھوٹی نسل کے چوہے نے اس میں اپنا گھر بنالیا تھا۔ صندوق میں ایک کونے پر ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ اس سوراخ سے چوہا دروازے کا کام لیتا۔ اِدھر اُدھر اناج لا لا کر جمع کر لیتا اور آرام سے رہتا۔

اِملی کے اُس درخت پر ایک چڑیا بھی رہا کرتی تھی۔ اس سے چوہے کی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک دن چڑیا اپنے دوست چوہے کا گھر دیکھنے نیچے آئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے صندوق کے سوراخ

میں جھانک کر دیکھا اور بولی "دیکھا میرا گھر"
چڑیا ذرا ناک بھوں چڑھا کر بولی "بھلا یہ بھی کوئی گھر ہے؟ اس میں روشنی اور ہوا کے لئے ایک کھڑکی بھی تو نہیں، بس صندوق جیسا ہے"
چوہے نے ہنس کر کہا "ارے صندوق جیسا کیا، صندوق تو ہے ہی۔ کھڑکی نہیں تو میرے لئے اچھا ہی ہے، ورنہ بلّی کو اندر جھانکنے کا موقع مل جائے گا اور اُسے جھانکتے دیکھ کر میری جان نکل جاتی ہے"
"اچھا، اب میں سمجھ گئی۔ لیکن اتنے چھوٹے سے گھر میں تم نے اناج کا یہ ڈھیر کیوں لگا رکھا ہے؟" چڑیا نے پوچھا۔
"اگر یہ نہ ہو تو پھر میرا گزارہ کیسے ہو؟ کیا کئی روز کے کھانے کے لئے اناج جمع کرنا بھی اچھا نہیں —؟" چوہے نے سوال کیا۔
"کیوں نہیں ...... لیکن اس سے تو اچھا یہ ہے کہ ندی کے اُس پار بڑے کسان کے کھیت میں پڑے ہوئے اناج کے ڈھیر میں جا کر رہو، اِدھر اُدھر تلاش کرنے اور لانے سے بھی بچ جاؤ گے" چڑیا نے مشورہ دیا۔
"کیا سچ سچ وہاں اتنا اناج ہے؟" چوہے نے خوش ہو کر پوچھا۔
"ہاں تم آپ جا کر دیکھ لو میں جھوٹ کہتی ہوں یا سچ۔ وہاں سیکڑوں چوہے گھر بسائے ہوئے ہیں۔ وہ اناج ہی کے ڈھیر میں رہتے اور اناج ہی پر گھومتے پھرتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے ڈھیر ہیں وہاں ——!" چڑیا نے اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی انگلی سے کھاتے ہوئے جواب دیا۔
لیکن چوہے کو اب بھی شک تھا کہ ندی کے پار اناج کے اتنے بڑے بڑے ڈھیر ہو سکتے ہیں، جن میں سیکڑوں چوہے گھر بسائے ہوں اور اناج ہی پر گھومتے پھرتے ہوں۔ اس لئے اس نے پھر چڑیا سے کہا
"بہن! اگر تیرا کہنا ٹھیک ہے تو میں آج ہی وہاں چلا جاؤں گا"
"ٹھیک ہے اور اس میں تمھارا ہی فائدہ ہے۔ لیکن اگر تم کو شک ہے تو ایک بار جا کر دیکھ آؤ ...... جھوٹ ہو تو مجھ سے کہنا ....!" چڑیا یہ کہہ کر پھُر سے اڑی اور درخت پر جا بیٹھی۔
اسی دن شام کو چوہا ندی کی طرف

چل پڑا۔ ندی کے کنارے کے پانی میں ایک پتھر
پر چڑھ گیا۔ وہ تھکا ماندہ بھی تھا اور پیاسا
بھی۔ اس نے ندی کا ٹھنڈا پانی پیٹ بھر پیا
جب وہ سر اٹھا کر اپنی لمبی لمبی مونچھیں صاف
کر رہا تھا، تو اسے ایک ڈراؤنا دھماکا سنائی
دیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دیکھا
کہ بڑا سا پتہ پانی پر بہا چلا جا رہا ہے اور
اس پر ایک مینڈک بیٹھا ہوا نظر آیا۔ دیکھتے ہی
دیکھتے پتا اس کی طرف پلٹا اور اب جو لہرائی۔
تو پتھر پر چڑھ آیا، جس پر وہ خود کھڑا تھا۔
"بھیا موس! ذرا پتے کو پانی میں دھکیل
دو ۔۔۔!!" مینڈک نے گھیں گھوں کرتے
ہوئے چوہے سے کہا۔
"اچھی بات ہے ۔۔۔ مگر ہاں ذرا یہ
تو بتائیے کہ بڑے کسان کا کھیت کہاں ہے؟"
چوہے نے کنول کے پتے کو پانی میں دھکیلتے
ہوئے مینڈک سے پوچھا۔
"اس پار نیچے کی طرف ہے، آؤ تم بھی اسی
پتے پر بیٹھ جاؤ، ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں"
مینڈک نے کہا۔
چوہا فوراً کنول کے پتے پر کود پڑا اور
اور مینڈک کے سامنے جا بیٹھا۔ پتا پانی میں پھر
بہنے لگا۔
"ذرا ایک منٹ ٹھہرنا۔ اُس پتھر پر کوئی چیز
ہے" یہ کہتے کہتے مینڈک کنارے کے پتھر پر
پھدک کر پہنچ گیا اور کیڑے کو کھا کر واپس آ
گیا۔ اُس کے کودنے سے پتا زور سے ڈگمگایا
اور چوہا پانی میں گرتے گرتے بچا۔ اب تو اسے
مینڈک پر غصہ آ گیا۔
"بغیر کچھ کہے سنے آپ کا اس طرح کودنا
اچھا نہیں۔ میں ذرا سنبھل نہ جاتا تو پانی میں

ڈوب جاتا ——" چوہے نے کہا۔

"پانی ہی تو ہے، تیر جاتے ——" مینڈک ہنس کر بولا۔

"واہ! اچھی کہی، جیسے میں بھی تمھاری طرح مینڈک ہوں، جو مجھے تیرنا آتا ہے ——" چوہے نے جواب دیا۔

مینڈک کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کنارے پر کوئی اور کیڑا نظر آیا۔ ایک ہی چھلانگ میں مینڈک پھر کنارے جا پہنچا۔ اس دفعہ پتا اتنے زور سے ڈگمگایا کہ چوہا اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور بیچ بیچ پانی میں گر پڑا۔ لیکن جلد ہی پانی کی ایک تیز اور اونچی لہر نے اُسے دوسرے کنارے پر پھینک دیا۔ چوہا ڈوب مرنے سے تو بچا، لیکن ٹھنڈ سے اُس کا برا حال ہو گیا۔ اُس میں جو حرکت کرنے کی بھی طاقت نہ رہی۔

"تیرنا آتا نہیں، اور چلے ہیں تیرنے ؟" چوہے نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سُنا۔ سر اٹھا کر دیکھنے پر اُسے آم کے ایک درخت کے نیچے ایک گلہری بیٹھی نظر آئی۔

"کیوں خالہ بی! سچ کہو میں بھی پانی میں تیرنے کی ہمت کر سکتا ہوں؟ یہ سب ایک بدمعاش مینڈک کی شرارت سے ہوا ——" یہ کہہ کر چوہے کو زور کی چھینک آئی۔

"اگر کسی طرح تمھارا بدن جلد ہی خشک نہ ہوا، تو زکام ہو جانے کا ڈر ہے۔ اچھا ٹھہرو! کچھ دن پہلے کپڑے کا ایک ٹکڑا آندھی سے اُڑ کر یہاں آ گیا تھا۔ یہ لو تم اُسے خوب اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھ جاؤ ——" یہ کہہ کر گلہری نے چوہے کو کپڑے کا ٹکڑا دے دیا۔

چوہے نے کپڑے کے ٹکڑے کو بدن پر لپیٹ لیا اور چپ چاپ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اُسے دیکھنے کے لئے گلہری کے بچے باہر نکل آئے۔ کپڑے میں لپٹا ہوا، چوہا ان کے لئے ایک تماشہ بن گیا تھا۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔

اتنے میں آسمان سے کسی پرندے کی آواز سنائی دی "وہ دیکھو! عقاب منڈلا رہا ہے۔ جو جہاں ہے، وہیں رہے، بالکل چپ چاپ!" ایک اچھے پرندے نے سب کو خطرے سے آگاہ کیا۔

"اے باپ رے باپ!! موت کا دیوتا آ رہا ہے۔ تم سب لوگ چھپ جاؤ۔ میاں چوہے! تم بالکل نہ ہلو! اوپر خطرہ منڈلا رہا ہے ——

اوپر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ خدا تمھارا نگہبان ہو۔"
یہ کہہ کر گلہری جلدی جلدی اپنے بچوں کے ساتھ درخت پر چڑھی اور پیڑ کے ایک خول میں گھس گئی۔
آسمان پر عقاب نے دو تین چکر لگائے مگر شکار کے لئے کچھ دکھائی نہ دیا۔ آم کے درخت کے نیچے کپڑے کا ٹکڑا، تو ضرور نظر آیا، لیکن اُسے اُس کے اندر چھپا ہوا چوہا نظر نہ آیا۔ وہ دوسری طرف چلا گیا۔

چوہے کے بدن کا پانی اب بالکل سوکھ گیا تھا۔ وہ کپڑے سے باہر نکل آیا۔ گلہری اور اس کے بچے بھی باہر آ گئے۔

"خالہ! آپ کی مہربانی سے میرا بدن بھی سوکھ گیا اور میری جان بھی بچ گئی اگر کپڑے کا یہ ٹکڑا نہ ہوتا، تو نہ جانے میری کیا درگت بنتی؟ اب مہربانی کر کے مجھے بڑے کسان کا راستہ بتا دیجئے!" چوہے نے کہا۔

بڑے کسان کا کھیت ——؟ وہ جَو کا کھیت دکھائی دے رہا ہے نا! اسی کے پاس ہے۔" گلہری کے بجائے کوّے نے چوہے کو راستہ بتایا۔
چوہا، گلہری، اس کے بچوں اور کوّے سے رخصت ہو کر جَو کے کھیت کی طرف چل پڑا۔

جَو کا کھیت سامنے دکھائی تو دے رہا تھا۔ لیکن بہت دیر تک چلنے اور بھٹکنے کے بعد چوہا وہاں پہنچ گیا۔ وہ کھیت کی مینڈھ پر چلتا چلا گیا۔ لیکن فاصلہ پھر بھی کم نہ ہوا۔ چوہے نے کہاں اتنا بڑا کھیت دیکھا تھا۔

خیر خدا خدا کر کے کسی طرح جَو کا کھیت پار کرتے ہی دھان کے کھیت میں ایک بہت بڑا اناج کا ڈھیر دکھائی دیا۔ "اُفوہ! اتنا بڑا ڈھیر؟ اس میں سیکڑوں کیا ہزاروں چوہے رہ سکتے ہیں۔" چوہا اس بڑے ڈھیر کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور خوشی کے مارے تیزی سے ڈھیر کی طرف دوڑنے لگا۔ لیکن سچ پوچھو تو دھان کے اس بڑے ڈھیر میں دھان سے زیادہ بھُس اور کوڑا کرکٹ تھا۔ قریب ہی بڑے کسان کی اناج کی کوٹھیاں بھی تھیں۔ ان کوٹھیوں کو چوہوں سے بچانے کے لئے اس نے وہ ڈھیر کھیت میں لگا رکھا تھا۔ چوہا ڈھیر کے بالکل پاس پہنچ کر یکایک رُک گیا۔ اُسے وہاں دھان کے دانوں کو چھپتا ہوا، ایک بڑی نسل کا چوہا نظر آیا۔

"ارے بھائی کھانا چاہتے ہو، تو کھاؤ، دانے جمع کیوں کر رہے ہو بھائی؟ چھوٹے چو

نے کہا۔

"اوہ! تو کوئی نیا نیا آیا ہوا معلوم ہوتا ہے تو پھر اناج جمع کرنا پہنچانا تیرا کام ٹھہرا۔ سترہ چوہوں کے کھانے کے لئے۔ چلو، جلدی کرو اپنا کام شروع کردو ۔۔۔" بڑے چوہے نے اسے حکم دیا۔

بڑے چوہے کی یہ بات سن کر چھوٹے چوہے کو حیرت ہوئی "جن کو کھانے کی ضرورت ہے، کیا وہ یہاں آکر نہیں کھا سکتے؟ ایک کی غذا آخر دوسرا کیوں ڈھو کر پہنچائے؟ یہ بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی ۔۔" چھوٹے چوہے نے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو ۔۔۔! یہاں کا یہی قاعدہ ہے۔ جو نئے آتے ہیں، انھیں پرانوں کے لئے کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ سوچتے ہو مفت کا مال آسانی سے مل گیا ہے، کھا کر چلتے ہو جائیں ہماری نوکری کرو، تب تمھیں کھانے کی اجازت ملے گی۔ ورنہ ایک دانہ نہیں چھو سکتے ۔ سمجھے؟" بڑے چوہے نے دھمکی دی

چھوٹا چوہا بہت ہی گھبرایا اور پریشان ہوا اسے یہ بے گاری اور دوسرے کی غلامی بالکل پسند نہ آئی۔ وہ وہاں سے کہیں اور چلنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ بڑے چوہے نے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا۔ اس پر دونوں میں جھگڑا ہونے لگا۔

اتنے میں وہاں کہیں سے اُڑتا اڑتا ایک کبوتر آنکلا۔ اس نے دونوں چوہوں کو لڑتے دیکھا تو اُن سے ڈانٹ کر کہا ۔۔ "ٹھہرو! تم دونوں لڑتے کیوں ہو ۔۔؟"

چھوٹے چوہے نے کبوتر کو ساری باتیں بتا دیں۔ کبوتر نے بڑے چوہے کو قصوروار ٹھہرایا، اور اُسے مارنے کی دھمکی دی۔ پھر اُس نے چھوٹے چوہے سے کہا ۔۔۔ "تم اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آئے ہی کیوں؟ کیا تم نے نہیں سُنا کہ دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں ۔۔۔ میں تمھارے ہی گاؤں کی طرف جا رہا ہوں، اگر چلنا چاہو، تو میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ، میں تمھیں پہنچا دوں گا۔"

چھوٹا چوہا، چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ جھٹ کبوتر کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ کبوتر اسے وہاں سے لے کر روانہ ہو گیا۔

چھوٹا چوہا اپنے گھر واپس آگیا۔ اور سوچنے لگا۔ جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

کارٹون

میں تو وہ بڑی والی پنسل لوں گی جو دکان کے اوپر رکھی ہے۔

زمین کی کشش

محمد اسلم خواجہ

آپ جب کرکٹ کھیلتے ہیں اور گیند کو بلّے سے زور سے مارتے ہیں۔ تو گیند ذرا سی دیر بعد زمین پر گر پڑتی ہے۔ پھل توڑنے کے لئے جب آپ اُسے ڈھیلے سے مارتے ہیں تو پھل زمین پر ٹپک پڑتا ہے اور ڈھیلا بھی نیچے آکر گر پڑتا ہے۔

ایک لوہے کے ٹکڑے کو ہوا میں اچھالئے یہ نیچے گر پڑے گا۔ کسی کنوئیں کے اوپر پتھر کا ٹکڑا لے جائیے اور اُسے چھوڑ دیجئے یہ کنوئیں میں گر جائے گا۔ کسی بھاری چیز کو اٹھاتے وقت آپ کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چیزیں صرف زمین پر ہی نہیں رہنا چاہتیں اور نہ صرف پھینکنے کے بعد زمین پر آنا چاہتی ہیں۔ بلکہ اگر انہیں جگہ ملے تو وہ زمین کے اندر بھی گھس جائیں کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

اس سوال کا جواب سب سے پہلے انگلستان کے مشہور سائنسداں سر اسحاق نیوٹن نے دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ سیب کے باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ یہ چاند کیوں اوپر اس طرح ٹکا ہوا ہے یہ کیوں نہیں گر پڑتا۔ ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ ایک سیب ان کے پاس آکر گرا۔ ان کا خیال فوراً اس

طرف گیا اور وہ غور کرنے لگے کہ سیب زمین پر ہی کیوں گرا۔ پہلے بھی لوگ سیب اور دوسری چیزوں کو زمین پر گرتے دیکھا کرتے تھے لیکن کبھی کسی نے اِس مسئلہ پر غور نہ کیا تھا۔ ہاں نیوٹن کو اس میں ایک عجیب بات معلوم ہوئی اور اسے خیال ہوا کہ ضرور کوئی ایسی قوت ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ انہوں نے کئی تجربہ کئے اور بہت سے حساب لگا کر دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین سب چیزوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر چیز ایک دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جس چیز میں مادّہ کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ اس میں قوت کشش ہوگی۔ چیزوں کے درمیان میں فاصلہ جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی ان کی قوت کشش کم ہوگی۔ زمین کی اِس کشش کو "کشش مرکزی" (Gravition) کہتے ہیں۔

نیوٹن کا نام دُنیا میں ہمیشہ قائم رہے گا۔ زمین کی کشش کا راز معلوم کرنے کی وجہ سے ان کا شمار دنیا کے اعلیٰ ترین سائنس دانوں میں ہے۔ نیوٹن نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ ہر چیز کا وزن اس کے مادّہ کی تعداد پر منحصر ہے کسی چیز میں جتنا زیادہ مادّہ ہوگا اُس پر اُتنی ہی زیادہ زمین کی قوت کشش ہوگی۔ اسی قوت کشش سے سورج چاند، ستارے، اور سیارے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

اگر زمین میں اپنی طرف کھینچنے کی طاقت نہ ہوتی تو گیند اُچھالنے کے بعد پھر کبھی واپس نہ آتی اور اوپر ہی کی طرف چلتی ہی چلی جاتی۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگرچہ سیب اور زمین دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے تھے لیکن زمین کی بہ نسبت سیب میں مادّہ کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے سیب زمین پر گر پڑا۔ اس زمین پر جتنی چیزیں ہیں وہ سب زمین سے چھوٹی ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ زمین کے مرکز کی طرف کھنچتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی چیز میں کشش زیادہ ہے۔ بڑی چیز میں یا چھوٹی چیز میں؟ کس کا وزن زیادہ ہے؟ مادے کی مقدار کس میں زیادہ ہے؟

اب اس کو سمجھنے کے لئے میں روزمرّہ کی چند اور مثالیں پیش کروں گا۔ لیجئے پہلے آپ ایک تجربہ کرکے ہی دیکھئے۔

میز کے کنارے پر ایک ایسی کتاب رکھئے کہ کتاب کا تھوڑا سا حصّہ باہر نکلا رہے۔ اب

کتاب کو تھوڑا سا سرکائیے۔ مگر کتاب نہیں گرتی۔ اب پھر سرکائیے، آخر کار اگلی مرتبہ کے سرکانے پر کتاب گر جاتی ہے۔ اس حد پر جس پر ذرا سا سرکانے پر گر جاتی ہے ایک لائن کھینچ دیجئے۔ کتاب کو اب °۹۰ پر گھمانے سے یعنی دوسری طرف سے بھی یہی عمل کیجئے۔ اور جس مقام پر کتاب گر جائے اُس پر بھی ایک لائن کھینچ دیجئے۔ یہ دونوں لکیریں جہاں ملتی ہیں، اُس مقام کو دیکھئے۔ اپنی اُنگلی پر اس نقطہ کو رکھ کر کتاب کو ٹکا لینے کی کوشش کیجئے۔ جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے۔

(Centre of Gravity) کہتے ہیں۔ اس لئے جب تک یہ نقطہ میز کے اوپر رہتا ہے کتاب نہیں گرتی اور جہاں باہر ہوا کتاب گر جاتی ہے۔ یعنی اِس کتاب پر زمین کی قوت کشش اس نقطے پر مرکوز ہے گویا کہ کل کتاب کا وزن اِسی نقطہ پر جمع ہو گیا ہے۔

تو اس تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ ہر ایک چیز کی ایک کشش مرکزی ہوتی ہے جہاں پر زمین کی قوت مرکوز ہوتی ہے۔ اس نقطہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ کسی چیز کو ایک جگہ پر قائم

کتاب ٹک جائے گی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس تجربے سے آپ دیکھ سکتے ہو کہ کتاب میں ایک ایسا نقطہ ہے۔ جہاں پر کتاب ٹکائی جا سکتی ہے۔ اس نقطہ کو کشش مرکزی کا نقطہ
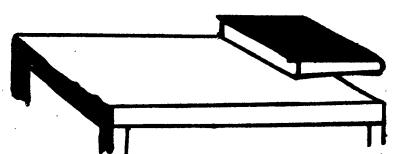
ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کا نقطہ کشش مرکزی اس کے قاعدے پر ہو۔ ہم روزانہ اس بات کی مثال دیکھتے یا کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً اس کو سمجھنے کے لئے بہت سی

مثالیں لیجئے۔

(۱) چھوٹا بچہ چلنا سیکھنے سے پہلے گر جاتا ہے کیوں کہ اس کے جسم کا کشش مرکزی جسم کے باہر ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے جسم کے حصے اس کے جسم کو اس طرح سنبھال لیتے ہیں۔ کہ یہ نقطہ ہمیشہ بیچ میں رہتا ہے۔

(۲) ایک بالٹی پانی لیکر چلتے ہوئے کسی آدمی کو دیکھئے، بالٹی لادنے سے پہلے چلنے کا طریقہ کیا تھا بالٹی لینے کے بعد اس کے کھڑے ہونے کا طریقہ دیکھئے۔ یہ کیسا فرق ہے؟ یہاں بھی بالٹی ہاتھ میں لینے کی وجہ سے مرکزی کشش میں تبدیلی ہوئی ہے۔

(۳) جب کسی ناؤ میں سب سواری ایک طرف کو ہو جاتی ہیں تو ڈوبنے کا اندیشہ ہوتا ہے، بتائیے کیونکہ کشش مرکزی بدل جاتی ہے۔

(۴) ولایت سے جو جہاز ہندوستان کی طرف آتے ہیں ان کی کشش مرکزی کو ٹھیک رکھنے کے لئے نمک کے بوجھ سے جہاز کو بھاری کرنا پڑتا ہے۔ جب یہ جہاز یہاں سے ولایت جاتے ہیں تو کپاس، غلہ، اس قسم کا کچا مال لے جاتے ہیں، جن کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں آتے وقت ولایت سے مشین یا کارخانے سے طرح طرح کے بنے ہوئے سامان لاتے ہیں ان کا وزن زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کشش مرکزی بہت اوپر اٹھ جاتا ہے جس کی وجہ سے سمندر کی لہروں سے جہاز بہت ہلتا رہتا ہے۔ اور ڈوبنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ان جہازوں کے کشش مرکزی نیچا کرنے کے لئے نمک بھر دیتے ہیں۔ نمک کے بوجھ سے کشش مرکزی پانی میں بہت نیچے ہو جاتا ہے اور لہروں کے اثر سے الٹنے کا اندیشہ کم ہو جاتا ہے۔

ان معمولی قدرتی واقعات سے متاثر ہو کر نیوٹن نے اتنا بڑا اصول نکال کر ہماری معلومات کو بڑھا دیا۔ اور اسی وجہ سے سائنس پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ زمین کی کشش کا راز معلوم کرنے والا نیوٹن اپنے بارے میں خود کیا کہتا ہے "اگر میں نے ذرا سا بھی آگے دیکھا ہے تو وہ صرف بڑے بڑے قدآور دیوؤں کے کندھوں پر کھڑے ہو کر دیکھا ہے" بڑے قدآور دیوؤں سے نیوٹن کی مراد ان سائنس دانوں سے ہے جنہوں نے نیوٹن سے پہلے سائنس

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

میاں رمضو کی نہ پوچھئے ہر کام انوکھا، ہر بات نرالی۔ ایک مرتبہ وہ کچھ نقدی باندھ کر بیل خریدنے میلے گئے۔ سارا میلا چھان مارا لیکن انہیں اپنے مطلب کا بیل نہ ملا۔ تب انہوں نے سوچا کہ خالی ہاتھ کیسے واپس جاؤں اور پھر کچھ دنوں کے بعد پیسے خرچ ہو جائیں گے، کیوں نہ کوئی دوسرا جانور خرید لوں۔ اگلے میلے میں اس جانور کو بیچ کر پھر بیل لے لوں گا۔ چناں چہ اچھی طرح ٹھوک بجا کر انہوں نے اتنے پیسے میں ایک گدھا اور ایک بکری خرید لی۔ بکری کی گردن میں گھنٹی باندھ دی، اور اپنے آپ گدھے پر سوار ہو کر چلے۔ آگے آگے آپ پیچھے پیچھے بکری مزے میں تانیں اُڑاتے ہوئے گھر آ رہے تھے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بیوقوف آدمی کہیں چھپتا نہیں اور پھر میلے ٹھیلے میں تو اس کی حرکتوں کو دیکھ کر لوگ پہچان لیتے ہیں۔ ادھر سے تین ٹھگ گزر رہے تھے۔ انھوں نے رمضو میاں کو دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان گئے اور ان کے پیچھے پیچھے لگ گئے۔

ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک ٹھگ نے ان کی بکری پیچھے سے غائب کر دی اور گھنٹی گدھے کی دُم میں باندھ دی۔ ذرا سی دیر بعد

دوسرے ٹھگ نے میاں رمضو سے کہا "کیوں بھائی گھنٹی گردن میں باندھی جاتی ہے یا دُم میں؟" میاں رمضو نے پلٹ کر جو دیکھا تو بکری غائب تھی۔ بڑے گھبرائے۔ ٹھگ نے پوچھا "کیوں بھائی کیا ہوا؟" میاں رمضو نے کہا۔ "گھنٹی بکری کی گردن میں تھی اور بکری غائب" ٹھگ بولا۔ اُدہو وہ بکری آپ ہی کی تھی؟ ابھی ابھی ایک آدمی اس طرف کو (جدھر وہ ٹھگ گیا تھا اس کے الٹی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لے جا رہا تھا۔ میاں رمضو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ گدھا ٹھگ کے حوالے کرکے اس طرف کو دوڑ پڑے۔

بکری کا دور دور پتا نہ تھا۔ ادھر اُدھر ڈھونڈے ڈھونڈتے پھرے لیکن کہیں سراغ نہ مل سکا۔ لوٹ کر جو میاں رمضو آئے تو اب گدھا بھی غائب تھا۔ بے چارے کو بڑا دھکا لگا۔ منہ لٹکائے صورت بنائے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک کنواں ملا۔ دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا زار و قطار رو رہا ہے۔ میاں رمضو میں ایک بڑی اچھی بات یہ تھی کہ وہ خواہ کتنی ہی تکلیف میں ہوتے دوسروں کی تکلیف دیکھ کر اپنا دکھ بھول جاتے۔ انھوں نے اس آدمی سے پوچھا کیوں بھائی کیوں روتے ہو؟ وہ بولا میری سونے کی انگوٹھی ابھی پانی نکالتے ہوئے کنویں میں گر گئی ہے۔ اگر کوئی نکال دے تو میں اس کو بہت سا انعام دوں گا۔ میاں رمضو نے سوچا وہ گدھا بکری کھو ہی چکا ہوں، کچھ انعام مل جائے گا تو یہ گھاٹا بھی پورا ہو جائے گا۔ جھٹ کپڑے لتّے اُتار کنویں میں پھاند ہی تو پڑے۔ وہ اُدھر کنویں میں اُترے ادھر یہ تیسرا ٹھگ بھی ان کے سارے کپڑے لے کر یہ جا وہ جا۔ اب جو میاں رمضو کنویں سے نکلتے ہیں تو سب کچھ غائب ننگ دھڑنگ کھڑے ہو گئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن پھر میاں رمضو نے کبھی میلے ٹھیلے کا رُخ نہ کیا۔

(فارسی سے اپنائی گئی)

ڈرامے

امتحان	۹ ر	بنیادی حق	۱۰ ر
چھوٹا لڑکا	۴ ر	چور لڑکا	۶ ر
دیوان غالب صاحب	۶ ر	[illegible]	عجیب تحریر ۵ ر

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

عقلمند وزیر

کہتے ہیں کہ ایک تھا راجا۔ نام تھا اس کا نارنا تھ لیکن وہ اپنی رعایا پر بڑا ظلم ڈھاتا تھا۔ ملک کا ہر آدمی اس سے پریشان تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ظلم سے تنگ آکر لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر دوسرے شہروں میں چلے گئے تھے۔ ساری بستیاں ویران ہو گئیں تھیں اس کے علاقے میں ہر جگہ اُلّو بولتا تھا۔ اس کا وزیر شرن ناتھ نہایت ہی رحم دل، دانشور و چالاک تھا۔

ایک دن وزیر اور بادشاہ دونوں شکار کرنے جا رہے تھے۔ راستے میں کسی ایک اجڑے ہوئے درخت پر دو اُلّو بیٹھے نظر آئے۔ بادشاہ نے وزیر سے پوچھا کہ بتاؤ دونوں اُلّو آپس میں کیا بات چیت کر رہے ہیں۔ بتاؤ ورنہ تمھارا سر قلم کر دوں گا۔ وزیر درخت کے پاس گیا اور کچھ دیر ٹھہر کر چلا آیا اور نہایت عاجزی سے بولا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ان دونوں کی گفتگو سناؤں۔

بادشاہ نے جواب دیا "برا ماننے کی کیا بات کیونکہ میں نے تمھیں خود ان دونوں کی باتیں معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

وزیر نے کہا "ایک اُلو اپنے بڑے بچے کی شادی دوسری اُلو کے یہاں کرنا چاہتا ہے لیکن جہیز میں دو سو ویران بستیاں مانگتا ہے۔ دوسرے اُلو نے جواب دیا کہ "خدا زندہ رکھے، راجہ نارناتھ کو دو سو ویران بستیاں تو کیا میں تم کو دو ہزار ویران بستیاں جہیز میں دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"بادشاہ یہ سن کر بے حد شرمندہ ہوا اور اس نے ظلم سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔"

اشفاق احمد گرگانوی سنبھال

نجومی

سڑک پر ایک جگہ بڑی بھیڑ تھی لوگ ایک نجومی کو اپنے ہاتھ دکھا رہے تھے۔ اور نجومی گپیں ہانک رہا تھا۔ ایک شخص نے جو کافی دیر سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا، آگے بڑھ کر کہا "نجومی بڑے فریبی ہوتے ہیں لوگوں کو گول مول باتیں بتا کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتے ہیں"

نجومی نے اس شخص کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا اور کہا "اگر آپ کو میری باتوں پر شک ہے تو آپ آزما سکتے ہیں۔ وہ شخص کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور ہاتھ دکھانے لگا۔ نجومی نے حال بتانے سے پہلے کہا "دیکھئے اگر میں آپ کو ایک بات سچ بتلاؤں تو آپ مجھے ایک روپیہ دیجئے ورنہ مجھ سے دو روپیہ لیجئے"

نجومی نے سلیٹ پر کچھ لکیریں کھینچیں اور کچھ سوچتے ہوئے بولا "آج سے دو سال پہلے آپ کا ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے آپ کے بائیں ہاتھ پر چاقو مارا تھا۔ بتائیے سچ ہے یا جھوٹ" اس نے بایاں ہاتھ کھولا تو واقعی ایک بڑے زخم کا نشان تھا۔

اس نے نجومی کو ایک روپیہ دیا۔ اور کہا۔ "آگے بتاؤں" نجومی نے کہا "آپ اس شہر میں اسی سے بدلا لینے آئے ہیں۔ لیکن..."

اس شخص نے کہا "لیکن کیا" نجومی نے کہا وہ شخص ایک ہفتہ پہلے سمندر میں ڈوب کر مر چکا ہے" اس نے نجومی کو ایک روپیہ دیتے ہوئے کہا "اور کچھ بتاؤ" نجومی نے کہا "آپ کی قسمت کا ستارہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو اس شہر میں ایک بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔ اس لئے آپ سے جتنی جلد ہو سکے اس شہر کو چھوڑ دیجئے ورنہ پچھتائیں گے" اس آدمی

نے اپنی جیب سے پانچ روپیہ کا نوٹ دیتے ہوئے کہا "واقعی تم سچے نجومی ہو" اور چلا گیا۔ نجومی نے اپنا سامان جلدی سے اُٹھایا اور گھر کی طرف دوڑا۔

" بیوی نے تعجب سے پوچھا آج اتنے جلدی کیسے آ گئے"۔ نجومی نے کہا یہ ایک راز ہے" بیوی نے کہا کیا بات ہے"؟ نجومی نے کہا" آج سے دو سال پہلے میرا ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا میں نے اس کے بائیں ہاتھ پر چاقو مار دیا اور یہاں چلا آیا۔ بے روزگاری میں میں نے یہ نجومی کا بھیس بدلا اور اپنا کام چلانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ شخص ضرور بدلہ لے گا آج اتفاقاً سڑک پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ آدمی جہاں چلا آیا اور بولا" نجومی فریبی ہوتے ہیں لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ مہرہ دیکھا تو وہی شخص تھا جس کو میں نے زخمی کیا تھا۔ میں ڈر گیا۔ لیکن ہمت سے کام لیتے ہوئے میں نے اُسے بلایا اور شرط لگائی کہ اگر میں سچ کہوں تو روپیہ مجھے دینا ورنہ مجھ سے لینا اور میں نے اُسے جھگڑے کا حال بتایا اور بعد میں اُسے جب میری باتوں کا یقین آ گیا تو میں نے اُسے ڈرا کر اس شہر سے واپس کر دیا۔

آج مجھے سکون ہوا۔ مجھے ہر دم اُسی کا ڈر لگا رہتا تھا۔ میں نے اپنی عقلمندی سے ایک بڑے خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

خورشید احمد قریشی۔ کاندھلہ

شہزادی کا ہار

ایک درخت پر ایک کبوتر رہتا تھا۔ اسی درخت میں ایک سانپ بھی تھا۔ سانپ اور کبوتر میں بہت گہری دوستی تھی۔ لیکن سانپ میں یہ عادت تھی کہ جب کبوتر کے انڈوں میں سے بچے نکلتے تو سانپ ان بچوں کو کھا جاتا تھا۔

اس طرح بہت دن گزر گئے اور سانپ کبوتر کے بچوں کو کھاتا گیا۔ اس وجہ سے کبوتر اور کبوتری دونوں بہت رنجیدہ رہنے لگے۔ جب کبوتری اپنے انڈوں سے بچے نکالتی تو کبوتر اور کبوتری دونوں اُداس ہو جاتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سانپ ان کے بچوں کو ہرگز جیتا نہ چھوڑے گا۔ کبوتر اپنا گھر چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتا تھا۔

آخر ایک دن کبوتر کو ایک ترکیب سوجھی جس جگہ کبوتر کا گھونسلہ تھا اس درخت سے

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۵ پر)

زبیدہ رعنا

گدھے کی تصویر

میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ اشرف آپہنچیں اور اپنی بنائی ہوئی تصویر مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگیں "دیکھئے باجی کتنی اچھی تصویر بنائی ہے میں نے" میں نہ جانے کس خیال میں تھی۔ اُن کی بات سُن کر چونک پڑی۔ لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اللہ تصویر دیکھ کر جیسے سب کچھ سمجھ میں آگیا ہو۔ وہ اپنی تصویر دیوار پر لٹکا کر چلی گئیں۔ میں تصویر کو دیکھنے لگی۔ یہ تصویر ایک بوڑھے مریل سے گدھے کی تھی جو زخموں سے چور چور تھا۔ اور کچھ بچے اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے تصویر میں حرکت ہو رہی ہے۔ تصویر بڑھنے لگی۔ میں حیران تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے ذرا سی دیر میں بڑھتے بڑھتے بہت بڑی ہو گئی تھی۔ میں ابھی اپنے خیالات میں الجھی ہوئی تھی کہ ایک آواز سے چونک پڑی۔ یہ آواز اسی گدھے کی تھی وہ ان بچوں سے کہہ رہا تھا "معلوم نہیں تم کیوں مجھے ستا رہے ہو اور میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو۔ میں ایک ستایا ہوا گدھا ہوں۔ مجھے تم نے اتنا ستایا ہے کہ میں گھبرا گیا ہوں۔ اور اب تم سب مجھے بیوقوف کہہ رہے ہو" بچے ہنس پڑے اور چیخنے لگے "گدھا بیوقوف ہے۔ گدھا بیوقوف

ہے۔" گدھے نے دھیرے سے پھر کہا: "پہلے میری بات تو سُن لو پھر جتنا چاہو ہنس لینا۔" دیکھو! حقیقت میں گدھے اتنے بیوقوف نہیں ہوتے جتنا کہ تم سمجھے ہو۔" پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ مگر گدھے نے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور بولا: "یہ ٹھیک ہے کہ انسان عقلمند ہوتے ہیں۔ لیکن ہم بھی عقل رکھتے ہیں۔ خدا نے عقل کی دولت صرف انسانوں ہی کو نہیں دی بلکہ جانوروں کو بھی دی ہے۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ گدھوں کی عقل انسانوں سے کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے، جمعہ جمعہ آٹھ دن کی، ہو یہ سب کیا جانو۔ میں بہت مصیبت زدہ ہوں اگر تم سننا چاہو تو اپنی کہانی سنا سکتا ہوں ـــ بچے ایک دوسرے کو تکنے لگے اور بولے "ہاں ہاں ضرور سناؤ۔ ہم بڑے شوق سے سنیں گے۔" اور گدھے نے اپنی آپ بیتی سُنانی شروع کر دی۔

جب میں تمہاری عمر کا تھا تو بہت بھولا بھالا تھا۔ میری صورت بہت اچھی تھی دوسرے جانوروں کے بچے میری خوبصورتی پر رشک کرتے تھے۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا میری خوبصورتی اور دلکشی کم ہونے لگی۔ اور جب میں اچھی طرح چلنے کے قابل ہو گیا تو اب مجھ پر مصیبتیں پڑنے لگیں اور مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے میرے ماں باپ مجھ سے چھوٹ گئے۔ اور میرے مالک نے مجھے بیچ ڈالا۔ اور میری گردن میں غلامی کا پٹہ پڑ گیا جس کی وجہ سے میں پہلے کی طرح آزادی کے ساتھ کلیلیں کرنے اور اچھلنے کودنے سے محروم ہو گیا۔ اب میرے اوپر ہر طرح کا بوجھ لادا جانے لگا۔ لکڑ چونا، مٹی، اور مٹی کے برتن وغیرہ میری نازک سی پیٹھ پر لادے گئے۔ پھر ایک دن نہ جانے کیسے میں دھوبی کے پنجے میں پھنس گیا۔ ہر وقت سامنے موت نظر آتی تھی۔ مجھ پر کپڑوں کی بڑی بڑی گٹھریاں لادی گئیں۔ میں اس قدر بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ لیکن کیا کرتا مجبور تھا۔ اس بوجھ سے میری پچھلی ٹانگیں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان ہو جاتیں مگر دھوبی تو بے رحم تھا ہی میں ڈنڈوں کے ڈر کے مارے ذرا بھی چون و چرا نہ کرتا۔" پھر گدھا اپنی ٹانگ سے زخم پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو اُڑاتے ہوئے بولا: "جب مجھ پر میلے کپڑے لاد دیئے جاتے تو مجھے گھن سی آتی۔ اور اپنی بے بسی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا۔ اکثر مجھے کام کے بعد یوں ہی چھوڑ دیا جاتا کہ کہیں سے مل جائے تو کھا لوں۔" گدھے نے

پیر جھٹک کر مکھیوں کو اُڑا دیا اور پینترا بدل کر کہنے لگا "تم میرا کٹا ہوا کان دیکھ رہے ہو۔ ہاں یہ کوٹھے پر داغ کا نشان بھی دیکھ لے۔ کس بُری طرح داغا گیا ہے۔ آدمی بھی کتنا ظالم ہوتا ہے۔ جانتے ہو یہ کیا ہیں؟" گدھا اپنے کان آگے کی طرف کر جواب کا انتظار کر رہا تھا لیکن پھر خود ہی کہنے لگا۔ سُنیئے ہمارے مالک کو یہ ڈر ہے کہ کہیں اور گدھوں میں نہ مل جاؤں اور پہچاننا مشکل ہو جائے۔ آدمی بھی خوب ہوتا ہے۔ محض اپنی پہچان کی خاطر کسی کے کان کاٹ دیتا ہے۔ یہ کہہ کر گدھا انسان کی بیوقوفی پر بھی بڑے زور سے ہنسا۔ پھر بولا۔

"اب میں بوڑھا ہو چلا ہوں۔ آئے دن کے ظلم سے تنگ آچکا ہوں۔ میری حالت اس قابل نہیں کہ میں پہلے کی طرح زیادہ کام کر سکوں۔ یہ ظالم لوگ مجھے اس بڑھاپے میں بھی چین لینے نہیں دیتے۔ اتنا بوجھ لادتے ہیں کہ کمزوری کے سبب رہی سہی طاقت بھی جواب دے جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو تھک کر بیٹھ جاتا ہوں تو آدمی سمجھتا ہے کہ میں کام چور ہوں اس لئے میری اس قدر مرمت کی جاتی بلکہ میری پیٹھ لہولہان ہو جاتی ہے تب بھی میں ڈر کے مارے بھاگتا ہوں۔ اور جب دوڑتا ہوں تو بھی برابر مار پڑتی ہے۔ اور اس بیرحمی سے کہ خدا کی پناہ"! میں اس روز روز کی مار پیٹ سے تنگ آچکا ہوں اب مجھ میں اتنی مصیبتوں کے برداشت کرنے کی طاقت بھی نہیں رہی، چپکے سے سب کی آنکھ بچا کر آج اس طرف بھاگ نکلا تھا کہ باقی زندگی کے دن شاید کچھ آرام سے گزار سکوں گا۔ لیکن یہاں پہنچنے پر تم لوگوں نے مجھے اپنی سواری کے لئے تاکا ہے۔ کوئی کان پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ کوئی ڈنڈے سے خبر لے رہا ہے کوئی لات مارتا ہے تو کوئی پتھر، گدھے نے ایک سرد آہ بھری اور پھر کہنے لگا۔ بتائیے کہ میں اب کیا خدمت کر سکتا ہوں تمہاری؟ .... تم نے سن لیا کہ مجھ پر آج تک ظلم ہی ظلم ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور میں آہ بھی نہیں بھر سکتا۔

ابھی گدھا اپنی بات ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک طرف سے دھوبی ڈنڈا لئے آدھمکا اور آتے ہی اس نے اس زور سے ڈنڈا رسید کیا کہ بیچارا گدھا بلبلا اٹھا۔ لڑکے ایک طرف کو ہٹ گئے۔ گدھا آگے آگے اور دھوبی پیچھے۔ ڈنڈے کی مار اور گدھے کی بلبلاہٹ نے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

فضل الرحمٰن نیازی

تین گپّی دوست

تین دوست موہن، سلیم اور کلیم ایک ساتھ رہتے تھے۔ اور تینوں بڑے گپّی تھے۔ جب بھی اطمینان سے بیٹھ جاتے تو پھر ایسی ایسی گپیں ہانکتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ لیکن وہ ان باتوں کو سچ کہہ کر پیش کرتے اور یہ سمجھتے کہ لوگ اس بات کو یقین کر لیں گے۔

ایک دن یہ تینوں دوست ندی کے کنارے گھومنے گئے۔ وہاں اُنھوں نے سوچا کہ سب مل کر اپنی زندگی کا کوئی حیرت انگیز واقعہ سنائیں۔ چنانچہ موہن نے سُنانا شروع کیا کہ کل رات میں ذرا دیر سے گھر واپس آیا۔ جب آیا تو سب لوگ اپنے اپنے بستروں میں جاکر سو گئے تھے۔ میں ایک کتاب اُٹھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور لیٹے لیٹے پڑھتا رہا۔ پڑھتا رہا ۔۔ پڑھتا رہا۔ پڑھتا رہا ۔۔ پڑھتا رہا ۔۔ پڑھتا رہا ۔۔ پڑھتا رہا ۔۔ پڑھتا رہا ۔۔ پڑھتا رہا ۔۔۔ اب جو موہن نے کہنا شروع کیا پڑھتا رہا ۔۔ پڑھتا رہا تو مسلسل کہتا رہا۔ آخر

دونوں دوست یہ سن کر گھبرا گئے اور سلیم
نے بات کاٹ کر کہا۔ "بھائی تم اپنی بات
چھوڑو پہلے میری سنو۔ میں رات کو اپنی
خالہ کے گھر سویا۔ صبح صبح مجھے گھوڑے
پر بیٹھ کر ایک اور جگہ جانا تھا۔ چنانچہ میں
منھ اندھیرے اُٹھا۔ اور جلدی سے
گھوڑے پر زین کس کر چل دیا۔ ابھی میں
زیادہ سے زیادہ چار پانچ میل ہی گیا
ہوں گا کہ ہمارے گھوڑے نے رک کر
کہا۔ "ککڑوں کوں۔ ککڑوں کوں۔ میں چونکا
اور سوچنے لگا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے
یہ گھوڑا ککڑوں کوں مرغے کی طرح کیوں
بول رہا ہے۔ اتنے میں سورج کی ایک
کرن پڑی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں مرغے
پر سوار تھا۔ دراصل جس کو میں گھوڑا سمجھ
کر بیٹھا تھا وہ مرغا تھا۔ ہماری خالہ کے
یہاں کے سب مرغے اسی طرح گھوڑے
کے برابر تھے۔

کلیم نے کہا۔ "بھئی سلیم تم نے
بہت حیرت انگیز بات سنائی۔ لیکن میں
تم کو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات
سناتا ہوں۔ میں ایک روز ایک دوست
کے ساتھ شکار پر گیا۔ میرے پاس
اس وقت ایک بڑی اچھی بندوق تھی
جو حال ہی میں مجھے تحفے کے طور پر ملی
تھی۔ چنانچہ میں نے اس بندوق سے
ایک سارس پر گولی چلائی۔ سارس پہلے
ہی اڑ گیا لیکن گولی اس کے پیچھے بھاگی۔
اور اس کے پیچھے کئی دن چکر کاٹتی رہی
آخر ایک دن ایسا ہوا کہ ایک روز سارس
میرے گھر میں گھسا اور جیسے ہی وہ آکر
بیٹھا وہ گولی سارس کے لگی۔ اور میرے
دیکھتے دیکھتے سارس وہیں لوٹ پوٹ
ہو گیا۔

موہن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور
پھر آنکھ کھل گئی۔
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔
دراصل میں پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ سو
یہ گھوڑے کی طرح مرغا اور سارس کو
مارنے والی گولی خواب میں دیکھی"

سلیم اور کلیم موہن کے اس مذاق
سے جھینپ گئے۔

محمد فرحت صدیقی دہلوی

کنجوس

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں فرانس میں ایک کنجوس رہتا تھا۔ اس کے پاس یوں تو کافی دولت تھی لیکن وہ خود بڑی بری حالت میں رہتا تھا۔ جَو کی روٹی کھاتا، ٹھنڈا پانی پیتا اور پھونس کے بستر پر سوتا۔ اس طرح اس کی زندگی بڑے مزے میں کٹ رہی تھی۔ اس نے اپنی ساری دولت ایک باغ میں پتھر کے نیچے دبا دی تھی۔ اب اس کا روز کا کام تھا کہ باغ میں جاتا اور پتھر کے نیچے کے برتن کو دیکھ کر خوش خوش گھر چلا آتا۔

اس کے گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ لے دے کر ایک بھتیجی رہ گئی تھی۔ سو اسے اپنے چچا کی حالت پر بڑا رحم آتا لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اُسے ہر طرح سمجھاتی کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے اپنے کام میں لائیے اور آرام سے زندگی بسر کیجئے لیکن بھلا کنجوس کی سمجھ میں یہ بات کیسے آ سکتی تھی۔ اس کے روزمرہ کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔

ایک دن کسی چور اچکے نے اُسے باغ میں جاتے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا کنجوس اپنے برتن کو دیکھ کر جیسے ہی پلٹا، چور نے برتن غائب کر دیا۔ اگلے دن جب کنجوس باغ میں گیا

اور اس نے پتھر اٹھا کر دیکھا تو برتن غائب تھا کنجوس کا دل دھک سے رہ گیا لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ روتا پیٹتا اپنی بھتیجی کے پاس دوڑا گیا اور بولا "میں لٹ گیا، تباہ ہو گیا میری ساری دولت ختم ہو گئی۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں"۔

اس کی بھتیجی فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو آج چچا میاں کا خزانہ غائب ہو گیا۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک ترکیب سوچ لی اور بولی "میرے اچھے ابا! آپ ہمت کیوں ہارتے ہیں"۔

یہ سُن کر کنجوس چیخ چیخ کر رونے لگا اور بولا "اب بھی ہمت نہ ہاروں! میری زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی"۔

ان کی بھتیجی نے کہا "چچا میاں آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ چور کا نام نہ پوچھیں تو میں آپ کا برتن آپ کو دلا دوں"۔

کنجوس یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے کہا مجھے چور کے نام کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو صرف اپنا برتن واپس چاہیئے"۔

اس کی بھتیجی فوراً اُسی طرح کا ایک برتن لے آئی اور کنجوس سے بولی "یہ لیجئے یہ ہے آپ کی دولت! لیکن ہاتھ نہ لگائیے۔ میں نے جادو کے زور سے منگائی ہے اگر آپ نے ہاتھ لگایا تو ساری دولت غائب ہو جائے گی"۔

کنجوس نے اپنا برتن تو پہچان ہی لیا تھا اُسے کیا ضرورت تھی کہ وہ اُسے چھو کر اپنی دولت سے ہاتھ دھوتا۔ چنانچہ اُس نے کہا "مجھے کیا ضرورت کہ میں خواہ مخواہ اس کو پا کر کھوؤں تم خود چل کر اُسے کہیں رکھ دو"۔

یہ سن کر بھتیجی بہت خوش ہوئی اور اس نے کہا کہ "بہتر ہے اب اس کو کمرے کے فرش کے نیچے گاڑ دیا جائے"۔

چنانچہ اُس نے وہ برتن کمرے کے فرش کے نیچے گاڑ دیا۔ اب کنجوس کو اطمینان ہو گیا اور وہ پہلے کی طرح زندگی گزارنے لگا۔ اسی طرح ٹھنڈا پانی پیتا، جو کی روٹی کھاتا اور پھونس پر سوتا۔ اور یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ اس کی ساری دولت اس کے کمرے کے فرش کے نیچے محفوظ ہے۔

اسکی بھتیجی نے کتنی اچھی ترکیب سوچی۔ اگر اس برتن میں دولت بھی ہوتی تو اس سے کنجوس کی زندگی میں کیا فرق ہوتا۔ کنجوس کی ساری زندگی جو کی روٹی کھاتے ٹھنڈا پانی پیتے اور پھونس پر سوتے گزر گئی۔

مختار حسین مالیگانوی

چالاک بندر

ایک جنگل میں دو بندر رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا "چو" اور دوسرے کا "مو"۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ مو بہت چالاک تھا اور چو سے عمر میں بھی بڑا تھا۔ بے چارا چو جب اس کے پاس آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے جاتا تو مو ٹال مٹول کرتا۔ کبھی کہتا میرے سر میں درد ہے اور کبھی کہتا مجھے تو لڑکیوں کا کھیل بالکل پسند نہیں......

ایک روز چو ٹہلتے ٹہلتے مو کے گھر جا رہا تھا کہ اسے راستے میں ایک کیلا پڑا ہوا ملا۔ اسی وقت وہ مو کے پاس گیا اور کہا۔ "دیکھو تو مو مجھے کیا چیز ملی ہے۔" مو نے جب دیکھا کہ چو کے ہاتھوں میں کیلا ہے تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے جان بوجھ کر غصہ ظاہر کیا اور بولا۔ "ارے یہ کیا الا بلا اٹھا لائے۔ پھینکو جلدی پھینکو۔ ورنہ ہم پر کوئی مصیبت آپڑے گی۔"

"لیکن یہ ہے کیا۔؟" چو نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

مونے کہا۔ "بھائی تم کو کہاں سے یہ خطرناک چیز مل گئی۔ تم پھینکو تو بتاؤں تم نہیں جانتے اس میں بارود بھرا ہوگا اب تو پھینک دو۔ میرے یار۔

چونے اسی وقت کیلے کو دور پھینک دیا۔ اور مو سے بولا۔ "میرے دوست اچھا ہوا جو تم نے مجھے بتلا دیا۔ ورنہ میں تو اسے کھانے ہی والا تھا۔

مونے کہا۔ "بھائی بتاتا کیسے نا' یہ تو میرا فرض ہے کہ اپنے سے چھوٹوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کروں۔ کیا آج کھیلنے کا ارادہ نہیں ہے"۔

چو کھیلنے کے لئے تیار ہوگیا اور کھیل کے میدان میں دونوں کھڑے ہوگئے۔

مونے کہا۔ "چور کون بنے گا؟ لاؤ پہلے میں ہی چور بن جاتا ہوں...."

چونے سوچا کہ آج اس نے میری جان بچائی ہے اس لئے کیوں نہ میں ہی چور بن جاؤں اس لئے وہ چور بن گیا۔

چونے اپنی آنکھ بند کرلی اور سو تک گننے لگا۔ ادھر مو جھٹ کودتے پھاندتے اس جگہ پہنچا جہاں چو نے کیلے کو پھینکا تھا۔ اور فوراً کیلا اٹھا کر کھا گیا۔ اور زور سے بولا۔ آجاؤ.... چو ڈھونڈتے ڈھونڈتے مو کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ مو بڑے مزے سے کیلا کھا کر اپنی انگلیوں کو چاٹ رہا تھا۔

اچھّے بچّے
لوما ہیئر آئل
ہی
استعمال کرتے
ہیں
دماغی قوت
بالوں کی سیاہی
مضبوطی اور چمک
بالوں کے بڑھنے
اور انھیں گرنے سے
بچانے کے لئے لوما
ہی استعمال کیجیے،
جو
ہر مشہور جنرل مرچنٹ
کے یہاں مل سکتا ہے
Loma

بچوں کی برادری جامعہ کی جانب سے

گاندھی ٹرافی کا

مضمون یا کہانی کا تحریری مقابلہ

شرطیں

۱۔ اس مقابلے کے لئے بچوں کو عمر کے لحاظ سے دو گروپ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۸ سے ۱۲ تک اور ۱۳ سے ۱۵ تک اپنے نام کے ساتھ اپنی عمر ضرور لکھیئے۔

۲۔ کہانی یا مضمون روشنائی سے صاف اور ایک اِک لائن چھوڑ کر لکھیئے کاپی سائز کے کاغذ پر صرف ایک طرف لکھا جائے

۳۔ لکھنے والے کو اختیار ہوگا کہ وہ اردو میں بھیجے یا ہندی میں۔

۴۔ کہانی یا مضمون کہیں سے نقل نہ کیا گیا ہو۔ اور پہلے کہیں چھپا نہ ہو۔

۵۔ پہلے گروپ کی کہانی یا مضمون زیادہ سے زیادہ ۶ صفحے کاپی سائز پر اور دوسرے گروپ کی کہانی یا مضمون زیادہ سے زیادہ ۸ صفحے کاپی سائز پر ہونا چاہئے۔

۶۔ کہانی یا مضمون کے شروع میں اس کا عنوان موٹے قلم سے اور آخر میں اپنا نام اور پورا پتہ اور عمر خوش خط اور صاف لکھیئے۔ کہانی یا مضمون کی نقل اپنے پاس رکھیئے۔ دفتر واپسی کی ذمہ داری نہ لیگا۔

۷۔ کہانی یا مضمون ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء تک دفتر "بچوں کی برادری جامعہ، جامعہ نگر دہلی" کے پتے پر بھیجیے۔

۱۲۰ روپے کے انعامات

۱۔ ہر گروپ میں سب سے اچھی کہانی یا مضمون پر ۱۵، ۱۵ روپے کے انعامات دیئے جائیں گے۔

۲۔ اس کے بعد دوسری اچھی کہانیوں میں سے ججوں کے فیصلے کے مطابق ہر گروپ میں سے پانچ پانچ روپے کے دس انعامات دیئے جائیں گے۔ انعامات بچوں کی پسند کے مطابق کھلونوں، کتابوں اور رسالوں کے سالانہ چندے کی شکل میں دیئے جائیں گے۔

بچوں کی دلچسپ کتابیں

دنیا کے بسنے والے ۱۰/
مقناطیس کی کہانی ۸/
بھن بھن بانو ۱۰/
چھوٹی لالٹین ۵/
جو تیرا چلو بھر خون نہ پیا ہو ۷/
شہزادہ اور ٹھگ ۸/
ہمت کے پھل ۶/
جادو کی چھڑی ۳/
جادو کا باغ ۴/
شہزادی کا ہار ۵/
پھولوں کی شہزادی ۵/
جادو کی کہانی ۵/
رستم چور ۵/
سونے کا راجا ۵/
لنگڑا دیو ۵/
فقیر کی دعا ۵/
خدا کی لاٹھی ۵/
چھوٹوں کا بادشاہ ۵/
نقلی شہزادی ۵/

دنیا کے بچے ۱۰/
بجلی اور مقناطیس کی کہانی ۱۰/
پرندوں کا ابکا ۴/
خرگوش کا ہونٹ ۵/
شہزادی گلفام ۶/
شہزادی گلنار ۷/
اندھیر نگری ۳/
ناگ شہزادہ ۴/

قدرت کے کرشمے ۱۰/
ان تھک جان ۱۰/
ننھا ٹٹو ۴/
جنگل کا راجا ۵/
جنگو کی بلی ۶/
محنت ۷/
شہزادی تسلیم ۴/
بدھو سیٹھ ۴/

بجلی کی کہانی ۸/
جاں باز سپاہی ۱۰/
مزہ چکھائیں گے ۵/
خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا ۵/
مرغی اجمیر چلی ۵/
چوہوں کی کانفرنس ۶/
پریم کی جیت ۴/
مداری کا ڈنڈا ۴/
قاضی اور ٹھگ ۴/
ضدی شہزادہ ۵/
بوڑھا جادوگر ۵/
کایا پلٹ ۵/
مسٹر گڑبڑ خاں ۵/
گوہر پری ۵/
جادوگر کی کہانی ۵/
جادو کا صندوق ۵/
نوشیرواں کا انصاف ۵/
شیخ چلی نے شادی کی ۳/
لاٹھی کا سانپ ۶/

بچوں کے ناول

الٹا درخت ۲/۱۲/۰
لال بجھکڑ ۱۰
تیس مار خاں ۷

بچوں کی نئی کتابیں

امت کی ماں ۴/
نجومی کی پیشین گوئی ۳/
جاسوسی کہانی ۴/
جادو کا کوڑا ۴/
انوکھا راجہ ۴/
سپری کا انعام ۳/
رحمدل لڑکی ۳/

بے گناہ وزیر ۳/
خاک کا پتلا ۳/
کئے جاؤ کوشش ۳/
شرارت کا پتلا ۴/
جنگل کی شہزادی ۵/
جادوگر ۶/
اور وہ شریف بن گیا ۴/

کتابیں منگانے کا پتہ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر - دہلی

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں
مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی

میری ہنڈکلیا

نونہال پینے والے بچے
دُوسرے بچوّں کو ہمیشہ
پچھاڑ دیتے ہیں۔
نونہال
ننھے بچوّں کو مضبوط بنانے والا
مشہور ٹانک۔
ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے
FORMULA
One Full Dose (4 50 c c) of
NAUNEHAL CONTAINS -
Vitamin B1 0 4 mg
Vitamin B2 0 6 mg
Niacinamide 5 0 mg
Ascorbic Acid 15 0 mg
Vitamin A 1000 I. U.
Vitamin D2 500 I. U
Dist Ext mint 5 Min.
Dist Ext Cumin 5 Min
Aqua Menth ½ Min
Aqua Anisi 1½ Min
Cal Hypophosphis ½ grains
Sod Bromidum ¼ grain
Sucrose 64 grains
CAUTION
Always keep the phial intact inside the Carton after use.
Naunehal
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔
انعامی کوپن۔
جب بھی آپ نونہال خریدیں تو بکس کھول کر دیکھ لیں۔ اگر اس
میں انعامی کوپن نکل آئے تو یہ کوپن آپ ہمارے کسی بھی اسٹاکسٹ
یا ایجنٹ کو دے کر ایک شیشی نونہال مفت حاصل کر لیں۔
نوٹ:- نونہال بے بی شو۔ ماہ فروری ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوگا۔ صیحح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

روسی

بچّے

پیام تعلیم

ادارہ

حامد علی خاں — بی، اے (جامعہ)

اطہر پرویز — ایم، اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ — چار روپے

فی پرچہ — ۶/ — چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی

فہرست

آپ نے اخباروں میں دہلی، یو پی اور پنجاب کے علاقوں میں سیلاب کا حال پڑھا ہوگا۔ اس بار جو سیلاب آئے۔ اس سے بڑا زبردست نقصان ہوا۔ نہ جانے کتنے گاؤں بہہ گئے ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں روپیوں کا نقصان ہوا اور بہت سی جانیں گئیں۔ جمنا کے سیلاب کا اثر ہمارے یہاں بھی ہوا اور قریب تھا کہ سیلاب کا پانی جامعہ کے پڑوسی گاؤں اوکھلے میں داخل ہو جاتا لیکن گاؤں کے رہنے والوں اور جامعہ کے طالب علموں اور استادوں نے دن اور رات بند باندھ کر سیلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

خیر سیلاب تو سیلاب تھا۔ پھر بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس نے سب سے بڑا نقصان یہ کیا کہ ہمارے میلے کو عین وقت پر ملتوی کر دیا۔ چنانچہ اب میلا ۱۴ر اکتوبر کے بجائے ۲۸ر اکتوبر سے ۳۰ر اکتوبر تک ہوگا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم اسی پرچے میں آپ کو میلے کی سیر کرائیں گے لیکن اب تاریخ کے ٹلنے کی وجہ سے آپ کو اگلے پرچے تک انتظار کرنا پڑے گا۔

بچوں کی برادری کے انعامی مقابلے کی آخری تاریخ یعنی ۳۰ر اکتوبر قریب آگئی ہے۔ہمیں یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس بار بچوں نے اس مقابلے میں زیادہ دلچسپی لی۔ امید ہے کہ ہمارے پیامی آیندہ بھی اِسی طرح لکھتے رہیں گے ہم انعام پانے والی کہانیوں اور مضامین کو سالنامے میں شائع کریں گے جو جنوری میں نکل رہا ہے۔

جو بچے اپنے سالانہ چندے ۱۵ر دسمبر تک روانہ کر دیں گے انھیں سالنامہ مفت ملے گا۔ امید ہے کہ پیامی اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنا کر سالنامہ پڑھنے کا موقع دیں گے۔

اس بار ہم ایک مضمون "سویت روس" پر شائع کر رہے ہیں۔ اسی مہینے میں روس میں آزادی کا دن منایا جاتا ہے اور یہ تو آپ نے اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا کہ اسی مہینے میں روس کے وزیر اعظم مارشل بلگانن بھی ہمارے دیس میں تشریف لا رہے ہیں۔

اس پرچے میں آپ کو روسی بچوں کی اچھی اچھی تصویریں ملیں گی۔ ان تصویروں کے لئے ہم روسی سفارت خانے کے ممنون ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان تصویروں کو پسند کریں گے۔

اس پرچے میں ایک تصویروں والی کہانی بھی شائع کی جا رہی ہے۔ آپ ہمیں اس کے بارے اپنی رائے لکھئے۔ اگر آپ نے اسے پسند کیا تو ہم آیندہ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے ؛

بعض بچے جب ہمیں خط لکھتے ہیں تو نہ اپنا خریداری نمبر لکھتے ہیں اور نہ پتہ۔ اسی لئے ان کے خطوں کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ آیندہ اس کا خیال ضرور رکھئے کہ خریداری نمبر اور اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

چوکیدار

مُنّی بی بی اپنی میز پر
بیٹھی ہوئی تصویر بنا رہی
تھیں کہ اُن کی پوسی اُچھل کر کرسی پر بیٹھ گئیں اور میاؤں میاؤں
کرتی ہوئی بولیں۔

"مُنّی بی بی کیا کر رہی ہو؟"

مُنّی تصویر بناتے ہوئے بولیں "میں تمھارے لئے ننھا مُنا
سا گھر بنا رہی ہوں۔ یہ دیکھو چھت بن گئی اور اے لو وہ دروازہ
بھی بن گیا اور دیکھو چمنی میں سے دھواں نکلنے لگا۔ تم کھانا پکاؤ گی
اور یہ دھواں نکلے گا۔"

"اوہو اس میں کھڑکی تو ہے نہیں، تم تو جانتی ہو کہ بلّیاں
کھڑکی سے اُچھل کر باہر جاتی ہیں" پوسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ لو کھڑکیاں بھی بن گئیں۔ ایک، دو، تین، چار" مُنّی
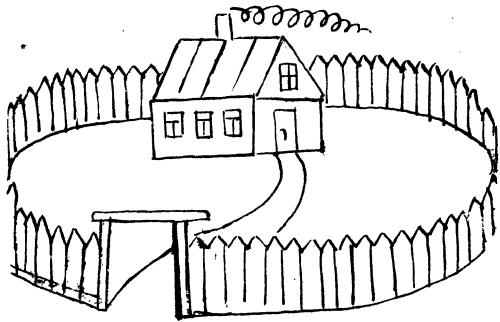
نے جلدی سے کھڑکیاں بھی بنا دیں۔

"جی کھڑکیاں تو بن گئیں۔ لیکن اگر میرا جی باہر ٹہلنے کے لئے چاہا تو کیا کروں گی۔" بلّی نے منھ بنا کر کہا۔

"یہ لو میں نے باڑی بنا دی۔ بس ہو گیا تمھارا باغ —— اب تم یہاں جو چاہے سو کرو۔ کھیلو، کودو، تفریح کرو۔"

یہ دیکھ کر بلّی بڑے زور سے ہنسی اور بولی۔ "اسے تم باغ کہتی ہو۔ جہاں ایک بھی تو پودا نہیں۔" "اجی منّی بی بی، اچھے گھر کا باغ بڑا اچھا ہوتا ہے۔ جہاں ہرے بھرے پودوں کی کیاریاں ہوتی ہیں۔ طرح طرح کے پھول کھلتے ہیں۔"

منّی نے جلدی سے ایک اور پنسل اٹھائی اور بولی "واہ بی مانو، واہ یہ بھی کوئی مشکل بات

ہے میرے لئے ۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ ایک اچھے گھر کا اچھا باغ ہونا چاہیئے ۔ یہ لو اب بن گئیں اچھی ہری بھری کیاریاں ۔ تم تو صرف کیاریوں ہی کو کہتی ہو ۔ میں تمہارے لئے کیاریوں کے ساتھ ساتھ سیب کا درخت بھی لگائے دیتی ہوں ۔ لو یہ سیب کا درخت بھی لگ گیا ۔ اب دیکھو بنا ہے کیسا باغ ! اب تم ہی بتاؤ اِس میں کون سی ایسی کمی رہ گئی ہے ۔ اب تم پھل بھی کھاؤ اور ترکاریاں بھی اپنے باغ کی ہی استعمال کرو ۔ ٹھیک ہے نا ــــ"

بلی مسکرائی اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولی :" ہاں بھئی باغ تو خوب ہے ۔ اس میں پھول، پھل اور ترکاریاں سب ہی کچھ ہیں ــــــــ مگر ایک چیز

پھر بھی نہیں۔"
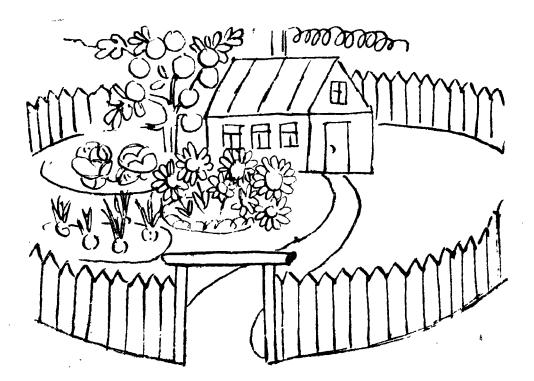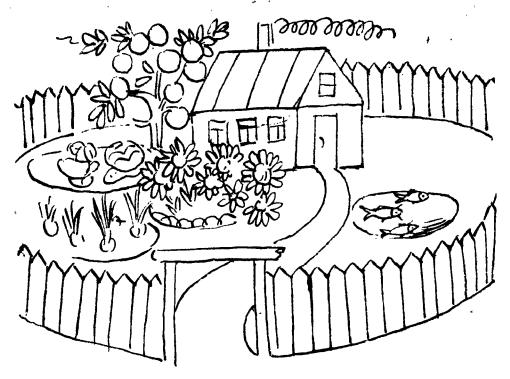
"وہ کون سی چیز؟" منّی نے حیرت سے پوچھا۔

باغ تو تم نے بنا لیا لیکن منّی بی بی! ــــــ بھلا میں مچھلیاں کہاں پکڑوں گی.
یہاں تو نہ تالاب ہے اور نہ مچھلی"

لیکن منّی بھی تو بڑی اچھی تصویریں بنانا جانتی تھی، اس نے جھٹ
سے دوسری طرف تالاب بنا دیا اور اس میں مچھلیاں ڈال دیں۔

اَب تو پوسی نے بڑے غور سے تصویر کو دیکھا۔ کبھی منّی کے
دائیں سے جھانکتی، کبھی بائیں سے، اور خوش ہو کر بولی "واہ وا واہ
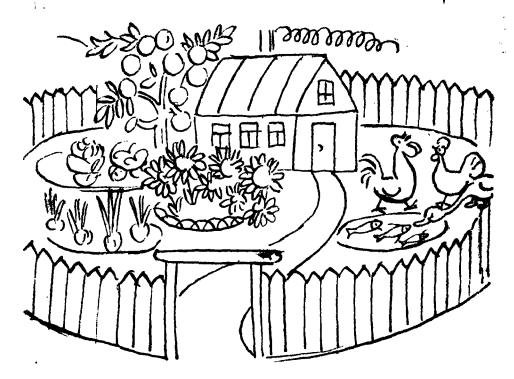
——— اب گھر بنا ہے مزے کا، مگر بس ایک زرا سی کمی پھر بھی رہ گئی ہے۔ بھئی مُنّی تم تو جانتی ہو مجھے مرغیاں کتنی پسند ہیں۔ میں مرغیاں تو ضرور پالوں گی۔"

مُنّی نے کہا "واہ یہہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ لو میں ابھی پالے دیتی ہوں مرغیاں۔ بس اب خوش۔ ایک مرغا ایک مرغی اور دو چوزے —"

پوسی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا — "مزا آگیا مُنّی بی بی — واہ واہ کیا گھر بنایا ہے۔ کیسے موٹے تازے مرغے مرغیاں ہیں اور یہ چوزے نرم نرم — بس مزا ہی آجائے گا اس گھر میں۔"
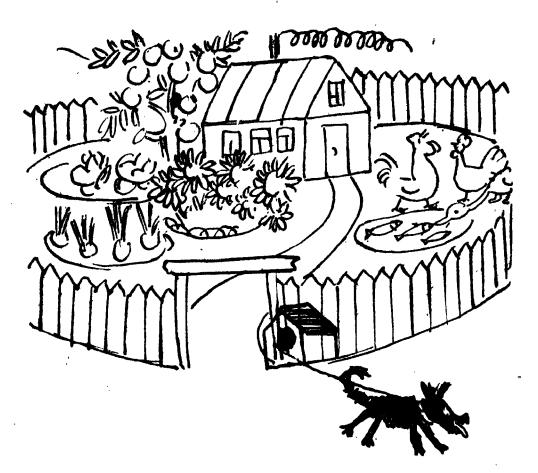
لیکن پوسی شرمائی ہوئی سی آہستہ سے کان میں بولیں "منّی بی بی بس ایک کام اور کر دو۔ پھر میں اور کسی کام کے لئے نہیں کہوں گی۔ اور اب مکان ہو بھی تو گیا ہے کتنا اچھا——— بس ذرا ایک چوہیا اور ہوجاتی اس گھر میں تو مزا آجاتا۔"

مُنّی چڑھ کر بولی " نا بہن ! میں چوہیا سے یہ گھر خراب نہیں کرتی۔ اتنا اچھا گھر ہے اور اس میں پلے چوہیا۔ ہر گز نہیں "

پوسی نے منھ بنا کر کہا " تو بی بی، پھر کون کرے گا گھر کی رکھوالی۔ بغیر چوہیا کے سونا سونا ہوگا گھر۔ مجھے تو نہیں بھائے گا "

" چوکیدار ——— میں یہاں چوکیدار بٹھادوں گی " اور یہہ کہہ کر مُنّی نے ایک کتّا بنا دیا۔

کتّے کی تصویر دیکھتے ہی پوسی کی پونچھ اُٹھ گئی۔ ڈر کے مارے رواں رواں کھڑا ہوگیا۔ اور چڑھ کر بولی " مجھے تمھارا گھر بالکل پسند نہیں، میں تو ہر گز بھی نہیں رہوں گی اس گھر میں " اور یہہ کہہ کر پوسی یہہ جا وہ جا۔ بے چاری مُنّی اپنی تصویر لئے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

ایک عقلمند آدمی
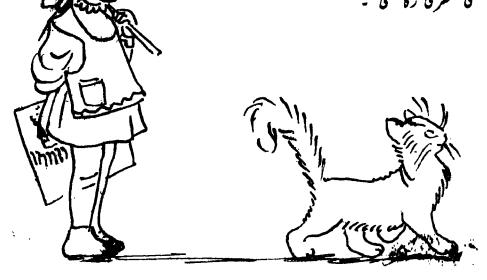
(ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اب سے پچیس تیس سال پہلے کچھ خطوط نینی جیل سے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے نام لکھے تھے۔ جو "جگ بیتی" کے نام سے کتابی شکل میں چھپے ہیں۔ یہ چند سطریں اسی کتاب میں سے لی گئی ہیں۔) (اڈیٹر)

پیاری بیٹی! تم خوب جانتی ہو کہ مجھے نصیحت کرنے اور وعظ کہنے سے کتنی نفرت ہے۔ جب کبھی نصیحت کرنے کو میرا جی چاہتا ہے، تو ہمیشہ اس عقلمند آدمی کی کہانی یاد آجاتی ہے۔ جو میں نے کبھی پڑھی تھی۔ شاید تم بھی ایک دن وہ کتاب پڑھو جس میں یہ کہانی درج ہے۔ کوئی تیرہ سو برس گزرے کہ ملک چین سے ایک سیاح علم و دانش کی تلاش میں ہندوستان آیا، اس کا نام ہیون سانگ تھا وہ شمال کے پہاڑ اور ریگستان طے کرتا ہوا یہاں پہنچا۔ اُسے علم کا اتنا شوق تھا کہ راستے میں اس نے سیکڑوں مصیبتیں اٹھائیں اور

ہزاروں خطروں اور مشکلوں کا مقابلہ کیا وہ ہندوستان میں بہت دن رہا' خود سیکھتا تھا اور دوسروں کو سکھاتا تھا۔ زیادہ تر وہ نالندہ کی یونیورسٹی میں رہا جو شہر پاٹلی پُتر کے قریب واقع ہے۔ اب اس شہر کو پٹنہ کہتے ہیں۔

ہیون سانگ پڑھ لکھ کر بہت قابل ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس کو فاضلِ قانون (بدھ مت) کا خطاب دیا گیا۔ پھر اس نے سارے ہندستان کا سفر کیا۔ اور اس عظیم الشّان ملک کے اُن باشندوں کو جو اب سے صدیوں پہلے رہتے تھے دیکھا بھالا' اور ان کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد اس نے اپنا سفر نامہ لکھا۔ اسی کتاب میں وہ کہانی درج ہے جو اس وقت مجھے یاد آئی یہ ایک شخص کا قصہ ہے جو جنوبی ہند سے شہر "کرنا سورنا" میں آیا تھا۔ یہ شہر صوبہ بہار بھاگل پور کے آس پاس کہیں تھا۔ سفر نامہ میں لکھا ہے کہ یہ شخص اپنے پیٹ کے چاروں طرف تانبے کی تختیاں باندھے رہتا تھا اور سر پر ایک جلتا ہوا مشعل رکھتا تھا۔ ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہوئے اکڑ اکڑ کر چلتا تھا اور اس عجیب و غریب انداز میں بڑی شان سے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ آخر آپ نے یہ کیا صورت بنائی ہے تو وہ جواب دیتا کہ میرے اندر اتنی حکمت بھری ہے کہ مجھے اندیشہ ہے، کہ کہیں میرا پیٹ نہ پھٹ جائے اس لئے میں نے اپنے پیٹ پر تانبے کی تختیاں باندھ رکھی ہیں' اور چونکہ تم سب لوگ جہالت کے اندھیرے میں رہتے ہو' اور مجھے تم پر ترس آتا ہے' اس لئے میں ہر وقت اپنے سر پر مشعل لئے پھرتا ہوں۔

(جواہر لال نہرو)

———— ०O० ————

افتخار احمد اقبال بی۔ اے

سانپ! سانپ!

بڑے دنوں بعد چچا کیپٹن محمود شہر آئے تھے۔ مجھے سلطان پور میں اُن سے ملے چھ سات مہینے ہو چکے تھے۔ ان کے ساتھ چچی اور دونوں لڑکے لڑکیاں یعنی رضیہ اور منیر بھی تھے اور سلطان پور میں ظفر مما جتو اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ اس لئے اپنے گھر سے مطمئن ہو کر چچا جان شہر کی سیر کو چلے آئے تھے۔ خسرو بھائی سے ملے بھی انھیں چار سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس لئے اُن سے ملاقات بھی ہو گئی اور جگہ کی تبدیلی سے کچھ نئی نئی دلچسپیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ چار پانچ دن تو بڑی گڑ بڑ میں کٹے۔ چچا جان کے پرانے دوست احباب جن میں کچھ فوجی لوگ، کچھ مہم پسند اور کچھ شکاری، غرض طرح طرح کے لوگ شامل تھے، یہ سب لوگ ان کو گھر میں ٹکنے ہی نہ دیتے تھے۔ آج فلاں صاحب کے ہاں دعوت ہے، کل شام کی چائے فلاں وظیفہ یاب کپتان یا کرنیل کے ہاں پینی ہے، پرسوں..... لیکن اس کی تفصیل بے کار ہے! ہاں میری اور منیر کی ملاقات خوب ہوئی۔ ہم اور منیر ہم عمر ہیں اور بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے، پڑھتے لکھتے آئے تھے۔ اب قریب قریب چار سال وہ دوسرے شہر میں تعلیم حاصل کر کے چلا آیا تھا، اب ہم پھر ایک ساتھ رہنے لگے تھے۔ یہ تیسری مرتبہ وہاں آیا تھا۔ پہلے جب وہ بالکل ننھا سا تھا اس کے بعد جب وہ آٹھ دس سال کا تھا، پھر اب۔ میری اور منیر کی دوستی تو اصل میں سلطان پور کے ننھے منے ٹیلوں، ہرے بھرے

جنگلوں اور میدانوں، اور تیز بہنے والی ندیوں میں پلی ہوئی تھی۔ اب وہ گھوڑے پر بالکل اپنے باپ کی طرح سواری کرتا تھا۔ اور اس کا نشانہ بھی غضب کا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایک چھوٹا سا واقعہ اس دوران میں ایسا ہوا کہ جس کو یاد کر کے ہم لوگ مہینہ بھر ہنستے رہے۔

بات یہ تھی کہ ایک روز میں اور منیر آصفیہ لائبریری میں دیر تک کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لائبریری کے بند ہونے کے وقت آپہنچا تو میرے دوست ندیم نے ہنس کر پوچھا "کیا آپ لوگوں کے لئے لائبریری کو رات بھر کھلا رکھا جائے؟" تب ہم نے مطالعہ ختم کیا اور ندیم صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

رات بڑی خوشگوار تھی۔ آسمان میں چھوٹا سا چاند خنجر کی طرح لٹک رہا تھا۔ بازاروں میں خوب چہل پہل تھی۔ باتوں باتوں میں ندیم نے اُسی روز کا ایک حادثہ سنایا۔

"بڑا افسوس ہوا یہ سُن کر" اکثر ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ بچے آپس میں عجیب عجیب کھیل کھیلتے ہیں اور اگر کوئی کمزور دل کا آدمی ہو تو اُس پر فوری اثر ہو جاتا ہے

"آخر ہوا کیا" میں نے دریافت کیا۔

"کسی لڑکے نے اپنے ایک دوست کو بھوت بن کر ڈرا دیا" ندیم صاحب نے کہا "وہ کمزور دل لڑکا تھا۔ یکایک ایک ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر اُس نے ایک چیخ ماری اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ایسے بے تکے مذاق سے بعض وقت بڑے خطرناک واقعات ہو جاتے ہیں۔ ممکن تھا کہ ڈر کے مارے اُس کا دم نکل جاتا۔"

"جی ہاں" میں نے سر ہلا کر کہا "بعض وقت موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک ایسا ہی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"لیکن اتنے بھی کمزور دل ہوں گے" منیر نے مسکرا کر کہا "کہ ایسی معمولی بات سے ڈر کر ختم ہو جائیں؟"

"ہوتے تو ہیں" ندیم نے جواب دیا پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر کے رستے پر ہو لئے اور ہم دونوں نئے پُل سے گزر کر ٹہلتے ہوئے جام باغ روڈ دارالشفا کی طرف مُڑ گئے۔

اس وقت ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آسمان میں سفید کشتیوں کی طرح تیرتے ہوئے چاند کے آس پاس چمک رہے تھے اور چاند کبھی

ان میں ڈوب جاتا اور کبھی نکل آتا گویا آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ اور تارے حیرت سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے! میں اور مُنیر بھوتوں کے متعلق اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتے چلے جا رہے تھے۔

"ایک مرتبہ ابا جان کو جن نظر آیا تھا" منیر نے کہا" اتنا لمبا سا اور سفید نورانی کپڑے پہنے ایک پرانے مقبرے کی چھت پر کھڑا تھا اور ہوا سے اُس کی لمبی بگلے کی طرح سفید ڈاڑھی ہل رہی تھی۔۔۔"

"سب گپیں ہیں" میں نے ہنس کر کہا "چچا جان کو کبھی ایسے بھوت پریت، جن شیطان نظر نہیں آئے"

"ارے واہ، اور وہ سانپ والا واقعہ بھول گئے؟" منیر نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"وہی نا جس میں چچا جان کے پاؤں میں گولی لگی تھی؟" میں نے پوچھا

"ہاں وہی ـــــ سلطان پور کے پُرانے قلعے میں ۔۔۔" منیر بولا " ابا جان کا بیان ہے کہ اتنا بڑا زرد رنگ کا ناگ۔ انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ ناگ نہیں جن تھا!"

"جن وِن نہیں تھا مجھے معلوم ہے۔ ظفر خاں نے گولی چلائی تھی۔ ناگ کسی طرح بچ گیا اور چچا جان کی ٹانگ زخمی ہو گئی" میں نے کیپٹن محمود کا سنایا ہوا واقعہ یاد کر کے کہا "شاید تم بھوتوں سے ڈر۔۔۔"

"کون میں؟" منیر نے بات کاٹ کر کہا" ا بھوتوں سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں!"

"خیر خیر، میں نے تم جیسے بہادر بہت سے دیکھے ہیں" میں ٹالتے ہوئے بولا" وقت آنے پر معلوم ہوگا۔۔۔۔"

اب ہم گھر کے قریب آ گئے تھے۔ بچوں کے کھیل کے میدان میں کئی آدمی بیٹھے ریڈیو سُن رہے تھے۔ ہم یہ سب دیکھتے بھالتے اپنے گھر کے راستے پر مڑ گئے۔ باغیچے کے بیرونی دروازہ کے قریب ایک اونچا اور گھنا بڑ کا درخت کسی دیو کی طرح خاموش کھڑا تھا جس کی شاخوں سے کبھی کبھی چاند جھانکتا دکھائی دیتا تھا۔ ہم دونوں باتیں کرتے وہاں پہنچے ہی تھے کہ یکایک منیر نے اچھل کر پیچھے ہٹتے ہوئے ایک چیخ ماری "سانپ! سانپ!۔۔۔۔ مسعود! سانپ!۔۔۔۔"

میں بھی گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹا اور غور سے زمین پر دیکھنے لگا۔ واقعی اندھیرے میں ایک لمبا سا کالا سانپ ہمارے سامنے زمین پر رینگ رہا تھا۔ منیر میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے گھسیٹنے لگا۔ وہ ڈر کے مارے کانپ رہا تھا "مسعود۔۔۔۔ بھاگو۔۔۔

کالا ناگ ہے!" اُس نے ڈری ہوئی آواز میں چلا کر
کہا۔ میں غور سے سانپ کو دیکھتا ہوا بولا "ٹھہرو....
منیر مجھے دیکھنے دو..... اتنا ڈر کیوں رہے ہو؟"
"ڈر.....؟" آں..... سانپ جو ہے۔"
منیر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

اب میں نے جو غور سے اِدھر اُدھر دیکھا
تو بڑ کے سائے سے ہٹ کر پھیکی چاندنی میں ایک
پتلی سی کالی ڈوری دور تک پھیلی ہوئی نظر آئی۔
اُسی وقت سانپ اُچھلا اور قریب ہی سے دبے
دبے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے غور سے
سڑک کے اُس کنارے پر دیکھا وہاں دو سائے
سے بیٹھے نظر آئے۔ میں سارا واقعہ سمجھ گیا اور
تیزی سے بولا "اچھا یہ تم لوگوں کی شرارت ہے؟"
پھر میں نے جھپٹ کر کالے ناگ پر اپنا پاؤں رکھ
دیا اور اُس سے جو ڈوری بندھی تھی۔ ہاتھ کے
ایک جھٹکے سے توڑ دی۔ سڑک کے اُس پار بیٹھے
ہوئے دو لڑکے ہنسنے لگے۔ مجھے بڑا غصّہ آ رہا تھا۔
ہاتھ میں سانپ کو مروڑتا ہوا میں ان لڑکوں کی
طرف دوڑا اور انہی کے بنائے ہوئے نقلی سانپ
سے دو چار ہاتھ انھیں رسید کر دیے "لو یہ انعام
ہے راہ گیروں کو ڈرانے کا" میں نے کڑک کر کہا

وہ دونوں محلّے کے غنڈے قسم کے لڑکوں
میں گنے جاتے تھے۔ مار کر کھا کر بڑبڑاتے ہوئے
وہ ایک طرف بھاگ گئے۔ اب میں منیر کی طرف
مُڑا۔ وہ دور کھڑا آنکھیں پھاڑے اصل واقعہ
سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اب میرا غصہ کافور
ہو گیا اور بے ساختہ ہنسی آنے لگی۔

"اجی او رستم صاحب! کہاں ہیں آپ؟"
میں اُسے چھیڑنے کے لئے پکارنے لگا۔

"یہ کیا معاملہ ہے مسعود؟" اُس نے پریشان
لہجہ میں پوچھا "کیا مردہ سانپ تھا وہ؟ میں تو
ڈر گیا تھا کہ کہیں اصلی کالا ناگ نہ ہو بڑا زہریلا
ہوتا ہے۔"

"جی ہاں! جی ہاں!" میں ہنستے ہوئے بولا
اسی لئے آپ کے دیدے باہر نکل آئے تھے اور آپ
تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جی ہاں! تاکہ اگر سچ مچ سانپ
ہوتا تو آپ کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر ڈس لیتا
اور آپ خدا گنج سدھارتے؟"

"اوں مذاق چھوڑو مسعود" منیر نے منہ بنا
کر کہا "یہ بتاؤ کہ تمھارے ہاتھ میں....."

"جی یہ وہی سانپ ہے آپ کا!" میں نے
مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

"ارے..... یہ!" منیر نے ربڑ کا نقلی سانپ
میرے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ لڑکوں نے راستہ
چلنے والوں کو ڈرانے کے لئے ایک لمبی سی کالی رسّی
کے اوپر ربڑ کے ٹکڑے لگا دیئے تھے اور باریک
کالی ڈور سے اسے حرکت دے رہے تھے۔ اب
وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

"کچھ ہو بھئی" اُس نے چلتے ہوئے کہا "ایک
کوئی چیز سامنے آجائے تو ڈرنا لازمی ہے۔"

"جی ہاں بالکل بجا" میں نے منافقیہ انداز
میں کہا "یہی بات میں جناب سے کچھ دیر پہلے
عرض کرچکا تھا۔"

ہم گھر میں داخل ہوئے۔ منیر ادھر اُدھر
کی باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے سب کو سنانے
کے لئے زور سے کہنا شروع کیا "اجی اب مجھے
باتوں میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو منیر میاں! میں
اسی وقت تمھاری بہادری کی داستان سب کو سناتا
ہوں!"

"ارے..... چُپ مسعو....." منیر نے
گھبرا کر دبی زبان سے کہا "سب سے کہتے نہ پھرو"
"نہیں نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا! یہ مجھے
رشوت دینے کی کوشش نہ کرو" میں نے شرارت
سے اسی آواز میں کہا "چچا کیپٹن محمود خاص طور سے
اس واقعے کو سنیں گے!"

"کیا ہوا؟... کیا ہوا؟..... کیا بات ہے
مسعود؟" چچی جان، اماں جان، کیپٹن محمود اور سب
کے سب گھر والے حیران ہو کر مجھ سے پوچھنے لگے۔

اور جب میں نے سب کے سامنے نقلی
سانپ کا واقعہ مزے لے لے کر اور اپنی طرف سے
نمک مرچ لگا کر سنایا تو ہنسی کی دھوم مچ گئی۔
منیر مجھ سے خفا ہو کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا تھا
اور اندر سے تالا لگا کر سو جانے کی کوشش کر رہا تھا

محنت کا پھل

محمود پرویز کاکوی

سلیم کے باپ کا اس کے بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ اسی لئے اب دنیا میں اس کی زندگی کا سہارا اس کی غریب ماں تھی۔ سلیم کی ماں نے زمیندار صاحب کے ہاں کھانا پکانے کی نوکری کرلی تھی۔ زمیں دار صاحب کی طرح ان کی بیوی بھی بڑی سخت مزاج تھیں۔ ذرا ذرا سی بات کے لئے بیچاری سلیم کی ماں کو ڈانٹا کرتیں، تنخواہ کاٹ لیا کرتیں، اور کبھی کبھی تو ایسا اتفاق ہوتا کہ کھانا تک نہ دیتیں۔ سلیم کی ماں کیا کرتی آنسو بہا بہاکر رہ جاتی۔ بعض اوقات تو زمیندار صاحب کے گھر بھر کی سخت مزاجی سے تنگ آکر اس کا جی چاہتا کہ وہ نوکری چھوڑ دے۔ مگر پھر وہ یہی سوچتی کہ اگر اس نے نوکری چھوڑ دی تو بیچارے سلیم کی پرورش کس طرح ہوگی۔ اس گاؤں

میں سوائے زمیندار صاحب کے اور کوئی
ایسا تھا نہیں کہ جہاں وہ نوکری کر لیتی
یا کچھ اوپر کا کام ہی کر دیا کرتی ۔ مجبوراً یہ
تکلیفیں برداشت کرتی اور اسی طرح
زمیندار صاحب کے ہاں کھانا پکاتی ۔
سلیم جب کچھ سیانا ہو گیا تو اس
کی ماں نے اسے مسجد کے مولوی صاحب
کے پاس پڑھنے کے لئے بٹھا دیا ۔ غریب
کا لڑکا مگر بلا کا ذہین اور محنتی ! بہت
جلد اس نے اُردو کی ابتدائی کتابیں ختم
کر ڈالیں ۔ سلیم کے دل میں علم کا شوق
پیدا ہو گیا تھا ۔ اس نے مولوی صاحب
سے سن رکھا تھا کہ علم سے انسان کو
دولت عزّت اور سربلندی حاصل ہوتی
ہے ۔ اور اسی دن سے سلیم نے اپنے
ننھے سے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ
ضرور پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگا ۔
پھر اس کے پاس روپیہ پیسہ ہوگا ۔ عزت
اور سربلندی حاصل ہوگی ۔ اور سب سے
بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کی پیاری ماں
زمیندار صاحب کے ہاں کام نہیں کرے
گی ۔ اس کو روزانہ ڈانٹ نہیں سننا
پڑے گی ۔ برتن مانجھتے مانجھتے اس کی
انگلیوں میں خراشیں نہیں پڑیں گی ۔ ننھا
سلیم ان ہی خیالات میں گھنٹوں کھویا رہتا ۔
اس گاؤں سے باہر ایک اسکول تھا
جہاں قریب کی بستیوں کے لڑکے پڑھنے
آیا کرتے تھے ۔ زمین دار صاحب نے
بھی اپنے لڑکے کو اسی اسکول میں
داخل کروا دیا تھا ۔ سلیم کا دل بھی چاہتا
تھا کہ کاش وہ بھی اسکول میں پڑھ سکتا ۔
مگر اسکول میں پڑھنے کے لئے فیس چاہئے ۔
کتابیں خریدنے کے لئے پیسہ چاہئے ۔ اور
سلیم کی غریب ماں فیس اور کتابوں کے
لئے پیسے کہاں سے لاتی ؟
ایک دن سلیم اپنی ماں کے ساتھ
زمیندار صاحب کے ہاں آیا اور باہر
ہی بیٹھ گیا ۔ زمیندار صاحب کے لاڈلے
بیٹے نے جب سلیم کو دیکھا تو تیز لہجے
میں بولا ۔
"دیکھو بے سلیم ! میرا بستہ روزانہ سکول
پہنچا دیا کروگے ؟ مہینہ میں آٹھ آنے ملیں

گئے۔

سلیم نے اچانک زمیندار صاحب کے لاڈلے کی ایسی بات چیت سُنی تو مارے غیرت کے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا، جیسے لفظ "ابے" نے اس کے مُنہ پر ایک طمانچہ مار دیا ہو۔ اس کے جی میں تو آیا کر فوراً کہہ دے۔

"مجھے نہیں چاہیئے یہ آٹھ آنے!"

مگر اسکول کے نام میں نہ جانے کیسی مٹھاس تھی کہ جس نے اُسے موہ لیا اور اس نے خوش ہو کر کہا۔

ضرور لے چلوں گا، چھوٹے بابو!۔ ضرور لے چلوں گا۔ اور آپ جب پڑھ کر لوٹیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی ساتھ بستہ دبائے واپس آؤں گا۔"

اب سلیم روزانہ احمد کا بستہ دبائے اسکول جاتا۔ اسکول میں وہ احمد کی چوتھی کلاس میں سب سے پیچھے فرش پر بیٹھ جاتا۔ ماسٹر صاحب جو کچھ پڑھاتے وہ غور سے سُنتا رہتا۔ وقفے میں سب لڑکے باہر میدان میں کھیلنے چلے جاتے اور اپنے اپنے بستے سلیم کی نگرانی میں چھوڑ جاتے۔ سلیم کسی سے کتاب مانگ کر اکیلا بیٹھا پڑھتا رہتا۔ جیسے جیسے اسکول میں پڑھائی ہوتی ویسے ویسے سلیم بھی دلچسپی سے پڑھتا رہتا۔ جب مہینہ ختم ہونے پر اسے آٹھ آنے ملے تو اس نے اس سے انگریزی کی ایک پُرانی کتاب خرید لی جو اسکول میں پڑھائی جاتی تھی۔ رات کو زمیندار صاحب کے ہاں کا سارا کام ختم کر کے سلیم کی ماں گھر چلی آتی اور تھکی ہاری لیٹ رہتی۔ مگر سلیم کافی رات گئے تک مٹی کے چراغ کی مدھم روشنی میں پڑھتا رہتا۔ اسکول میں جو بھی سبق دیا جاتا۔ وہ رات بھر میں یاد کر لیا کرتا۔ وہ اسکول کے کسی لڑکے سے حساب کی کتاب مانگ کر سوالات ردی کاغذ پر نقل کر لیتا اور گھر آ کر سلیٹ پر انھیں حل کرتا۔ بقیہ تاریخ اور جغرافیہ تو اسے کلاس ہی میں یاد ہو جاتی۔ وہ اتنے دھیان سے ماسٹر صاحب کی باتیں سُنا کرتا کہ وہیں اسکول میں اسے ہر سبق سمجھ میں آ جاتا۔

ایک دن اسکول میں انسپکٹر صاحب معائنہ کے لئے آئے۔ سب لڑکے صاف صاف کپڑے پہن کر اسکول آئے تھے۔ سلیم بھی احمد کا بستہ دبائے اسکول آیا اور اسی طرح چپکے سے دبک کر بیٹھ رہا تاکہ اس پر کسی ماسٹر کی نظر نہ پڑ جائے اور وہ کلاس سے نکال نہ دیا جائے۔ وہ تو انسپکٹر صاحب کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ جب انسپکٹر صاحب چوتھی کلاس میں آئے اور لڑکوں سے انگریزی کا پچھلا سبق پوچھا تو کوئی بھی نہ سُنا سکا۔ کسی کو بھی یاد نہ تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ انسپکٹر صاحب اچانک اسی سوال کو پوچھ لیں گے، ورنہ وہ پہلے ہی سے اس کے لئے تیار ہو جاتے

"کسی کو بھی یاد نہیں"؟ انسپکٹر صاحب نے پھر ایک بار سوال پوچھا۔

مگر ساری کلاس میں کسی کا بھی ہاتھ نہیں اٹھا۔ تمام لڑکے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ دفعتاً انسپکٹر صاحب نے دیکھا کہ سب سے پیچھے پھٹی قمیص پہنے ایک لڑکا فرش پر بیٹھا ہوا ہے۔ انھوں نے اب تک اسے نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے حیرت سے پوچھا "کون ہو تم"؟

"جی میں..... احمد بابو کا نوکر ہوں۔ ان کا بستہ پہنچانے آتا ہوں"!

"تو کیا تمہیں ان لڑکوں کا سبق یاد ہے"؟

"جی ہاں۔ جب ماسٹر صاحب پڑھاتے ہیں تو میں بھی سُن کر یاد کر لیتا ہوں"

"اچھا تو سناؤ!" اور سلیم نے فرفر سارے سبق سنا ڈالے۔ لڑکوں کی گردنیں مارے شرم کے جُھک گئیں۔

دوسرے دن سے سلیم اسکول آنے لگا اب اس کا داخلہ باقاعدہ جماعت میں ہو گیا وہ اپنی کتابیں لے کر آتا۔ انسپکٹر صاحب نے اس کی مفلسی پر ترس کھا کر اسے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اس کی فیس معاف کر دی تھی اور اسکول سے کورس کی ساری کتابیں بھی اُسے دلوا دی تھیں، اب وہ فرش پر نہیں بیٹھتا بلکہ بنچ پر۔

سلیم نے خوب محنت کر کے مڈل کا اور اس کے بعد میٹرک کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا۔ کالج میں پڑھنے کے لئے بھی

وظیفہ کام آتا رہا۔ اس نے اپنی بے انتہا محنت، شوق اور حوصلہ سے بی۔ اے اور اس کے بعد ایم۔ اے کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ اس نے مقامی اخبار میں دو گھنٹے کی نوکری کر لی تھی اور اس سے جو تنخواہ ملتی اس سے گھر کا خرچ چلتا۔ اب اس کی ماں گھر ہی پر رہا کرتی۔ اس نے زمیندار صاحب کے ہاں کی نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔

لیکن سلیم کی پڑھائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے وکالت پڑھنا شروع کر دیا۔ دفتر سے آنے کے بعد کالج جاتا۔ اور رات میں خوب محنت سے قانون کی کتابیں پڑھا کرتا۔ آخر ایک دن وہ بھی آیا جب سلیم وکیل کہلانے لگا۔ اس نے شہر میں وکالت شروع کر دی۔ آدمی محنتی ہوشیار اور ذہین تھا، بہت تھوڑے دنوں میں اپنی ساکھ قائم کر لی۔ اچھے اچھے وکیلوں میں اس کی گنتی ہونے لگی۔ وہ ایسی عمدہ بحث کرتا اور اتنی اچھی دلیل پیش کرتا کہ مخالفین کے دانت کھٹے ہو جاتے ہر جگہ اس کی شہرت ہو گئی۔ مقدمے کافی تعداد میں اس کے پاس آنے لگے اور اس کی وکالت چل نکلی۔

اور اب اس کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے بجائے ایک خوبصورت دو منزلہ بنگلہ تھا۔ ایک پھلواری تھی۔ کمرے میں ریڈیو تھا۔ اچھے اچھے فرنیچر تھے۔ نوکر اور خانساماں تھے۔ رات میں چراغ کی دھندلی روشنی کے بجائے رنگین قمقمے جلتے تھے برساتی میں فیروزی رنگ کی کار کھڑی رہتی۔ اس کی ماں بھی بڑے مزے میں دن گزارتی۔

ایک دن صبح ہی صبح زمیندار صاحب کی بیوی سلیم کے یہاں آئیں اور اس کی ماں سے نہایت لجاجت سے بولیں۔

"بہن! میں سلیم کے لئے اپنی بیٹی دلّو کی نسبت لے کر آئی ہوں۔ کتنی اچھی جوڑی رہے گی!"

اور سلیم کی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

ایک چڑیا ہے مگر بے بال و پر
نہ تو کوئی پاؤں ہے اس کے نہ سر
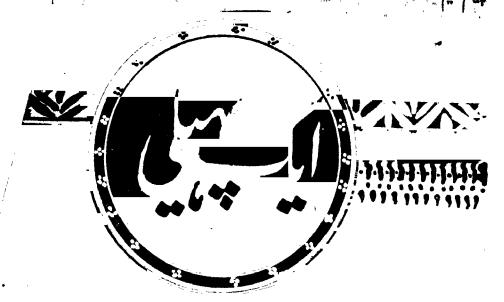
نہ تو منھ ہے اور نہ منھ میں ہے زباں
نہ تو دل ہے اور نہ سینہ میں جگر

نہ جواں ہے اور نہ کوئی طفل ہے
یہہ بہر صورت نہ مادہ ہے نہ نر

نہ تو دانہ ہے نہ پانی ہے نہ گھاس
بے غذا چلتی ہے یہ آٹھوں پہر

وقت پر اسکول پہنچاتی ہے یہ
اور چھٹی کی بھی دیتی ہے خبر

جیب میں پہلے تھا اس کا آشیاں!
اب کلائی پر بنا رکھا ہے گھر
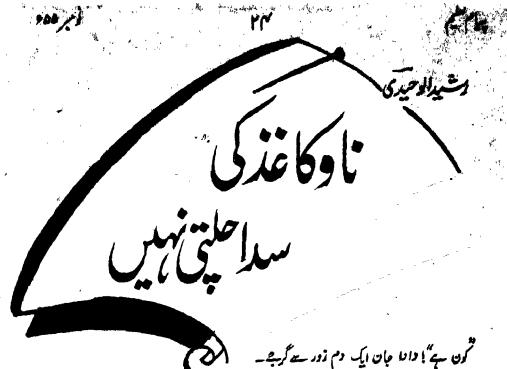
محسن اعظم گڑھی

"کون ہے"! دادا جان ایک دم زور سے گرجے۔

"جی میں ہوں" شاہد نے چونک کر کہا۔ دادا جان چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولے "اوہ! میں تو گھبرا گیا تھا کیا ہے بیٹا"۔

شاہد نے اندر جاتے ہوئے کہا "آج سردی بھی کیسی ہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میں نے سوچا کہ دادا کے پاس جا کر لیٹ جاؤں"۔

"آؤ بیٹا" داد جان نے اپنا لحاف اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور شاہد سے بولے "زرا گھڑی تو دیکھو کیا وقت ہے"۔

شاہد نے گھڑی دیکھی تو پورے تین بج چکے تھے"۔ دادا جان نے کہا "اچھا بیٹا زرا دیکھو انگیٹھی میں کچھ آگ ہو تو حقہ ہی تیار کر دو اب نیند کہاں"۔

یہ سننا تھا کہ شاہد جھٹ کود کر انگیٹھی کے پاس پہنچ گیا۔ انگیٹھی میں آگ بجھ چکی تھی۔ مگر کہیں کہیں راکھ میں دبی ہوئی چنگاری آگ کو گرم کئے ہوئے تھی۔ لیکن کوئلوں میں دھونکتے دھونکتے اس

قابل ہو گئی کہ دادا جان کا حقہ تیار ہو سکے اُس نے
جلدی سے حقہ تیار کر کے دادا جان کے سامنے
رکھ دیا اور خود لحاف میں جا گھسا۔ لیکن ایک دم
اچھل کر بیٹھ گیا۔ "دادا! دادا! آپ نے وعدہ کیا
تھا کہ ہمیں ایک اچھی سی سچی کہانی سنائیں گے۔"

ذرا سی دیر میں شاہد کا اصرار اور دادا
جان کا انکار بڑھتا رہا۔ آخر شاہد جیت گیا اور دادا
جان کہانی سنانے کے لئے راضی ہو گئے۔ اور بولے
"اچھا جاؤ، شمیم، نزہت، خالدہ کو بھی بلا لو۔ تھوڑی
دیر میں تینوں لڑکیاں بھی آ دھمکیں۔ دادا جان نے
جلدی جلدی سب کو بٹھایا اور لحاف اوڑھا کر
سب سے وعدہ لے لیا کہ اگر کوئی بیچ میں بولا تو پھر
کہانی بند کر دی جائے گی۔ سب نے وعدہ کر لیا تو
دادا نے کہانی سنانی شروع کر دی۔ بہت دن گزرے
اب سے تقریباً ستر برس پہلے اسی قصبے میں ایک
لڑکا رہتا تھا۔ نام تو اس کا کچھ اور ہی تھا مگر لوگ
اُسے شمو شمو کہتے تھے۔ شمو بہت شریر لڑکا تھا۔

"دادا جان وہ آپ کے رشتے کے چچا کبھی کبھی
آتے ہیں، وہ بھی آپ کو شمو ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔"
نزہت نے درمیان میں بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اور دادا ایک دم زور سے گرجے "خاموش!"

نزہت نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی۔ تو دادا
جان نے پھر کہنا شروع کیا۔ شمو کی شرارت سے
لوگ بہت عاجز تھے۔ اس کے باپ اچھے خاصے کھاتے
پیتے آدمی تھے ان کے پاس زمین کے علاوہ ایک
دوکان بھی تھی۔ دوکان پر تو اس کے ابا جان بیٹھتے
تھے اور شمو خود تمام دن کھیت کی دیکھ بھال کرتا۔
شمو کے باپ نے اس کی آسانی کے لئے ایک ملازم
بھی رکھ لیا تھا۔ جو اس کے ساتھ کھیت میں رہا
کرتا۔ یہ ملازم لڑکا شمو کی ایک رشتے کی خالہ کا لڑکا
تھا۔ جس کا باپ مر گیا تھا۔ بہت غریب تھیں وہ بیچاری
شمو ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ جس کو شمو کے باپ نے
اپنے گھر نوکر رکھ لیا تھا اُسے سب بھولا کہہ کر پکارتے
تھے۔ بھولا شمو سے عمر میں کوئی ۵ برس چھوٹا تھا اور
شمو کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ برس کے لگ
بھگ تھی۔ شمو اس لڑکے پہ بہت ظلم کرتا تھا۔ ذرا
ذرا سی بات پہ بُری طرح مارتا۔

ایک مرتبہ صبح ہی صبح شمو نے بھولے کو ساتھ لیا
اور کھیت میں پہنچ گیا۔ اتفاق سے بھولا ایک ٹوکری لانی
بھول گیا تھا شمو زور سے گرجا۔ بھولا گڑگڑانے لگا۔
بھیا میں ابھی لاتا ہوں، جب لائے گا دیکھا جائیگا
پہلے تو یہ بتا کہ بھول کیوں آیا؟"

...ابھی وہ کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ شمو نے لپک کر ایک ڈنڈا اس کے سر پر جما دیا۔ ڈنڈا پڑتے ہی بھولا زمین پر گر گیا۔ اس کے کافی سخت چوٹ آئی۔ لیکن شمو نے وہاں سے سیدھے گھر کا راستہ لیا۔ بھولا بے چارہ پتہ نہیں کتنی دیر وہیں پڑا رہا۔ اتفاقاً قصبے کا ایک نوجوان دوکان دار اُدھر سے گذرا۔ وہ بھولا کو لے کر گھر پہنچا۔ بھولے کی ماں نے جس وقت اپنے لاڈلے کا یہ حال دیکھا، ایک دم بیہوش ہو کر گر پڑی اُدھر شمو کے ابا اپنے صاحبزادے کو دو چار باتیں سنا کر سیدھے بھولے کے گھر گئے، اور اس کی ماں کو دس روپے دے کر اور کچھ تاکید کر کے چلے آئے۔ اگلے دن بھولا ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ مہینوں اس کا علاج ہوا آخر ایک دن وہ مر گیا۔ بھولا کی ماں اس غم کی تاب نہ لا سکی اور وہ بھی مر گئی۔ اس لئے کہ اب اس کو سہارا دینے والا کوئی بھی تو نہ تھا۔

دادا میاں نے بجھے ہوئے حقے پر دو تین لمبے لمبے کش لگائے اور پہلو بدل کر پھر کہنا شروع کیا۔ "ایک رات شمو کھانا کھا کر لیٹا، لیٹتے ہی نیند آ گئی اور تھوڑی دیر میں وہ خواب کی دنیا میں پہنچ گیا۔ خواب میں دیکھتا کیا ہے کہ وہ ایک جنگل میں پڑا ہوا ہے۔ ذرا سی دیر میں جھاڑی میں سے ایک کالا موٹا سا سانپ نکلا اور شمو کے اس ہاتھ پر جس سے اس نے بھولے کو لاٹھی ماری تھی کاٹ کر چل دیا۔ شمو ایک دم گھبرا کر اٹھ گیا اس کے اسی ہاتھ میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا۔ کچھ دیر میں وہ درد بڑھنا شروع ہوا اور اس قدر تیز ہو گیا کہ برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن اکثر شمو کے اسی ہاتھ میں درد اٹھتا ہے۔ اور وہ اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ شمو تمام گھر میں مچھلی کی طرح تڑپتا ہے۔ نہ جانے کتنے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد دادا نے کہا "سو بھئی شاید بدنصیب شمو کے ہاتھ میں پھر دورہ شروع ہو گیا"

دوسرے لمحے دادا تمام کمرے میں ذبح کئے ہوئے مرغے کی طرح تڑپ رہے تھے اور کہتے جاتے تھے "بیٹا وہ بدنصیب شمو تمہارے سامنے ہے"

اب سب بچے حیرت سے دادا جان کو تکتے رہے دادا جان نے کہا "بیٹا! تم لوگ آئندہ خیال رکھنا کبھی کسی پر ظلم مت کرنا۔ اس روز سب بچوں نے طے کیا کہ وہ کبھی کسی کو نہ ستائیں گے"

سوویت روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اس میں یورپ کا بڑا حصّہ اور شمالی وسطی ایشیا شامل ہے۔ چھوٹے بڑے بارہ سمندروں کا پانی روس کے ساحلوں سے ٹکراتا ہے اور بارہ ہی ملکوں سے اس کی سرحد بھی چھوتی ہے۔ یہ امریکہ سے رقبے میں تقریباً تگنا بڑا ہے اور دنیا کے کل رقبے کا چھٹواں حصہ ہے۔ لیکن روس کی آبادی بہت گنجان نہیں ہے۔ اتنے بڑے رقبے کے باوجود آبادی کل ۲۰ کروڑ ہے۔ یعنی ہمارے دیس کی آبادی کی آدھی سے کچھ زیادہ۔

آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ روس میں چھوٹی بڑی کل ملاکر ایک سو نوّے قومیتیں بستی ہیں اور ملک بھر میں تقریباً ڈیڑھ سو زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن زبان تو زبان یہاں کا موسم بھی عجیب وغریب ہے۔ شمال کے علاقے کا تو یہ حال ہے کہ سال بھر ہی تو سردی رہتی ہے اور زمین برف سے ڈھکی رہتی ہے وہاں کے ایک علاقے آرخنگلسک میں سردیوں کے موسم میں سب سے چھوٹا

دن تین گھنٹے بارہ منٹ کا اور گرمیوں کے موسم میں سب سے بڑا دن ۲۰ گھنٹے ۴۸ منٹ کا ہوتا ہے اور ۳ گھنٹے ۱۲ منٹ کی رات ہوتی ہے۔

یہ بڑی سلطنت سولہ حصوں پر بٹی ہوئی ہے اور ان ۱۶ ریاستوں نے اپنی مرضی سے ایک متحدہ سلطنت "متحدہ سوویٹ یونین" کے نام سے بنالی ہے۔ اب سے ۳۸ سال پہلے زار کے نام سے ایک شاہی خاندان حکومت کرتا تھا لیکن نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک زبردست انقلاب ہوا جس کی رہنمائی روس کے ایک رہنما لینن نے کی اور زار شاہی کا خاتمہ کرکے ایک نئی جمہوری حکومت قائم کی۔

لینن کی موت کے بعد ۱۹۲۴ء میں یوسف استالن ان کی جگہ آئے جنھوں نے تیس سال تک روس کے عوام کی رہنمائی کی۔

جس طرح ہمارے ملک کا نظام چلانے کے لئے ایک پارلیمنٹ ہے جس کے دو ایوان ہیں۔ لوک سبھا اور راجیہ سبھا۔ اسی طرح سوویت روس کی پارلیمنٹ اعلیٰ سوویت کہلاتی ہے۔ یہاں بھی اعلیٰ سوویت کے دو ایوان ہیں۔ ان دونوں کو برابری کے حقوق حاصل ہیں ایک کا نام سپریم کونسل ہے جس میں ۳ لاکھ آبادی پر ایک نمایندہ شامل ہوتا ہے۔ اس کا چناؤ ہر چوتھے سال ہوتا ہے دوسری قومیتوں کی کونسل ہوتی ہے جس میں روس کی مختلف قوموں کے نمایندے ہوتے ہیں اور ان سب کی نمایندگی برابر ہوتی ہے۔ یہ دونوں ایوان ملاکر اعلےٰ سوویت کہلاتے ہیں۔ لیکن سوویت یونین کا انتظامی کام وزیروں کی کونسل کرتی ہے اور ان وزیروں کی کونسل کا صدر ہی در اصل اپنے وزیروں کی مدد سے ملک کے سارے کاروبار چلانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ان دنوں اس عہدے پر مارشل بلگانن فائز ہیں جو نومبر کے تیسرے ہفتے میں ہمارے ملک میں بھی تشریف لا رہے ہیں۔ ان سے پہلے مالنکوف اور

اور استالن اسی عہدے پر رہ چکے ہیں۔

سوویت روس مختلف قوموں کا ایک خاندان ہے، جہاں ہر قوم کو برابری کے حقوق حاصل ہیں، ان کو یہاں تک حقوق حاصل ہیں کہ وہ جب چاہیں اپنی مرضی سے مرکزی حکومت سے علیحدہ ہو جائیں۔

بچوں کی تعلیم سے روسی بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ یوں تو ان کے یہاں کل ملاکر ۸۰۰ سے بھی زیادہ ایسے کالج اور یونیورسٹیاں ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن روس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ماسکو میں ہے۔ جس کی نئی عمارت ابھی حال ہی میں بنی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اس میں تقریباً ۳۰ ہزار کمرے ہیں۔ اگر کوئی بچہ ہر روز ایک کمرے میں رہے تو آخری کمرے میں پہنچتے پہنچتے اس کی عمر ۸۲ سال کی ہو جائے گی۔ اور تب کہیں وہ ہر کمرے میں ایک دن گزار سکے گا۔ اس بڑی عمارت میں ۳۶ منزلیں ہیں اور ۱۱۳ لفٹ ہیں۔ اس لئے کہ اتنی بڑی عمارت میں سیڑھیوں کا کیا کام۔ لوگ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے بجلی کی لفٹ کے ذریعے آتے جاتے ہیں۔

آج کل ماسکو یونیورسٹی میں ۱۲ ہزار طالب علم تعلیم پا رہے ہیں اور ہر طالب علم کے رہنے کے لئے علیحدہ کمرا ہے۔ طالب علموں کی ضرورت کی تمام چیزیں یہاں ملتی ہیں۔ انھیں کسی چیز کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ماسکو یونیورسٹی میں سنسکرت، عربی، فارسی، ہندی اور اردو کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

یوں تو روسی، کھیل کود کے بڑے شوقین ہوتے ہیں لیکن ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت فٹ بال کو حاصل ہے۔ فٹ بال روس کا قومی کھیل ہے پچھلے سال روس کی ایک فٹ بال ٹیم نے ہمارے دیس کا دورہ کیا تھا۔ اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں میچ کھیلے تھے۔ روسی فٹ بال کے علاوہ

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

بڑھیا اور بادشاہ

بدرالدین

کہتے ہیں کہ ایک بار ملک شاہ سلجوقی، اصفہان کے کسی جنگل میں شکار کھیلنے کے ارادے سے نکلا اور اس نے ایک گاؤں میں بڑی اچھی جگہ اپنا پڑاؤ ڈالا۔

جب بادشاہ شکار کے لئے چلا گیا تو اس کے چند ملازموں نے دو بکریاں پکڑلیں اور اُسے ذبح کرکے خوب اچھی طرح کھایا۔

یہ بکریاں ایک غریب بڑھیا کی تھیں۔ جس کے چار بچے تھے۔ وہ اپنی دونوں بکریوں کا دودھ بیچ کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔

جب بڑھیا کو معلوم ہوا کہ اس کی دونوں بکریاں بادشاہ کے آدمیوں نے ہڑپ کرڈالی ہیں تو اُسے سخت صدمہ ہوا اس لئے کہ لے دے کر یہی دونوں بکریاں اس کا سہارا تھیں۔

بے چاری اپنی جھونپڑی سے نکلی اور گرتی پڑتی آدھی رات کو پل پر جاکر بیٹھ گئی کیونکہ اسی پل سے بادشاہ کی سواری گزرنے والی تھی۔ بڑھیا بادشاہ کے انتظار میں ساری رات جاگتی رہی۔ آخر خدا خدا کرکے صبح ہوئی اور بادشاہ کی سواری آئی۔ بادشاہ

کو دیکھتے ہی بڑھیا آگے بڑھی اور اپنی پوری آواز کے ساتھ گرج کر بولی۔

"اے ظالم بادشاہ! اگر تو نے اس پل پر میرا انصاف نہ کیا، تو خدا کے جلال کی قسم میں قیامت کے دن پل صراط پر تیرا دامن پکڑوں گی۔ تجھے ہر حال میں میرا انصاف کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ اب یہ سوچ لے کہ ان دونوں پلوں میں کونسا پل ٹھیک ہے۔" بڑھیا نے یہ باتیں بڑی گستاخی کے ساتھ کہی تھیں۔ بادشاہ کے آدمی سمجھے کہ اب بڑھیا کی خیریت نہیں ہے۔ اس لئے آج تک کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بادشاہ سے اس طرح سے بات چیت کرے لیکن بادشاہ پر اس کا الٹا اثر ہوا وہ بڑھیا کی بات سنتے ہی اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور بڑھیا سے بولا۔

"بڑی بی پل صراط پر میرا لشکر، میرا ملک، میری دولت، میری عظمت و حشمت کوئی بھی میرے کام نہ آئے گی۔ اور میرا کوئی ساتھی میری مدد نہیں کر سکتا۔ میں اسی پل پر تمہارا انصاف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بتاؤ تو تم پر میں نے کیا ظلم کیا ہے؟ تاکہ یہیں اس کا فیصلہ ہو جائے، مجھے تو معلوم نہیں کہ میں نے تم پر کیا ظلم کیا ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں تم کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

بڑھیا نے جواب دیا "مجھ پر تم نے ظلم کیا ہے! تمہارے غلام جو کچھ کرتے ہیں وہ صرف تمہاری طاقت کے بل پر، ان کا ظلم تمہارا ظلم ہے، ان کا رحم و انصاف تمہارا رحم و انصاف ہے۔"

اس کے بعد بڑھیا نے اپنی بکریوں کا تمام واقعہ بادشاہ کو سنایا جسے سن کر بادشاہ کو بے حد افسوس ہوا اور اس نے حکم دیا کہ ان غلاموں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ اور اس کے بدلے میں بڑھیا کو فوراً ستر بکریاں دی جائیں۔"

یہ سن کر بڑھیا خوش ہو گئی اور اس نے بادشاہ کو خوب جی کھول کر دعائیں دیں۔ اس طرح بڑھیا کی دعائیں لے کر بادشاہ رخصت ہوا اور اس کے بعد پھر کبھی بادشاہ کے آدمیوں نے کسی کو نہیں ستایا۔
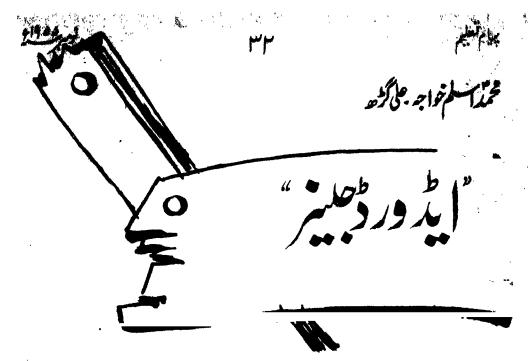
محمد اسلم خواجہ۔ علی گڑھ

"ایڈورڈ جینر"

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ چیچک کتنا پھیلنے والا مرض ہے۔ جس سے کہ لوگ ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں ہندوستان میں مرتے ہیں۔ ایک دفعہ جب یہ شروع ہوجاتا ہے تو پھر بڑی تیزی سے پھیلتا ہے۔ اور اِسی وجہ سے چیچک کے مریض احتیاط کے طور پر تندرست آدمیوں سے الگ رکھے جاتے ہیں۔

سو سال پہلے چیچک انگلستان میں ایسی ہی عام تھی جیسے کہ آج کل ہندوستان میں ہے۔ تقریباً ۸۰ ہزار آدمی ہر سال اس مرض کا شکار ہو جاتے تھے۔ لیکن اب انگلستان میں قریب قریب اس مرض کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ ۱۸۵۱ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا' اِس کے مطابق چیچک کا ٹیکا سب کے لئے ضروری کر دیا گیا تھا۔

چیچک کا ٹیکا لگا کر چیچک کو روکنے کی ترکیب سب سے پہلے "ایڈورڈ جینر" نامی ایک ڈاکٹر نے کی تھی۔ جو کہ لندن کے مشہور ڈاکٹر جان ہنٹر کا محبوب شاگرد تھا۔

ایک دن "ایڈورڈ جینر" ایک دوا فروش کی دوکان پر کھڑا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک دیہاتی لڑکی دوا فروش سے چیچک کے متعلق پوچھنے آئی۔ بات چیت کے دوران میں لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ "میرے چیچک

نہیں نکل سکتی، کیوں کہ ایک بار میرے نکل چکی ہے۔"

اور یہی بات ایڈورڈ جینر کے دل کو ایسی لگی کہ وہ برابر سوچتے رہے کہ آخر ایک بار چیچک کا حملہ ہو جانے کے بعد پھر کیوں چیچک نہیں نکلتی اور اتنی سی بات کو سوچتے سوچتے اس نے اپنی تحقیقات شروع کر دی۔

جینر ابھی طالب علم ہی تھا۔ اور ایک میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ لیکن اس دیہاتی لڑکی کی بات نے جینر کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور وہ حیرت میں پڑ گیا، کہ اِس اعتقاد میں جو کہ انگلستان میں اُس وقت بہت عام تھا کوئی سچائی بھی ہو سکتی ہے؟ یعنی جس شخص کے ایک بار چیچک نکل چکی ہو اُس کے دوبارہ نہیں نکلے گی۔ چنانچہ اس نے بیس برس تک چیچک کو روکنے کی ترکیبوں کی خوب چھان بین کی۔

آخرکار جینر کو پکا یقین ہو گیا کہ لوگوں کا خیال صحیح ہے۔ اور اُس کے ایک تجربے نے ثابت کر دیا کہ لوگوں کے جسم میں اگر چیچک کے جراثیم ٹیکے کے ذریعہ داخل کئے جائیں تو چیچک سے آدمی کو بچایا جا سکتا ہے۔ جینر کو اپنی اس تحقیق پر اس قدر اعتقاد تھا کہ سب سے پہلے اس نے اپنے لڑکے کے چیچک کا ٹیکا لگایا۔

ایڈورڈ جینر نے اب اپنی تحقیق کے بارے میں ایک ستّر صفحے کی چھوٹی سی کتاب لکھی، جس میں تیئیس۲۳ ایسے چیچک کے ٹیکوں کی تفصیل بیان کی۔ ٹیکے کے فائدے بھی بیان کئے۔ اور پھر عوام کے سامنے اِس کتاب کو پہنچایا۔ مگر اُس زمانے کے لوگوں نے اُس حیرت انگیز ایجاد کو کسی طرح نہ مانا اور طرح طرح کی باتیں کہیں۔ مثلاً یہ کہا "کہ جو لوگ اس ٹیکے کو لگوائیں گے۔ اُن کا چہرہ بیل کی طرح تکونا ہو جائے گا۔ یا قد چھوٹا ہی رہ جائے گا۔" وغیرہ وغیرہ

مگر جب ٹیکا لگنا شروع ہوا اور اس کا اثر بہت اچھا ہوا تو لوگوں کے دِلوں سے رفتہ رفتہ شک و شبے دور ہو گئے۔ اور پھر تو چیچک کے ٹیکے لگانے کا سلسلہ پورے انگلستان میں رائج ہو گیا۔ آخر یہ ڈاکٹر، بادشاہ اور ملکہ کے بھی سامنے لایا گیا۔ عوام نے اِس کی خدمت کو تسلیم کیا۔ اس کی زندگی ہی میں سارے یورپ میں اس کی تحقیق کی قدردانی ہوئی۔ اور اس کا ٹیکا عام ہو گیا۔ ہندستان نے بھی اس تحقیق کی قدردانی کی۔ اور اب ہمارے ملک میں بھی عام ہو گیا ہے۔ اور اِسی وجہ سے پہلے کے مقابلے میں لوگوں کی چیچک سے موتیں بھی کم واقع ہونے لگی ہیں۔

بعض قدردانوں نے اس عمدہ تحقیق کے سلسلے میں جینر کو بہت سا روپیہ بھی دینا چاہا، لیکن ایڈورڈ جینر
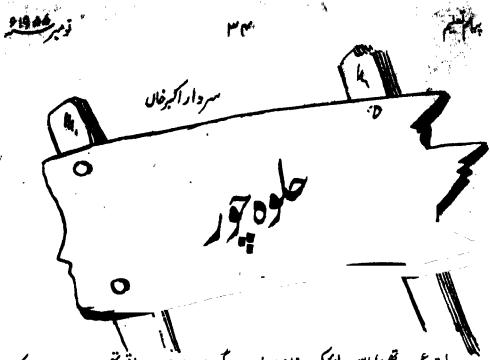
باقی صفحہ ۴۴ پر

بات عجیب تھی، اس لئے کہ روزانہ ہمارے گھر میں چوری ہوجاتی تھی۔ روپے پیسے کی نہیں، بلکہ حلوے اور مٹھائی کی! ہمارے گھر میں کل ملاکر پانچ بہن بھائی تھے۔ میں، رشید اور سلیم، رضیہ آپا، اور زہرہ آپا۔ نہ معلوم ہم میں سے کون چور تھا جو رات ہی رات میں سارا حلوہ صاف کر جایا کرتا تھا۔

اس روز روز کی چوری سے گھر کے سب لوگ پریشان تھے۔ امی جان کا خیال تھا کہ ملازمہ حلوا چراتی ہے۔ لیکن بے چاری ملازمہ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی گھر چلی جاتی تھی۔ اس لئے امّی کا خیال غلط ثابت ہوا۔ لیکن پھر کون چراتا؟ آخر عاجز آکر ابّا جان نے کہا کہ جو آدمی حلوہ چور کو پکڑے گا اُسے ایک روپیہ انعام ملے گا۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حلوہ چور ڈر گیا۔ کیونکہ اب وہ حلوہ دو ایک دن چھوڑ کر چرانے لگا تھا۔

آج اتوار کا دن تھا۔ ابا جان کلّن حلوائی کے ہاں سے بڑا مزیدار حلوہ لے کر آئے۔ حلوہ تھا مزیدار۔ مگر ہم پانچوں بہن بھائیوں کے برابر کے حصے لگائے گئے۔ اور باقی حلوا امّی نے الماری میں رکھ دیا۔

میں بھی سوچا کرتا تھا کہ کسی طرح حلوا چور کو پکڑا جائے ۔ آخر ایک روز میں نے طے کر لیا کہ آج رات کو میں خود حلوہ چور کو پکڑوں گا ۔ چنانچہ جب سب سونے کے لئے لیٹے ۔ اور ہر کمرے کی روشنی بجھا دی گئی تو میں آہستہ سے اٹھا ۔ اور دبے پاؤں باورچی خانے میں داخل ہوا ۔ اور حلوے کی الماری کے بالکل پاس اس طرح چھپ کر بیٹھ گیا کہ اگر کوئی حلوے کی الماری کی طرف آئے تو مجھے معلوم ہو جائے ۔ ایک بج گیا لیکن حلوہ چور کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا ۔ میں نے سوچا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اس نے ناغہ کیا ہے ۔ یا پھر کوئی جن بھوت ہو جو اس طرح آکر حلوہ کھاتا ہو ۔ طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے ۔ پھر چار بج گئے ۔ اچانک کچھ آہٹ سی ہوئی ۔ میں نے دیکھا کہ کوئی میری طرف چلا آ رہا ہے ۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو وہ نسیمہ آپا نکلیں ۔ لیکن ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ۔ وہ میرے پاس سے گزرتی ہوئی صراحی کی طرف پانی پینے چلی گئیں ۔

جب مجھے بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی تو میں نے سوچا چور تو آیا نہیں اور یہاں حلوہ کھانے کو جی چاہ رہا تھا ۔ اس لئے میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں ہی اب حلوہ کھاؤں ۔ اس لئے میں اپنی جگہ سے چپکے چپکے اٹھا ۔ اس وقت سب اپنے اپنے بستروں پر چادر تانے پڑے تھے ۔ جب مجھے پورا اطمینان ہو گیا تو میں دوبارہ باورچی خانے میں آیا اور الماری کھولی ——— حلوہ سنہری اور روپہلی ورقوں سے ڈھکا ہوا اوپر ہی رکھا تھا ۔ میں نے پلیٹ نکالی اور پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا ۔ کوئی ٹھنڈی چیز میری پیٹھ سے آکر لگی ۔ مڑکر دیکھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ سلیم اپنا مصنوعی پستول میری پیٹھ سے لگاتے ہوئے بولا "ہینڈز آپ بھائی جان ۔ حلوہ چور پکڑنے چلے تھے اور خود بن گئے ۔" پاس ہی کھڑے ہوئے رشید نے اپنی توتلی زبان میں سلیم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "ہاں بھائی دان دلا ہاتھ اوپل اٹھا لیدیئے" میں شرم سے

پانی پانی ہوگیا۔ اتنے میں نسیمہ آپا اور زہرہ آپا بھی آگئیں۔ اور وہ مجھے کھینچ کھانچ کر ابا کے پاس لے گئیں۔ ابا ابھی ابھی جاگے تھے۔ صبح ہو چلی تھی۔ اماں جان وضو کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ابا مسکرائے اور بولے "لاڈو میرا اچھا لاڈو اس کے بعد سلیم اور رشید کو آٹھ آٹھ آنے مل گئے۔ اور میں منہ بسورتا رہ گیا۔ اس کے بعد سلیم مجھے اپنے بستر کے پاس لے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بستر پر اب بھی کوئی سو رہا ہے۔ لیکن جب اس نے کمبل ہٹا کر دکھائے تو وہاں بس دو موٹے موٹے تکیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ میں اس چالاکی پر عش عش کرنے لگا۔ مگر افسوس مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ حلوہ چور کون ہے؟ حالانکہ گھر میں صرف میں حلوہ چور مشہور ہوں۔

بقیہ "سوویت روس"

باسکٹ بال، والی بال وغیرہ بھی بڑی دلچسپی سے کھیلتے ہیں۔

گھریلو کھیلوں میں شطرنج روس میں بے حد مقبول ہے اور دنیا کے سب سے اچھے شطرنج کے کھلاڑی روس ہی میں ہیں۔

روسی ہر میدان میں ترقی کر رہے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جس طرح ہمارے ملک میں پانچ سالہ منصوبوں کے مطابق ترقی کے کام ہو رہے ہیں۔ ہم پانچ سال کے لئے اپنے کاموں کا ایک منصوبہ بناتے ہیں کہ پانچ سال کے اندر اپنے ملک کی ترقی کے سلسلے میں یہ یہ کام کریں گے۔ اسی طرح روس کے لوگ اپنے کاموں کو اپنے منصوبے کے مطابق کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج روس ہر میدان میں ترقی کر رہا ہے اور اس کی گنتی دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتی ہے۔ (اظہر محمد)

بیٹا۔ ابا جی! میں نے آپ کو دس روپے کا فائدہ کروایا۔
ابا جی۔ وہ کیسے ؟
بیٹا۔ امتحان میں فیل ہوکر۔ آپ نے کہا تھا کہ پاس ہونے پر دس روپے انعام میں دوں گا۔

ماسٹر۔ موہن تم بڑے نالائق ہو۔
موہن۔ لیکن جناب میں تو چھوٹا ہوں۔

ماسٹر۔ کیا تم نے جغرافیہ کے نوٹ دیکھے۔
لڑکا۔ جناب میں نے رات بھر کتاب دیکھی لیکن اس میں ایک نوٹ نہ ملا۔

نیاض محمد خاں علی گڈھ

خالد۔ حوالات کے کیا معنی ہیں ؟
حامد۔ جہاں لاتوں کی ہوا کھائی جاتی ہے۔

نذر حیدر آزاد۔ جھانسی

ایک دوست۔ بتاؤ بسمارک کون تھا۔
دوسرا۔ جناب تیس مارک کا بھائی۔

سکھ دیو سنگھ سراٹ۔ ساکچی

استاد۔ اکبر کون تھا ؟
شاگرد۔ ایک مشہور شاعر
استاد۔ اور اکبر الہ آبادی کون تھا۔
شاگرد۔ اپنے دور کا ایک مشہور بادشاہ۔

رب اختر۔ پرولیا

استاد۔ بتاؤ بحر ہند کسے کہتے ہیں۔
شاگرد۔ ہند کے بہرے کو۔

محمد محبوب الحق بسمل۔ آرہ

مالک :- ڈرائیور ! یہ کیا کر رہے ہو ؟
ڈرائیور :- سرکار گیر بدل رہا ہوں ۔
مالک :- (بگڑ کر) میرے بیٹھے بیٹھے تو تم گیر بدل رہے ہو اگر کہیں میں نہ ہوں تو ساری موٹر بدل ڈالو گے ۔

مجسٹریٹ :- (ملزم سے) تم ثابت کرو کہ تم نے چوری نہیں کی ۔
ملزم :- حضور ۔ میرے ہاتھ نے چوری کی ہے ۔ میرا کوئی قصور نہیں ۔ میں گلی سے گزر رہا تھا ۔ پاس کے ایک مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی میرے ہاتھ نے بڑھ کر میز پر سے پرس اٹھا لیا ۔
مجسٹریٹ :- اچھا تو تمہارے ہاتھ کو چھ مہینے کی سزا دی جاتی ہے ۔
ملزم نے یہ سن کر اپنا ہاتھ میز پر رکھ دیا ۔ اور چل دیا ۔ مجسٹریٹ نے دیکھا تو وہ ہاتھ ربر کا تھا ۔

حمید اصغر نما ۔ لکھنؤ

احمد :- (استاد سے مخاطب ہو کر) ماسٹر صاحب ! میں نے کل موہن کو بیڑی پیتے دیکھا ۔
استاد :- کیوں موہن ! کیا احمد سچ کہہ رہا ہے ۔
موہن :- (جھٹ سے) نہیں ماسٹر صاحب یہ جھوٹ بول رہا ہے میں نے تو سگریٹ پی تھی ۔

ایک صاحب اپنے لڑکے کی کاہلی سے بے حد پریشان تھے اور یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس میں چستی پیدا ہو ۔ چنانچہ انھوں نے کہا " بیٹا ذرا باہر جاکر دیکھو تو بارش تو نہیں ہو رہی ہے "
" ابا ! آپ ذرا سیٹی بجائیے ابھی کتا دوڑا چلا آئے گا ۔ اگر بارش ہو رہی ہوگی تو کتا بھیگا ہوگا ۔

رحیم :- ارے میاں حجام یہ تم نے کیا کیا کہ سارے بال مونڈ ڈالے ۔
حجام :- جی حضور آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ذرا خوب صفائی سے بال کاٹنا ۔ اب آپ بتائیے اس سے زیادہ اور کیا صفائی ہو سکتی ہے ۔

——— ولیل الرحمٰن ہوڑہ

مختلف معلومات

کیا آپ جانتے ہیں کہ:—

(۱) دنیا کی سب سے بڑی گھڑی "بگ بن" ہے جو لندن میں ہے۔

(۲) دنیا کا سب سے بڑا محل کریملن ہے جو ماسکو میں ہے اور جہاں روس کی حکومت کا مرکزی دفتر ہے۔

(۳) دنیا کی سب سے بڑی ریلوے لائن روس میں ہے جو ولاڈی واسٹک سے لینن گراڈ تک جاتی ہے۔

(۴) دنیا کی سب سے اونچی عمارت امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے جو امریکہ میں ہے۔

(۵) دنیا کی سب سے بڑی لائبریری نیشنل لائبریری ہے جو ماسکو میں ہے۔

(۶) دنیا کا سب سے بڑا گنبد بیجاپور میں ہے جو گول گنبد کہلاتا ہے۔

(۷) دنیا کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن نیویارک میں ہے یہاں ۱۴ پلیٹ فارم ہیں۔

(۸) دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت تاج محل ہے۔

(۹) دنیا کا سب سے پُرانا درخت لنکا میں ہے یہ درخت مہاراجہ اشوک کی لڑکی نے اپنے ہات سے لگایا تھا۔

(۱۰) دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ماسکو میں ہے جس میں ۳۰ ہزار کمرے ہیں۔

(۱۱) دنیا کی سب سے بڑی دیوار، چین میں ہے جو دیوارِ چین کے نام سے مشہور ہے۔

(شریف الدین احمد)

ریحان احمد عباسی

شاہ جی کی کہانی

عیدگاہ کے راستہ میں بستی سے نکلنے کے بعد داہنے ہاتھ کو جو پرانی مسجد ملتی ہے' اس کے بارے میں لوگوں میں نہ جانے کتنے قصّے کہانیاں مشہور ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ وہاں جن بھوت رہتے ہیں ہمارے محلّے میں ایک صاحب رہتے ہیں جن کا نام تو نہ جانے کیا ہے لیکن لوگ اُنھیں شاہ جی کہتے ہیں۔ اس پرانی مسجد کے بارے میں شاہ جی ایسے عجیب و غریب قصّے بیان کرتے ہیں کہ اچھا بھلا آدمی بھی اُنہیں سُن لے تو اُدھر جانے کا نام نہ لے۔ لیکن شاہ جی کا تو معمول تھا کہ وہ ہر مہینے چاند کی تیرہ کو آدھی رات کے وقت اس مسجد میں جاتے اور وہاں جا کر چراغ جلاتے۔ لوبان سلگاتے' بیٹھ کر کچھ پڑھتے اور پو پھٹنے سے پہلے واپس آجاتے۔ بھوتوں اور جنوں کے قصّے سُنانے میں وہ ہمیشہ آگے آگے رہتے تھے۔

محلّے کے آدمی جب دن بھر کے کام کاج سے فرصت پا کر رات کو چوپال میں جمع ہوتے تو شاہ جی اُنھیں مسجد کے جنوں اور بھوتوں کے ایسے ایسے بھیانک اور ڈراؤنے قصّے سُناتے کہ سُننے والوں کا دل دہل جاتا۔ اور لوگ اس طرح چپ چاپ سُنتے کہ اگر سوئی بھی گرے تو آواز سُنائی دے۔ سب لوگ خوف سے سہمے ہوئے اُن کی

طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے۔ لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ شاہ جی کے قصّے بچّے بڑے سب ہی دلچسپی لے کر سُنتے اور کوئی منع نہ کرتا کہ ہمیں مت ڈراؤ۔ یا یہ کہ ہم ایسے قصّے نہیں سُننا چاہتے۔ بلکہ ہوتا یہ تھا کہ سُننے والوں کا اشتیاق بڑھتا جاتا۔ ڈرے سہمے ہوتے لیکن پھر بھی وہاں سے کہیں نہ جاتے۔ بس اس وقت تو ایک ہی خیال اُن کے دل میں رہتا تھا کہ پھر کیا ہوا؟ ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ اگر اس وقت دروازے کے باہر ذرا بھی کھٹکا ہوتا تو سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ جاتیں اور لوگ گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے۔ گویا اندھیرے میں کوئی چیز تلاش کر رہے ہیں۔

شاہ جی کے قصّے اتنے مشہور ہو گئے تھے۔ کہ دور دور سے آدمی اُن کے سُننے کے لئے آتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جن بھوت اپنی شکل و صورت بدل لیتے ہیں۔ کبھی وہ بلّی اور کتا بن جاتے ہیں تو کبھی چھپکلی یا سانپ یا شیر یا آدمی بن جاتے ہیں۔ غرض سب ہی کے بھیس میں آسکتے ہیں۔ جب چاہیں وہ اپنا قد بھی چھوٹا بڑا کر سکتے ہیں وہ چاہیں تو اتنے بڑے ہو جائیں کہ آسمان چھُو لیں اور چاہیں تو اتنے چھوٹے ہو جائیں کہ سُوئی کے ناکے میں سے نکل جائیں۔

یہ کہانیوں کا سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔ لیکن ایک دن جب شاہ جی مسجد میں لوبان سُلگانے گئے تو پھر وہاں سے واپس نہ آئے۔

اگلے دن اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی جسے پڑھ کر سب لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ کہ "شاہ جی گرفتار کر لئے گئے۔ پرانی مسجد میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ رہتا تھا جو مسجد کے تہ خانے میں لوٹ کھسوٹ کا مال جمع کرتا۔ اور وہیں سے بیٹھے اِدھر اُدھر چھاپے مارا کرتا تھا" بعد میں معلوم ہوا کہ شاہ جی ہر جمعے لوبان سُلگانے نہیں بلکہ وہاں اپنی تنخواہ لینے جایا کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ لوگوں کو جھوٹی کہانیاں سُنا سُنا کر اتنا ڈرا دیں کہ لوگ کبھی پرانی مسجد میں جانے کا رُخ بھی نہ کریں۔

چنانچہ یہ سن کر ہمیں بہت افسوس ہوا۔ افسوس اس لئے نہیں ہوا کہ شاہ جی پکڑے گئے بلکہ اس لئے ہوا کہ ہم ایسی چیز کا یقین کرنے لگے تھے جو سرے سے ہے ہی نہیں۔ بھوت جن ہوتے ہی کہاں ہیں جو اپنی صورت بدلیں۔

شاہ جی کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ہم مسجد میں جسے بھی دیکھیں اُسے بھوت سمجھیں، اور وہاں سے بھاگ آئیں۔

عبداللطیف نیّر

(فرحت ہاتھ میں دو پیڑے لئے ناچتا ہوا آتا ہے)

فرحت :- اہا ہا! مجھے ملے دو پیڑے! مزے کے میٹھے، میٹھے! اب دونوں پیڑے میں کھاؤں گا۔ بس میں اکیلا ہی کھاؤں گا! کسی کو نہیں دوں گا۔ ابّا کو نہیں دوں گا۔ امی کو نہیں دوں گا۔ آپا کو نہیں دونگا اور منے کو بھی نہیں دوں گا۔ (منّا داخل ہوتا ہے)

منّا :- فرحت بھیّا! کیا ہے آپ کے ہاتھ میں؟

فرحت (آہستہ سے ایک طرف منھ کرکے) اب دکھاؤں گا منّے کو اپنے پیڑے۔ اب منّے کا تھوڑا سا مذاق اڑانا چاہیئے۔

فرحت (بلند آواز سے منّے سے کہتا ہے) منّے دیکھو یہ پیڑے ہیں!

منّا :- کہاں سے لائے بھیا یہ دو پیڑے؟

فرحت :- بھئی واہ دو ہیں کیا؟ ذرا دیکھو غور سے دیکھو یہ تین پیڑے ہیں، تین!

منّا :- بالکل نہیں! دو ہیں۔

فرحت :- واہ- ذرا پھر دیکھو یہ دو ہیں۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو- یہ تین پیڑے ہیں! بتاؤں کیا کیسے؟

منّا :- اچھا گن کر دکھاؤ۔

فرحت:۔ (گنتے ہوئے) دیکھو ہاں! یہ ہوا ایک
یہ ہوئے دو۔ اچھا اب بتاؤ کہ ایک اور
دو کتنے ہوتے ہیں؟

منا:۔ تین!

فرحت:۔ پھر ہو گئے نا، تین پیڑے! اچھلے کہیں
کے (ہنستا ہے)

منا:۔ (روتے ہوئے) ہرگز نہیں میں پاگل
نہیں! یہ دو ہی پیڑے ہیں۔ یہ دو سے
زیادہ نہیں ہو سکتے۔ صاف صاف دو
دکھائی دے رہے ہیں۔

(پروین پیچھے سے سب دیکھتی ہے اور
آگے آتی ہے)

پروین:۔ واہ! فرحت بھیا شاباش! تم بہت
ہشیار ہو! منے، یہ تین پیڑے ہی ہیں۔

منا:۔ نہیں، دو!

پروین:۔ ارے! ذرا ٹھہرو تو سہی! فرحت
یہاں لاؤ وہ پیڑے۔ منے، یہ ایک پیڑا
تم کھا لو دیکھوں کیسے۔ ہاں کھا لیا نا۔
واہ واہ۔ یہ دوسرا پیڑا میں کھاتی ہوں
اور اب تیسرا پیڑا فرحت کھائے گا۔
(منا پیڑا کھاتا ہے پروین فرحت کے
ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہے)

پروین:۔ کیوں فرحت، کیسا ہے تیسرا پیڑا؟
ہے نا میٹھا! مزے کا ہے۔

فرحت:۔ (رونی صورت بنا کر) اچھا، اچھا،
دیکھ لوں گا میں بھی، میرے پیڑے
دونوں چٹ کر گئے۔

بقیہ ایڈورڈ جینیر

نے قطعی انکار کر دیا۔ دراصل جینیر ان لوگوں میں سے
تھے جو اپنی قوم کے لئے باعثِ فخر ہیں۔ انھوں نے
اپنی تحقیقات کا بدلہ روپے کی شکل میں لینے سے انکار کر دیا۔
اس کے لئے سب سے بڑی دولت یہی تھی کہ اس
نے ایک ایسی چیز ایجاد کر کے لوگوں کو اس خوفناک
بیماری سے بچا لیا ہے۔ اس کی ساری شہرت کا
دارومدار صرف اس کی یہ بڑی تحقیق ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار شہنشاہ نپولین نے
کچھ انگریزوں کو قید کر لیا تھا۔ اور رہا کرنے سے انکار
کر دیا۔ اتنے میں ملکہ نے ایڈورڈ جینیر کا نام لے کر
سفارش کی "یہ اس ملک کے لوگ ہیں جس نے ایڈورڈ
جینیر جیسا سپوت پیدا کیا"۔ یہ سن کر فوراً شہنشاہ
نے کہا "ایڈورڈ جینیر اس کے نام پر تو ہم کسی
چیز سے بھی انکار نہیں کر سکتے" اور اس نے
انھیں قید سے آزاد کر دیا۔

پرانے زمانہ کی بات ہے، ایک شہر میں ایک لوہار رہتا تھا۔ لوہار بھی ایسا ویسا نہیں اپنے کام میں طاق اور اپنے فن میں بے نظیر۔ کہتے ہیں کہ ایک بار اس نے بڑی محنت سے لوہے کا ایک صندوقچہ بنایا اور اپنی ساری کاریگری اس پر لگا دی صندوقچہ کی کنجی اس طرح ایک تالے میں رکھی گئی۔ کہ بغیر دوسری کنجی کے نکل نہ سکے۔

ہمارا اور آپ کا زمانہ ہوتا تو جھٹ پٹ اس نمونہ کو پیٹنٹ کرا لیا جاتا تاکہ کوئی دوسرا آدمی نہ بنا سکے۔ لیکن یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب اس طرح کے غیر معمولی اور حیرت انگیز اور اچھے کاموں کی بادشاہوں یا امیروں سے داد ملتی تھی۔

لوہار بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور یہ تحفہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ اور سارے درباری اس اچھوتے تحفے کو دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ ایسا صندوق نہ کسی نے دیکھا اور نہ سنا۔ سب ہی نے لوہار کے کام کی تعریف کی۔ بادشاہ نے انعام و

اکرام دیا۔ لوہار اپنا انعام لے کر ابھی چلنے بھی نہ پایا تھا کہ دیکھتا کیا ہے کہ بادشاہ اور درباری سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بادشاہ تو دو چار قدم آگے بڑھا لوہار نے کنکھیوں سے دیکھا کہ ایک عالم اپنی دستار سنبھالتے، جبّہ لہراتے دربار میں چلے آرہے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور بڑی عزت سے لے جا کر ان کو بٹھایا۔ لوہار بیچارا سوچ میں پڑ گیا کہ ہو نہ ہو اس عالم کی عزت اس کے علم کی وجہ سے ہے۔

اب جو لوہار دربار سے نکلا تو اس نے طے کر لیا کہ لوہار کے کام کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ چنانچہ وہ اپنے تمام اوزار بیچ باچ شہر کے ایک بڑے مولانا کی خدمت میں جا پہنچا اور بڑے ادب سے بولا کہ میں علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا بہت حیران ہوئے اور بولے "ارے بھائی کہیں بوڑھے توتے بھی پڑھتے دیکھے ہیں۔ تمہاری عمر تیس پینتیس سال کی ہے۔ اب تم کیا پڑھوگے"۔ مگر لوہار تو بادشاہ کے دربار میں عالم کی عزت دیکھ چکا تھا وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجبوراً مولانا پڑھانے کے لئے تیار ہوگئے۔ اب وہ لوہار کو ہر روز ایک سبق دیتے۔ اس طرح پڑھاتے پڑھاتے ایک سال گزر گیا۔ لیکن لوہار ویسے کا ویسے ہی رہا۔ پہلے استاد عاجز تھے تو اب لوہار بھی پڑھتے پڑھتے تنگ آگیا۔ اس کا اپنے پرانے کام سے دل اچاٹ ہو ہی گیا تھا۔ اس نے ایک سال تک مسلسل کوشش کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر تنگ آکر اس نے سوچا کہ مجھے دنیا چھوڑنی چاہیئے۔ یہ سوچ کر اس نے گھربار چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ چلتے چلتے جب تھک گیا تو دھوپ سے بچنے کے لئے ایک سایہ دار جگہ پہنچا۔ یہاں بڑی بلندی سے ایک چشمہ گرتا تھا۔ ایک جگہ پانی رِس رِس کر قطروں کی شکل میں ایک پتھر پر ٹپک رہا تھا۔ معلوم نہیں کب سے۔ اس طرح پتھر میں پانی کے مسلسل ٹپکنے سے ایک سوراخ ہوگیا تھا۔

لوہار کبھی سخت پتھر کے سوراخ کو دیکھتا کبھی پانی کی نرم بوندوں کو۔ اچانک اس کا

چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا جیسے اس کے دماغ میں کوئی اچھی سی نئی بات سوجھی ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ علم تو پانی سے زیادہ نرم ہے اور میں پتھر سے زیادہ تو سخت ہوں نہیں اگر پانی کے قطرے مسلسل گر کر اس پتھر میں سوراخ کر سکتے ہیں تو کیا علم میرے دل میں گھر نہیں کر سکتا؟

اس کا سوچنا تھا کہ اس کے قدم خود بخود اپنے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ پھر تو وہ دل و جان سے پڑھنے لکھنے میں لگ گیا۔ تیس سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا تیس سال تک برابر علم حاصل کرتا رہا۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ ان پڑھ لوہار اپنے وقت کا زبردست عالم اور امام مانا گیا۔ اور بڑے بڑے علما ان کا احترام کرنے لگے۔ انھوں نے تیس سال تک پڑھایا۔ اور تیس سال تک فتویٰ دیا۔

آپ کہیں گے پوری کہانی سنادی لیکن نام نہیں بتایا۔

اچھا سنئے ان کا نام تھا امام قفال شاشی۔

باغ کی سیر

آؤ آؤ باغ میں جائیں
باغ میں جا کر جی بہلائیں
چل کر دیکھیں پھول رنگیلے
نیلے نیلے پیلے پیلے
اچھے اچھے پیارے پیارے
جیسے ہوں آکاش کے تارے

گہرے گہرے ہلکے ہلکے
رنگ ہم اُنکے دیکھیں چلکے
باغ کی کیاری کیاری دیکھیں
کلیاں پیاری پیاری دیکھیں
دیکھیں پھولوں کی رنگینی
خوشبو سونگھیں بھینی بھینی
میٹھے میٹھے میوے چکھیں
کچھ کھائیں کچھ جیب میں رکھیں
آؤ سنیں چڑیوں کا گانا
بُلبل اور کوئل کا ترانا
توڑ کے پھل ہم گھر کو لائیں
آپا اور منّے کو کھلائیں

راجہ نواب

کارٹون

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)

اس طرح ہم نے غبارے میں
ہوا بھری

نادان دوست

کسی گاؤں میں ایک لالہ جی رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں اپنے سسرال جانا تھا۔ چاہتے تھے کہ کوئی ساتھی مل جائے تو باتوں میں راستہ کٹ جائے۔ ان کے پڑوس میں ایک آدمی رہتا تھا جسے لوگ بدھو کہتے تھے۔ لالہ جی نے سوچا کہ اگر بدھو ہی ساتھ چلنے پر راضی ہو جائے تو اچھا ہے۔ راستہ میں دور تک جنگل پڑتے تھے۔ اُنھوں نے بدھو کو چلنے پر راضی کرلیا۔ بدھو نے سوچا کہ چلو کچھ دنوں کے لئے تو کھانے پینے کا انتظام ہوگیا۔ بدھو نے اپنی پگڑی میں ایک روپیہ رکھ لیا۔

لالہ جی کا سسرال ان کے مکان سے کافی فاصلے پر تھا۔ دونوں صبح سویرے گھر سے نکلے۔ شام ہو گئی لیکن وہ لوگ گھر سے پھر بھی دو میل دور تھے۔ بدھو نے کہا کہ اب تو رات ہو رہی ہے رات بھر یہیں آرام کرو۔ صبح سویرے چلے جائیں گے ـــــ لیکن لالہ جی نے کہا کہ صرف دو میل کا فاصلہ اور ہے، رات جنگلوں میں بسر کرنا ٹھیک نہیں، گھر جا کر آرام کریں گے۔ مگر بدھو میاں نہ مانے اور بولے "میں اب یہاں سے ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا۔" اور یہ کہہ کر انھوں نے ایک تناور درخت کے نیچے اپنا بستر کھول دیا اور لیٹ گئے۔

لالہ جی بڑے پریشان ہوئے۔ رات کے وقت
اکیلے اتنی دور جانے سے بہت۔ آخر بدھو کو دل
ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے انھوں نے بھی
وہیں رات گذارنے کا ارادہ کرلیا۔ لالہ جی نے
اپنی گٹھری تو اس ڈھیر میں چھپا کر رکھدی اور خود
بھی وہیں پر پڑ رہے۔

آدھی رات کے قریب کچھ چوروں کا ادھر
سے گذر ہوا۔ رات اندھیری تھی۔ جب درخت کے
نزدیک سے گذرنے لگے تو اندھیرے میں انہیں
بدھو نظر نہ آیا۔ وہ لوگ اُسے لکڑی کا کندا سمجھے
زرا آگے بڑھنے پر چوروں نے آپس میں کہا۔
"اس گاؤں کے لوگ کتنے بیوقوف ہیں کہ راستہ
میں اتنا بڑا کندا چھوڑ دیا ہے۔"

بدھو بے وقوف تو تھے ہی یہ سن کر
اُن سے نہ رہا گیا اور فوراً بولے "تم لوگوں کو
کندے اور آدمی میں بھی فرق نہیں معلوم ہوتا؟
جب اتنا بھی نہ سمجھ سکو گے تو چوری کیا خاک
کروگے ——"

چوروں نے بدھو میاں کی بات سُن
لی اور دوڑے ہوئے جاٹ کے پاس گئے
اور اُسے مارنا پیٹنا شروع کردیا۔ جاٹ نے
چوروں سے کہا "مجھے مت مارو میرے پاس روپے
پیسے کہاں؟ ایک روپیہ ہے جو میری پگڑی میں بندھا
ہے۔ اگر مارو گے تو میرا یہ روپیہ بھی گر جائے گا"
اب تو چوروں نے وہ روپیہ بھی اُن سے چھین لیا
اور ایک چور اس روپیہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ بدھو
نے کہا "دیکھتے کیا ہو، روپیہ خراب نہیں ہے۔
اگر یقین نہ ہو تو اس پوال کے ڈھیر میں لالہ جی
بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لو" —— بدھو کی بیوقوفی پر
چوروں کو بڑی ہنسی آئی اور سبھوں نے لالہ جی
کو پکڑ کر خوب پیٹا اور ان کی گٹھری کو لے کر چلتے
بنے —— چوروں کے جانے کے بعد لالہ جی اُسی
وقت سسرال کو اکیلے ہی یہ کہتے ہوئے چل
دئے کہ "نادان دوست دانا دشمن سے زیادہ
بُرا ہے"

(سید علیم الدین حالی)

"موت کا باعث"

ایک چھوٹی سی چڑیا کہیں سے ایک گوشت
کا ٹکڑا اپنی چونچ میں دبائے چلی جا رہی تھی۔
ایک بڑی چڑیا نے جو اُسے دیکھا تو وہ اس
گوشت کے ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لئے دوڑی
چھوٹی چڑیا بھاگی چلی جا رہی تھی اور بڑی چڑیا
اُسے اپنی چونچ سے مار رہی تھی آخر وہ چھوٹی

سی جان نڈھال ہو گئی اور زمین پر گر کر مر گئی۔ بڑی چڑیا نے اس گوشت کے ٹکڑے کو اٹھا لیا۔ اور اپنی چونچ میں دبا کر اڑ گئی۔ لیکن فوراً ایک کوّے کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے وہ ٹکڑا بڑی چڑیا سے چھیننے کے لئے اس پر حملہ کیا۔ کوّے کی مار کھا کر وہ چڑیا نیچے گری اور مر گئی۔ اب وہ ٹکڑا کوّے کے قبضہ میں تھا۔ وہ اس ٹکڑے کو لے اپنے گھونسلے کی طرف اڑا۔ ایک بھوکی چیل نے جو کوّے کو گوشت کا ٹکڑا لے جاتے دیکھا تو دل میں کہا میں تو بھوکی ہوں اور یہ گوشت کا ٹکڑا گھر لے جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ایک زور کا جھپٹّا مارا۔ کوّے اور چیل میں خوب لڑائی ہوئی۔ کوّا ہار گیا اور زمین پر گر کر مر گیا۔ اب وہ ٹکڑا چیل کے قبضہ میں تھا۔ ایک باز نے جو دیکھا کہ چیل گوشت کا ٹکڑا لئے جا رہا ہے تو اس نے بھی چیل پر حملہ کیا۔ اب باز اور چیل میں خوب لڑائی ہوئی۔ لیکن بھلا چیل کیا کھا کر باز کا مقابلہ کر سکتا۔

اتنے میں ایک زوردار آندھی آئی۔ باز کے منہ سے گوشت کا ٹکڑا چھوٹ گیا اور کہیں دور جا کر مٹی میں مل گیا۔

سب کے من کی بات

ہندوستان میں اکبر ہی ایک ایسا شہنشاہ گزرا ہے جو جتنا خود ہنستا تھا اتنا ہی دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دیتا تھا۔ ہر بیٹھک میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ڈالتا جو ہنسنے ہنسانے کے لئے کافی ہوتی۔ ایک مرتبہ دربار لگا تھا کہ اکبر نے پوچھا "یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو سب کے من کی بات بتا دے۔"

درباری اور دوسرے امراء حاضرین اس سوال سے حیرت میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سبھوں کے دل کی بات بتانا آسان کام نہ تھا اور اگر کسی کے بارے میں کچھ کہہ بھی دے تو وہ درباری اپنی اہمیت جتانے کیلئے جھٹلا دے گا۔

جب اکبر نے دیکھا کہ سب لوگ خاموش ہیں تو بیربل کی طرف رخ کیا اور بولے "کیوں بیربل کیا تم بھی نہیں بتا سکتے؟"

بیربل نے جواب دیا "ضرور بتا سکتا ہوں جناب"

"تو پھر خاموش کیوں ہو؟" اکبر نے پوچھا

"جہاں پناہ! میں یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے

علاوہ اور کوئی جواب بھی دے سکتا ہے یا نہیں؟"
بیربل نے مسکراتے ہوئے کہا۔
سارے درباریوں نے دل میں سوچا کہ آج بیربل دربار میں ضرور بے وقوف بنے گا۔ بیربل کی ذہانت اور حاضر جوابی نے دربار کے بیشتر لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ اتنے میں اکبر نے کہا "ہاں تو بیربل! بتاؤ سب سے من کی بات"
بیربل نے پوچھا "حضور تمام درباریوں کے من کی بات ایک ہی ساتھ بتا دوں یا الگ الگ ......"
اکبر نے جواب دیا "ایک ہی ساتھ بتاؤ"
بیربل نے کہا "یہاں بیٹھے ہوئے تمام درباری یہ سوچ رہے ہیں کہ جہاں پناہ اسی طرح سکھ چین سے راج کرتے رہیں تاکہ ہم لوگ بھی خوش رہیں۔ ان سبھوں کے من میں یہی ہے حضور، اگر یقین نہ ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لیا جائے، دوسرے درباری اب بیربل کا کہنا جھٹلا نہ سکے اور ہر طرف سے یہی آواز آئی "ہاں جہاں پناہ! میرے دل میں یہی بات ہے بیربل نے بالکل سچ کہا۔"

ارجمند بانو

"ایک مزیدار کہانی" ★

ایک مرتبہ ایک صاحب ہوٹل میں تشریف لے گئے اور ایک پیالی چائے کا آرڈر دیا۔ جب چائے کی پیالی سامنے آئی تو اس نے بیرے سے کہا کہ مجھے چائے نہیں چاہیئے۔ بلکہ اس کے بدلے قہوہ لاؤ قہوہ، چنانچہ اس کے آرڈر کے مطابق قہوہ لایا گیا۔ اس نے اس کو پیا اور بغیر دام ادا کئے ہوٹل سے باہر جانے لگے۔ ہوٹل کے بیرے نے ان کو روک کر دام مانگے۔ صاحب نے اس سے پوچھا کس چیز کے دام مانگتے ہو۔ بیرے نے جواب دیا "کیا آپ نے قہوہ نہیں پیا؟"
انھوں نے کہا "ہاں ضرور پیا ہے" لیکن میں نے آپ کو اس سے پہلے چائے نہیں دی تھی بیرے نے کہا "آپ نے چائے کے بھی تو پیسے ادا نہیں کئے" صاحب نے چڑھ کر کہا "میں نے چائے پی کہاں جو اس کے دام ادا کرتا"
اس گفتگو سے بے چارہ بیرہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ صاحب بڑے اطمینان سے منہ پونچھتے ہوئے باہر چلے گئے۔

عصمت نواز احمد انصاری

خالد صدیقی

کالا منھ

ہمارے نوکر رمضانی کی عادت تھی کہ وہ روزانہ دن چڑھے سو کر اٹھا کرتا تھا۔ جب سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی۔ چڑیاں چہچہانے لگتیں، سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تو ہمارے رمضانی میاں آنکھ کھولتے اور کہتے ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے، ابھی تو جھٹ پٹا ہے اتنی جلدی اٹھ کر کیا کروں گا؟ چلو ایک نیند اور لے لوں۔" یہ سوچ کر رمضانی پھر سو جاتے۔

جب گھر میں شور مچنے لگتا۔ باورچی خانہ سے دھواں چکر لگاتا ہوا اوپر اٹھتا تو نو بجتے تو رمضانی میاں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے۔ اور وہ بھی بڑی سستی کے ساتھ۔ سب لوگ رمضانی کی اِس عادت سے تنگ آگئے تھے

بچا س دفعہ کہا کہ بھئی ذرا جلدی اُٹھنے کی عادت ڈالو مگر وہ ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے اُڑا دیتے۔ اتنا کہنے سننے کے بعد بھی جب رمضانی کی عادت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو مجبور ہو کر میں نے ایک

ترکیب کی۔

ایک دن میں کچھ تڑکے تڑکے اٹھا اور رمضانی کے کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ رمضانی میاں مزے میں پڑے سو رہے ہیں میں نے ترکیب تو پہلے ہی سوچ رکھی تھی اس لئے میں جھٹ سے ناہید کے واٹر کلر کا نیا ڈبہ اٹھا لایا اور بڑے کالے رنگ سے رمضانی کا منہ خوب اچھی طرح پوتا۔ پھر سفید رنگ سے داڑھی مونچھ بنائی اور جب یہ سب کچھ کر چکا تو وہاں سے لوٹ آیا بالکل چپ چاپ آہستہ آہستہ۔ اور اُس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی رمضانی میاں جاگے میں نے اُس کو پیسے تھما دیئے۔ "رمضانی دیکھ ذرا لپک کر بازار سے بسکٹ تو لے آؤ، ناشتہ کے لئے سمجھے"؟ میں نے اُسے اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ منہ ہاتھ بھی دھوئے۔

جس کسی نے بھی بازار میں رمضانی کو دیکھا وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ لیکن رمضانی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج لوگ اُسے دیکھ دیکھ کر کیوں اس طرح ہنس رہے ہیں؟ وہ حیرت میں پڑ گیا۔ وہ پہلے والا رمضانی ہی تو ہے۔ لیکن رات بھر میں اُس کے اندر کیا تبدیلی ہو گئی جو لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کر رہی ہے۔

اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ اور وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک بالکل اس کے پاس ایک آدمی ٹھٹھا مار کر ہنستا ہوا آیا اور اپنے ساتھی سے کہنی مار کر بولا "ارے جلدی دیکھ چلتا پھرتا کارٹون چلا جا رہا ہے"۔ رمضانی کو دیکھ کر اُس کا ساتھی بھی قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔

رمضانی کا چہرہ غصہ سے لال انگارہ ہو گیا۔ لیکن وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ "ہند سائیکل ورکس" کے سامنے ایک دوسرے آدمی کو ہنستا ہوا دیکھ کر اُس سے نہ رہا گیا۔ وہ غصہ سے بولا۔ "آخر کیا بات ہے جو آپ مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں"۔ اُس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ رمضانی کو پکڑ کر سامنے والی پنواڑی کی دوکان میں آئینہ کے سامنے

چھوڑ دیا۔ جب رمضانی نے آئینہ میں اپنا کالا منہ دیکھا تو ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

گھر لوٹنے پر اس نے سب سے پوچھا کہ اس کا کس نے منہ کالا کیا ہے۔ مگر سب نے لاعلمی ظاہر کی، آخر میں رمضانی میرے پاس آیا اور بولا "بھیا! یہ شرارت آپ کی معلوم ہوتی ہے" میں بالکل انجان بن گیا اور بولا "بھئی مجھے بالکل معلوم نہیں کہ تمہارا کس نے منہ کالا کیا۔ ہاں میں نے کہانیوں میں یہ ضرور پڑھا ہے کہ جو آدمی صبح دیر تک سوتا رہتا ہے۔ پریاں اس کا منہ کالا کر دیتی ہیں۔ شاید تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو" اس حادثے کے بعد رمضانی بہت تڑکے اٹھنے لگا۔

مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں

روسی بچے پنڈت جواہرلال نہرو کے بھیجے ہوئے ہاتھی کے بچے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

انڈونیشیا کے نائب صدر ڈاکٹر محمد حتیٰ جامعہ میں

پیام تعلیم

فہرست

اگلا پرچہ

سالنامہ

پیام تعلیم کا اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا جس میں بچوں کی انعامی کہانیاں شائع ہوں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے مشہور ادیبوں کی کہانیاں اور مضامین سالنامے کی زینت ہوں گے

قیمت ایک روپیہ

ادارہ

حامد علی خاں بی اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم اے (علیگ)

آرٹسٹ

گلیڈون میسی

سالانہ چندہ چار روپے

فی پرچہ چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی

بچّوں سے باتیں

اس بار تعلیمی میلے کی تاریخیں یوں تو ۱۴ر ۱۵ر ۱۶ر اکتوبر رکھی گئی تھیں۔ لیکن بارش کی وجہ سے عین وقت پر تبدیلی کرنی پڑی۔ اور ہمارا میلہ ۲۸ر ۲۹ر ۳۰ر اکتوبر کو اسی شان سے ہوا۔

۲۸ر نومبر کی صبح کو ایران کے سفیر ہز اکسی لنسی جناب علی اصغر حکمت نے میلے کا افتتاح فرمایا۔ ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے حکمتؔ صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایران اور ہندوستان کے قدیم تعلقات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر مجیب کی تقریر کے بعد جناب علی اصغر حکمت نے فارسی میں ایک تقریر کی، جس کا ترجمہ اردو میں ساتھ ہی ساتھ کیا گیا۔

اس کے بعد جامعہ نرسری اسکول کا افتتاح ہوا اور بچے نرسری پارک میں کھیل کود میں لگ گئے۔

تمام دکانیں پہلے ہی سے سجائی جا چکی تھیں۔ اب میلے میں بھیڑ ہونی شروع ہو گئی۔

دوسرے وقت دہلی ریاست کے وزیر ترقیات چودھری برہم پرکاش صاحب نے

دیہاتی کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ اس کانفرنس میں ہمارے قرب وجوار کے کسانوں نے شرکت کی اور کچھ دیہاتی بھائیوں نے تقریریں بھی کیں

دلچسپ پروگراموں کا یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔ اس درمیان میں بچوں کی بیت بازی اور مشاعرہ ہوا جسے بچوں کے علاوہ بڑوں نے بھی دلچسپی سے سنا۔

بچوں کی موسیقی کے پروگرام کامیاب رہے اس میں دہلی کے مختلف اسکولوں اور انجمنوں نے حصہ لیا۔ فریدہ آباد کے نابینا بچوں کے گانے کے پروگرام کا کیا کہنا گانےمیں دہلی کے مختلف اسکولوں اور انجمنوں نے حصہ لیا۔ فریدہ آباد کے نابینا بچوں کے گانے کا پروگرام سبھوں نے پسند کیا۔ حاضرین نے اسے بڑے شوق سے سنا۔

بچوں کی کانفرنس تعلیمی میلے کی جان تھی اس کے بارے میں ہم نے آپ کے لئے خاص طور پر ایک مضمون لکھوایا ہے۔ جس سے کانفرنس کا منظر آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اپنے اپنے شہروں میں بچوں کی برادری قائم کریں اور اس کے ذریعہ بچوں کی کانفرنس کریں۔ اس کانفرنس کی کامیابی پر ہم بچوں کے علاوہ جناب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کو بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس بار تعلیمی میلے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر سال سے زیادہ ڈرامے پیش کئے گئے۔

مشیر فاطمہ صاحبہ نے "موسم بہار کی ایک شام" پیش کیا جو بے حد پسند کیا گیا اسٹیج پر ایک حسین فضا اور خوشنما منظر تھا۔

مدرسہ ابتدائی نے امسال دو ڈرامے پیش کئے۔ 'امن اور جنگ' اور 'صدقہ' یہ دونوں ڈرامے بچوں اور بڑوں نے بڑے ذوق و شوق سے دیکھے۔ "دیہی تھیٹر" تعلیم و ترقی کی جانب سے عبدالستار صدیقی نے "رائی کا پہاڑ" نام سے ایک سبق آموز ڈراما پیش کیا۔ جو بہت کامیاب رہا۔

مدرسہ ثانوی کا خاموش اداکاری کا مقابلہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھا تھا۔ اس سے لڑکوں میں اداکاری کی صلاحیت

کا اندازہ ہوتا تھا۔ بچوں نے اپنے لئے خود موضوعات چنے تھے۔ اور بغیر کسی مکالمے کے اپنی اداکاری سے اپنے کردار کو ظاہر کیا۔

مدرسہ ثانوی کا ڈراما "اخبار کا دفتر" بھی بہت کامیاب رہا۔ جامعہ کالج کے طلباء نے ایک مزاحیہ ڈراما "آنریری مجسٹریٹ" پیش کیا، جو بے حد پسند کیا گیا۔ میلے کا اختتام "حبّہ خاتون" کی نمائش پر ہوا۔ یہ ڈراما ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی نگرانی میں جامعہ ڈراما سوسائٹی نے پیش کیا۔ جو بحد پسند کیا گیا۔ ڈرامے کو دیکھنے کے لئے دہلی سے کافی آدمی آئے تھے۔

الغرض تین دن کے شور و شر اور دلچسپیوں کے بعد یہ دلچسپ میلہ ختم ہوا ہمیں امید ہے کہ آیندہ سال کا تعلیمی میلہ اور اچھا ہوگا۔

یہ سال اس لحاظ سے بہت اچھا رہا ہے کہ ہمارے دیس میں دوسرے ملکوں سے مہمان آئے اور برابر آرہے ہیں۔ ابھی اسی مہینے میں انڈونیشیا کے نائب وزیر اعظم ڈاکٹر محمد حتّیٰ، نیپال کے مہاراجہ اور مہارانی، اور روس کے ممتاز رہنما مارشل بلگانن اور خروشچیف تشریف لائے۔

انڈونیشیا کے نائب صدر ڈاکٹر محمد حتّیٰ صاحب ۱۶ر نومبر کو جامعہ بھی تشریف لائے۔ آپ نے ہماری جامعہ کے مدرسوں کو خاص طور پر دیکھا اور یہاں کچھ وقت گزارا جامعہ کے بچے ان کو دیکھ کر خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہے تھے وہ جدھر سے گزرتے اُن پر پھولوں کا مینھ برستا۔

ڈاکٹر محمد حتّیٰ صاحب نے جامعہ میں تقریباً ایک گھنٹہ گزارا۔

پیام تعلیم کا یہ شمارا اس سال کا آخری پرچہ ہے۔ اب اگلے مہینے میں ہم سالنامہ شائع کر رہے ہیں۔ اس میں انعامی مقابلے میں انعام پانے والی کہانیاں شائع کی جائیں

(باقی صلا پر)

ریوڑیاں

اک دن کوئی ننھے میاں — جب کھا رہے تھے ریوڑیاں
تھیں میٹھی میٹھی کُرکُری — چھوٹی تھیں کچھ اور کچھ بڑی
اتنے میں بس اِجّو میاں — جب کھیلنے آئے وہاں
اِجّو میاں کو دیکھ کے — ننھے میاں گھبرا گئے
اور ریواڑیاں کھانے لگے — کچھ جلدی جلدی پہلے سے
اور ہاتھ میں کچھ داب لیں — اور مُنہ میں بھی پھر کچھ بھریں
یہ دیکھتی آپا بھی تھیں — جو دیکھ کر ان کو ہنسیں
کہنے لگے ننھے میاں — اِجّو کو دے دو ریوڑیاں

کھاتے ہیں سب بچّے بھلے
آپس میں چیزیں بانٹ کے

خلیل محمودی

مشیر الحق بحری آبادی
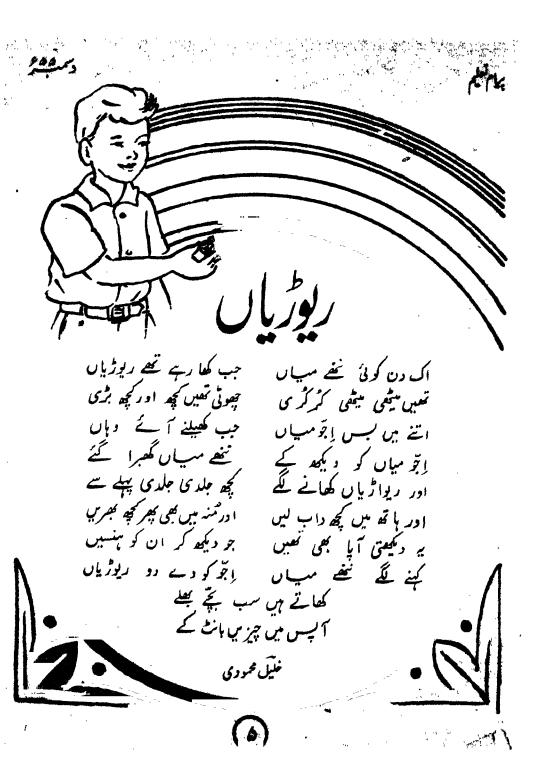
بچّوں کی کانفرنس

جامعہ کے تعلیمی میلے کا کسے انتظار نہیں تھا۔ اس لئے کہ یہی میلا ہے جہاں بچوں کی دلچسپی کی ساری چیزیں اکٹھا ہوتی ہیں۔ سال بھر میں ایک ہی بار تو یہ میلا لگتا ہے۔ اور اس بار تو اس کا اور بھی انتظار تھا، کیونکہ "بچوں کی کانفرنس" بھی ہونے والی تھی۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ۳ ½ بجتے بجتے کانفرنس کا پنڈال بھر گیا تھا۔ اگرچہ اس کا نام "بچّوں کی کانفرنس" تھا لیکن بڑے بھی بچوں کے ساتھ ساتھ کانفرنس کی کارروائی دیکھنے آئے تھے۔ سامنے ڈائس پر ریشمی پردہ پڑا تھا۔ پنڈال میں لوگ شوق اور حیرت سے پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے بہت سے لوگوں کے لئے یہ کانفرنس ایک نئی چیز تھی۔ کیونکہ بچوں نے شاید ابھی تک کہیں بھی کانفرنس نہ کی ہوگی! لوگ یہی سوچ رہے تھے کہ ہر وقت کھیلنے کودنے والے بچے اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ کس طرح اٹھا سکیں گے۔

ٹھیک ۳ ½ بجے پردہ اٹھ گیا۔ اسٹیج کو بہت خوبصورتی اور نفاست سے سجایا گیا تھا۔ بیچ میں ایک اونچے سے ڈائس

پر صدر کی کرسی تھی جو ابھی خالی تھی۔ صدر کے برابر سکرٹری کی کرسی تھی۔ ڈائس کے نیچے صدر کے داہنے اور بائیں ہاتھ کی طرف نصف دائرہ بناتے ہوئے کرسیوں کی ۴-۴ قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر نمائندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک منٹ کے بعد کانفرنس کے صدر سلمان متعلم مدرسہ ابتدائی، مجلس استقبالیہ کے ممبران کے ساتھ ڈائس پر آئے۔ نمایندوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ ایک بچی نے صدر کو ہار پہنایا۔ اس کے بعد تالیوں کی آواز میں کانفرنس شروع ہوئی۔

سب سے پہلے ہائر سکنڈری اسکول دہلی گیٹ کے ایک بچے سریندر کمار نے ایک گانا سنایا۔ اس کے بعد مجلس استقبالیہ کی سکریٹری شوکت بانو مانک کے سامنے آئیں اور انھوں نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھنا شروع کیا۔ پنڈال میں پہلے ہی سے والنٹیروں کے ذریعہ چھپا ہوا خطبہ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت تقسیم کرایا جا چکا تھا۔ اس لئے لوگ کبھی ننھی سی سکرٹری استقبالیہ کو دیکھتے اور کبھی اس کے خطبہ کو۔ جس میں اس نے آنے والوں کا شکریہ ادا کیا تھا، اپنی کوتاہیوں پر معذرت کی تھی اور اپنے بزرگوں سے گذارش کی تھی وہ گھر کے چھوٹے اور بڑے بچوں میں فرق نہ کریں۔ گھروں کی موجودہ حالت کا نقشہ شوکت بانو نے ان الفاظ میں کھینچا کہ "بچوں کیلئے قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ "وہاں کیوں گئے"؟ اس سے کیوں ملے؟ اتنی رات تک کیوں جاگتے رہے، غرض ایک بات ہو تو کہی جائے، بڑے بھائی جان بارہ بارہ اور ایک ایک بجے رات تک باہر دوستوں میں بیٹھ کر تاش کھیلیں تو کوئی کچھ نہ پوچھے اور ہم کچھ دیر تک کہانی سنیں یا قصہ پڑھیں تو فوراً حکم ہوتا ہے سو جاؤ"۔

لوگ ابھی اپنے گھروں کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ خطبہ کا وہ حصہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ فضا میں گونجنے لگا جس میں کہا گیا تھا کہ "کچھ لوگ اس دیس کی یا دنیا کی شانتی مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے

بڑے اپنے بس بھر کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا سے امن ختم نہ ہو پائے ہمیں بھی کوشش کرنی ہے کہ دنیا میں شانتی قائم رہے۔ لوگ بھی تعجب ہی کر رہے تھے کہ چھوٹے چھوٹے بچے کس طرح امن قائم کریں گے کہ شوکت بانو نے بتانا شروع کیا کہ امن کے لئے بنیادی چیز اتحاد ہے اتحاد بچوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ مل جل کر درجے میں پڑھیں اور چھٹی ملنے کے بعد مل جل کر ایک جگہ کھیلیں۔ کیونکہ جب ہم مل جل کر کھیلتے ہیں تو ہم میں مل جل کر کام کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کسی سے تکلیف پہنچ جاتی ہے تو اُسے معاف کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب تک ہم میں یہ شوق اور جذبہ پیدا نہ ہوگا اس وقت تک دنیا سے لڑائی جھگڑے کا خطرہ دور نہ ہوگا۔

جب خطبہ استقبالیہ ختم ہوا تو بچوں کی کانفرنس کے صدر عامر سلمان اپنا خطبہ سنانے کے لئے کھڑے ہوئے ان کے ساتھیوں نے انھیں صدر بناکر جو بھاری ذمہ داری انھیں سونپی تھی اس پر انھیں خوشی بھی تھی اور ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی۔ گھبراہٹ اس بات کی کہ کہیں دوستوں کی سونپی ہوئی ذمہ داری کو ٹھیک طرح انجام نہ دے سکیں۔ لیکن انہیں اپنے دوستوں پر پورا بھروسہ تھا کہ اگر لوگوں نے سچے دل سے ان کا ساتھ دیا تو ذمہ داری کا جو بوجھ ان کے کندھوں پر تھا اُسے وہ منزل تک آسانی سے پہنچا سکیں گے۔

اپنے خطبہ میں انہوں نے پچھلی کانفرنسوں کے کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے اس چوتھی کانفرنس کے کام پر کچھ روشنی ڈالی۔ ان کو اور اس کانفرنس کو خوشی تھی کہ پچھلی مرتبہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے جو مانگیں مانگی تھیں وہ بڑی حد تک پوری ہو گئی تھیں۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے" اسکولوں میں پرانے طریقہ تعلیم کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا" دنیا دن بدن ترقی کر رہی ہے لیکن اگر ترقی نہیں ہوئی تو بچوں کے تعلیم کے

ڈھنگ میں۔ ہم کو ابھی تک وہی طوطے مینا کی طرح کتابیں رٹنی پڑتی ہیں جس میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔" انھوں نے نئے طریقہ تعلیم کو اختیار کرنے کی رائے دی اور مثال دے کر سمجھاتے ہوئے کہا کہ "مثلاً ڈاک خانے پر اگر کوئی سبق ہونے والا ہے تو ڈاک خانے کے مضمون پر مختلف عنوان قائم کرکے کلاس کے لڑکوں کو ایک ایک عنوان دے دیا جائے پھر ان سے اس پر مضمون لکھوایا جائے۔ اس سے متعلق تصویریں جمع کرائی جائیں۔ اور اگر ہو سکے تو لڑکوں کو ڈاک خانے کا انتظام دکھایا جائے۔ اس طرح بچے جو کچھ سیکھیں گے وہ دلچسپی سے سیکھیں گے اور بہت دنوں تک یاد رکھیں گے۔"

پڑھنے کے بعد کھیلنا کودنا ضروری ہے شاید اسی لئے تعلیم پر بحث کرتے کرتے اچانک صدر صاحب چچا نہرو سے درخواست کرنے لگے کہ ریلوے سے بڑی چھٹیوں میں ان کے سیر سپاٹے کا وہ انتظام کرا دیں۔ اس طرح بچوں سے متعلق تعلیمی اور تفریحی باتوں پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے آخر میں حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جے ہند کہہ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بچے دو خطبے سنتے سنتے اکتا جائیں گے" شاید اسی لئے انتظامی کمیٹی نے صدر کے خطبہ کے بعد ایک نظم کا پروگرام رکھا تھا نظم سنانے کے لئے بچوں کی برادری شہر رام پور کے صدر زاہد حسین، مائک کے سامنے آئے اور انھوں نے ترنم کے ساتھ ایک نظم سنائی۔ ان کے بعد سکریٹری بچوں کی برادری توفیق الرحمان قدوائی پیغامات سنانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ پیغامات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کے بڑے بڑے لوگ اس کانفرنس کو صرف بچوں کا کھیل نہیں سمجھتے بلکہ اس کی اہمیت کو مانتے ہیں۔ سید محمود صاحب وزیر خارجہ ہندوستان نے جامعہ ملیّہ میں تعلیم پانے والے بچوں کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا تھا "میں امید کرتا ہوں کہ بچوں کی برادری ہر بچے کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں پوری طرح سے کامیاب ہوگی" کے ایل شریمالی

نائب وزیر تعلیم ہندوستان نے اپنے پیغام میں کہا تھا "بچے جو مفید تجربات بچپن میں حاصل کریں گے وہ آگے چل کر انھیں ایک اچھا شہری بنائیں گے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے لئے مفید اور اچھے موقع مہیا کریں"۔ اسی طرح ہمارے ملک کے بڑے بڑے لوگوں مثلاً شری گوبند بلبھ پنت وزیر داخلہ ہندوستان شری گورمکھ نہال سنگھ وزیر اعلیٰ ریاست دہلی اور ہندوستان سے باہر لوگوں مثلاً سفیر امریکہ، سفیر برطانیہ فرانس اور چین وغیرہ نے بچوں کی کانفرنس کے لئے پیغامات بھیجے۔ جس میں انھوں نے اس کانفرنس سے اپنی دلچسپی دکھائی تھی۔

پیغامات کے بعد تجویزوں کی باری تھی۔ چھ تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔ پہلی میں کہا گیا تھا کہ "بچوں کے لئے مدرسوں میں ہاتھ کے کام کے لئے زیادہ سے زیادہ انتظام کیا جائے۔ کیونکہ صرف کتابی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ہم تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف حرفوں کو بھی سیکھ لیں تو آیندہ زندگی میں ہمیں بہت سے فائدہ ہوں گے۔

موافقت کے بعد جب مخالفت کا نمبر آیا تو مخالف مقرر نے ہاتھ کے کام کے نقصانات بتانے شروع کئے کہ "اس طرح لڑکے بڑھئی لوہار ہوکر رہ جائیں گے۔ صرف کتابی تعلیم ہی اصل تعلیم ہے"۔ اسی طرح دوسری تجویز میں کہا گیا تھا کہ ہر اسکول میں بچوں کی ایک عدالت قائم کی جائے تاکہ جسمانی سزا دینے کا دستور ختم کیا جا سکے" اس تجویز کو پیش کرنے والا لڑکا یہ چاہتا تھا کہ ہمیں مارا پیٹا نہ جائے کیونکہ اس طرح ہمارے دل میں استادوں کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے، لڑکے میں ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے مگر مخالف کا خیال تھا کہ اسکولوں سے مار پیٹ نہ ختم ہونی چاہئے۔ کیونکہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق "ڈنڈا باجے دھم دھم ودیا (تعلیم) آئے چھم چھم" اس کے بعد ایک لڑکے نے آکر یہ تجویز پیش کی کہ "سبھی اسکولوں میں بچوں کے بیٹھنے کا اچھا انتظام ہونا چاہئے" کیونکہ خیموں اور درختوں کے نیچے موسم سے بچاؤ نہیں ہو پاتا جاڑے میں ٹھنڈی ہوا لگتی ہے۔ گرمی میں

ڈ کے تھپیڑے ستاتے ہیں اور برسات میں
بارش کے قطرے پریشان کرتے ہیں اس
لئے اسکولوں کے واسطے اچھی عمارتیں ہونی
چاہئیں۔ مخالف لڑکے کا کہنا یہ تھا کہ عمارتوں
سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندستان
کے کونے کونے میں تعلیم پھیل جائے۔ اگر ہم
اس وقت عمارتوں کے چکر میں پڑ جائیں گے
تو پھر تعلیم کو گھر گھر نہ پھیلا سکیں گے پھر
ایک بچے نے یہ تجویز رکھی کہ "ہر شہر میں بچوں
کے لئے ایک بال بھون ہو" اس بال بھون
میں ہر قسم کے تفریح کا سامان ہوگا۔ کھیل
کود کی جگہ ہوگی تجویز پیش کرکے جب بچہ بیٹھ
گیا تو ایک بچی نے اٹھ کر کہا کہ تجویز اچھی ہے
لیکن اس میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بھی ہونا
چاہئے۔ کیونکہ "بے چڑیا گھر کے بال بھون ایسا
معلوم ہوگا جیسے بے نمک کا آٹا"۔ بال بھون
بنوا لینے کے بعد ایک بچے نے تجویز پیش کی
کہ "ہر اسکول کو اپنے بچوں کے لئے دوسری
جگہوں کی سیر کا انتظام کرنا چاہئے تاکہ بچے
سیر کرکے اپنی معلومات بڑھا سکیں۔ اور
سفر کرکے تجربے بھی حاصل کر سکیں
اور حکومت کو اس سلسلے میں
اسکولوں کی مدد کرنی چاہئے"۔ کیونکہ سیر
سے تجربہ بڑھتا ہے۔ ہم جو کچھ اپنی کتابوں
میں پڑھتے ہیں اُسے اپنی آنکھوں سے
دیکھ کر زیادہ آسانی سے یاد رکھ سکتے ہیں
آخری تجویز میں یہ رائے دی گئی تھی کہ
"بچے اپنی ضرورتوں کو مل جُل کر پورا کرنے
کے لئے انجمنیں بنائیں دوکانیں اور بنک
قائم کریں" تجویز پیش کرنے والی بچی کا
یہ کہنا تھا کہ اسکولوں کے باہر خوانچہ لگانے
والے بہت گندے ہوتے ہیں ہم ان سے
اپنا پیسہ خرچ کرکے بیماریاں خریدتے ہیں
اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم اپنے اسکولوں میں
خود اپنی دوکانیں قائم کرلیں۔ اپنے بنک
قائم کرلیں تاکہ ہمیں روپیہ جمع کرنے اور
نکالنے کا طریقہ معلوم ہو اور پیسے کھونے نہ
پائیں لیکن مخالف لڑکے کا خیال تھا کہ یہ
تجویز پاس نہ ہونی چاہئے کیونکہ اسکولوں
میں دوکان کھول لینے سے چھوٹے دوکانداروں
کا کاروبار ختم ہو جائے گا۔ ان کے بچے لکھ
پڑھ نہ پائیں گے"۔

ان چھوٹے چھوٹے مقررین کو دیکھ کر اور ان کی تقریروں کو سن کر شاید بہت سے بڑوں کو رشک آ رہا ہوگا۔ سب سے دلچسپ بات تو یہ تھی کہ تقریروں کے بعد جب رائے شماری کا وقت آتا تو کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ یہ بچے بھی اپنے بہت سے بڑوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں کہ جدھر ایک شخص نے ہاتھ اٹھایا ادھر سب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رائے دیتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھتے ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کیا بات منظور یا نامنظور کر رہے ہیں۔ کبھی وہ مقرر کی جادو بیانی میں کھو جاتے تھے تو کبھی اس کے دلائل میں گم ہو جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے کچھ تجویزوں کو پاس کیا اور کچھ کو رد کر دیا۔

تجویزوں کے بعد بچوں کا پارک دریا گنج کے بچوں نے ایک ترانہ سنایا۔ اور پھر سکریٹری نے اٹھ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ "رسمی طور سے ہماری کارروائی ختم ہوگئی لیکن آپ کی تفریح کے لئے ہم آپ کے سامنے ایک چھوٹا سا ڈراما پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہم اسٹیج کا انتظام درست کرتے ہیں آپ بچوں سے دو ایک گانے سنئے۔

اسٹیج کا پردہ گرا دیا گیا۔ مائک پردہ کے باہر رکھ دیا گیا۔ ایک پارٹی نے اپنے تفریحی گانوں سے مجمع کو اُس گذرتے ہوئے وقت کا احساس کبھی نہ ہونے دیا جو اسٹیج کو ڈرامے کے لائق بنانے میں لگا۔

تھوڑی دیر بعد پردہ اٹھا دیا گیا اور لوگوں نے ایک مختصر سا ڈراما دیکھا جو صحت کے موضوع پر تھا۔

ڈرامے کے بعد کانفرنس کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہر شخص کانفرنس کی کارروائی سے متاثر تھا۔ بہت سے لوگوں کے لئے بچوں کی یہ کانفرنس بالکل نئی چیز تھی شروع میں جب وہ شریک ہوئے تھے تو انہیں احساس نہیں تھا کہ وہ اتنا عمدہ پروگرام دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہ اسے بچوں کا ایک کھیل سمجھ کر آئے تھے لیکن اب وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہوں نے اِس "کھیل" کو نہ دیکھا ہوتا تو ایک بہت اچھے پروگرام سے محروم رہ جاتے۔

محمود پرویز کاکوی

چوکیدار

پچھم سے پورب کافی دور تک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ پہاڑی کے نیچے گھنا جنگل تھا۔ جس میں طرح طرح کے جانور پائے جاتے تھے۔ پہاڑی کے ڈھلوان پر ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ اس بستی کے رہنے والے زیادہ تر پہاڑی باشندے تھے، جو جنگل میں آنے والے شکاریوں کا سامان ڈھوتے، ان کی خدمت کرتے، جب وہ جانے لگتے تو ان کا سامان واپس اسٹیشن پہنچا دیتے، جو یہاں سے پورے چار میل دور تھا۔ اس طرح وہ اپنی گزر کر لیتے۔ اس کے علاوہ جنگل سے لکڑیوں کا گٹھر سر پر اُٹھائے دور دور کے گاؤں بیچ آتے۔

پہاڑی پر بسی ہوئی اس چھوٹی سی بستی میں ایک معمولی سا ہوٹل بھی تھا جس کا مالک اپنی چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے بالکل چینیوں جیسا تھا۔ ایک دو پُرانی میزوں اور چند معمولی کرسیوں کے علاوہ یہاں کوئی اور فرنیچر نہ تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں ہوٹل کے علاوہ ایک معمولی سا ڈاک بنگلہ بھی پہاڑی کے ٹھیک نیچے تھا۔ جنگل میں شکار کھیلنے

کے لئے جو لوگ دور دراز مقاموں سے آتے وہ اسی ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا کرتے ۔ہوٹل کی بہ نسبت یہ قرینے کا تھا۔ فرنیچر بھی اچھے اچھے تھے ۔ اس ڈاک بنگلہ کی دیکھ بھال کے لئے ڈراؤنی آنکھوں اور کڑی مونچھوں والا ایک چوکیدار مقرّر تھا۔

لیکن اس بستی میں ڈاک بنگلہ سے متعلق ایک عجیب روایت مشہور تھی۔وہ یہ کہ جب بھی کوئی شکاری رات میں یہاں ٹھہرتا، دوسرے دن صبح کو وہ مردہ پایا جاتا۔ پہاڑی لوگوں کا کہنا تھا کہ اس ڈاک بنگلہ میں بھوتوں کا اڈّا ہے ۔بھوتوں کی خوفناک شکل دیکھ کر ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہوگا۔

ہوٹل کے چپٹی ناک والے مالک نے اس روایت سے کافی فائدہ اٹھایا۔اکثر وہ آئے ہوئے شکاریوں کے درمیان ڈاک بنگلہ کے بھوتوں کا پروپیگنڈا کر دیتا اور جو شکاری کمزور دل کے واقع ہوتے، ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنے کی بجائے ہوٹل میں رات بسر کرتے اور اس طرح ہوٹل کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ۔

ایک مرتبہ ایک انگریز شکار کھیلنے کے لئے آیا۔ ہوٹل کے مالک نے اسے منع کیا اور کہا کہ" آپ ڈاک بنگلہ میں نہ ٹھہریئے۔ اس میں بھوتوں کا اڈّا ہے ۔اس لئے جو شکاری بھی وہاں ٹھہرتا ہے، خود موت کا شکار ہو جاتا ہے ۔" مگر اس انگریز نے ہوٹل کے چپٹی ناک والے مالک کی بات کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ یہ بڑا بہادر اور نڈر انسان تھا۔ بھوت پریت کا بالکل قائل نہ تھا۔ چنانچہ چوکیدار سے کہہ دیا کہ وہ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے گا اور اپنا سامان ایک کمرے میں رکھوا دیا ۔

شام کو جب شکار کھیلنے کے بعد وہ ڈاک بنگلہ میں واپس آیا۔ چونکہ وہ بہت تھک گیا تھا، اسی لئے رات میں سویرے ہی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا ۔اس نے اندر سے دروازے بند کر دیئے ۔صرف باغیچہ کی طرف کی کھڑکی کھلی رکھی تاکہ ٹھنڈی ہوا آتی رہے۔ اور اس نے احتیاطاً اپنا ریوالور تکیہ کے

نیچے رکھ لیا۔ اور سو گیا۔

آدھی رات گزرنے پر "دھم" سے کوئی آواز آئی۔ انگریز کی آنکھ کھل گئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے جونہی کھڑکی کی طرف دیکھا، اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ـــــ ایک ڈراؤنی شکل کھڑکی سے کود کر فرش پر آگئی تھی۔ عجیب بھیانک چہرہ، لانبی لانبی انگلیاں اور ان میں دو دو انچ کے ناخن!ـــ سارا بدن بالکل سیاہ کوئلا جیسا ـــــ اور آہستہ آہستہ وہ شکل اس کے پلنگ کے پاس آنے لگی۔ انگریز نے مارے دہشت کے آنکھیں بند کرلیں مگر اس نے محسوس کیا کہ..... وہ شکل اس کے پاس آئی اس پر جھکی، اس کے سینے پر کچھ دیر تک ہاتھ رکھا۔ پھر آہستہ آہستہ لوٹنے لگی۔ جب اس کے پیروں کی چاپ دور ہوتی سنائی دی تو انگریز نے ہمت کرکے آدھی آنکھیں کھولیں۔ اس نے دیکھا، پیچھے ہٹ کر چند قدم کے فاصلے پر وہ خوفناک شکل اس کے لٹکے ہوئے کوٹ کے پاس رکی۔ پھر تیزی سے اس کا ہاتھ جیب کے اندر پہنچا۔

معاً انگریز کے دماغ میں یہ خیال آیا۔ بھوت کا میری جیب سے کیا کام؟

اور فوراً ہی اس کا ڈر جاتا رہا۔ اس نے تیزی سے ریوالور نکالا اور فائر کر دیا۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور سارا کمرہ لرز اٹھا۔

گولی کی آواز اور چیخ سن کر قریب کے پہاڑی باشندے دوڑے ہوئے آئے۔ انگریز خبیث شکل پر جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ چہرہ پر جھلی چپکی ہوئی ہے۔ اس نے جھلی نوچ لی ـــ جھلی کے الگ ہونے پر اصلی شکل جونمودار ہوئی تو اسے دیکھتے ہی پہاڑی باشندوں کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ان کے سامنے ڈاک بنگلہ کا چوکیدار بھوت کی شکل میں مرا پڑا تھا۔

صفیہ سلطانہ

جاڑے کے چند پھول

دُنیا میں بہت سے پھول ایسے ہیں جو اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں لیکن ان میں خوشبو زرا سی بھی نہیں ہوتی۔ دوسری طرف آپ کو ایسے پھول بھی ملیں گے جو بڑے خوشبودار ہوتے ہیں لیکن دیکھنے میں زیادہ خوبصورت نہیں ہوتے لیکن کچھ پھول ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جیسے ظاہر ویسا باطن۔

یہاں میں چند پھولوں کے بارے میں لکھوں گی۔ جو غیر ملک سے یہاں لائے گئے ہیں جن میں یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

ڈھلیا :۔ یہ پھول بے حد حسین ہوتا ہے۔ اس میں خوشبو نہیں ہوتی لیکن اپنی خوب صورتی کی وجہ سے باغوں کی زینت ہوتا ہے۔ آلو کی طرح ڈھلیا کا اصلی وطن بھی میکسیکو ہے۔ جہاں سے وہ پہلے سوئیڈن اور پھر فرانس لایا گیا۔ اس کے بعد دنیا کے دوسرے ممالک میں پہنچا۔ ہندوستان میں بمبئی اور دکن کے ڈھلیا خاص طور پر مشہور ہیں۔ جب اس کا پودا سوکھ جاتا ہے تو اس کی جڑ کی گانٹھ کو زمین میں دبا کر رکھا جاتا ہے۔ جس سے پھر نیا پودا

پھوٹ نکلتا ہے۔ بیجوں سے بھی پودا اُگاتے ہیں۔ اُس کے بیج میدانوں میں اکتوبر اور پہاڑی علاقوں میں مارچ میں بوئے جاتے ہیں لیکن عموماً گانٹھ ہی سے نیا پودا اُگاتے ہیں اس کے لئے مٹی کسی قدر ریت ملی ہوئی ہونی چاہئے۔

پھول کے مختلف رنگ ہوتے ہیں مثلاً لال، پیلا، کاسنی، نارنجی، وغیرہ۔ اس کی پنکھڑیاں لمبی نوکدار ہوتی ہیں۔ یہ گملوں اور کیاریوں دونوں میں بویا جا سکتا ہے۔ گلدان میں سجانے پر بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔

ایسٹر:۔ اس پھول کا اصل وطن چین ہے۔ یہیں سے یہ دوسرے ملکوں میں گیا۔ ہندستان میں اس کے پھول زیادہ بڑے نہیں ہوتے لیکن یورپ اور جاپان والوں نے مختلف طریقوں سے نہایت بڑے پھول اُگانے شروع کئے۔ جو اس سے زیادہ بڑے ہونے لگے۔ یہ پھول مختلف رنگ کے ہوتے ہیں سفید، ارغوانی، آسمانی، قرمزی، پیلا، گلابی، وغیرہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ اس کے بیج شروع جاڑوں میں بونے چاہئیں۔ ایسٹر کا پھول کئی قسم کا ہوتا ہے۔ بعض پھول اکہرے اور بعض دوہرے ہوتے ہیں۔ اس کو گملوں میں بھی بویا جاتا ہے۔ لیکن روش کے کنارے اور کیاریوں میں تو یہ بس بہار ہی دیتے ہیں۔ اس کا پھول توڑنے کے بعد کئی دنوں تک پانی میں رہتا ہے اور مُرجھاتا نہیں۔

کارنیشن:۔ کارنیشن بہت ہی خوبصورت پھول ہے۔ اس میں ساتھ ہی لونگ کی طرح کی خوشبو ہوتی ہے۔ اگرچہ میدانوں میں بھی اُگتا ہے مگر ہے یہ پہاڑی اور سرد علاقوں کے لئے۔ اس کے بیج سردی کے موسم میں بونے چاہئیں۔ لیکن اس کے لئے مٹی کے ساتھ سڑے ہوئے پتوں اور گائے کے گوبر کی کھاد کی بھی ضرورت ہے۔

کارنیشن کا پودا تقریباً دو فٹ اونچا ہوتا ہے۔ اس میں بعض سدا بہار قسم کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کا رنگ بڑا خوشنما ہوتا ہے۔ اور گلدانوں میں لگا دیجئے تو کمرا کھِل جاتا ہے۔

ڈیانتھس:۔ یہ پودا یورپ میں تو

بہت دنوں چلتا ہے لیکن یہاں ہر سال بونا پڑتا ہے۔ اس کا پودا ایک فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اور پھول اکہرے، دوہرے، دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ رنگ بھی کئی ہوتے ہیں جیسے سفید، اودا، قرمزی، گلابی اس میں طرح طرح کی دھاریاں اور دھبے پڑے ہوتے ہیں اس کی کئی قسمیں ہیں۔ سب میں خوشبو نہیں ہوتی۔ چند میں ہلکی ہلکی بُو ہوتی ہے۔ ڈیانتھس کے علاوہ اس کو "پنک" بھی کہتے ہیں۔ اس کے بیج بھی سردی میں بوئے جاتے ہیں، لیکن اس کو برسات سے بچانا ضروری ہے۔ یہ بہت آسانی سے اُگ آتا ہے۔

پٹونیا:۔ پٹونیا بھی ایک خوب صورت پھول ہے۔ جس سے چمن کی بہار ہوتی ہے یہ پھول اکہرے اور دُہرے ہوتے ہیں، دہرا پھول زیادہ حسین ہوتا ہے۔ اکہرے پھول سفید، گلابی اور قرمزی رنگوں کے اور دہرے بنفشئی، سفید، اودے، دھاری دار، گلابی، قرمزی وغیرہ ہوتے ہیں۔ پھولوں میں ہلکی سی بُو ہوتی ہے۔

اس کے بیج بہت باریک ہوتے ہیں۔ اس لئے ریت میں ملا کر بونا چاہئے۔ یہ پودے بھی بہت آسانی سے اُگتے ہیں اکہرے پھول کے پودے زمین میں بھی بوئے جا سکتے ہیں مگر دوہرے پھولوں کے پودوں کو گملوں میں بونا چاہئے۔ پہلے اس کو سائے میں رکھا جاتا ہے پھر رفتہ رفتہ سورج کی روشنی میں لاتے ہیں۔ آپ جب یہ پودا اُگائیں گے تو یقین ہے اس کے پھولوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

سویٹ پی:۔ موسم سرما کا یہ پھول باغوں کی خوب صورتی کے لئے اپنا جواب آپ ہے۔ اس میں میٹھی میٹھی خوشبو ہوتی ہے۔ پھول سفید، آسمانی، اودے اور گلابی کئی رنگ کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے اور بڑے دو قسم کے پھول ہوتے ہیں۔ بڑے پھول ہندوستان میں پہاڑی مقامات میں بوئے جا سکتے ہیں۔ لیکن چھوٹے میدانوں میں بھی اُگا سکتے ہیں۔

سویٹ پی کی بیل ہوتی ہے۔ جب پودے ایک فٹ کے ہوتے ہیں اور پھول بڑی بہار دکھلاتے ہیں۔

زبیدہ رعنا

اب پچھتائے کیا ہوت

بہت دنوں کی بات ہے ۔ کہتے ہیں کسی شہر میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ ویسے تو یہ بہت نیک تھی ۔مگر تھی بہت کنجوس ۔ اپنی تمام عمر کسی کو ایک پائی خیرات نہیں دی وہ جب بہت بوڑھی ہو گئی تو اللہ میاں نے ایک فرشتہ سے کہا" اس بڑھیا کے مرنے کے دن بہت قریب آگئے ہیں مگر اس نے کبھی کسی کو کچھ دیا نہیں ۔ اس لئے کل صبح چڑیا بن کر تم اس کے گھر جانا اور کسی نہ کسی طرح جب وہ چاول دھونے کے لئے رکھے تو کچھ دانے کھا کر سیدھے یہاں آجانا ۔

"پروردگار عالم! بڑھیا بہت کنجوس ہے وہ تو اپنے گھر میں کسی پرندے تک کو آنے نہیں دیتی ۔ فرشتے نے سر جھکا کر کہا۔

لیکن خداوند عالم کا حکم سر آنکھوں پر کل صبح ضرور جاؤں گا اور کچھ نہ کچھ لانے کی کوشش کروں گا" فرشتے نے نہایت ادب سے کہا ۔

بڑھیا روزانہ صبح کھچڑی پکایا کرتی تھی۔ اگلے دن صبح ہی صبح فرشتے نے کوے کا روپ دھارا ۔ اور بڑھیا کے گھر کی منڈیر پر آ بیٹھا ۔ اس وقت بڑھیا چاول دھوکر

دال لینے جا رہی تھی کہ کوّے کی آواز سُن کر اس کو اُڑانے لگی۔ کوّا اُڑ جاتا اور پھر آ بیٹھتا بڑھیا تنگ آ گئی اور آخر چاول کی لگن اُٹھا دال لینے چلی گئی۔ کوّے نے سوچا۔ بڑھیا بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جب بڑھیا دال لے کر آئی۔ اور اس نے چاول میں دال ملا کر لگن میں پانی ڈال دیا اور چاول دھو چکی، تو کوّے نے سوچا کہ اب تو یہ چلی اور پھر کہاں موقع ملے گا۔ اس لئے وہ اڑ کر لگن پر آ بیٹھا اور اس نے جلدی جلدی برتن میں چونچ مار کر کچھ چاول کھا لئے۔ بڑھیا یہ دیکھ کر بہت غضبناک ہوئی اور اس نے جھپٹ کر کوّے کو پکڑ لیا۔ بڑھیا نے کوّے کو اپنے ایک ہاتھ میں پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی چونچ کھولی اور اُسے برتن میں جھٹکنا شروع کیا۔ کچھ دانے برتن میں گر گئے۔ بڑھیا اس پر بھی خاموش نہ ہوئی۔ اب کوّے کے حلق میں تھوڑا پانی ڈال کر ہلایا اور پھر برتن میں انڈیل لیا۔ اور کوّے کو چھوڑ دیا۔ کوّا اُڑتا ہوا آسمان پر چلا گیا۔ اللہ میاں اور دوسرے فرشتے اس کے انتظار میں تھے۔ جیسے ہی کوّا پہنچا۔ اللہ میاں نے کہا کہ جو کچھ تمہارے مُنہ میں ہے اگل دو۔

کوّے نے جو اُگلا تو چند مونگ کے چھلکوں کے سوا کچھ بھی نہ نکلا۔ اللہ میاں نے فرمایا۔ اس بڑھیا کی قسمت میں ہم نے ہر ممکن کوشش کی۔"

چند دنوں بعد بڑھیا کا انتقال ہو گیا۔ اس کو اپنے دوسرے اچھے کاموں کے بدلے اللہ میاں نے جنّت میں پہنچا دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی مگر وہ روزانہ شام کو دیکھتی کہ ہر شخص اپنے اپنے باغ سے پھل توڑ کر کھاتا ہے۔ لیکن اس کو کچھ نہیں ملتا۔ آخر ایک دن اس نے خدا سے شکایت کی کہ "اے پروردگار! مجھے آج تک کبھی کوئی پھل نہیں ملا؟"

اللہ میاں نے ایک فرشتے کو حکم دیا "جاؤ اس بڑھیا کو اس کے باغ میں چھوڑ دو۔" بڑھیا یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اور فرشتہ کے ساتھ اپنے باغ

میں آئی - وہاں اس نے دیکھا کہ مونگ کا کھیت لہلہا رہا ہے - فرشتہ تو باغ بتلا کر چلا گیا اور بڑھیا خوش خوش مونگ کی پھلیاں توڑ کر دامن میں جمع کرنے لگی -
جب بہت سی پھلیاں جمع ہوگئیں تو وہ ایک جگہ بیٹھ گئی اور پھلیوں کو چھیل چھیل کر دیکھنے لگی - وہ جس پھلی کو چیرتی اس میں صرف چھلکے ہی نکلتے - اسی طرح اس نے پوری پھلیاں چھیل ڈالیں لیکن کسی میں سے ایک دانہ بھی نہ نکلا - بڑھیا یہ دیکھ کر بہت روئی -

اللہ تعالیٰ نے کہا " تو نے زندگی میں کوئی خیرات نہیں کی - تجھے یاد ہوگا کہ ایک دن ایک کوا تیری منڈیر پر آ بیٹھا تھا - اور اس نے برتن سے چند دانے کھا لئے - اور تو نے اس کو پکڑ کر اس کے منہ میں پانی ڈالا اور ان دانوں کو بھی نکال لیا - جب کوا یہاں واپس آیا تو ہم نے اس کے پیٹ میں سے وہ سب کچھ اگلوا لیا جو کہ اس نے کھایا تھا مگر اس میں سے سوائے چند چھلکوں کے کچھ بھی نہ نکلا - اور جو نکلا اس کا یہ کھیت اُگ آیا - دیکھ یہی تیرا پھل ہے - اگر تو دوسروں کو خیرات کرتی تو تجھ کو بھی اوروں کی طرح اچھے اچھے پھل ملتے "

اب تو بڑھیا بہت پچھتائی لیکن اب کیا ہوتا ہے ؛

بقیہ بچّوں سے باتیں

ہیں - اس کے علاوہ بچّوں کے مشہور ادیبوں کی کہانیاں، اور نظمیں بھی سالنامے کے حسن کو دو بالا کریں گی - اس کے لئے ہم بڑی اچھی اچھی تصویریں اکٹھا کر رہے ہیں - اگر آپ اپنا سالنامہ پچھلے سال کی طرح محفوظ طریقہ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو چھ آنے کے ٹکٹ بھیج دیجئے تاکہ یہ سالنامہ آپ کو رجسٹری سے بھیجا جا سکے -

جو بچّے ابھی پیام تعلیم کے خریدار نہیں بنے ہیں وہ سالنامہ مفت حاصل کرنے کے لئے ابھی سے اس کے خریدار بن جائیں ؛

اے، ع، انصاری

کالیداس کی عقل مندی

ایک بار راجا بھوج کے دربار میں چار نوجوان لڑکیاں حاضر ہوئیں۔ ان چاروں کے ناک نقشے، رنگ اور عمر میں ذرا بہت فرق تھا۔ لیکن ان کا قد، لباس طور طریقہ اور بناؤ سنگار بالکل ملتا جلتا تھا۔ راجا اور اُس کے درباری ان چاروں لڑکیوں کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ راجا نے اُن سے دربار میں آنے کا مقصد پوچھا۔ اُن لڑکیوں میں سے ایک نے کہا ــــ "ہم چاروں بچپن ہی میں کاشی چلے گئے تھے۔ وہاں جا کر ہم نے پڑھنا لکھنا شروع کر دیا۔ اب ہم سارے علم اور فن میں مہارت حاصل کر کے اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔ آپ کے دربار میں اس لئے آئے، کہ دیکھیں آپ کے عالم ہم سے زیادہ جانتے ہیں، یا ہم اُن سے۔ ہماری بہت سی چیزیں بالکل ملتی جلتی ہیں۔ دیکھنے میں بھی کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ لیکن در اصل ہم چاروں کی ذات الگ الگ ہے۔

کیا آپ کے دربار کے عالم بتا سکتے ہیں کہ کون لڑکی کس ذات سے تعلق رکھتی ہے ؟

راجہ بھوج نے اپنے دربار میں بیٹھے عالموں کی طرف دیکھا۔ سب کے سب گم سم بیٹھے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ٹیڑھے سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے ؟ یہ کیسے معلوم ہو کہ ان میں کون کس ذات سے تعلق رکھتی ہے ؟

دربار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ عالموں کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس لئے کہ راجا جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ جب کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اُس نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر ان سے کہا ——" اگر آپ لوگ ہمارے یہاں مہمان ہونا منظور کریں، تو تیسرے دن تک ہمارے عالم آپ کے سوال کا جواب دے سکیں گے "

لڑکیوں نے خوشی خوشی راجا کی بات مان لی۔ وہ روز دربار میں حاضر ہوتیں اور راجا کے درباری عالموں سے بحث مباحثہ کرتیں۔ اُن کی قابلیت اور عقلمندی دیکھ کر دربار کے سارے عالم دنگ رہ گئے۔ لیکن پھر بھی ان کی ذات کا پتہ نہ چل سکا۔ یہاں تک کہ تیسرا دن بھی ختم ہو گیا۔

راجا بھوج کے دربار کے عالموں میں سنسکرت زبان کے نامور اور بے مثال عالم اور شاعر کالی داس بھی تھے۔ ان کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی، وہ رات کو کمبل اوڑھ کر اُس مکان کے باہر والے چبوترے پر جا سوئے، جس میں راجا کی طرف سے چاروں لڑکیاں ٹھہرائی گئی تھیں۔

چوتھے دن سویرا ہوا۔ چاروں لڑکیاں جاگ اٹھیں اور آکر اُس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئیں، جس کے نیچے چبوترے پر کسی راہ چلتے مسافر کی طرح کمبل اوڑھے ابھی تک کالی داس پڑے تھے۔

پورب میں سورج کو نکلتے دیکھ کر اُن لڑکیوں میں سے ایک لڑکی

نے مشرق کی طرف نظر اُٹھائی اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"پورب کی طرف آسمان سونا ملے ہوئے پارے کی طرح پھیلا پڑ گیا ہے"۔

ایک اور لڑکی بولی "بے وقوفوں کی محفل میں چاند شرمندہ ہو رہا ہے"۔

تیسری نے کہا "کاہل راجاؤں کی طرح ستارے آسمان میں چھپ گئے ہیں"۔

چوتھی لڑکی بول اٹھی "غریب گھر گرہستی والوں کی طرح چراغ کی روشنی پھیکی پڑ گئی ہے"۔

اب کالی داس کمبل اوڑھے اس طرح اُٹھ کھڑے ہوئے کہ ان لڑکیوں میں سے کوئی انھیں دیکھ کر پہچان نہ لے۔ ان کا یہاں سونے کا مقصد اب پورا ہو چکا تھا۔ وہ خوشی خوشی گھر پہنچے اور دربار میں جانے کی تیاری کرنے لگے۔

اس دن دربار میں راجا بھوج نے چاروں لڑکیوں کے سامنے اپنے درباری عالموں سے کہا "یہ چار عالم لڑکیاں تین دن سے ہمارے یہاں مہمان ہیں۔ ان کی ذات کے پتہ چلانے کی ذمّہ داری آپ سب پر تھی۔ آج وعدے کے مطابق آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے تو بتائیے۔ نہیں تو آپ لوگوں کو ہار ماننی پڑے گی ——"

کالی داس کے سوا سارے عالموں کے چہروں پر آج پھر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دربار میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن یہ سناٹا چند لمحوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ کالی داس اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے کہا "مہاراج میں ان لڑکیوں کے سوال کا جواب دوں گا۔ اگر اجازت ہو، تو عرض کروں"

راجا کا اُداس چہرہ کھل اٹھا اور انھوں نے کہا —— "ضرور عرض کرو! ہماری طرف سے اجازت ہے"۔

کالی داس نے کہنا شروع کیا ——

"ہماری ان چاروں مہمان لڑکیوں نے، آج صبح سورج کو نکلتے دیکھ کر ایک ایک اشلوک بنا کر کہا۔ وہ اشلوک یہ ہیں۔

پہلا — پورب کی سمت آسمان سونا جلے ہوئے پارے کی طرح پھیلا پڑ گیا ہے۔ دوسرا — بے وقوفوں کی محفل میں چاند شرمندہ ہو رہا ہے۔ تیسرا — کاہل راجاؤں کی طرح ستارے آسمان میں چھپ گئے ہیں چوتھا — غریب گھر گرہستی والوں کی طرح چراغ کی روشنی پھیکی پڑ گئی ہے
پہلا اشلوک کہنے والی لڑکی 'سنار' دوسرا کہنے والی 'برہمن' تیسرا کہنے والی 'چھتری' اور چوتھا کہنے والی ویش (یعنی بنیا) ذات سے تعلق رکھتی ہے۔"

راجا نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ لڑکیوں نے ہاتھ جوڑ کر کالی داس کو سلام کیا اور کہا کہ اُن کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے

سارے دربار میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ راجا نے ان چاروں لڑکیوں کی قابلیت اور عقلمندی کی بھی تعریف کی اور انھیں بہت سا انعام و اکرام دے کر نہایت عزت اور احترام کے ساتھ اپنے دربار سے رخصت کیا۔

دنیا کی سب سے چھوٹی لغت

دلّی میں جناب بلراج مونگا ایک فوٹوگرافر ہیں - ان کے پاس ایک ننھی منی سی کتاب ہے - یہ انگریزی کی ایک لغت ہے جو دنیا کی سب سے چھوٹی لغت ہے - ۲،۸ سنٹی میٹر لمبی اور ۱،۹ سنٹی میٹر چوڑی ہے اور اس کی موٹائی ۹ ملی میٹر ہے - اس میں ۱۲۰۰۰ انگریزی کے الفاظ ہیں اور کل ملاکر ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے ؞

اس کتاب پر چھپنے کی تاریخ نہیں لکھی لیکن بلراج مونگا صاحب کا کہنا ہے کہ یہ کتاب سو سال پرانی ہے اور ان کے خاندان میں نسلاً بعد نسلاً چلی آرہی ہے - کتاب اتنی چھوٹی ہے کہ اس کے الفاظ خوردبین سے ہی نظر آسکتے ہیں -

اس کتاب کے ٹائٹل کے سامنے ڈاکٹر جانسن کی تصویر ہے جنہوں نے پہلی انگریزی کی لغت تیار کی تھی -

اس لغت میں شروع میں ایک پیش لفظ بھی ہے جو ۲۰۰ الفاظ پر ہے - کتاب لغت کے اعتبار سے بھی اچھی ہے - اس میں سائنسی الفاظ اور اصطلاحات بھی ہیں - اس کو برطانیہ میں گلاسکو کے ایک پبلشر ڈیوڈ برائس نے چھاپا تھا ؞

فریدہ سلطانہ

آنکھ مچولی

باجی، اپیا اور میں تینوں کمرے میں بیٹھے بڑے اطمینان سے مونگ پھلیاں کھا رہے تھے کہ باہر سے بھائی جان کی آواز آئی "زرا سنو بھئی عطیہ" اور پھر وہ خود بھی اندر آگئے "کیا ہو رہا ہے ؟ زرا سا ہمارا بھی کام کر دو" "ضرور بھائی جان، کہئے" باجی ایک دم کمر باندھ کھڑی ہو گئیں۔

"نہیں نہیں اتنی جلدی نہیں۔ بات یہ ہے کہ آج عارف کی بیوی آئیں گی۔

"عارف بھائی کی انگریز بیوی !" میں نے زرا تعجب سے پوچھا۔ عارف بھائی کو تو ہم لوگ سب اچھی طرح جانتے تھے مگر ان کی بیوی سے ابھی تک ہم میں سے کوئی نہ ملا تھا۔

"ہاں۔ آج وہ پانچ بجے چائے پر آ رہی ہیں۔"

باجی بولیں "تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب ڈرائینگ روم ٹھیک کر کے چائے کا انتظام کر لیں"

"ہاں تم سب ڈرائنگ روم صاف کر دینا چائے کی دیکھ بھال امی جان خود

کرلیں گی - اور تم سب بھی تیار ہو جانا دیکھو سب کام ڈھنگ کا ہو۔" بھائی جان تو یہ کہہ کر چلے گئے اور ہم سب پروگرام بنانے لگے کہ شام کو عارف بھائی کی بیوی کی کیا کیا خاطر کریں - اتنے میں راشد آدھمکے - تھے تو حضرت مجھ سے سال دو سال بڑے ہی مگر اُن سے میں بہت بے تکلف تھی، اس لئے میں ان کا نام ہی لیا کرتی تھی - اس وقت راشد نے آتے ہی ایک ہاتھ سے میری آنکھیں بند کیں - دوسرے سے مونگ پھلیاں گود سے اٹھالیں پھر اپیا اور باجی کی خوشامد ہونے لگی - باجی نے لاکھ سمجھایا کہ کھانسی میں مونگ پھلی نقصان کرے گی مگر وہ بھلا کہاں ماننے والے آسامی تھے - چار ناچار پیچھا چھڑانے کے لئے سب نے تھوڑی تھوڑی دیں - جب سب سے مونگ پھلی بچ چکے تو مجھ سے بولے "چلو زکو تاش کی ایک بازی ہو جائے کہو تو بھائی جان اور خالد کو بھی بلا لوں -

" نا بابا، اس وقت نہیں پانچ بجے عارف بھائی کی بیوی آرہی ہیں اور ہم سب کو ڈرائنگ روم صاف کرنا ہے" میں نے کہا۔

وہ تو پانچ بجے آئیں گے ابھی تو چار بھی نہیں بجے، یہ دیکھو نا، ارشد نے اپنی گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ گھڑی دیکھ کر ہم سب تو کچھ کچھ تیار ہو گئے۔ مگر باجی کو کون راضی کرتا خیر میں نے بڑی ہمت کر کے باجی سے کہا" راشد ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ باجی ابھی تو کافی دیر ہے - چار کا انتظام تو امی جان نے کر ہی لیا ہوگا - اب رہا ڈرائنگ روم تو اس کو ٹھیک کرنے میں کیا دیر لگے گی۔

راشد دوڑ کر تاش لے آئے باجی لاچار ہو کر بولیں کیا کھیلو گی ؟

اپیا نے لقمہ دیا "تاش نہیں باجی اس وقت تو آنکھ مچولی ہو جائے۔

" دھت ترے کی سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا - میں نہیں کھیلتا آنکھ مچولی یہ لڑکیوں کا کھیل "

بڑی مشکل سے میں نے اور اپیا

نے راشد کو اس شرط پر راضی کیا کہ کھانے
کے بعد کوئی پڑھے گا نہیں۔ جلدی سوئے
گا نہیں۔ سب بیٹھ کر تاش کھیلیں گے۔
ان شرطوں پر راشد اتنے خوش ہوئے
کہ خود ہی چور بن گئے۔ دھائی ڈرائنگ
روم کا دروازہ بنائی گئی۔ راشد نے آنکھیں
میچیں۔ سب نے چھپنے کی تیاری کی۔ میں
نے آواز لگائی "سلی بھوٹے سل بٹہ
پھوٹے، دیکھنے والے کی آنکھیاں پھوٹیں"
لیجئے کھیل شروع ہو گیا۔ پہلے باجی
پکڑی گئیں۔ اور چور بنیں پھر اپیا اور
میں غرض اس طرح دیر تک ہم لوگ کھیلتے
رہے کھیل میں اتنا مزا آرہا تھا کہ وقت
کا بالکل پتہ ہی نہ چلا۔ اور پانچ بھی بج
گئے۔ اب اپیا چور بنیں۔ انھوں نے دھائی
پر آنکھیں میچیں۔ میں ڈرائنگ روم میں
صوفے کے نیچے چھپ گئی۔ باجی اور
راشد دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ادھر
میں نے کو کی اور ادھر بھائی جان، عارف
بھائی کی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔
اپیا چاہتی تھیں کہ ہم لوگوں کو ڈھونڈیں
مگر جب باہر ایک عورت کی آواز سنی
تو سمجھیں کہ بھابی جان جو اپنی کسی سہیلی
سے ملنے گئی تھیں، واپس آرہی ہیں۔
انہوں نے مورچہ بدل، اُن کو ڈرانے کے لئے
جو ہاؤ کیا، تو انگریز خاتون اچھل پڑیں۔ اپیا
نے دروازے سے بھابی جان کا سہما ہوا
چہرہ دیکھنے کے لئے جو سر نکالا تو بھائی
جان اور عارف بھائی کی بیوی کا سہما
ہوا چہرا دیکھ کر سر پہ پاؤں رکھ اندر بھاگ
آئیں۔ ادھر باجی اور راشد یہ شور وغل
سن کر سمجھے کہ میں نے دھائی چھولی اور
اپیا ان کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ موقع غنیمت
جان باجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دروازے
سے ہاتھ بڑھا کر دھائی پر جو مارا تو بھرپور
ہاتھ میم صاحبہ کی پیٹھ پر پڑا اور وہ گھبرا کر
پیچھے ہٹ گئیں۔ بھائی جان آگے بڑھے تو
باجی بھاگتی نظر آئیں۔

ایک طرف عارف بھائی کی بیوی پریشان
تھیں دوسری طرف بھائی جان حیران کہ
آخر معاملہ کیا ہے۔ جو لڑکیوں کے آئے حواس
جاتے رہے۔ بھائی جان نے ان سے معافی

چاہی اندر بیٹھنے کے لئے کہہ اندر چلے گئے۔ ادھر میری شامت دیکھئے کہ وہ محترمہ اسی صوفے پر بیٹھیں جس کے نیچے میں چھپی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو بس ایسا لگا کہ کمر پر جیسے کسی نے چار من کا پتھر رکھ دیا ہو بڑی ہمت کی کہ خاموش رہوں مگر آخر کب تک؟ ادھر وہ اطمینان سے پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھیں ادھر بے اختیار میرے منہ سے اوئی اللہ نکل گیا۔

وہ بے چاری، قسمت کی ماری پہلے ہی سہمی ہوئی تھیں، یہ آواز سن کر اچھل ہی تو گئیں اور ایک طرف جاکر کھڑی ہوگئیں۔ میں نکلنے کی ہمت کر ہی رہی تھیں کہ بھائی جان پھر اندر آگئے۔ میم صاحبہ نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ اس کے نیچے کوئی ہے۔ بھائی جان جھکے تو مجھے پایا۔ انہوں نے مجھے نکلنے کے لئے کہا۔ ڈرتی ڈرتی نکلی تو میم صاحبہ نے "بلو" کہہ کر بھائی جان سے پوچھا کہ یہ آپ کی چھوٹی بہن ہیں نا۔ بھائی جان نے بڑی دبی آواز میں اقرار کیا۔ میم صاحبہ اور قریب آگئیں اور مجھے بڑے پیار سے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ نام وغیرہ پوچھ کردہ مسکراکر کہنے لگیں کہ ہماری طرف تو لوگ صوفے کے اوپر بیٹھتے ہیں۔ آپ نیچے کیوں تھیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں اس کا کیا جواب دیتی بھائی جان نے ان کو سمجھایا کہ یہ لوگ آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ یہ سن کر وہ چپ ہوگئیں مگر جب چلنے لگیں تو بولیں "کسی روز ہم بھی آنکھ مچولی کھیلیں گے۔"

بھائی جان تو ان کو پہنچانے چلے گئے میں اندر جو آئی تو دیکھا باجی، اپیا، راشد سب بیٹھے ہیں۔ میں بھی بیٹھ گئی۔

راشد نے کہا "میں نے گھڑی صرف ڈیڑھ گھنٹہ سست کی تھی، کیا بتاؤں مجھ سے غلطی ہوئی۔"

سب کو افسوس تھا کہ ذرا سی لاپرواہی سے اتنے اچھے بھائی جان کو ناراض کر دیا۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ رات کو کھانے بعد سب معافی

باقی صفحہ ۴۱ پر

موٹر کی ایجاد

محمد اسلم خواجہ
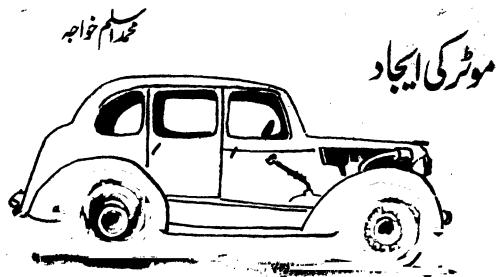
انسان کے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ سب سے پہلے لوگ دور کا سفر طے کرنے کے لئے مختلف جانور مثلاً ہاتھی، گھوڑا، اونٹ کا استعمال کرتے تھے۔ مگر اس کے سفر میں وقت کی بربادی اور تکالیف بہت تھیں اسی لئے انسان اس وقت سے ہی کسی ایسی تیز رفتار چیز کی ایجاد کی کھوج میں لگا رہا۔ جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔ آدمی کی محنت رائگاں نہیں جاتی۔ آخر کار مستقل جدو جہد کے بعد انسان ریل، موٹر اور ہوائی جہاز جیسی تیز چلنے والی چیزوں کے بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ آیئے آج میں آپ کو موٹر کی ایجاد کی کہانی سنائیں۔

اٹھارویں صدی میں انسان نے بھاپ سے کام کرنے والے انجن ایجاد کئے۔ اب لوگوں نے سوچا کہ جب بھاپ کی طاقت سے ایک انجن ایک مقام پر جما ہوا کام کرسکتا ہے تو اس کی مدد سے وہ سڑک پر بھی چل سکتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انسان کو اپنی اس کوشش میں بھی کامیابی حاصل

ہو گئی۔ اور بھاپ کی طاقت سے چلنے والی گاڑیاں سڑکوں پر دکھائی دینے لگیں' بھاپ کے ذریعہ سے چلنے والے ان انجنوں کو ہم موٹر کی سب سے پہلی شکل کہہ سکتے ہیں۔

لیکن آج کل کی موٹر کی ایجاد کی بنیاد گیس کے انجن کی ایجاد پر ہے جسے ڈاکٹر نکولس آٹو نے ۱۸۷۶ء میں بنایا تھا' یہی سبب ہے کہ موٹر انجن کو آج بھی انہیں کے نام سے پکارا جاتا ہے آٹو کو انجن بنانے میں کامیابی تو حاصل ہو گئی' لیکن اس کی چال بہت دھیمی تھی' گوٹ لیب ڈیملا نامی ایک شخص نے اس انجن میں بہت سی تبدیلیاں کیں' اور اسے بہت ہلکا بنا کر پیٹرول سے چلایا۔ یہ انجن ۱۸۷۶ء میں تیار ہوا تھا۔ اس انجن کے تین سال بعد ڈیملا نے ایک دوسرا انجن بنایا۔ جو پہلے انجن سے زیادہ کامیاب رہا۔ اس انجن کو بنانے کے تمام حقوق ڈیملا نے ایک فرانسیسی کارخانے کے ہاتھ بیچ دیئے۔ یہی کارخانہ تھا جس نے ۱۸۸۱ء میں موٹر بنانے کا کام شروع کیا۔ اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

اب موٹر بن گئی تھی اور چلنے لگی تھی۔ لیکن آدمی تو چاہتا ہے کہ ہر کام کو بہتر سے بہتر کرے اسی لئے وہ اب اس چکر میں تھا کہ اس کو اور زیادہ بہتر بنائے اس کے بعد موٹر کی رفتار کو بڑھانے کے لئے اور تمام خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ابھی زیادہ توجہ رفتار ہی طرف رہی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' اور تجربہ زیادہ ہوتا گیا۔ اس کی رفتار قابلِ اطمینان ترقی کرتی گئی۔ ۱۸۹۴ء میں موٹر کی رفتار ۱۲ میل فی گھنٹہ تھی' ۱۹۲۰ء میں یہ رفتار پچاس میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی' اور آج کل کسی موٹر کے لئے پچاس یا ساٹھ میل چلنا ایک معمولی سی بات ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو دو سو یا ڈھائی سو' میل کی رفتار سے بھی چلنا انجن کے لئے زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔ رفتار میں تیزی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ موٹروں کو آرام دہ

بنانے کی طرف بھی لوگ لگ گئے۔

موٹروں کے ڈھانچے کو ہلکا بنانے کی کوشش کی گئی۔ دھات کی بھاری بھاری چادریں استعمال کی گئیں۔ جس سے موٹروں کی رفتار اور خوبصورتی میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ اب انجن کے کل پُرزے بھی مضبوط بنائے جانے لگے۔ اور پھر ایک سے ایک خوبصورت موٹریں بننے لگیں۔ اور آخرکار یہ اِنسان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج سڑکوں پر موٹر کے طرح طرح کے خوبصورت ماڈل نظر آتے ہیں

موٹر کو تیز چلانے کے لئے اچھی سڑکوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے جب سے موٹروں کی رفتار کی طرف توجہ دی گئی، اُسی وقت سے سڑکوں کو سدھارنے کا کام بھی شروع ہوا۔ اور آج دنیا میں خوبصورت صاف اور چکنی سڑکوں کا جال سا بچھ گیا ہے۔ ان سڑکوں پر اچھی موٹروں میں چلتے ہوئے ہمیں بالکل تکلیف نہیں ہوتی موٹر سے جو ہمیں آسانیاں اور سہولتیں حاصل ہیں، اُن کی ہی بدولت وہ بہت مقبول سواری ہوگئی ہے۔

سواریوں کے علاوہ آج کل ہم ان کا استعمال بھی کئی طریقوں سے کررہے ہیں۔ مثلاً سڑک پر پانی چھڑکنے، کوڑا کرکٹ اٹھانے سامان لانے لے جانے اور آگ بجھانے وغیرہ کے کام میں آتی ہے۔ لیکن ابھی موٹریں اتنی قیمتی ہیں کہ صرف بڑے بڑے آدمی ہی موٹریں رکھتے ہیں۔ اور زیادہ تر آدمی اس نعمت سے محروم ہیں اور اس معاملے میں اسی طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے اُن کے باپ دادا گزارتے تھے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد سب لوگ اس میں سواری کرسکیں گے ٭

جو خریدار چھ آنے کے ٹکٹ اپنے خریداری نمبر کے ساتھ بھیجیں گے انھیں سالنامہ رجسٹری سے بھیجا جائے گا

برف کا آدمی

(کہانی لکھئے)

ایصار عبدالعلی

ندیدہ

سلیم بڑا ندیدہ لڑکا تھا، اور اب تو اس کے ندیدے پن کی حد ہو گئی تھی۔ پرسوں آپا کی سہیلی کی شادی میں گیا تو اتنا ندیدہ پن دکھایا کہ امّی اور آپا دونوں کو شرمندہ ہونا پڑا اس کے اندر یہ بھی بُری عادت تھی کہ وہ ہر چیز پر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا۔ اور گھر میں بھی ہمیشہ چھانٹ کر بڑی سے بڑی چیز لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی ننھی شارمین سے خوب خوب ہاتھا پائی ہوتی۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ پاپا بہت سے امرود لائے، اور اس سے پہلے کہ ان کا حصّہ لگتا۔ سلیم نے سارے بڑے بڑے امرود چھانٹ کر اپنے قبضہ میں کر لئے۔ ننھی شارمین کو بھی لالچ آیا۔ اُس نے بھی ایک بڑا سا امرود اٹھا لیا اور بھاگنا چاہتی تھی کہ سلیم نے اس کی فراک اتنے زور سے پکڑ کر کھینچی کہ وہ چرسے پھٹ گئی اور پھر جب اس نے بھی غصّے میں اس کے چھانٹے ہوئے بڑے بڑے امرود زمین پر گرا دیئے، تو بس اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانا مل گیا۔ اور پھر سلیم کا ہاتھ شارمین کے بالوں میں تھا اور

شارمین کا ہاتھ سلیم کے گریبان میں۔ بھلا
اس کا ننھا سا ہاتھ سلیم کے بالوں تک کہاں
پہونچ سکتا تھا۔جب چیخ پکار کی آواز اتی
تک پہنچی تو انھوں نے آکر دونوں کو الگ کیا
آخر وہ بھی کہاں تک الگ کرتی رہتیں۔
اس کے ندیدے پن نے تو گھر بھر کو عاجز
کر رکھا تھا۔

یہ تو سب کچھ جیسے تیسے برداشت
کیا جا رہا تھا لیکن اب ننھی شارمین کی
طرف سے بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بھی
سلیم کی حرص میں ویسی ہی ندیدی ہوتی جا
رہی تھی۔

آخر ان روز روز کے جھگڑوں اور سلیم
کی عادتوں سے تنگ آکر آپا نے اس کے
لئے ایک علاج سوچ لیا، اور اس کی سالگرہ
کے دن کا انتظار کرنے لگیں۔

اور پھر وہ دن آگیا۔اس دن سلیم
کی سالگرہ تھی، بڑھیا بڑھیا کپڑے پہنے
ہوئے وہ سوچ رہا تھا" اہا آج تو
میں اتنا بڑا سا کیک کاٹوں گا اور پھر
سارے کا سارا خود ہی کھا جاؤں گا۔
مومن، راشد اور شارمین دیکھ دیکھ کر منھ میں
پانی بھر لیں گے، اور میں انھیں ٹھینگا دکھا
دوں گا ــــ اور کیا !!!

جب کیک کاٹنے کا وقت آیا اس نے
جلدی سے کیک کاٹا اور کھانے کے لئے ایک
بڑے سے ٹکڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا
کہ آپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے سے
ٹکڑے کے بجائے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اسے
دے کر باقی بڑے بڑے ٹکڑے سب بچوں
کو بانٹ دیئے۔ وہ منھ دیکھتا رہ گیا۔تمام
دوست ہنس ہنس کر ہال میں اچھلنے کودنے
لگے۔

رات ہوئی تو آپا نے کھانا اپنی نگرانی میں
میز پر لگوایا اور سب بچے بیٹھ کر کھانے لگے
سامنے میز پر کوفتوں کی قاب رکھی تھی۔
اس میں سب کوفتے تو چھوٹے چھوٹے تھے
بس ایک کوفتہ بڑا تھا۔اس نے لپک کر
سب سے پہلے اس بڑے کوفتے کو اپنی
پلیٹ میں نکال لیا۔ پھر نوالا بنا کر منہ میں
رکھا اور دیر تک چباتا رہا، لیکن یہ کیا ــ؟
نہ تو کوفتے میں نمک مرچ تھا اور نہ اس

کے اندر کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس نے منہ بنا کر سب کی پلیٹوں پر نظر ڈالی تو پلیٹوں میں رکھے ہوئے کوفتوں میں انڈے بھرے ہوئے تھے —— اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اور جھنجلا کر اُس نے نوالا تھوک دیا۔

سب بچے مسکرا دیئے۔ لیکن کوئی زور سے نہیں ہنسا۔

اب اس کے مُنہ کا مزہ خراب ہو گیا تھا اور پھر اس کے سب دوست اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا بھی رہے تھے۔ جیسے اس کا خاموشی سے مذاق اُڑا رہے ہوں، اس لیئے اس نے سوچا کہ وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ لیکن وہ بھاگتا بھی کیسے؟ ابھی تو کھیر کھانا باقی تھی۔ اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کھیر کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی نظر برابر ہی رکھے ہوئے شارمین کے کھیر کے پیالے پر پڑ گئی، اس کے منہ میں ڈھیر سا پانی بھر آیا —— "ارے باپ رے باپ" —— اس نے دل میں سوچا —— "شرو کا پیالہ اتنا بڑا اور ہم سب کا اتنا چھوٹا؟

اس کی ہوس اور بڑھ گئی اور آنکھ بچا کر اس نے اپنے چھوٹے پیالے سے شارمین کا بڑا پیالہ بدل لیا۔ پھر بڑے مزے سے چمچہ بھر کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ مُنہ سے کھیر کا فوّارہ سا پھوٹ پڑا اور سارا دسترخوان خراب ہو گیا۔ چاروں طرف سے بچّوں کے قہقہے اور تالیاں گونج اٹھیں۔ ان میں موہن راشد اور شارمین کی آوازیں سب سے آگے تھیں —— دراصل اس بڑے پیالے میں کھیر کی بجائے چاولوں کی نکلی ہوئی پیچ تھی اور اس میں بھی اچھی طرح نمک تھا۔

سلیم کھسیانا ہو کر رونے لگا اتنے میں آپا کھانے کے کمرے میں آ گئیں تھیں۔ دیکھتے ہی وہ اور زور زور سے رونے لگا۔ آپا انگلی پکڑ کر اسے باغ میں لے گئیں اپنی گود میں بٹھا کر اس کے آنسو پونچھے اور کہنے لگیں —— "ارے اس میں رونے کی کیا ضرورت ہے تم نے ایسا کام ہی کیوں کیا جو دوسروں کو ہنسنے کا موقع ملا۔ تم تو بڑے اچھے بھیا ہو، بولو اب تو اس

بقیہ صفحہ ۴۱ پر

ایک رات کا مہمان

ریحان احمد عباسی
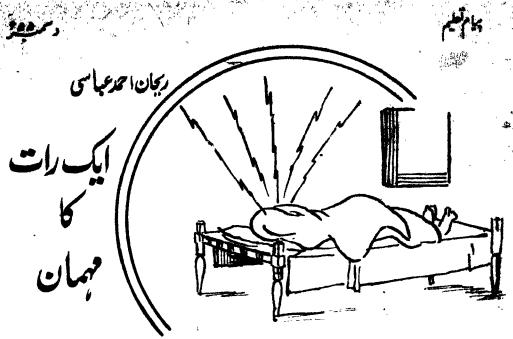
ہماری جو شامت آئی تو ہم نے بلا سوچے سمجھے اور بغیر کسی انتظام کئے ایک صاحب کو رات بھر کے لئے اپنے یہاں ٹھہرا لیا۔ وہ صاحب اگر کھانے پینے کی حد تک ہی مہمان بنائے جاتے تو انجام بخیر و عافیت ہوتا۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ ان جاڑوں کی راتوں میں جب کہ ہمارے پاس صرف ایک ہی کمرہ ہے ہم ثواب کے لالچ میں انھیں سُلانے پر خوشی خوشی تیار ہوگئے۔

دس ساڑھے دس بجے تک ان سے کچھ رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد جب نیند آنے لگی۔ تو ہم نے باتیں بند کردیں اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ بستر میں لیٹ کر دو چار بار اِدھر سے اُدھر کروٹیں بدلیں۔ جب ذرا آرام ملا اور خاموشی چھائی تو دماغ نے کچھ دیر گذری ہوئی باتیں یاد کیں، نئے پروگرام بنائے پھر یہ خیالات بھی گڈمڈ ہونے لگے۔ میٹھی نیند کا ایک جھونکا آیا۔ لیکن اسی وقت ایک بھیانک اور ڈراؤنی آواز سنائی دی۔ اور پھر تو اسی طرح کی بھیانک اور عجیب سُر تال

ی آوازوں کا ایک سلسلہ سا بندھ گیا۔ بھلا ایسے میں مجھے نیند کیسے آتی۔ میں تو قصوری میں نیند کے مزے لے رہا تھا اور یہاں تھوڑے چل رہے تھے آج معلوم ہوا کہ خراٹے لینا کسے کہتے ہیں؟ دل میں سوچنے لگا کہ اگر اس مہمان نے اسی طرح آوازیں نکالیں تو پھر نیند آچکی۔ یا اللہ کیا ہوگا۔ نیند نہ آئی تو سر میں درد ہو جائے گا۔ کل چھٹی بھی نہیں، جو دن چڑھے تک سو کر رات کی نیند پوری کروں۔ عجیب پریشانی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ جب اس پریشانی میں بہت دیر ہو گئی، تو دل نے کہا کہ کب تک اسی طرح بیٹھے رہو گے۔ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔ آخر کچھ سوچ کر کھنکارا۔ میری تدبیر کام کر گئی ان حضرت کے خراٹے بند ہو گئے۔ اب ترکیب معلوم ہو گئی تھی جب انھوں نے کچھ دیر بعد پھر خراٹے لئے تو میں فوراً کھانسنے لگا اور اس طرح پھر آوازیں بند ہو گئیں۔ لیکن افسوس کچھ دیر بعد کھانسنے کا وہ اثر جاتا رہا اب زور سے بھی کھانستا ہوں تو ادھر سے

خراٹے بند ہونے کی رسید نہیں ملتی۔ یہ ترکیب تو بیکار ہو گئی۔ آخر ایک ترکیب اور سوجھی وہ لمپ جو کچھ دیر پہلے گل کر دیا تھا دوبارہ روشن کیا، اس کی روشنی اُن کے چہرے پر ڈالی اور چھڑی جو چارپائی کے پاس رکھی تھی آواز کے ساتھ زمین پر گرا دی۔ یہ ترکیب خوب کارگر ہوئی۔ اس بار خراٹے ہی بند نہیں ہوئے بلکہ جاگ بھی پڑے۔ مجھے بیٹھے ہوئے دیکھ کر فرمانے لگے۔

"تو ابھی نہیں سویا؟"

میں نے عرض کیا "خراٹوں کی وجہ سے نیند نہیں آئی"

فرمایا "اچھا تو بھی خراٹے لیتا ہے"

گویا میں خود اپنے خراٹوں کی وجہ سے نہ سو سکا تھا میں نے دوبارہ عرض کیا "خراٹے میں نہیں بلکہ آپ لے رہے تھے اور"

میری بات کاٹتے ہوئے کہا "ابھی ذرا آنکھ لگی تھی" یعنی ابھی تمہید ہی تھی اور وہ خراٹے بطور نمونہ پیش کئے گئے تھے۔ میں نے دل میں سوچا اب تو یہ جاگ ہی گئے ہیں، کیوں نہ میں جلدی سے سو جاؤں۔ میں

پندرہ منٹ کے لئے ہی آنکھ لگ جائے تو اچھا رہے۔ میں ابھی سونے کے معاملہ پر غور کر ہی رہا تھا کہ معلوم ہوا وہ مجھ سے پہلے ہی نیند کو پیارے ہو گئے۔ اب کی بار آواز زیادہ زور دار تھی۔ اس کے اُتار چڑھاؤ میں بھی پہلے سے زیادہ فرق تھا۔ پہلے تو ایک ہی طرح کی آوازیں نکلتی تھیں لیکن اب ان میں کچھ کچھ دیر کے بعد فرق ہو جاتا تھا۔ ناک اور منہ کا فراخدلی سے استعمال ہو رہا تھا۔ میں نے حسرت سے گھڑی کی طرف دیکھا اب ایک بجنے میں دس منٹ تھے۔

گھڑی دیکھ کر اور بھی پریشانی بڑھنے لگی پھر دماغ پر زور ڈالا کہ کس طرح ان آوازوں کو بند کیا جائے۔ میں بستر سے اُٹھا، میز گھسیٹ کر ادھر سے ادھر کی، دروازہ کھولا اور بند کیا، زمین پر رکھے ہوئے اگالدان سے جان بوجھ کر ٹھوکر کھائی۔ لیجئے آوازیں بند ہو گئیں وہ کچھ کسمسائے، کروٹ بدلی، ایک منٹ خاموشی رہی لیکن اس کے بعد پھر وہی میاں کی ملہار شروع۔

اور تو اور اب ان کی خراٹوں کی آوازوں نے پڑوسیوں کو بھی نوازنا شروع کر دیا۔ بچے ڈر ڈر کر اٹھنے لگے، ان کی ماؤں نے اس بے وقت کے ڈرنے پر دو چار محبت کے ہاتھ لگائے۔ چاروں طرف آوازیں تیز ہو گئیں۔ مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں۔ کچھ ہی دیر میں آدھی رات کو صبح کے آثار نظر آنے لگے۔ ہر طرف آوازوں کی چہل پہل ہو گئی لیکن ہمارے مہمان ان سب باتوں سے بے خبر خوابِ خرگوش میں مبتلا تھے۔ اب تو مجھے اپنی مصیبت پر رونا آگیا۔

میں خراٹے بند کرانے کی کوئی اور ترکیب سوچنے لگا جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو جھنجلاہٹ میں آواز دے ڈالی، کچھ بُرا بھلا بھی کہا۔ آوازیں پھر بند ہو گئیں وہ جاگ بھی گئے۔ جاگنے کے بعد شاید حالات کا جائزہ لیا ہوگا۔

کیونکہ ذرا دیر بعد بولے " تو ابھی جاگ رہا ہے میں سمجھا سوتے میں بڑبڑا رہا تھا" یہ سن کر مجھے کچھ ہنسی آئی کچھ غصہ، سوچنے

لگا یہ میرے مہمان ہیں انھیں بُرا بھلا کہنا
مہمان نوازی کے آئین کے خلاف ہے لیکن
بھئی یہ سب کچھ سوچنا بیکار تھا کیونکہ مہمان
صاحب جواب کا انتظار کئے بغیر بھر خراٹوں
کی دنیا میں جا پہنچے تھے۔

تدبیر نے کام نہیں کیا، غصّہ بے کار
ثابت ہوا دل نے کہا اب صبر کرکے دیکھو۔
کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ شاید
اس کے اثر سے ان کے خراٹے بند ہوجائیں
یا ممکن ہے خراٹوں میں ہی نیند آجائے
یہ سوچ میں نے لمپ گُل کیا، کانوں میں
انگلیاں ٹھونسیں اور رضائی میں دبک کر
سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دو بجے، تین بجے، چار بجے لیکن نیند
کوسوں دور۔ آوازیں ایسی ڈراونی اور بھیانک
کہ بیان سے باہر۔ کچھ ڈر کچھ خوف، کچھ غصہ
کچھ جھنجلاہٹ۔ عجیب بے بسی اور بے کسی
کا عالم ایسے میں اللہ یاد آیا۔ دعائیں مانگنی
شروع کیں۔ آیتہ الکرسی پڑھی۔ آخر کار
اللہ نے دعا سُن ہی لی مہمان صاحب پوری
طرح اٹھ بیٹھے۔ میں دل میں خوش ہوا لیکن ابتو چھ
بجنے والے تھے۔

بقیہ " آنکھ مچولی "

مانگ لیں۔ غرض کھانے کے بعد سب
بھابی جان کو سفارش کے لئے لے کر بھائی
جان کے کمرے میں گئے۔ وہ ہمارے آنے کا
مطلب سمجھ گئے۔ اپنے پاس بٹھا لیا اور
ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولے "راشد
تاش لانا۔ آج بہت دن بعد فرصت ملی
ہے زرا بیٹھک رہے گی۔"

بھابی جان نے مسکرا کر ہم سب کی
طرف دیکھا اور میں دل میں سوچنے لگی کہ
ہمارے بھائی جان کتنے اچھے ہیں ٭

بقیہ " ندیدہ "

طرح ندیدہ پن اور ہوس نہیں کروگے؟"
"نہیں"—— سلیم نے بڑے سچے دل سے
اقرار کیا۔ آپا نے اس کو شاباشی دی باپا سے کہہ کر
نیا کیرم بورڈ دلانے کا وعدہ کیا۔ خوب اچھی اچھی
باتیں بتائیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ کھانے میں
بغیر نمک مرچ اور بغیر انڈے کا بڑا سا
کوفتہ اور نمکین کھیر خود انھوں نے ہی بنوائی
تھی۔

اطہر جمیل صدیقی

تیر اندازی

کہتے ہیں کہ اب سے سینکڑوں سال پہلے شہر ہستنا پور کی تنگ گلیوں میں بہت سے چھوٹے بڑے بچے گیند کھیل رہے تھے اچانک اُن کی گیند ایک گہرے کنوئیں میں جا گری تمام بچے کنوئیں کی مینڈھ پر جمع ہو گئے اور اس میں جھانک جھانک کر گیند نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگے وہ اپنی گیند کے چکر میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ جب ایک بوڑھے راہ گیر نے ان سے راستہ معلوم کیا تو کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بوڑھے راہ گیر نے کنوئیں میں جھانک کر معاملہ کو سمجھ لیا پھر اس نے لڑکوں سے کہا "اگر تم مجھے راستہ بتا دو تو میں تمہاری گیند نکال سکتا ہوں۔" لڑکے بوڑھے کی بات پر ہنس دیے اور سوچنے لگے کہ یہ ستر سال کا بوڑھا کسطرح بغیر رسّی کے گیند نکال سکتا ہے۔

بوڑھے نے راستہ معلوم کرنے کے بعد اپنے کندھے سے تیر کمان اُتارا اور کنوئیں میں پڑی ہوئی گیند پر پہلا تیر مارا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک کئی تیر چھوڑے، اور ایک تیر کو دوسرے تیر میں چبھتے گئے۔ اس طرح کنوئیں کے منہ تک تیروں کا تانتا

سا باندھ دیا اور پھر تو آسانی سے کنویں سے گیند نکالکر بچوں کو دیدی۔ اڑتے اڑتے یہ خبر راجا پانڈے تک پہنچی۔ راجہ نے بوڑھے تیر انداز کو دربار میں طلب کیا اور اسے اپنے پانچوں بیٹوں اور اپنے بڑے بھائی کے سو بیٹوں کو تیر اندازی سکھانے کا کام سونپ دیا۔ بوڑھے تیر انداز کا نام درونا چاریہ تھا۔ اس زمانے میں ان جیسا تیر چلانے والا دوسرا نہ تھا۔ درونا چاریہ بڑی محنت اور محبّت سے راجکماروں کو تیر اندازی سکھانے لگے۔ راج کمار ارجن ان کا فرمانبردار اور ہونہار شاگرد تھا۔ ایک دن درونا چاریہ جی نے ارجن سے خوش ہو کر کہا "ارجن! میں تم کو ایسا تیر انداز بنا دوں گا کہ تم سے بڑھ کر ساری دنیا میں کوئی دوسرا تیر انداز نہ ہوگا" ارجن یہ سن کر بے حد خوش ہوئے۔

ایک بار استاد درونا چاریہ کے پاس ایک بھیل شہزادہ آیا اور اس نے کہا کہ جناب میں نے آپ کے تیر چلانے کی بہت تعریف سُنی ہے میں تیر اندازی کا شوقین ہوں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے بھی اپنا شاگرد بنا لیں۔ درونا چاریہ یہ بات سُن کر بہت ناراض ہوئے۔ بھلا وہ بھیل لڑکے کو اپنا شاگرد کیسے بنا لیتے' اس لئے انھوں نے انکار کر دیا۔ بے چارا اپنا سا مُنہ لے کر چلا گیا۔

ایک مرتبہ ارجن اپنے چاروں بھائیوں کے ساتھ ایک جنگل میں شکار کھیلنے کے لئے پہنچے۔ ارجن کا پیارا کتّا بھی ان کے ساتھ تھا۔ شکار کا پیچھا کرتے کرتے وہ کتا ارجن سے دور ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ کتّا برابر بھونکے جا رہا تھا۔ یکایک کتّے نے بھونکنا بند کر دیا اور کچھ دیر بعد وہ دوڑتا ہوا ارجن کے پاس آیا۔ ارجن نے دیکھا کہ کتّے کے مُنہ میں اتنے بہت سے تیر گھسے ہوئے تھے کہ کتّا بھونکنے کے لئے اپنا منہ نہ کھول سکتا تھا۔ لیکن تعریف کی بات یہ تھی کہ کتّے کے کہیں بھی زخم نہ آیا تھا۔ کسی نے بڑی ہوشیاری اور پھرتی سے اتنے بہت سے تیر چلا کر کتّے کا بھونکنا بند کرا دیا تھا۔ ارجن نے کتّے کے منہ سے جلدی تیر نکالے اور کتّے

کے ساتھ ساتھ ہو لیا کتّے نے ارجن کو ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ارجن نے دیکھا کہ ایک بھیل لڑکا بڑی تیزی کے ساتھ تیر اندازی کی مشق کر رہا ہے۔ ایک نیچ لڑکے کو تیر برساتے دیکھ کر ارجن کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا کہ لڑکے تمہارا کیا نام ہے اور تم کس کے شاگرد ہو۔ اس نے اپنا نام اِک لوّے بتایا اور اُستاد کا نام درونا چاریہ۔ ارجن درونا چاریہ کا نام سن کر بہت چکرایا اور سوچنے لگا کہ استاد نے اس بھیل لڑکے کو کیسے مجھ سے زیادہ تیر اندازی سکھا دی ہے ارجن اسی اُدھیڑ بُن میں گھر واپس آیا اور تمام قصہ استاد درونا چاریہ کو کہہ سنایا۔ درونا چاریہ بھی اس قصہ کو سُن کر حیرت میں پڑ گئے، اور دوسرے دن راج کمار ارجن کے ساتھ بھیل کی جھونپڑی پر جا پہنچے۔ بھیل لڑکا درونا چاریہ کو دیکھتے ہی پیروں میں گر پڑا اور بولا کہ "اُستاد اس دن جب آپ نے مجھے محل سے نکال دیا تھا تو میں یہاں بن میں رہنے لگا اور پھر میں نے آپ کی ایک مٹی کی مورت بنائی اور اس سے اجازت حاصل کر کے اس کے سامنے تیر اندازی شروع کر دی اب میں ہر طرح فن تیر اندازی سیکھ چکا ہوں"۔

درونا چاریہ جی چاہتے تھے کہ ارجن جیسا تیر انداز کوئی دوسرا نہ ہو۔ دوسرے وہ بھیل لڑکے اِک لوّے کو نیچ بھی تو خیال کرتے تھے۔ انھوں نے اِک لوّے سے کہا کہ اے شاگرد اگر تم مجھے اپنا استاد مانتے ہو تو نذرِ عقیدت پیش کرو۔ اِک لوّے نے کہا کہ استاد اگر آپ کہیں تو آپ کے لئے میری جان تک حاضر ہے۔ درونا چاریہ نے موقع کو غنیمت جان کر اِک لوّے سے اس کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا مانگ لیا۔ درونا چاریہ کے دیکھتے دیکھتے اِک لوّے نے اپنے استاد کی خدمت میں داہنے ہاتھ کا انگوٹھا پیش کر دیا۔ یہ دیکھ کر استاد درونا چاریہ دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوئے، اور وہاں سے چلے آئے۔ بھیل لڑکے نے پھر انگوٹھے کے بعد کی دونوں انگلیوں کی مدد سے تیر اندازی کی مشق کی اور اس میں وہ

باقی صفحہ ۴۵ پر

شفیقہ فرحت

آج نو بجتے ہی جلّو نے خوشی خوشی اسکول جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ورنہ عام طور پر تو ہمیشہ کی طرح اسکول جانے سے کتراتی تھی۔ جب دیکھو جلّو صاحبہ گھر میں موجود ہیں۔
"کیا ہوا بھئی —؟" کوئی پوچھتا۔
"آج ہمارے سر میں درد ہے۔" جلّو بیگم کیلا کھاتے ہوئے جواب دیتیں۔ یا پھر آج کھانسی ہوگئی ہے۔ آج زکام ہو گیا ہے۔ آج پیٹ میں درد ہے۔ آج پیر میں درد ہے۔"

شروع شروع میں تو ان بہانوں کی بدولت انھیں چھٹی ملتی رہی۔ مگر چند روز میں ہی ان کے اس سر پیر اور پیٹ کے درد کا راز سب پر کھل گیا۔ پھر تو چاہے کیسا ہی درد کیوں نہ ہو، جلّو بی کو پکڑ دھکڑ کر اسکول بھجوا دیا جاتا۔ بیچاری چلاتی رہ جاتیں مگر وہاں کون سنتا تھا۔

اب جبکہ وہ آٹھویں کلاس میں پہنچ گئی تھی تب بھی اس کی یہ عادت گئی نہ تھی۔ اب بھی اکثر وہ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اسکول نہ جانے کے بہانے سوچا کرتی اور جب کوئی اچھا بہانہ نہ ملتا تو صبح اٹھ کر

مجبوراً گھر کے لئے دیا ہوا کام کرتی ۔ یہ کام وہ بڑی بے دلی سے کرتی ۔ اور ہمیشہ دیر سے اسکول پہنچتی ۔ مگر آج کا دن اس کے لئے غیر معمولی دن تھا ۔ سب نے دیکھا تھا کہ جلّو بڑے چاؤ اور شوق سے تیار ہو کر وقت سے بہت پہلے چلی گئی ۔

بات یہ تھی کہ آج جلّو کو مضمون کی کاپی واپس ملنے والی تھی اور اسے پورا پورا یقین تھا کہ اس کا مضمون کلاس میں سب سے اچھا ہوگا ۔ زیادہ نہیں تو دس میں سے کم از کم آٹھ نمبر تو ضرور ملیں گے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک تعریفی جملہ بھی ملے گا ۔ اس کی ماسٹرنی صاحبہ ہمیشہ اس کا مضمون دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہیں ۔ آج جلّو خوش تھی کہ چلو یہ ماسٹرنی صاحبہ بھی آج کلاس میں اس کی خوب تعریف کریں گی ۔ اُسے خوب شاباشی دیں گی ۔ اور یہی نہیں سب کو اس کا مضمون پڑھ کر سنائیں گی ۔

جلّو تو یہ بھی سوچ رہی تھی کہ ماسٹرنی صاحبہ اسٹاف روم میں بھی سب ٹیچروں کے سامنے اس کی اور اس کے مضمون کی تعریف کریں گی ۔ اور خوش ہو کر ٹافی انعام میں دیں گی ۔ جلّو کو ٹافی اتنی پسند تھی کہ وہ ہر وقت اسی کے بارے میں سوچا کرتی ۔ اگر انہوں نے ٹافی نہ دی تو پھر مس ڈیکا سٹا تو ضرور دیں گی ۔ کیونکہ وہ تو اسے یوں بھی بہت چاہتی ہیں ۔ اہا ! اہا ! پھر تو مزہ آ جائیگا

جلّو یوں تو بہت ہوشیار تھی ۔ لیکن چونکہ محنت سے جی چُراتی تھی اس لئے اچھے نقشے بنانا اور اچھے مضمون لکھنا اسے کبھی نہ آیا ۔ وہ جلدی جلدی نقشہ بناتی اور لاپرواہی سے دو تین منٹ میں رنگ بھر کے رکھ دیتی ۔ یہی حال مضمون کا تھا ۔ عنوان ہفتہ بھر پہلے دیا جاتا ۔ مگر بھلا جلّو کیوں پہلے سے کچھ کرتی وہ سارا ہفتہ نہ اس کے بارے میں خود سوچتی نہ کسی سے پوچھتی ۔ بس جس دن مضمون دینا ہوتا اس دن صبح کاپی لے کر بیٹھ جاتی اور الٹا سیدھا جو کچھ جی میں آتا گھسیٹ کے رکھ دیتی ۔ استانی صاحبہ ہمیشہ اس کے مضمون کی برائی کرتیں اور خوب ڈانٹتیں

اسے کبھی چار پانچ سے زیادہ نمبر بھی نہیں ملے۔ مگر آج کی بات ہی اور تھی ــــ!
مضمون کا گھنٹہ کھانے کی چھٹی کے بعد آتا تھا۔ روز اسے کھانے کی چھٹی بڑی پیاری لگتی۔ وہ اسکول شروع ہوتے ہی اس کا انتظار کرنے لگتی۔ کھانا کھانے کے بعد خوب اُدھم مچاتی۔ آج وہ اس چھٹی سے بھی اُکتا گئی تھی۔ کھانے میں بھی دل نہیں لگا۔ کھانے کے بعد۔ سلیمہ نے اس کی کاپی پر سیاہی گرا دی۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ اسی بات پر اچھا خاصا جھگڑا کھڑا کر دیتی کم از کم اس کی چٹیا پکڑ کر تو ضرور کھینچتی، اس کی کاپی پھاڑ دیتی۔ مگر آج اس نے سلیمہ کو کچھ بھی نہیں کہا۔ کاپی کی طرف دوبارہ دیکھا بھی نہیں۔

خدا خدا کر کے چھٹی ختم ہوئی اور مضمون کا گھنٹہ آیا۔ ماسٹرنی صاحبہ بہت سی کاپیاں لئے کمرے میں داخل ہوئیں اور سب کو کاپیاں ملنے لگیں۔ جلّو کا دل خوشی کے مارے اُچھلنے لگا۔ اس نے بڑی بے چینی سے اپنی کاپی کھولی مگر وہاں تو سارے کا سارا مضمون کٹا ہوا تھا۔ اور دس میں سے آٹھ نمبر کے بجائے بڑا سا صفر بنا تھا۔

غصّے سے جلّو کا منہ لال ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ماسٹرنی صاحبہ کی چٹیا پکڑ کر پوچھے کہ انھوں نے یہ بے ایمانی کیوں کی۔ اس کا مضمون بہت اچھا تھا۔ اتنا اچھا کہ خود ماسٹرنی صاحبہ بھی نہیں لکھ سکتیں پھر انہوں نے اسے آٹھ نمبر کیوں نہیں دیئے۔ اس پر سب سے "اچھا" کیوں نہیں لکھا۔ ماسٹرنی صاحبہ پڑھاتی رہیں اور جلّو دل ہی دل میں ان سے لڑتی رہی۔

گھنٹہ ختم ہوا تو استانی نے جلّو سے ان کے ساتھ اسٹاف روم میں چلنے کے لئے کہا۔ جلّو غصّے سے پیر پٹختے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اسٹاف روم میں اور کوئی نہ تھا۔ اپنی کتابیں میز پر رکھ کر ماسٹرنی صاحبہ نے کہا "سچ بتاؤ زلیخا یہ مضمون تم نے کس سے لکھوایا تھا۔ اپنی آپا سے یا بھائی جان سے ــــ؟"

اس طرح پکڑے جانے پر جلو سٹ پٹائی

مگر تھی ضدی بھلا وہ کیسے مانتی۔ اکڑ کر بولی "واہ میں کیوں کسی سے لکھوانے لگی۔ وہ تو میں نے خود لکھا ہے۔"

"اچھا اگر یہ تم ہی نے لکھا ہے تو ذرا اس لفظ کے مطلب تو بتاؤ۔ اب جو ماسٹرنی صاحبہ نے ان دو چار بڑے بڑے لفظوں کے معنی پوچھے جو جلّو نے اپنے مضمون میں لکھے تھے تو اس کی ساری قلعی کھل گئی۔ وہ خوب روئی اور بولی "سلیمہ کو ہمیشہ اچھے نمبر ملتے ہیں۔ مجھے کبھی اچھے نہیں ملے۔ اسی لئے میں نے یہ مضمون بھائی جان سے لکھوایا تھا کہ اب تو میں کلاس میں اول آؤں گی۔"

ماسٹرنی نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا کہ "اگر تمہارا کام دوسرے کریں گے تو تمہاری قابلیت کیا بڑھے گی؟ تم خود محنت سے مضمون لکھو پھر دیکھو کیسے سلیمہ سے اچھے نمبر نہیں ملتے۔ پہلے مضمون کے بارے میں خوب سوچ لیا کرو۔ پھر کسی سے پوچھ لیا کرو اور پھر لکھا کرو۔"

جلو کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ خود محنت سے مضمون لکھے گی اور اپنا کوئی کام دوسرے سے نہیں کروائے گی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ جلّو نے ماسٹرنی صاحبہ کی بات اتنی جلدی اس لئے مان لی کہ انہوں نے اسے ٹافی دی تھی۔ اور ٹافی دے کر تو جلو سے یہ کام کروایا جا سکتا ہے پھر یہ تو اچھا کام تھا اور سچی بات تھی۔

بقیہ

تیر انداز

کمال پیدا کیا کہ ارجن اپنے انگوٹھے کی مدد سے تیر چلانے میں نہ کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ بھیل اب بھی تیر چلانے میں انگوٹھے کا استعمال نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ایک پُرکھے نے اپنا انگوٹھا گرو کو دان کر دیا تھا تو اب ہم اس کا استعمال کیسے کر سکتے ہیں' یہ استاد سے گہری عقیدت کا کتنا بڑا ثبوت ہے۔

ادارہ

ہندسے کا کھیل

آئیے آپ کو ہندسے کا جادو سکھائیں
جس سے آپ اپنے دوستوں کو چکرا سکتے ہیں۔
اپنے کسی دوست سے کہئے کہ وہ کوئی ہندسہ کسی
کاغذ پر لکھ کر رکھ لیں اور آپ کو نہ بتائیں، اس
لئے کہ آپ بغیر دیکھے بتا سکتے ہیں کہ اس نے
کیا لکھا ہے۔

جب وہ لکھ لے تو پھر آپ اس سے
کہئے کہ اس ہندسے کو ۲ سے ضرب دیں اور
اس میں ۵ جمع کر لیجئے پھر جو آئے اس کو ۵
سے ضرب دے کر ۳ اور جمع کر دیجئے اور ایک
بار پھر ۱۰ سے ضرب دیجئے۔ اب جو کچھ آئے اس
میں ۳ اور جمع کر دیجئے اس طرح جو رقم آئے
وہ آپ اپنے دوست سے معلوم کر لیجئے اور
دل ہی دل میں ۱۵۰ گھٹا دیجئے۔ اور جو رقم ۱۵۰ کے
گھٹانے سے بچے اس کے اکائی اور دہائی کے ہندسے
ہمیشہ ۳۳ آئیں گے ان کو کاٹ کر باقی سے ایک گھٹا
دیجئے۔ یہی وہ ہندسہ ہے جو آپ کے دوست نے
سوچا تھا۔ اب آپ اس کی مثال اس طرح
سمجھ لیجئے تاکہ آپ کو آسانی ہو۔ فرض کر لیجئے کہ
آپ کے دوست نے ۱۲ سوچا ہے اس کو ۲ سے
ضرب دینے سے ۲۴ آیا اور ۵ جمع کرنے سے
۲۹ اور ۲۹ کو ۵ سے ضرب کیا تو ۱۴۵ ہو گیا
۳ اور جمع کیا تو ۱۴۸ ہوا اب اسے ۱۰ سے ضرب کرنے پر
۱۴۸۰ آیا جس میں ۳ جمع کیا تو ۱۴۸۳ آیا اس میں
سے چپ چاپ ۱۵۰ گھٹا دیا۔ تو ۱۳۳۳ بچا۔ بس
آپ نے اکائی اور دہائی کے ۳۳ کاٹ دیئے تو
۱۳ بچا۔ ایک گھٹانے پر صحیح عدد ۱۲ آجائے گا۔
یہی وہ عدد ہے جو آپ کے دوست نے سوچا تھا۔
اب آپ اسے بتا دیجئے۔ وہ آپ کی حساب دانی
دیکھ کر دنگ رہ جائے گا۔ یہ یاد رکھئے کہ اکائی اور
دہائی میں ہمیشہ ۳۳ آئیں گے انھیں کاٹ دیجئے۔

اشرف النساء

کھانے میں نمک

ایک بادشاہ تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ دونوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ایک دن وہ سوچنے لگا کہ نہ جانے اس کی لڑکیاں اس سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ آخر اس نے اپنی بڑی لڑکی کو بلایا اور اس سے پوچھا، تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟"

"اتنی ہی جتنی مجھے اپنی آنکھوں سے" بڑی لڑکی نے فوراً جواب دیا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر اسے قیمتی ہار دے دیا۔

اب بادشاہ نے دوسری لڑکی کو بلایا اور اس سے بھی یہی سوال کیا۔ لڑکی نے نہایت سادگی سے کہا" ابا میں آپ کو اتنا ہی چاہتی ہوں جتنا کھانے میں نمک کو۔"

بادشاہ کو یہ سُن کر بہت غصہ آیا کہ اس نے اسے ایک معمولی چیز کے برابر سمجھ رکھا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ بادشاہ نے غصّے میں آکر شہزادی کو محل سے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ بے چاری لڑکی بہت پریشان ہوئی۔ روئی، گڑگڑائی، لیکن بادشاہ نے ایک نہ سُنی راج ہٹ تو مشہور ہی ہے۔ ماں سے ملنے گئی۔ ماں نے اسے گلے لگا لیا۔

دونوں خوب روئے ۔ جاتے وقت ملکہ نے اچھے اچھے کپڑے اور قیمتی جواہرات ایک گٹھری میں باندھ کر شہزادی کے حوالے کئے اور ایک انگوٹھی بھی شہزادی کی انگلی میں پہنادی اور کہا " اس کی بہت حفاظت کرنا "

چھوٹی شہزادی اپنے محل پر آخری نظر ڈالتے ہوئے نکل گئی ۔ اور بغیر سوچے سمجھے ایک طرف کو چل دی ۔ چلتے چلتے وہ ایک دوسرے ملک میں پہنچی ۔ اُسے خیال آیا کہ یہاں نوکری کرلے ۔ وہ نوکری کے لئے بہت سر مارتی رہی ۔ لیکن کہیں کوئی کام نہیں ملا ۔ ایک دن اس کو معلوم ہوا کہ ایک کسان کو ایک چرواہے کی ضرورت ہے ۔ تو اس نے اپنا سب سے معمولی جوڑا نکالا اور اسے گندے پانی میں ڈال کر میلا کرڈالا ۔ تمام قیمتی کپڑے اور زیورات ایک چھوٹے سے معمولی صندوق میں خرید کر رکھ لئے ۔ اور ایک چرواہن کا بھیس بدل لیا ۔ اب وہ بالکل چرواہن معلوم ہورہی تھی ۔ کسان کے پاس گئی ۔ تو اس نے بڑی خوشی سے اسے نوکر رکھ لیا ۔ پہلے تو اس کو اس کام میں بہت تکلیف ہوئی مگر آخر بہت اچھی طرح کام کرنے لگی ۔

وہ اپنی بکریاں ایک چشمے کے کنارے چرانے جایا کرتی ۔ ادھر بکریاں چرتیں وہ نہا دھو کر صاف کپڑے اور زیورات پہن کر چشمے کے پانی میں اپنے کو دیکھتی اور شاہی محل کے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتی ۔

ایک دن اسی طرح وہ کپڑے وغیرہ پہنے چشمے میں اپنی صورت دیکھ رہی تھی کہ اسے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی ۔ دیکھتی کیا ہے کہ ایک خوبصورت شخص گھوڑے پر چلا آرہا ہے ۔ یہ اس ملک کا شہزادہ تھا جو شکار کے لئے نکلا تھا ۔ مگر راستہ بھول کر اس جنگل میں آگیا تھا ۔ شہزادہ لڑکی کو دیکھ کر پہلے تو ٹھٹکا ۔ لیکن فوراً ہی گھوڑے کو اس کی طرف بڑھایا ۔ لڑکی ہرنی کی طرح تیزی سے بھاگ کر جنگل میں غائب ہوگئی ۔ بہت دیر تک شہزادہ اس کو ڈھونڈتا رہا ۔ لیکن وہ نہ ملنا تھی نہ ملی ۔ آخر شہزادہ مایوس ہوکر لوٹنے لگا ۔ اس درمیان میں اس کے ساتھی اس کی تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچ گئے تھے اب وہ محل کو چلا لیکن خیال اسی لڑکی کی طرف تھا

محل میں آکر اس نے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ جاکر کسی طرح اس لڑکی کو ڈھونڈھ کر لائیں۔ فوراً ہی ملازم اس جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ آخر کافی تلاش کے بعد نوکر اس لڑکی کو اپنے ساتھ محل میں لے آئے شہزادے نے اپنی ماں سے کہا "میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔—

"بیٹا یہ ایک معمولی لڑکی ہے"۔ ملکہ نے کہا۔" اور تم شہزادے۔ وہ کالی ہے اور تم گورے، کہاں تم، کہاں کالی کلوٹی لڑکی۔ شہزادے نے کہا! "میری اماں! وہ کالی نہیں۔ اس کالے رنگ کے پیچھے ایک چاند چھپا ہوا ہے۔ آپ زرا پانی منگوائیے میں ابھی بتاتا ہوں"۔ حکم کی دیر تھی پانی لایا گیا۔ جب شہزادی منہ دھو چکی تو سب لوگ حیران رہ گئے، سچ مچ وہ تو بہت خوبصورت نکلی۔ پھر اس کو نہلا کر اچھے کپڑے پہنائے گئے۔ شہزادے کی ماں نے شادی کا پیام دیا تو شہزادی نے کہا کہ "میرے والد بادشاہ ہیں۔ میں ان کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ شہزادے نے اس بادشاہ کے پاس دعوت نامہ بھیجا۔ یہ دعوت نامہ پاکر وہ بادشاہ چند روز بعد یہاں آیا۔

بادشاہ کی آمد پر سارے شہر میں بڑا زور دار جشن منایا گیا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو بادشاہ ملکہ اور شہزادہ بادشاہ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے اور مہمان نے لقمہ اٹھایا تو نمک نہ تھا۔ اسی وقت نمک لایا گیا۔ لیکن بادشاہ کچھ اداس ہو گیا تو شہزادہ نے پوچھا "عالی جاہ! آپ اداس کیوں ہو گئے"۔

بادشاہ نے کہا "آپ کو کیا بتاؤں اس وقت کھانے میں نمک نہ پاکر مجھے اپنی لڑکی یاد آئی جو اسی طرح ایک بات پر مجھ سے جدا ہو گئی"۔ یہ کہہ کر بادشاہ کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور وہ دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہوا"۔

شہزادے نے کہا "عالی جاہ! آپ اداس نہ ہوں، تشریف رکھیں، آپ کی لڑکی یہیں موجود ہے"۔ فوراً شہزادی داخل ہوئی، اور دوڑ کر اپنے باپ سے لپٹ گئی"۔

لطیفے

مختلف بچے

بوڑھا:۔ احمد میاں! جیسی میری طاقت جوانی میں تھی ویسی اب بھی ہے۔

…دا:۔ وہ کیسے؟

بوڑھا:۔ میرے گھر میں ایک وزنی پتھر پڑا ہے۔ نہ وہ مجھ سے جوانی میں کبھی ہلا اور نہ بڑھاپے میں۔

دوست:۔ (دوسرے سے) جو انگوٹھی میں نے تم کو دی تھی وہ تمہارے نئے دوست کو پسند آئی؟

دوسرا:۔ ارے یار وہ تو بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے تو یہ تک بتا دیا کہ یہ تم نے کہاں سے چرائی تھی۔

عبدالسعید خاں لکھنؤ

حمید:۔ بھائی سلیم! مجھے رات کو ایک سے ایک پریشان خواب نظر آتے ہیں۔

سلیم:۔ مت دیکھا کرو۔

حمید:۔ وہ کیسے؟

سلیم:۔ آنکھیں بند کر لیا کرو۔

شفیع اصغر۔ جھانسی

ماں:۔ رشید بیٹا! کان کیوں کھود رہے ہو۔

رشید:۔ اماں! آج اسکول میں ماسٹر صاحب نے بتایا ہے کہ کان سے سونا نکلتا ہے۔

مالکن:۔ ارے بدھو! آج اتنا لیٹ کیوں آیا۔

بدھو:۔ مالکن میں تو لیٹ کر نہیں کھڑے ہو کر آرہا ہوں۔

عفت آرا نسیم۔ آرہ

باپ:- بیٹا جب مصیبت آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے۔
بیٹا:- آبا جان جب ہمارے یہاں آئے گی تو ایک ہی طرف سے آئے گی کیوں کہ ہمارے گھر میں ایک ہی طرف دروازہ ہے۔

چالاک وکیل:- چوری کا جرم تم پر ثابت ہو چکا ہے تم اب بھی سچ بول کر رہائی پا سکتے ہو۔
ملزم:- نہیں سرکار نہیں میں اب آپ لوگوں کے دھوکے میں نہیں آؤں گا۔

میں جانتا ہوں کہ اگر سچ بولا تو جیل جانا ہوگا۔

محمد محبوب الحق لسبل آرہ

سبزی فروش۔ اگر میرے پاس برلا کے برابر دولت ہو جائے تو میں برلا سے زیادہ دولت مند ہو جاؤں۔
گاہک:- وہ کیسے؟
سبزی فروش:- میرے پاس ایک سبزی کی دکان بھی تو ہے۔

بقیہ "کنجوس کا ہاتھ"

کیا تھا کہ جب تک وہ زندہ رہیں گے۔ اس وقت تک کسی کو اپنی کوئی بھی چیز نہ دیں گے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہے، اور انہوں نے اپنا ہاتھ تک بھی کسی کی طرف نہیں بڑھایا۔ آپ لوگوں کی غلطی تھی کہ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا نہیں اور ان کا ہاتھ مانگتے رہے۔ بھلا وہ کیسے دیتے۔
اگر آپ لوگ اُن سے کہتے کہ میرا ہاتھ پکڑ لو تو وہ ضرور اپنا ہاتھ بڑھا دیتے۔" اس بات پر لوگوں کو افسوس ہوا۔ لیکن کنجوس کی حماقت پر غصہ آیا جو مر گیا لیکن اُس نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا۔

(فارسی سے)

رب اختر (پورولیا)

کنجوس کا ہاتھ

ہمارے گاؤں میں ایک صاحب رہتے تھے جو بڑے کنجوس تھے۔ نام تو اُن کا کچھ اور تھا۔ لیکن لوگ انھیں کنجوس میاں ہی کہتے تھے۔ کیونکہ وہ کبھی کسی کو بھی اپنی کوئی چیز نہ دیتے تھے۔ آیئے ہم آپ کو اُن کی زندگی کی آخری کہانی سُنائیں۔

ایک بار وہ کنوئیں میں پانی بھرنے کے لئے گئے تو اچانک پیر پھسلا اور کنجوس میاں کنوئیں کے اندر جا پڑے۔ یہ دیکھتے ہی لوگ کنوئیں کے پاس پہنچے۔ ایک آدمی کنوئیں میں اُترا اور بولا "لاؤ میاں اپنا ہاتھ تھما دو۔" لیکن کنجوس میاں نے اپنا ہاتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس آدمی نے کہا "اگر تم اپنا ہاتھ دوگے تو میں تمھیں کنوئیں سے باہر کھینچ کر نکال دوں گا۔" مگر کنجوس میاں نے پھر بھی اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اور ڈوب کر اس دنیا سے چل بسے۔ وہ آدمی نا اُمید ہوکر کنوئیں سے باہر نکل آیا۔

کنجوس کی بیوی کو جہاں اپنے شوہر کی موت کا غم تھا وہاں اُسے ایک ہلکی سی خوشی بھی ہوئی لوگوں کو حیرت ہوئی اور پوچھا۔ "اتنے بڑے غم کے موقع پر خوشی کی کیا بات ہے؟" کنجوس کی بیوی نے جواب دیا "میرے شوہر نے یہ عہد

باقی صفحہ ۵۴ پر

بچوں کی دلچسپ کتابیں

- فقیر کی دعا ۵/
- لنگڑا دیو ۵/
- بچوں کی بیت بازی ۳/
- رستم چور ۵/
- بھن بھن بانو ۱۰/
- دنیا کے بسنے والے ۱۰/
- مقناطیس کی کہانی ۸/
- ہمت کے پھل ۶/
- شہزادی کا ہار ۵/
- جادو کی کہانی ۵/
- خدا کی لاٹھی ۵/
- میرا نام کیا ہے ۴/
- بجلی اور مقناطیس کی کہانی ۱۰/
- خرگوش کا ہونٹ ۵/
- شہزادی گلنار ۷/
- قدرت کے کرشمے ۱۰/
- جنگل کا راجا ۵/
- شہزادی نیلم ۴/
- جانباز سپاہی ۱۰/
- ننھا منو ۴/
- محنت ۷/

- نقلی شہزادی ۵/
- ناگ شہزادہ ۴/
- چھوٹی لالٹین ۵/
- جو تیرا چلو بھر خون پیا ہو ۷/
- شہزادہ اور ٹھگ ۸/

- بادشاہ کا خواب ۵/
- پرندوں کا ایکا ۴/
- شہزادی گلفام ۶/
- ان تھک جان ۱۰/
- جنگل کی بلی ۶/

بچوں کی نئی کتابیں

- امت کی ماں ۴/
- جاسوسی کہانی ۴/
- انوکھا راجہ ۴/
- رحم دل لڑکی ۳/
- خاک کا پتلا ۳/
- شرارت کا پتلا ۴/
- نجومی کی پیشین گوئی ۳
- جادو کا کوڑا ۴/
- پری کا انعام ۳/
- بے گناہ وزیر ۳/
- کئے جاؤ کوشش ۳
- جنگل کی شہزادی ۵
- جادوگر ۶/

- کایا پلٹ ۵/
- جادو کی چھڑی ۳/
- پھولوں کی شہزادی ۵/
- سونے کا راجہ ۵/
- اندھیر نگری ۳/
- دنیا کے بچے ۱۰/
- جھوٹوں کا بادشاہ ۵/

- بجلی کی کہانی ۴/
- مزہ چکھائیں گے ۵/
- خربوزہ شہزادہ ۵/
- مرغی چیر چلی ۵/
- گوہر پری ۵/

بچوں کے ناول

- علی بابا کا غار ۸/
- تیس مار خاں ۷/
- لال بجھکڑ ۱۰/

- پریم کی جیت ۴/
- قاضی اور ٹھگ ۴/
- بوڑھا جادوگر ۵/
- مسٹر گڑبڑ خاں ۵/
- جادوگر کی کہانی ۵/
- نوشیرواں کا انصاف ۵/
- لاٹھی کا سانپ ۶/
- اور وہ شریف بن گیا ۴/
- انوکھی چابی ۵/
- چوہوں کی کانفرنس ۶/
- مداری کا ڈنڈا ۴/
- ضدی شہزادہ ۵/
- علم کی قیمت ۳/
- شیخ چلی نے شادی کی ۳/
- چور کی داڑھی میں تنکا ۳/
- جادوگر ملکہ ۵/
- بدھو سیٹھ ۴/
- آگ کا چمن ۳/
- الٹا درخت (ناول) ۲/۱۲/۰

پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں　　مطبوعہ اشوک پریس دہلی

بنی ٦٦ ویں سالگرہ پر ۱۴ر نومبر کو چاچا نہرو بچوں کے ساتھ

ے موقع پر پروفیسر محمد مجیب جامعہ نرسری اسکول کے بچوں کے ساتھ

نوٹ:۔ نونہال بے بی شو ماہ فروری ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوگا۔ صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔